هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ

تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودی

جلد اول

ادارہ ترجمان القرآن

لاہور

اردو ڈیجیٹل لائبریری

Urdu Digital Library

اس پلیٹ فارم سے جاری ہونے والی تمام کتب صرف مطالعے اور تحقیقی مقاصد کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

ان کتب کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

مصنفین اور ناشرین کا بنیادی حق ہے کہ ان کی کتابیں خرید کر استعمال کی جائیں۔

اردو ڈیجیٹل لائبریری کے وٹسپ اور ٹیلیگرام چینل میں شامل ہو کر بہترین کتب سے لطف اندوز ہوں۔

http://telegram.me/UrduDigitalLibrary

مطلوبہ کتب کے لیے کتاب/مصنف کا نام لکھ کر وٹسپ کیجیے

+ 92 336 300 2000

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الانعام

جلد اوّل

ادارہ ترجمان القرآن
لاہور

تفسیر:	تفہیم القرآن (جلد اول، ڈیلکس ایڈیشن)	
مُفسر:	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	
باہتمام:	سیّد خالد فاروق مودودی	
مطبع:	عرفان افضل پرنٹنگ پریس، لاہور	
ناشر:	ادارہ ترجمان القرآن غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور	
فون:	Ph: + 92 - 42 - 37236665 - 37234014	
ای میل:	Idaratarjuman@yahoo.com	
ویب سائٹ:	www.tarjumanulquran.com.pk	
پہلی تا ۵۵ ویں (کتابت شدہ):	(مجموعی اشاعت)	۳۵۹۹۹۹
کمپیوٹرائزڈ ایڈیشن:		
اوّل تا بارھویں:	(مجموعی تعداد)	۴۹۰۰۰
خواندگی قرآنی متن:	قاری عادل ولیجہ مظاہری (رجسٹرڈ پروف ریڈر)	
ترھویں:	اکتوبر ۲۰۱۴ء	۵۴۰۰
چودھویں:	مارچ ۲۰۱۵ء	۱۳۰۰
پندرھویں:	اپریل ۲۰۱۶ء	۱۲۵۰

فہرست مضامین

فہرست نقشہ جات

(تمام نقشہ جات جلد کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

دیباچہ

قرآنِ مجید کے ترجمہ وتفسیر پر ہماری زبان میں اب تک اتنا کام ہو چکا ہے کہ اب کسی شخص کا محض برکت وسعادت کی خاطر ایک نیا ترجمہ یا ایک نئی تفسیر شائع کر دینا وقت اور محنت کا کوئی صحیح مَصرف نہیں ہے۔ اِس راہ میں مزید کوشش اگر معقول ہوسکتی ہے تو صرف اُس صورت میں جب کہ آدمی کسی ایسی کسر کو پورا کر رہا ہو جو سابق مترجمین ومفسّرین کے کام میں رہ گئی ہو، یا طالبینِ قرآن کی کسی ایسی ضرورت کو پورا کرے جو پچھلے تراجم وتفاسیر سے پوری نہ ہوتی ہو۔

اِن صفحات میں ترجمانی وتفہیمِ قرآن کی جو سعی کی گئی ہے، وہ دراصل اسی بُنیاد پر ہے۔ میں ایک مدّت سے محسُوس کر رہا تھا کہ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگوں میں رُوحِ قرآن تک پہنچنے اور اس کتابِ پاک کے حقیقی مدّعا سے رُوشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہوگئی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے، وہ مترجمین ومفسّرین کی قابلِ قدر مساعی کے باوجود ہُنوز تِشنہ ہے۔ اس کے ساتھ مَیں یہ احساس بھی اپنے اندر پا رہا تھا کہ اس تِشنگی کو بُجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ خدمت مَیں بھی کر سکتا ہوں۔ انھی دونوں احساسات نے مجھے اُس کوشش پر مجبُور کیا جس کے ثمرات ہدیۂ ناظرین کیے جا رہے ہیں۔ اگر فی الواقع میری یہ حقیر پیش کش لوگوں کے لیے فہمِ قرآن میں کچھ بھی مددگار ثابت ہوئی تو یہ میری بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی۔

اِس کام میں میرے پیشِ نظر علما اور محققین کی ضروریات نہیں ہیں، اور نہ اُن لوگوں کی ضروریات

ہیں جو عَرَبی زبان اور علومِ دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد قرآنِ مجید کا گہرا تحقیقی مُطالَعَہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حضرات کی پیاس بُجھانے کے لیے بہت کچھ سامان پہلے سے موجود ہے۔ میں جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، وہ اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں، جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اور علومِ قرآن کے وسیع ذخیرے سے استفادہ کرنا جن کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اُنھی کی ضروریات کو میں نے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس وجہ سے بہت سے اُن تفسیری مَباحِث کو مَیں نے سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا جو علمِ تفسیر میں بڑی اہمیّت رکھتے ہیں مگر اس طبقے کے لیے غیر ضروری ہیں۔ پھر جو مقصد مَیں نے اس کام میں اپنے سامنے رکھا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک عام ناظر اس کتاب کو پڑھتے ہوئے قرآن کا مفہُوم و مدّعا بالکل صاف صاف سمجھتا چلا جائے، اور اس سے وہی اثر قبول کرے جو قرآن اُس پر ڈالنا چاہتا ہے۔ نیز دَورانِ مطالعہ میں جہاں جہاں اسے اُلجھنیں پیش آ سکتی ہوں وہ صاف کر دی جائیں اور جہاں کچھ سوالات اس کے ذہن میں پیدا ہوں ان کا جواب اُسے بروقت مل جائے۔ یہ میری کوشش ہے۔ اب اس امر کا فیصلہ عام ناظرین ہی کر سکتے ہیں کہ مَیں اس میں کہاں تک کامیاب ہُوا ہوں۔ بہرحال یہ حرفِ آخر نہیں ہے۔ ہر ناظر سے میری درخواست ہے کہ جہاں کوئی تشنگی محسوس ہو، یا کسی سوال کا جواب نہ ملے، یا مدّعا اچھی طرح واضح نہ ہو رہا ہو اس سے مجھے مُطَّلَع کیا جائے، تاکہ میں اس خدمت کو زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکوں۔ علمائے کرام سے بھی مَیں گزارش کرتا ہوں کہ مجھے میری غلطیوں سے آگاہ فرمائیں۔

چند الفاظ ترجمانی و تفہیم کے متعلّق بھی:

مَیں نے اس کتاب میں ترجمے کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مَیں پابندیِ لفظ کے ساتھ قرآنِ مجید کا ترجمہ کرنے کو غلط سمجھتا ہوں۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جہاں تک ترجمۂ قرآن کا تعلّق ہے، یہ خدمت اس سے پہلے متعدّد بزرگ بہترین طریقے پر انجام دے چکے ہیں اور اس راہ میں اب کسی مزید کوشش کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ فارسی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ، اور اُردُو میں شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ رفیع الدّین صاحب، مولانا محمُود حَسَن صاحب، مولانا اشرف علی صاحب اور حافظ فتح محمد صاحب جالندھری کے تراجم اُن اغراض کو بخوبی پورا کر دیتے ہیں جن کے لیے ایک لفظی ترجمہ درکار ہوتا ہے۔

لیکن کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جو لفظی ترجمے سے پوری نہیں ہوتیں اور نہیں ہوسکتیں۔ اُنھی کو مَیں نے ترجمانی کے ذریعے سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

لفظی ترجمے کا اصل فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو قرآن کے ہر ہر لفظ کا مطلب معلوم ہو جاتا ہے اور وہ ہر آیت کے نیچے اس کا ترجمہ پڑھ کر جان لیتا ہے کہ اس آیت میں یہ کچھ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اس فائدے کے ساتھ اس طریقے میں کئی پہلو نقص کے بھی ہیں جن کی وجہ سے ایک غیر عربی داں ناظر قرآنِ مجید سے اچھی طرح مستفید نہیں ہوسکتا۔

پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسُوس ہوتی ہے، وہ روانیِ عبارت، زورِ بیان، بلاغتِ زبان، اور تاثیرِ کلام کا فُقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی رُوح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسُوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل وفکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب وجگر تک اُترتی چلی جارہی ہے۔ اس طرح کا کوئی تأثُّر رُونما ہونا تو درکنار، ترجمے کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے جس کی نظیر لانے کے لیے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمے کی چھلنی صرف دوا کے خشک اجزا ہی کو اپنے اندر سے گزرنے دیتی ہے۔ رہی ادب کی وہ تیز وتُند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے، اس کا کوئی حصّہ ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا۔ وہ اِس چھلنی کے اُوپر ہی سے اُڑ جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن کی تاثیر میں اس کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصّہ ہے، اس کے ادب کا حصّہ بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کا دل بھی پگھلا دیتی تھی۔ جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح عرب کی ساری زمین ہلا دی تھی۔ جس کی قوتِ تاثیر کا لوہا اس کے شدید ترین مخالفین تک مانتے تھے اور ڈرتے تھے کہ یہ جادُو اثر کلام جو سُنے گا وہ بالآخر نقدِ دل ہار بیٹھے گا۔ یہ چیز اگر قرآن میں نہ ہوتی اور وہ اُسی طرح کی زبان میں نازل ہوا ہوتا جیسی اس کے ترجموں میں ہم کو ملتی ہے، تو اہلِ عرب کے دلوں کو گرمانے اور نرمانے میں اسے ہرگز وہ کامیابی نہ حاصل ہوسکتی جو فی الواقع اسے حاصل ہوئی۔

لفظی ترجموں سے طبائع کے پوری طرح متأثّر نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ترجمے بالعُموم بَین السُّطُور درج کیے جاتے ہیں، یا نئے طرز کے مطابق صفحے کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے ایک طرف کلام اللہ اور دُوسری طرف ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اُس غرض کے لیے تو عین مناسب ہے جس کی خاطر آدمی لفظی ترجمہ پڑھتا ہے، کیونکہ اس طرح ہر لفظ اور ہر آیت کے مقابلے میں اس کا ترجمہ ملتا جاتا ہے۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ ایک آدمی جس طرح دُوسری کتابوں کو پڑھتا اور ان سے اثر قبول کرتا ہے، اُس طرح وہ ترجمۂ قرآن کو نہ تو مسلسل پڑھ سکتا ہے اور نہ اس سے اثر قبول کرسکتا ہے، کیونکہ بار بار ایک اجنبی زبان کی عبارت اس کے مطالعے کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے۔ انگریزی ترجموں میں اس سے بھی زیادہ بے اثری پیدا کرنے کا ایک سبب یہ ہے کہ بائبل کے ترجمے کی پیروی میں قرآن کی ہر آیت کا ترجمہ الگ الگ نمبروار درج کیا جاتا ہے۔ آپ کسی بہتر سے بہتر مضمون کو لے کر ذرا اس کے فقرے فقرے کو الگ کر دیجیے اور اُوپر نیچے نمبروار لکھ کر اُسے پڑھیے۔ آپ کو خود محسُوس ہو جائے گا کہ مربوط اور مسلسل عبارت سے جو اثر آپ کے ذہن پر پڑتا تھا اس سے آدھا اثر بھی اِن جدا جدا فقروں کے پڑھنے سے نہیں پڑتا۔

ایک اور وجہ، اور بڑی اہم وجہ لفظی ترجمے کے غیر مؤثّر ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرزِ بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے۔ اگر اس کو منتقل کرتے وقت تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں تبدیل نہ کیا جائے اور جُوں کا تُوں اس کا ترجمہ کر ڈالا جائے تو ساری عبارت غیر مربوط ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآنِ مجید ابتداءً لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیا گیا تھا، بلکہ دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں حسبِ موقع وضرورت ایک تقریر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی جاتی تھی اور آپؐ اسے ایک خطبے کی شکل میں لوگوں کو سُناتے تھے۔ تقریر کی زبان اور تحریر کی زبان میں فطرتاً بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً تحریر میں ایک شبہے کو بیان کر کے اسے رفع کیا جاتا ہے۔ مگر تقریر میں شبہ کرنے والے خود سامنے موجود ہوتے ہیں، اس لیے بسا اوقات یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ ''لوگ ایسا کہتے ہیں''، بلکہ مقرّر آمدِ سُخَن ہی میں ایک فقرہ ایسا کہہ جاتا ہے جو ان کے شُبہے کا جواب ہوتا ہے۔ تحریر میں سلسلۂ کلام سے الگ مگر اس سے قریبی تعلّق رکھنے والی کوئی بات کہنی ہو تو اس کو جملۂ معترضہ کے طور پر کسی نہ کسی طرح عبارت سے جدا کر کے لکھا جاتا ہے، تاکہ ربطِ کلام

ٹوٹنے نہ پائے۔ لیکن تقریر میں صرف لہجہ اور طرزِ خطاب بدل کر ایک مقرر بڑے بڑے جملہ ہائے معترضہ بولتا چلا جاتا ہے اور کوئی بے ربطی محسُوس نہیں ہوتی۔ تحریر میں بیان کا تعلّق ماحول سے جوڑنے کے لیے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن تقریر میں ماحول خود ہی بیان سے اپنا تعلّق جوڑ لیتا ہے اور ماحول کی طرف اشارہ کیے بغیر جو باتیں کہی جاتی ہیں، اُن کے درمیان کوئی خلا محسُوس نہیں ہوتا۔ تقریر میں متکلّم اور مُخاطَب بار بار بدلتے ہیں۔ مقرّر اپنے زورِ کلام میں موقع و محل کے لحاظ سے کبھی ایک ہی گروہ کا ذکر بصیغۂ غائب کرتا ہے اور کبھی اسے حاضر سمجھ کر براہِ راست خطاب کرتا ہے۔ کبھی واحد کا صیغہ بولتا ہے اور کبھی جمع کے صیغے استعمال کرنے لگتا ہے۔ کبھی متکلّم وہ خود ہوتا ہے، کبھی کسی گروہ کی طرف سے بولتا ہے، کبھی کسی بالائی طاقت کی نمایندگی کرنے لگتا ہے، اور کبھی وہ بالائی طاقت خود اس کی زبان سے بولنے لگتی ہے۔ تقریر میں یہ چیز ایک حُسن پیدا کرتی ہے، مگر تحریر میں آ کر یہی چیز بے جوڑ ہو جاتی ہے۔ یہی وجوہ ہیں کہ جب کسی تقریر کو تحریر کی شکل میں لایا جاتا ہے تو اس کو پڑھتے وقت آدمی لازماً ایک طرح کی بے ربطی محسُوس کرتا ہے، اور یہ احساس اُتنا ہی بڑھتا جاتا ہے جتنا اصل تقریر کے حالات اور ماحول سے آدمی دور ہوتا جاتا ہے۔ خود قرآنِ عَرَبی میں بھی ناواقف لوگ جس بے ربطی کی شکایت کرتے ہیں، اس کی اصلیت یہی ہے۔ وہاں تو اُس کو دُور کرنے کے لیے اِس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تفسیری حواشی کے ذریعے سے ربطِ کلام کو واضح کیا جائے، کیونکہ قرآن کی اصل عبارت میں کوئی کمی بیشی کرنا حرام ہے۔ لیکن کسی دُوسری زبان میں قرآن کی ترجمانی کرتے ہوئے اگر تقریر کی زبان کو احتیاط کے ساتھ تحریر کی زبان میں تبدیل کر لیا جائے، تو بڑی آسانی کے ساتھ یہ بے ربطی دُور ہو سکتی ہے۔

علاوہ بریں، جیسا کہ ابھی مَیں اشارتاً عرض کر چکا ہوں، قرآنِ مجید کی ہر سُورت دراصل ایک تقریر تھی جو دعوتِ اسلامی کے کسی مرحلے میں ایک خاص موقع پر نازل ہوتی تھی۔ اس کا ایک خاص پَس منظر ہوتا تھا۔ کچھ مخصُوص حالات اس کا تقاضا کرتے تھے۔ اور کچھ ضرورتیں ہوتی تھیں جنھیں پُورا کرنے کے لیے وہ اُترتی تھی۔ اپنے اُس پَس منظر اور اپنی اُس شانِ نزُول کے ساتھ قرآن کی اِن سُورتوں کا تعلّق اتنا گہرا ہے کہ اگر اس سے الگ کر کے مجرّد الفاظ کا ترجمہ آدمی کے سامنے رکھ دیا جائے تو بہت سی باتوں کو وہ قطعاً نہیں سمجھے گا، اور بعض باتوں کو اُلٹا سمجھ جائے گا، اور قرآن کا پورا مدّعا تو شاید کہیں اس کی گرفت میں آئے گا ہی نہیں۔ قرآنِ عربی کے معاملے میں اس مشکل کو دُور کرنے

کے لیے تفسیر سے مدد لینی پڑتی ہے، کیونکہ اصل قرآن میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دُوسری زبان میں ہم اتنی آزادی برت سکتے ہیں کہ قرآن کی ترجمانی کرتے وقت کلام کو کسی نہ کسی حد تک اس کے پَس منظر اور اس کے حالاتِ نُزُول کے ساتھ جوڑتے چلے جائیں، تاکہ ناظر کے لیے وہ پُوری طرح بامعنیٰ ہو سکے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآن اگرچہ عربیِ مُبِین میں نازل ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی ایک مخصُوص اصطلاحی زبان بھی رکھتا ہے۔ اس نے بکثرت الفاظ کو ان کے اصل لُغوِی معنیٰ سے ہٹا کر ایک خاص معنیٰ میں استعمال کیا ہے، اور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کو وہ مختلف مواقع پر مختلف مفہُومات میں استعمال کرتا ہے۔ پابندیِ لفظ کے ساتھ جو ترجمے کیے جاتے ہیں، ان میں اس اصطلاحی زبان کی رعایت ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہے، اور اس کے ملحوظ نہ رہنے سے بسا اوقات ناظرین طرح طرح کی اُلجھنوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً، ایک لفظ کفر کو لیجیے جو قرآن کی اصطلاح میں اصل عربی لُغت اور ہمارے فقہا و متکلّمین کی اصطلاح دونوں سے مختلف معنیٰ رکھتا ہے، اور پھر خود قرآن میں بھی ہر جگہ ایک ہی معنیٰ میں استعمال نہیں ہُوا ہے۔ کہیں اس سے مراد مکمّل غیر ایمانی حالت ہے۔ کہیں یہ مجرّد انکار کے معنیٰ میں آیا ہے۔ کہیں اس سے محض ناشکری اور احسان فراموشی مراد لی گئی ہے۔ کہیں مُقتضیاتِ ایمان میں سے کسی کو پورا نہ کرنے پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کہیں اعتقادی اقرار مگر عملی انکار یا نافرمانی کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے۔ کہیں ظاہری اطاعت مگر باطنی بے اعتقادی کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان مختلف مواقع پر اگر ہم ہر جگہ کفر کا ترجمہ کفر ہی کرتے چلے جائیں، یا اَور کسی لفظ کا التزام کر لیں، تو بلاشبہ ترجمہ اپنی جگہ صحیح ہو گا لیکن ناظرین کہیں مطلب سے محرُوم رہ جائیں گے، کہیں کسی غلط فہمی کے شکار ہوں گے، اور کہیں خَلجان میں پڑ جائیں گے۔

لفظی ترجمے کے طریقے میں کَسر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی تلافی کرنے کے لیے مَیں نے ''ترجمانی'' کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اُردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہُوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے، اسے حتّی الامکان صحّت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دُوں۔ اُسلوبِ بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عَرَبیِ مُبِین کی ترجمانی اُردُوئے مُبِین میں ہو، تقریر کا ربط فطری طریقے

سے تحریر کی زبان میں ظاہر ہو، اور کلامِ الٰہی کا مطلب و مدّعا صاف صاف واضح ہونے کے ساتھ اس کا شاہانہ وقار اور زورِ بیان بھی، جہاں تک بس چلے، ترجمانی میں منعکس ہو جائے۔ اس طرح کے آزاد ترجمے کے لیے یہ تو بہرحال ناگزیر تھا کہ لفظی پابندیوں سے نکل کر ادائے مطالب کی جسارت کی جائے، لیکن معاملہ کلامِ الٰہی کا تھا، اس لیے میں نے بہت ڈرتے ڈرتے ہی یہ آزادی برتی ہے۔ جس حد تک احتیاط میرے امکان میں تھی، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے کہ قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادیِ بیان کی گنجایش دیتی ہے، اس سے تجاوُز نہ ہونے پائے۔

پھر چونکہ قرآن کو پُوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ارشادات کا پَس منظر بھی آدمی کے سامنے ہو، اور یہ چیز ترجمانی میں پُوری طرح نمایاں نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے میں نے ہر سُورَہ کے آغاز میں ایک دیباچہ لکھ دیا ہے، جس میں اپنی حد تک پُوری تحقیق کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ سُورَہ کس زمانے میں نازل ہوئی، اُس وقت کیا حالات تھے، اسلام کی تحریک کس مرحلے میں تھی، کیا اس کی ضروریات تھیں اور کیا مسائل اُس وقت درپیش تھے۔ نیز جہاں کہیں کسی خاص آیت یا مجموعۂ آیات کی کوئی الگ شانِ نُزُول ہے، وہاں میں نے اُسے حاشیے میں بیان کر دیا ہے۔

حواشی میں میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی ایسی بحث نہ چھیڑی جائے جو ناظر کی توجّہ قرآن سے ہٹا کر کسی دُوسری چیز کی طرف پھیر دے۔ جتنے حاشیے بھی میں نے لکھے ہیں، دو ہی قسم کے مَقامات پر لکھے ہیں۔ ایک وہ جہاں مجھے محسُوس ہُوا کہ ایک عام ناظر اس جگہ تشریح چاہے گا، یا اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہو گا، یا وہ کسی شبہے میں مبتلا ہو جائے گا۔ دوسرے وہ جہاں مجھے اندیشہ ہُوا کہ ناظر اس جگہ سے سرسری طور پر گزر جائے گا اور قرآن کے ارشاد کی اصل رُوح اس پر واضح نہ ہو گی۔

جو لوگ اس کتاب سے پُورا فائدہ اُٹھانا چاہیں، اُن کو میں مشورہ دُوں گا کہ پہلے ہر سُورت کے دیباچے کو بغور پڑھ لیا کریں، اور جب تک وہ سُورت ان کے زیرِ مُطالعہ رہے، وقتاً فوقتاً اس کے دیباچے پر نظر ڈالتے رہیں۔ پھر روزانہ قرآنِ مجید کا جتنا حصّہ وہ معمولاً پڑھتے ہوں، اس کی ایک ایک آیت کا لفظی ترجمہ پہلے پڑھ لیں۔ اس غرض کے لیے فارسی، اُردو، انگریزی تراجم میں سے جس کو وہ چاہیں منتخب

کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد تفہیم القرآن کی ترجمانی کو حواشی کی طرف توجّہ کیے بغیر مسلسل ایک عبارت کے طور پر پڑھیں، تاکہ قرآن کے اس حصے کا پورا مضمون بیک وقت ان کے سامنے آ جائے۔ پھر ایک ایک آیت کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لیے حواشی کا مطالعہ کریں۔ اس طرح پڑھنے سے مجھے توقّع ہے کہ ایک عام ناظر کو قرآنِ مجید کی عالمانہ واقفیت نہ سہی، عامیانہ واقفیت اِن شاء اللہ بخوبی حاصل ہو جائے گی۔

اِس کتاب کو مَیں نے مُحرّم ۱۳۶۱ھ (فروری ۱۹۴۲ء) میں شروع کیا تھا۔ پانچ سال سے زیادہ مدّت تک اس کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ سُورۂ یوسُفؑ کے آخر تک ترجمانی اور تفہیم تیار ہوگئی۔ اس کے بعد پے دَر پے ایسے اسباب پیش آتے چلے گئے کہ مجھے نہ تو آگے کچھ لکھنے کا موقع مل سکا اور نہ اتنی فرصت ہی مُیَسّر آ سکی کہ جتنا کام ہو چکا تھا، اسی کو نظرِ ثانی کر کے اس قابل بنا سکتا کہ کتابی صُورت میں شائع ہو سکے۔ اب اسے حُسنِ اتفاق کہیے یا سُوءِ اتفاق کہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں یکایک مجھے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور یہاں مجھ کو وہ فرصت بہم پہنچ گئی جو اس کتاب کو پریس میں جانے کے قابل بنانے کے لیے درکار تھی۔ میں خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ جس غرض کے لیے میں نے یہ محنت کی ہے، وہ پُوری ہو اور یہ کتاب قرآنِ مجید کے فہم میں بندگانِ خدا کے لیے واقعی کچھ مددگار ثابت ہو سکے، وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

نیو سنٹرل جیل۔ ملتان ابُوالاعلیٰ

۱۷ ذی القعدہ ۱۳۶۸ھ (۱۱ ستمبر ۱۹۴۹ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مُقدّمہ

اِن گزارشوں کے عنوان میں لفظ ’’مقدّمہ‘‘ دیکھ کر کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں قرآن کا مقدّمہ لکھ رہا ہوں۔ یہ قرآن کا نہیں، تفہیمُ القرآن کا مقدّمہ ہے، اور اس کے لکھنے سے میرے پیشِ نظر دو مقصد ہیں:

اوّل یہ کہ قرآن کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے ایک عام ناظر اُن باتوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے جن کو ابتدا ہی میں سمجھ لینے سے فہمِ قرآن کی راہ آسان ہو جاتی ہے، ورنہ یہ باتیں دَورانِ مطالعہ میں بار بار کھٹکتی ہیں اور بسا اوقات محض اِن کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آدمی برسوں تک معانیِ قرآن کی سطح ہی پر گھومتا رہتا ہے، گہرائی میں اُترنے کا راستہ اُسے نہیں ملتا۔

دوم یہ کہ اُن سوالات کا جواب پہلے ہی دے دیا جائے جو قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے وقت بالعُموم لوگوں کے ذہن میں پیدا ہُوا کرتے ہیں۔ مَیں اس مقدِّمے میں صرف اُن سوالات کا جواب دُوں گا جو خود میرے ذہن میں اوّل اوّل پیدا ہوئے تھے، یا جن سے بعد میں مجھ کو سابقہ پیش آیا۔ ان کے علاوہ اگر کچھ اور سوالات بھی جواب طلب باقی رہ گئے ہوں تو ان سے مجھے آگاہ کیا جائے۔ اُن کا جواب اِن شاء اللہ آیندہ اشاعت کے موقع پر اس مقدِّمے میں بڑھا دیا جائے گا۔

عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں، ان میں ایک متعیّن موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب ایک ایسا شخص جو قرآن سے

ابھی تک اجنبی رہا ہے، پہلی مرتبہ اس کتاب کے مطالعے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یہ توقع لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ ''کتاب'' ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعیُّن ہو گا، پھر اصل مضمون کو ابواب اور فُصول میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلے پر بحث کی جائے گی، اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبے کو بھی الگ الگ لے کر اس کے متعلّق احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی۔ لیکن جب وہ کتاب کھول کر مُطالَعہ شروع کرتا ہے تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دُوسرے ہی اندازِ بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل نا آشنا تھا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اَخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت، نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تَخوِیف، بشارت، تسلّی، دلائل، شواہد، تاریخی قصّے، آثارِ کائنات کی طرف اشارے، بار بار ایک دُوسرے کے بعد آرہے ہیں۔ ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دُہرایا جا رہا ہے۔ ایک مضمون کے بعد دُوسرا اور دُوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہو جاتا ہے، بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یکایک آ جاتا ہے۔ مخاطَب اور مُتکلِّم بار بار بدلتے ہیں اور خطاب کا رُخ رہ رہ کر مختلف سَمتوں میں پھرتا ہے۔ بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں۔ تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں۔ فلسفہ و ما بعد الطبیعیات ہیں تو مَنطِق و فلسفہ کی زبان میں نہیں۔ انسان اور موجوداتِ عالَم کا ذکر ہے تو عُلُومِ طبیعی کے طریقے پر نہیں۔ تمدُّن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو عُلُومِ عمران کے طرز پر نہیں۔ قانونی احکام اور اُصُولِ قانون کا بیان ہے تو مُقنِّنوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف۔ اَخلاق کی تعلیم ہے تو فلسفۂ اَخلاق کے سارے لٹریچر سے اس کا انداز جُدا۔ یہ سب کچھ اپنے سابق کتابی تصوُّر کے خلاف پا کر آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور اُسے یوں محسُوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک غیر مُرتَّب، غیر مَربُوط، مُنتَشِر کلام ہے جو اوّل سے لے کر آخر تک بے شمار چھوٹے بڑے مختلف شَذرات پر مشتمل ہے، مگر مسلسل عبارت کی شکل میں لکھ دیا گیا ہے۔ مخالفانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے والا اسی پر طرح طرح کے اعتراضات کی بِنا رکھ دیتا ہے، اور مُوافقانہ نقطۂ نظر رکھنے والا کبھی معنیٰ کی طرف سے آنکھیں بند کر کے شُکوک سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی اس ظاہری بے ترتیبی کی تاویلیں کر کے اپنے دل کو سمجھا لیتا ہے، کبھی مصنوعی طریقے سے ربط تلاش کر کے عجیب عجیب نتائج نکالتا ہے، اور کبھی ''نظریۂ شَذرات'' کو قبول کر لیتا ہے، جس کی وجہ سے ہر آیت اپنے سیاق وسباق سے الگ ہو کر ایسی معنیٰ آفرینیوں کی آماج گاہ

بن جاتی ہے جو قائل کے منشا کے خلاف ہوتی ہیں۔

پھر ایک کتاب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اس کا موضوع معلوم ہو، اس کے مقصد و مدّعا اور اس کے مرکزی مضمون کا علم ہو، اس کے اندازِ بیان سے واقفیت ہو، اس کی اصطلاحی زبان اور اس کے مخصوص طرزِ تعبیر سے شناسائی ہو، اور اس کے بیانات اپنی ظاہری عبارت کے پیچھے جن احوال و معاملات سے تعلّق رکھتے ہوں، وہ بھی نظر کے سامنے رہیں۔ عام طور پر جو کتابیں ہم پڑھتے ہیں، ان میں یہ چیزیں بآسانی مِل جاتی ہیں اس لیے ان کے مضامین کی تہ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی بڑی زحمت نہیں ہوتی۔ مگر قرآن میں یہ اُس طرح نہیں ملتیں جس طرح ہم دُوسری کتابوں میں انھیں پانے کے عادی رہے ہیں۔ اس لیے ایک عام کتاب خواں کی سی ذہنیّت لے کر جب ہم میں کا کوئی شخص قرآن کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اسے کتاب کے موضوع، مدّعا اور مرکزی مضمون کا سُراغ نہیں ملتا، اس کا اندازِ بیان اور طرزِ تعبیر بھی اُسے کچھ اجنبی سا محسُوس ہوتا ہے، اور اکثر مقامات پر اس کی عبارات کا پَس منظر بھی اُس کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متفرق آیات میں حکمت کے جو موتی بکھرے ہوئے ہیں، ان سے کم و بیش مستفید ہونے کے باوجود آدمی کلام اللہ کی اصلی رُوح تک پہنچنے سے محروم رہ جاتا ہے اور علمِ کتاب حاصل کرنے کے بجائے اس کو کتاب کے محض چند منتشر نِکات و فوائد پر قناعت کر لینی پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر لوگ جو قرآن کا مطالعہ کر کے شُبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان کے بھٹکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فہمِ کتاب کے ان ضروری مبادی سے ناواقف رہتے ہوئے جب وہ قرآن کو پڑھتے ہیں تو اس کے صفحات پر مختلف مضامین انھیں بکھرے ہُوئے نظر آتے ہیں، بکثرت آیات کا مطلب اُن پر نہیں کُھلتا، بہت سی آیات کو دیکھتے ہیں کہ بجائے خود نُورِ حکمت سے جگمگا رہی ہیں مگر سیاق عبارت میں بالکل بے جوڑ محسُوس ہوتی ہیں، متعدّد مقامات پر تعبیرات اور اُسلوبِ بیان کی ناواقفیت انھیں اصل مطلب سے ہٹا کر کسی اَور ہی طرف لے جاتی ہے، اور اکثر مواقع پر پَس منظر کا صحیح علم نہ ہونے سے شدید غلط فہمیاں پیش آتی ہیں۔

قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اِس کے نُزُول کی کیفیت اور اس کی ترتیب کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا

موضوعِ گفتگو کیا ہے؟ اس کی ساری بحث کس مُدّعا کے لیے ہے؟ کس مرکزی مضمون کے ساتھ اس کے یہ بے شمار مختلف النّوع مضامین وابستہ ہیں؟ کیا طرزِ اِستدلال اور کیا طرزِ بیان اس نے اپنے مُدّعا کے لیے اختیار کیا ہے؟ یہ اور ایسے ہی دُوسرے چند ضروری سوالات ہیں جن کا جواب صاف اور سیدھے طریقے سے اگر آدمی کو ابتدا ہی میں مِل جائے تو وہ بہت سے خطرات سے بچ سکتا ہے اور اس کے لیے فہم و تدبُّر کی راہیں کشادہ ہو سکتی ہیں۔ جو شخص قرآن میں تصنیفی ترتیب تلاش کرتا ہے اور وہاں اسے نہ پا کر کتاب کے صفحات میں بھٹکنے لگتا ہے، اُس کی پریشانی کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ مطالعۂ قرآن کے ان مبادی سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ اس گمان کے ساتھ مطالعہ شروع کرتا ہے کہ وہ ''مذہب کے موضوع پر ایک کتاب'' پڑھنے چلا ہے۔ ''مذہب کا موضوع'' اور ''کتاب''، ان دونوں کا تصوّر اس کے ذہن میں وہی ہوتا ہے جو بالعُموم ''مذہب'' اور ''کتاب'' کے متعلّق ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر جب وہاں اسے اپنے ذہنی تصوّر سے بالکل ہی مختلف ایک چیز سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے مانوس نہیں کر سکتا اور سررشتۂ مضمون ہاتھ نہ آنے کے باعث بَین السُّطور یوں بھٹکنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہ ایک اجنبی مسافر ہے جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے۔ اس گم گشتگی سے وہ بچ جائے اگر اسے پہلے ہی یہ بتا دیا جائے کہ تم جس کتاب کو پڑھنے جا رہے ہو وہ تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے، اس کی ''تصنیف'' دُنیا کی ساری کتابوں سے بالکل مختلف طور پر ہوئی ہے، اپنے موضوع اور مضمون اور ترتیب کے لحاظ سے بھی وہ ایک نرالی چیز ہے، لہٰذا تمھارے ذہن کا وہ ''کتابی'' سانچا جو اَب تک کی کُتب بِینی سے بنا ہے، اس کتاب کے سمجھنے میں تمھاری مدد نہ کرے گا بلکہ اُلٹا مزاحم ہوگا۔ اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے پہلے سے قائم کیے ہوئے قیاسات کو ذہن سے نکال کر اس کی عجیب خُصُوصیّات سے شناسائی حاصل کرو۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ناظر کو قرآن کی اصل سے واقف ہو جانا چاہیے۔ وہ خواہ اس پر ایمان لائے یا نہ لائے، مگر اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اسے نقطۂ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اس نے اور اس کے پیش کرنے والے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

۱- خداوندِ عالَم نے، جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرماں روا ہے، اپنی بے پایاں مَملکت کے

اس حصّے میں، جسے زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا۔ اُسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں۔ بھلائی اور بُرائی کی تمیز دی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی۔ تَصَرُّف کے اختیارات بخشے۔ اور فی الجُملہ ایک طرح کی خود اختیاری (autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

۲- اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوندِ عالَم نے اچھی طرح اس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمھارا اور تمام جہان کا مالک، معبُود اور حاکم مَیں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو، نہ کسی دُوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمھاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمھیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے، دراصل تمھارے لیے ایک امتحان کی مدّت ہے، جس کے بعد تمھیں میرے پاس واپس آنا ہوگا اور میں تمھارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمھارے لیے صحیح رَوِیّہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبُود اور حاکم تسلیم کرو۔ جو ہدایت میں بھیجوں اس کے مطابق دنیا میں کام کرو، اور دنیا کو دَارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شُعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمھارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمھارے لیے ہر وہ رَوِیّہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رَوِیّہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمھیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہوگا اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمھیں اَبدی راحت و مَسرّت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنّت ہے۔ اور اگر دُوسرے کسی رَوِیّے پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دُنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہوگا اور دنیا سے گزر کر عالَمِ آخرت میں جب آؤ گے تو اَبدی رنج و مصیبت کے اُس گڑھے میں پھینک دیے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

۳- یہ فہمائش کر کے مالکِ کائنات نے نوعِ انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نَوع کے اوّلین افراد (آدم اور حوّا) کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ اوّلین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے، بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پُوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انھیں ان کا قانونِ حیات بتا دیا گیا تھا۔

اُن کا طریقِ زندگی خدا کی اطاعت (یعنی اسلام) تھا، اور وہ اپنی اولاد کو یہی بات سکھا کر گئے کہ وہ مطیعِ خدا (مُسلم) بن کر رہیں۔ لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اس صحیح طریقِ زندگی (دین) سے منحرف ہو کر مختلف قسم کے غلط رَوِیّوں کی طرف چل پڑے۔ انھوں نے غفلت سے اس کو گُم بھی کیا اور شرارت سے اس کو مَسخ بھی کر ڈالا۔ انھوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی اور غیر انسانی، خیالی اور مادّی ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھیرا لیا۔ انھوں نے خدا کے دیے ہوئے علمِ حقیقت (العلم) میں طرح طرح کے اَوہام اور نظریّوں اور فلسفوں کی آمیزش کر کے بے شمار مذاہب پیدا کر لیے۔ انھوں نے خدا کے مقرر کیے ہوئے عادلانہ اُصولِ اَخلاق و تمدُّن (شریعت) کو چھوڑ کر یا بگاڑ کر اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنے تعصُّبات کے مطابق ایسے قوانینِ زندگی گھڑ لیے جن سے خدا کی زمین ظلم سے بھر گئی۔

۴- خدا نے جو محدُود خود اختیاری انسان کو دی تھی، اس کے ساتھ یہ بات مطابقت نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقی مداخلت سے کام لے کر ان بگڑے ہوئے انسانوں کو زبردستی صحیح رَوِیّے کی طرف موڑ دیتا۔ اور اس نے دنیا میں کام کرنے کے لیے جو مُہلت اِس نَوع کے لیے اور اس کی مختلف قوموں کے لیے مقرر کی تھی، اس کے ساتھ یہ بات بھی مطابقت نہ رکھتی تھی کہ اِس بغاوت کے رُونما ہوتے ہی وہ انسانوں کو ہلاک کر دیتا۔ پھر جو کام ابتدائے آفرینش سے اُس نے اپنے ذمّے لیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان کی خود اختیاری کو برقرار رکھتے ہوئے اُس کی مُہلتِ عمل کے دَوران میں، اُس کی رہنمائی کا انتظام وہ کرتا رہے گا۔ چنانچہ اپنی اِس خود عائد کردہ ذمّہ داری کو ادا کرنے کے لیے اس نے انسانوں ہی میں سے ایسے آدمیوں کو استعمال کرنا شروع کیا جو اُس پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کی پیروی کرنے والے تھے۔ اس نے ان کو اپنا نمایندہ بنایا۔ اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے۔ ان کو علمِ حقیقت بخشا۔ انھیں صحیح قانونِ حیات عطا کیا۔ اور انھیں اس کام پر مامور کیا کہ بنی آدم کو اُسی راہِ راست کی طرف پلٹنے کی دعوت دیں جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔

۵- یہ پیغمبر مختلف قوموں اور مُلکوں میں اُٹھتے رہے۔ ہزار ہا برس تک ان کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہزار ہا کی تعداد میں وہ مبعوث ہوئے۔ اُن سب کا ایک ہی دین تھا، یعنی وہ صحیح رَوِیّہ جو اوّل روز ہی انسان کو بتا دیا گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی ہدایت کے پَیرو تھے، یعنی اخلاق و تمدُّن کے وہ اَزَلی و اَبَدی اُصول جو آغاز

ہی میں انسان کے لیے تجویز کر دیے گئے تھے۔ اور اُن سب کا ایک ہی مشن تھا، یعنی یہ کہ اِس دین اور اِس ہدایت کی طرف اپنے اَبنائے نَوع کو دعوت دیں، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں ان کو منظّم کر کے ایک ایسی اُمّت بنائیں جو خود اللہ کے قانون کی پابند ہو اور دنیا میں قانونِ الٰہی کی اطاعت قائم کرنے اور اِس قانون کی خلاف ورزی روکنے کے لیے جِدّوجُہد کرے۔ ان پیغمبروں نے اپنے اپنے دَور میں اپنے اِس مشن کو پُوری خوبی کے ساتھ ادا کیا، مگر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئی، اور جنھوں نے اُسے قبول کر کے اُمّتِ مُسلِمَہ کی حیثیت اختیار کی، وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے، حتّٰی کہ ان میں سے بعض اُمّتیں ہدایتِ الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں، اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے مَسخ کر دیا۔

۶- آخرِکار خداوندِ عالم نے سرزمینِ عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُسی کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لیے پچھلے انبیاؑ آتے رہے تھے۔ اُن کے مُخاطَب عام انسان بھی تھے اور پچھلے انبیاؑ کے بگڑے ہوئے پَیرو بھی۔ سب کو صحیح رَوِیّے کی طرف دعوت دینا، سب کو ازسرِنو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں، اُنھیں ایک ایسی اُمّت بنا دینا اُن کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دُوسری طرف دنیا کی اصلاح کے لیے جِدّوجُہد کرے ــــــ اسی دعوت اور ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔

قرآن کی یہ اصل معلوم ہو جانے کے بعد ناظرین کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے، اس کا مرکزی مضمون کیا ہے، اور اس کا مُدّعا کیا ہے۔

اُس کا موضوع انسان ہے اِس اِعتبار سے کہ بلحاظِ حقیقتِ نفس الامری اُس کی فلاح اور اُس کا خُسران کس چیز میں ہے۔

اُس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظامِ کائنات اور اپنی ہستی اور اپنی دُنیوی زندگی کے متعلق جو نظریّات قائم کیے ہیں، اور اُن نظریات کی بنا پر

جو رَوِیّے اختیار کر لیے ہیں، وہ سب حقیقتِ نفسُ الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کُن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بتا دی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے وہی رَوِیّہ دُرست اور خوش انجام ہے جسے پچھلے صفحات میں ہم ''صحیح رَوِیّہ'' کے نام سے بیان کر چکے ہیں۔

اُس کا مُدّعا انسان کو اُس صحیح رَوِیّے کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی اُس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گُم اور اپنی شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔

اِن تین بنیادی اُمور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع اور اپنے مدّعا اور مرکزی مضمون سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اوّل سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النّوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جُڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر ہار کے رشتے میں مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ وہ زمین و آسمان کی ساخت پر، انسان کی خِلقت پر، آثارِ کائنات کے مشاہدات اور گزری ہوئی قوموں کے واقعات پر گفتگو کرتا ہے، مختلف قوموں کے عقائد و اَخلاق اور اعمال پر تنقید کرتا ہے، مابعد الطّبیعی اُمور و مسائل کی تشریح کرتا ہے، اور بہت سی دُوسری چیزوں کا ذکر بھی کرتا ہے، مگر اس لیے نہیں کہ اسے طبعیات یا تاریخ یا فلسفے یا کسی اور فن کی تعلیم دینی ہے، بلکہ اس لیے کہ اسے حقیقتِ نفسُ الامری کے متعلّق انسان کی غلط فہمیاں دُور کرنی ہیں، اصل حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی ہے، خلافِ حقیقت رَوِیّے کی غلطی و بدانجامی واضح کرنی ہے، اور اُس رَوِیّے کی طرف دعوت دینی ہے جو مطابقِ حقیقت اور خوش انجام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز کا ذکر صرف اُس حد تک اور اُس انداز میں کرتا ہے جو اس کے مُدّعا کے لیے ضروری ہے، ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدرِ ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رُجوع کرتا ہے، اور اس کا سارا بیان انتہائی یکسانی کے ساتھ ''دعوت'' کے محور پر گھومتا رہتا ہے۔

مگر قرآن کے طرزِ بیان اور اس کی ترتیب اور اس کے بہت سے مضامین کو آدمی اُس وقت تک اچھی طرح

نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ اِس کی کیفیّتِ نُزول کو بھی اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

یہ قرآن اس نوعیّت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اِسے لکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ اِسے شائع کر کے لوگوں کو ایک خاص رَوِیّہ زندگی کی طرف بُلائیں۔ نیز یہ اِس نوعیّت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس میں مصنّفانہ انداز پر کتاب کے موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلق بحث کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نہ تصنیفی ترتیب پائی جاتی ہے اور نہ کتابی اُسلوب۔ دراصل اِس کی نوعیّت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے شہرِ مکّہ میں اپنے ایک بندے کو پیغمبری کی خدمت کے لیے منتخب کیا اور اُسے حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ (قریش) سے دعوت کی ابتدا کرے۔ یہ کام شروع کرنے کے لیے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضمونوں پر مشتمل تھیں:

ایک، پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کے لیے کس طرح تیار کریں اور کس طرز پر کام کریں۔

دوسرے، حقیقتِ نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات، اور حقیقت کے بارے میں اُن غلط فہمیوں کی مجمل تردید جو گردوپیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں، جن کی وجہ سے اُن کا رَوِیّہ غلط ہو رہا تھا۔

تیسرے، صحیح رَوِیّے کی طرف دعوت اور ہدایتِ الٰہی کے اُن بنیادی اُصولِ اَخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کے لیے فلاح وسعادت ہے۔

شروع شروع کے یہ پیغامات ابتدائے دعوت کی مناسبت سے چند چھوٹے چھوٹے مختصر بولوں پر مشتمل ہوتے تھے، جن کی زبان نہایت شُستہ، نہایت شیریں، نہایت پُر اثر اور مُخاطَب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے ہوتی تھی، تاکہ دلوں میں یہ بول تیر ونشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود ان کے ترنُّم کی وجہ سے ان کی طرف متوجّہ ہوں، اور زبانیں ان کے حُسنِ تناسُب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر اُنھیں دُہرانے لگیں۔ پھر ان میں مَقامی رنگ بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ بیان تو کی جا رہی تھیں عالَم گیر صداقتیں، مگر ان کے لیے دلائل وشواہد اور مثالیں اُس قریب ترین ماحول سے لی گئی تھیں جس سے مُخاطَب لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ انھی کی تاریخ، انھی کی روایات، انھی کے روز مرّہ مشاہدے میں آنے والے آثار اور انھی کی اعتقادی واَخلاقی اور اجتماعی

خرابیوں پر ساری گفتگو تھی تاکہ وہ اس سے اثر لے سکیں۔

دعوت کا یہ ابتدائی مرحلہ تقریباً چار پانچ سال تک جاری رہا، اور اس مرحلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا ردِّعمل تین صورتوں میں ظاہر ہُوا:

(۱) چند صالح آدمی اس دعوت کو قبول کر کے اُمّتِ مسلمہ بننے کے لیے تیار ہو گئے۔

(۲) ایک کثیر تعداد جہالت یا خود غرضی یا آبائی طریقے کی محبّت کے سبب سے مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔

(۳) مکّے اور قریش کی حُدُود سے نِکل کر اس نئی دعوت کی آواز نسبتاً زیادہ وسیع حلقے میں پہنچنے لگی۔

یہاں سے اس دعوت کا دُوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اسلام کی اِس تحریک اور پُرانی جاہلیّت کے درمیان ایک سخت جاں گُسل کشمکش برپا ہوئی جس کا سلسلہ آٹھ نو سال تک چلتا رہا۔ نہ صرف مکّے میں، نہ صرف قبیلۂ قریش میں، بلکہ عرب کے بیشتر حِصّوں میں بھی جو لوگ پُرانی جاہلیّت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے، وہ اس تحریک کو بزور مٹا دینے پر تُل گئے۔ اُنھوں نے اسے دبانے کے لیے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔ جھُوٹا پروپیگنڈا کیا، الزامات اور شُبہات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کی، عوام الناس کے دلوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کیں، ناواقف لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سُننے سے روکنے کی کوششیں کیں، اِسلام قبول کرنے والوں پر نہایت وحشیانہ ظلم وستم ڈھائے، ان کا مَعاشی اور معاشرتی مقاطعہ کیا، اور ان کو اتنا تنگ کیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ دو دفعہ اپنے گھر چھوڑ کر حَبَش کی طرف ہجرت کر جانے پر مجبُور ہوئے، اور بالآخر تیسری مرتبہ ان سب کو مدینے کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ لیکن اس شدید اور روز افزوں مزاحمت کے باوجود یہ تحریک پھیلتی چلی گئی۔ مکّے میں کوئی خاندان اور کوئی گھر ایسا نہ رہا جس کے کسی نہ کسی فرد نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو۔ بیشتر مخالفینِ اسلام کی دشمنی میں شدّت اور تلخی کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اپنے بھائی، بھتیجے، بیٹے، بیٹیاں، بہنیں اور بہنوئی دعوتِ اسلام کے نہ صرف پیرو بلکہ جاں نثار حامی ہو گئے تھے اور ان کے اپنے دل وجگر کے ٹکڑے ہی ان سے برسرِ پیکار ہونے کو تیار تھے۔ پھر لُطف یہ ہے کہ جو لوگ پُرانی جاہلیّت سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس نَوخیز تحریک کی طرف آ رہے تھے، وہ پہلے بھی اپنی سوسائٹی کے بہترین لوگ سمجھے جاتے تھے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے بعد وہ اِتنے نیک،

اتنے راست باز اور اتنے پاکیزہ اَخلاق کے انسان بن جاتے تھے کہ دنیا اُس دعوت کی برتری محسُوس کیے بغیر رہ نہیں سکتی تھی جو ایسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور انھیں یہ کچھ بنا رہی تھی۔

اس طویل اور شدید کش مکش کے دَوران میں اللہ تعالیٰ حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت اپنے نبی پر ایسے پُرجوش خطبے نازل کرتا رہا جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز وتُند آگ کی سی تاثیر تھی۔ اُن خطبوں میں ایک طرف اہلِ ایمان کو اُن کے ابتدائی فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعُور پیدا کیا گیا، انھیں تقویٰ اور فضیلتِ اخلاق اور پاکیزگیِ سیرت کی تعلیم دی گئی، ان کو دینِ حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدوں اور جنت کی بشارتوں سے ان کی ہمّت بندھائی گئی، انھیں صبر وثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جِدّوجُہد کرنے پر اُبھارا گیا اور فداکاری کا ایسا زبردست جوش اور ولولہ اُن میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت جھیل جانے اور مخالفت کے بڑے سے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دُوسری طرف مخالفین اور راہِ راست سے منہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والوں کو اُن قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے، اُن تباہ شدہ بستیوں کے آثار سے عبرت دلائی گئی جن کے کھنڈروں پر سے شب و روز اپنے سفروں میں اُن کا گزر ہوتا تھا، توحید اور آخرت کی دلیلیں اُن کھلی کھلی نشانیوں سے دی گئیں جو رات دن زمین اور آسمان میں اُن کی آنکھوں کے سامنے نمایاں تھیں اور جن کو وہ خود اپنی زندگی میں بھی ہر وقت دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، شرک اور دعوائے خودمختاری اور انکارِ آخرت اور تقلیدِ آبائی کی غلطیاں ایسے بَیِّن دلائل سے واضح کی گئیں جو دل کو لگنے اور دماغ میں اُتر جانے والے تھے۔ پھر ان کے ایک ایک شُبہے کو رفع کیا گیا، ایک ایک اعتراض کا معقول جواب دیا گیا، ایک ایک اُلجھن جس میں وہ خود پڑے ہوئے تھے یا دُوسروں کو اُلجھانے کی کوشش کرتے تھے، صاف کی گئی، اور ہر طرف سے گھیر کر جاہلیّت کو ایسا تنگ پکڑا گیا کہ عقل وخِرَد کی دنیا میں اس کے لیے ٹھیرنے کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ اس کے ساتھ پھر اُن کو خدا کے غضب اور قیامت کی ہولناکیوں اور جہنّم کے عذاب کا خوف دلایا گیا، ان کے بُرے اَخلاق اور غلط طرزِ زندگی اور جاہلانہ رُسوم اور حق دشمنی اور مومن آزاری پر انھیں ملامت کی گئی، اور اَخلاق وتمدُّن کے وہ بڑے بڑے بنیادی اُصول ان کے سامنے پیش کیے گئے جن پر ہمیشہ سے خدا کی پسندیدہ صالح تہذیبوں کی تعمیر ہوتی چلی آ رہی ہے۔

یہ مرحلہ بجائے خود مختلف منزلوں پر مشتمل تھا جن میں سے ہر منزل میں دعوت زیادہ وسیع ہوتی گئی، جِدّوجُہد اور مُزاحمت زیادہ سخت ہوتی گئی، مختلف عقائد اور مختلف طرزِعمل رکھنے والے گروہوں سے سابقہ پیش آتا گیا، اور اسی کے مطابق اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں مضامین کا تنوّع بڑھتا گیا ـــــ یہ ہے قرآنِ مجید کی مکّی سورتوں کا پَس منظر۔

مکّے میں اس تحریک کو اپنا کام کرتے ہوئے تیرہ سال گزر چکے تھے کہ یکایک مدینے میں اس کو ایک ایسا مرکز بہم پہنچ گیا جہاں اس کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ عرب کے تمام حصّوں سے اپنے پیرووں کو سمیٹ کر ایک جگہ اپنی طاقت مجتمع کر لے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بیشتر متّبعینِ اسلام ہجرت کر کے مدینے پہنچ گئے۔ اِس طرح یہ دعوت تیسرے مرحلے میں داخل ہوئی۔

اس مرحلے میں حالات کا نقشہ بالکل بدل گیا۔ اُمّتِ مُسلِمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بِنا ڈالنے میں کامیاب ہوگئی۔ پُرانی جاہلیّت کے عَلَم برداروں سے مسلح مقابلہ شروع ہُوا۔ پچھلے انبیاؑ کی اُمّتوں (یہود و نصاریٰ) سے بھی سابقہ پیش آیا۔ خود اُمّتِ مُسلِمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گُھس آئے اور ان سے بھی نمٹنا پڑا۔ اور دس سال کی شدید کش مکش سے گزر کر آخرکار یہ تحریک کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیرِ نگیں ہوگیا اور عالَم گیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کُھل گئے۔ اِس مرحلے کی بھی مختلف منزلیں تھیں اور ہر منزل میں اِس تحریک کی مخصوص ضرورتیں تھیں۔ اِن ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی تقریریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی رہیں جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا، کبھی مُعلِّمانہ درس وتعلیم کا، اور کبھی مُصلِحانہ افہام وتفہیم کا ہوتا تھا۔ ان میں بتایا گیا کہ جماعت اور ریاست اور مَدَنیّتِ صالحہ کی تعمیر کس طرح کی جائے، زندگی کے مختلف شُعبوں کو کن اُصُول وضوابط پر قائم کیا جائے، مُنافِقین سے کیا سلوک ہو، ذِمّی کافروں سے کیا برتاؤ ہو، اہلِ کتاب سے تعلّقات کی کیا نوعیت رہے، برسرِ جنگ دشمنوں اور مُعاہِد قوموں کے ساتھ کیا طرزِعمل اختیار کیا جائے، اور مُنظّم اہلِ ایمان کا یہ گروہ دنیا میں خداوندِ عالَم کی خلافت کے فرائض انجام دینے کے لیے اپنے آپ کو کس طرح تیار کرے۔ اِن تقریروں میں ایک طرف مسلمانوں کی تعلیم و

تربیت کی جاتی تھی، ان کی کمزوریوں پر تنبیہ کی جاتی تھی، ان کو راہِ خدا میں جان و مال سے جہاد کرنے پر اُبھارا جاتا تھا، ان کو شکست اور فتح، مصیبت اور راحت، بدحالی اور خوش حالی، امن اور خوف، غرض ہر حال میں اس کے مناسب اخلاقیات کا درس دیا جاتا تھا، اور انھیں اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے جانشین بن کر اس دعوت و اصلاح کے کام کو انجام دے سکیں۔ دُوسری طرف اُن لوگوں کو جو دائرۂ ایمان سے باہر تھے، اہلِ کتاب، منافقین، کُفّار و مُشرکین، سب کو ان کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے سمجھانے، نرمی سے دعوت دینے، سختی سے ملامت اور نصیحت کرنے، خدا کے عذاب سے ڈرانے اور سبق آموز واقعات و احوال سے عبرت دلانے کی کوشش کی جاتی تھی، تاکہ ان پر حُجت تمام کر دی جائے۔

یہ ہے قرآنِ مجید کی مَدَنی سورتوں کا پَسِ منظر۔

اِس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ مجید ایک دعوت کے ساتھ اُترنا شروع ہوا، اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تکمیل تک تیئس سال کی مدّت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گزرتی رہی، ان کی مختلفُ النّوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصّے نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں وہ تصنیفی ترتیب نہیں ہوسکتی جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے کسی مَقالے میں اختیار کی جاتی ہے۔ پھر اس دعوت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قرآن کے جو چھوٹے اور بڑے حصّے نازل ہوئے، وہ بھی رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیے جاتے تھے، بلکہ تقریروں کی شکل میں بیان کیے جاتے اور اسی شکل میں پھیلائے جاتے تھے، اس لیے ان کا اُسلُوب بھی تحریری نہ تھا بلکہ خطابت کا اُسلُوب تھا۔ پھر یہ خطابت بھی ایک پروفیسر کے لیکچروں کی سی نہیں بلکہ ایک داعی کے خطبوں کی سی تھی جسے دل اور دماغ، عقل اور جذبات، ہر ایک سے اپیل کرنا ہوتا ہے، جس کو ہر قسم کی ذہنیتوں سے سابقہ پیش آتا ہے، جسے اپنی دعوت و تبلیغ اور عملی تحریک کے سلسلے میں بے شمار مختلف حالتوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر ممکن پہلو سے اپنی بات دلوں میں بٹھانا، خیالات کی دُنیا بدلنا، جذبات کا سیلاب اُٹھانا، مخالفتوں کا زور توڑنا، ساتھیوں کی اصلاح و تربیت کرنا اور ان میں جوش اور عزم اُبھارنا، دشمنوں کو دوست، اور منکروں کو مُعترف بنانا، مخالفین کی حُجت مُنقطع کرنا اور ان کی اَخلاقی طاقت کا اِستیصال کر دینا، غرض اُسے وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو ایک

دعوت کے عَلَم بردار اور ایک تحریک کے رہنما کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے اللہ نے اس کام کے سلسلے میں اپنے پیغمبر پر جو تقریریں نازل فرمائیں، اُن کا طرزِ خطابت وہی تھا جو ایک دعوت کے مناسبِ حال ہوتا ہے، اُن میں کالج کے لیکچروں کا سا انداز تلاش کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ قرآن میں مضامین کی اس قدر تکرار کیوں ہے۔ ایک دعوت اور عملی تحریک کا فطری اقتضا یہ ہے کہ وہ جس وقت جس مرحلے میں ہو اس میں وہی باتیں کہی جائیں جو اُس مرحلے سے مناسبت رکھتی ہوں، اور جب تک دعوت ایک مرحلے میں رہے بعد کے مراحل کی بات نہ چھیڑی جائے، بلکہ اُسی مرحلے کی باتوں کا اِعادہ کیا جاتا رہے، خواہ اس میں چند مہینے لگیں یا کئی سال صَرف ہو جائیں۔ پھر اگر ایک ہی قسم کی باتوں کا اِعادہ ایک ہی عبارت اور ایک ہی ڈھنگ پر کیا جاتا رہے تو کان انھیں سُنتے سُنتے تھک جاتے ہیں اور طبیعتیں اکتانے لگتی ہیں۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مرحلے میں جو باتیں بار بار کہنی ہوں انھیں ہر بار نئے الفاظ، نئے اُسلوب، اور نئی آن بان سے کہا جائے، تاکہ نہایت خوش گوار طریقے سے وہ دلوں میں بیٹھ جائیں اور دعوت کی ایک ایک منزل اچھی طرح مستحکم ہوتی چلی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی بُنیاد جن عقائد اور اصولوں پر ہو، اُنھیں پہلے قدم سے آخری منزل تک کسی وقت اور کسی حال میں نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے، بلکہ ان کا اِعادہ بہرحال دعوت کے ہر مرحلے میں ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ایک مرحلے میں قرآن کی جتنی سُورتیں نازل ہوئی ہیں، ان سب میں بالعُمُوم ایک ہی قسم کے مضامین الفاظ اور اندازِ بیان بدل بدل کر آئے ہیں۔ مگر توحید اور صفاتِ الٰہی، آخرت اور اس کی بازپُرس اور جزا و سزا، رسالت اور ایمان بالکتاب، تقویٰ اور صبر و توکُّل اور اسی قسم کے دُوسرے بُنیادی مضامین کی تکرار پورے قرآن میں نظر آتی ہے، کیونکہ اس تحریک کے کسی مرحلے میں بھی ان سے غفلت گوارا نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ بُنیادی تصوّرات اگر ذرا بھی کمزور ہو جاتے تو اسلام کی یہ تحریک اپنی صحیح رُوح کے ساتھ نہ چل سکتی۔

اگر غور کیا جائے تو اِسی بیان سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اُسی

ترتیب کے ساتھ کیوں نہ مُرتّب کر دیا جس کے ساتھ وہ نازل ہُوا تھا۔

اُوپر آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ تیئس سال تک قرآن کا نُزُول اُس ترتیب سے ہوتا رہا جس ترتیب سے دعوت کا آغاز اور اس کا اِرتقا ہُوا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ دعوت کی تکمیل کے بعد ان نازل شدہ اجزا کے لیے وہ ترتیب کسی طرح دُرست نہ ہوسکتی تھی جو صرف ارتقائے دعوت ہی کے ساتھ مناسبت رکھتی تھی۔ اب تو اُن کے لیے ایک دوسری ہی ترتیب درکار تھی جو تکمیلِ دعوت کے بعد کی صُورتِ حال کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ کیونکہ ابتدا میں اُس کے مُخاطب اوّل وہ لوگ تھے جو اسلام سے ناآشنائے محض تھے، اس لیے اُس وقت بالکل نقطۂ آغاز سے تعلیم وتلقین شروع کی گئی۔ مگر تکمیلِ دعوت کے بعد اس کے مُخاطَبِ اوّل وہ لوگ ہو گئے جو اس پر ایمان لا کر ایک اُمّت بن چکے تھے اور اُس کام کو جاری رکھنے کے ذمّہ دار قرار پائے تھے جسے پیغمبرؑ نے نظریّے اور عمل، دونوں حیثیتوں سے مکمّل کر کے ان کے حوالے کیا تھا۔ اب لامحالہ مُقدّم چیز یہ ہوگئی کہ پہلے یہ لوگ خود اپنے فرائض سے، اپنے قوانینِ حیات سے، اور اُن فتنوں سے جو پچھلے پیغمبروںؑ کی اُمّتوں میں رُونما ہوتے رہے ہیں، اچھی طرح واقف ہولیں، پھر اسلام سے بیگانہ دنیا کے سامنے خدا کی ہدایت پیش کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔

علاوہ بریں قرآنِ مجید جس طرز کی کتاب ہے، اسے اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اس پر خود ہی یہ حقیقت مُنکشِف ہو جائے گی کہ ایک ایک طرح کے مضامین کو ایک ایک جگہ جمع کرنا اِس کتاب کے مزاج ہی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کے مزاج کا تو تقاضا یہی ہے کہ اس کے پڑھنے والے کے سامنے مَدَنی مرحلے کی باتیں مکّی دَور والی تعلیم کے درمیان، اور مکّی مرحلے کی باتیں مَدنی دَور والی تقریروں کے درمیان، اور ابتدا کی گفتگوئیں آخر کی تلقینات کے بیچ میں، اور آخری دَور کی ہدایات آغازِ کار کی تعلیمات کے پہلو میں بار بار آتی چلی جائیں، تاکہ اسلام کا پورا منظر اور جامع نقشہ اس کی نگاہ میں رہے اور کسی وقت بھی وہ یک رُخا نہ ہونے پائے۔

پھر اگر قرآن کو اس کی نُزُولی ترتیب پر مُرتّب کیا بھی جاتا تو وہ ترتیب بعد کے لوگوں کے لیے صرف اُسی صُورت میں بامعنیٰ ہوسکتی تھی جب کہ قرآن کے ساتھ اس کی پُوری تاریخِ نُزُول اور اس کے ایک ایک جُز کی کیفیّتِ نُزول وشانِ نُزول لکھ کر لگا دی جاتی اور وہ لازمی طور پر قرآن کا ایک ضمیمہ بن کر رہتی۔ یہ بات اُس

مقصد کے خلاف تھی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا یہ مجموعہ مُرتّب اور محفوظ کرایا تھا۔ وہاں تو پیشِ نظر چیز ہی یہ تھی کہ خالص کلامِ الٰہی بغیر کسی دُوسرے کلام کی آمیزش یا شُمول کے، اپنی مختصر صُورت میں مُرتّب ہو، جسے بچّے، جوان، بُوڑھے، عورت، مرد، شہری، دیہاتی، عامی، عالم، سب پڑھیں، ہر زمانے میں اور ہر جگہ ہر حالت میں پڑھیں، اور ہر مرتبۂ عقل و دانش کا انسان کم از کم یہ بات ضرور جان لے کہ اُس کا خدا اُس سے کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد فوت ہو جاتا اگر اس مجمُوعۂ کلامِ الٰہی کے ساتھ ایک لمبی چوڑی تاریخ بھی لگی ہوئی ہوتی اور اس کی تلاوت بھی لازم کر دی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں، وہ اس کتاب کے مقصد و مُدّعا سے صرف نابلد ہی نہیں ہیں، بلکہ کچھ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا معلوم ہوتے ہیں کہ یہ کتاب محض علمِ تاریخ اور فلسفۂ عمران کے طَلَبہ ہی کے لیے نازل ہوئی ہے۔

ترتیبِ قرآن کے سلسلے میں یہ بات بھی ناظرین کو معلوم ہو جانی چاہیے کہ یہ ترتیب بعد کے لوگوں کی دی ہُوئی نہیں ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے قرآن کو اس طرح مُرتّب فرمایا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی سُورت نازل ہوتی تو آپؐ اُسی وقت اپنے کاتبوں میں سے کسی کو بُلاتے اور اس کو ٹھیک ٹھیک قلم بند کرانے کے بعد ہدایت فرما دیتے کہ یہ سُورت فُلاں سُورہ کے بعد اور فُلاں سُورہ سے پہلے رکھی جائے۔ اسی طرح اگر قرآن کا کوئی ایسا حصّہ نازل ہوتا جس کو مستقل سُورت بنانا پیشِ نظر نہ ہوتا، تو آپؐ ہدایت فرما دیتے تھے کہ اسے فُلاں سُورَہ میں فُلاں مَقام پر درج کیا جائے۔ پھر اسی ترتیب سے آپؐ خود بھی نماز میں اور دُوسرے مواقع پر قرآنِ مجید کی تلاوت فرماتے تھے اور اسی ترتیب کے مطابق صحابۂ کرامؓ بھی اس کو یاد کرتے تھے۔ لٰہذا یہ ایک ثابِت شُدہ تاریخی حقیقت ہے کہ قرآنِ مجید کا نُزُول جس روز مکمّل ہُوا اُسی روز اس کی ترتیب بھی مکمّل ہوگئی۔ جو اُس کا نازِل کرنے والا تھا، وہی اس کا مُرتّب کرنے والا بھی تھا۔ جس کے قلب پر وہ نازل کیا گیا، اُسی کے ہاتھوں اسے مُرتّب بھی کرا دیا گیا۔ کسی دُوسرے کی مجال نہ تھی کہ اس میں مداخلت کرتا۔

چونکہ نماز ابتدا ہی سے مسلمانوں پر فرض تھی[1]، اور تلاوتِ قرآن کو نماز کا ایک ضروری جُز قرار دیا گیا تھا، اس لیے نزولِ قرآن کے ساتھ ہی مسلمانوں میں حفظِ قرآن کا سلسلہ جاری ہو گیا اور جیسے جیسے قرآن اُترتا گیا، مسلمان اس کو یاد بھی کرتے چلے گئے۔ اس طرح قرآن کی حفاظت کا انحصار صرف کھجور کے اُن پتّوں اور ہڈّی اور جھلّی کے اُن ٹکڑوں ہی پر نہ تھا جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے کاتبوں سے اس کو قلم بند کرایا کرتے تھے، بلکہ وہ اُترتے ہی بیسیوں، پھر سیکڑوں، پھر ہزاروں، پھر لاکھوں دلوں پر نقش ہو جاتا تھا اور کسی شیطان کے لیے اس کا امکان ہی نہ تھا کہ اس میں ایک لفظ کا بھی ردّ و بدل کر سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب عرب میں اِرتداد کا طوفان اُٹھا اور اس کے فرو کرنے کے لیے صحابۂ کرامؓ کو سخت خوں ریز لڑائیاں لڑنی پڑیں، تو ان معرکوں میں ایسے صحابہؓ کی ایک کثیر تعداد شہید ہو گئی جن کو پُورا قرآن حفظ تھا۔ اِس سے حضرت عمرؓ کو خیال پیدا ہُوا کہ قرآن کی حفاظت کے معاملے میں صرف ایک ہی ذریعے پر اعتماد کر لینا مناسب نہیں ہے، بلکہ الواحِ قلب کے ساتھ ساتھ صفحاتِ قِرطاس پر بھی اس کو محفوظ کرنے کا انتظام کر لینا چاہیے۔ چنانچہ اس کام کی ضرورت انھوں نے حضرت ابوبکرؓ پر واضح کی اور انھوں نے کچھ تأمُّل کے بعد اس سے اتفاق کر کے حضرت زیدؓ بن ثابت انصاری کو، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب (سیکرٹری) رہ چکے تھے، اس خدمت پر مامور فرمایا۔ قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ ایک طرف تو وہ تمام لکھے ہوئے اجزا فراہم کر لیے جائیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑے ہیں، دُوسری طرف صحابۂ کِرامؓ میں سے بھی جس جس کے پاس قرآن یا اس کا کوئی حصّہ لکھا ہوا ملے، وہ ان سے لے لیا جائے[2]، اور پھر حُفّاظِ قرآن سے بھی مدد لی جائے، اور ان تینوں ذرائع کی مُتّفقہ شہادت پر، کامل صحّت کا اطمینان کرنے کے بعد، قرآن کا ایک ایک لفظ مُصحَف میں ثَبت کیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق قرآنِ مجید کا ایک مُستند نسخہ تیار کر کے اُمّ المومنین حضرت حَفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رکھوا دیا گیا

[1] واضح رہے کہ پنج وقتہ نماز تو بِعثَت کے کئی سال بعد فرض ہوئی، لیکن نماز بجائے خود اوّل روز ہی سے فرض تھی۔ اسلام کی کوئی ساعت کبھی ایسی نہیں گزری ہے جس میں نماز فرض نہ ہو۔

[2] معتبر رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں متعدّد صحابہؓ نے قرآن کو یا اس کے مختلف اجزا کو اپنے پاس قلم بند کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرات عثمان، علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عَمرو بن عاص، سالم مَولیٰ حُذَیفہ، زید بن ثابت، مُعاذ بن جَبَل، اُبَیّ بن کَعب اور ابو زید قیس بن السّکن رضی اللہ عنہم کے ناموں کی تصریح ملتی ہے۔

اور لوگوں کو عام اجازت دے دی گئی کہ جو چاہے اس کی نقل کرے اور جو چاہے اِس سے مقابلہ کر کے اپنے نسخے کی تصحیح کر لے۔

عرب میں مختلف علاقوں اور قبیلوں کی بولیوں میں ویسے ہی فرق پائے جاتے تھے جیسے ہمارے مُلک میں شہر شہر کی بولی اور ضلع ضلع کی بولی میں فرق ہے، حالانکہ زبان سب کی وہی ایک اُردو یا پنجابی یا بنگالی وغیرہ ہے۔ قرآنِ مجید اگرچہ نازل اُس زبان میں ہُوا تھا جو مکّے میں قریش کے لوگ بولتے تھے، لیکن ابتداءً اس امر کی اجازت دے دی گئی تھی کہ دُوسرے علاقوں اور قبیلوں کے لوگ اپنے اپنے لہجے اور محاورے کے مطابق اسے پڑھ لیا کریں، کیونکہ اس طرح معنیٰ میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، صرف عبارت اُن کے لیے ملائم ہو جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اسلام پھیلا اور عرب کے لوگوں نے اپنے ریگستان سے نکل کر دُنیا کے ایک بڑے حصّے کو فتح کر لیا، اور دُوسری قوموں کے لوگ بھی دائرۂ اسلام میں آنے لگے، اور بڑے پیمانے پر عرب وعجم کے اِختلاط سے عربی زبان متأثّر ہونے لگی، تو یہ اندیشہ پیدا ہُوا کہ اگر اب بھی دُوسرے لہجوں اور محاوروں کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت باقی رہی تو اس سے طرح طرح کے فتنے کھڑے ہو جائیں گے۔ مثلاً یہ کہ ایک شخص کسی دُوسرے شخص کو غیر مانوس طریقے پر کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہوئے سُنے گا اور یہ سمجھ کر اس سے لڑ پڑے گا کہ وہ دانستہ کلامِ الٰہی میں تحریف کر رہا ہے۔ یا یہ کہ یہ لفظی اختلافات رفتہ رفتہ واقعی تحریفات کا دروازہ کھول دیں گے۔ یا یہ کہ عرب وعجم کے اختلاط سے جن لوگوں کی زبان بگڑے گی، وہ اپنی بگڑی ہوئی زبان کے مطابق قرآن میں تَصَرُّف کر کے اس کے حُسنِ کلام کو بگاڑ دیں گے۔ ان وجوہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرامؓ کے مشورے سے یہ طے کیا کہ تمام مَمالکِ اسلامیہ میں صرف اُس معیاری نسخۂ قرآن کی نقلیں شائع کی جائیں جو حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا، اور باقی تمام دُوسرے لہجوں اور محاوروں پر لکھے ہوئے مَصاحِف کی اشاعت ممنُوع قرار دے دی جائے۔

آج جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے، یہ ٹھیک ٹھیک اُسی مُصْحَفِ صدّیقی کے مطابق ہے جس کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے سرکاری اہتمام سے تمام دیار و امصار میں بھجوائی تھیں۔ اِس وقت بھی دُنیا میں متعدد مقامات پر قرآن کے وہ مستند نسخے موجود ہیں۔ کسی کو اگر قرآن کی محفوظیّت میں ذرّہ برابر بھی شک ہو تو وہ اپنا اطمینان اس

طرح کرسکتا ہے کہ مغربی افریقا میں کسی کتاب فروش سے قرآن کا ایک نسخہ خریدے، اور جاوا میں کسی حافظ سے زبانی قرآن سُن کر اس کا مقابلہ کرے، اور پھر دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں حضرت عثمانؓ کے وقت سے لے کر آج تک مختلف صدیوں کے لکھے ہوئے جو مَصاحِف رکھے ہیں ان سے اس کا تقابُل کر لے۔ اگر کسی حرف یا شوشے کا فرق وہ پائے تو اس کا فرض ہے کہ دُنیا کو اس سب سے بڑے تاریخی انکشاف سے ضرور مُطّلع کرے۔ کوئی شک نواز قرآن کے مُنزَّل مِنَ اللہ ہونے میں شک کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، لیکن یہ بات کہ جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے، یہ بلا کسی کمی بیشی کے ٹھیک وہی قرآن ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا، یہ تو ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس میں کسی شک کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی دُوسری چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو اس قدر قطعی الثُّبوت ہو۔ اگر کوئی شخص اس کی صحّت میں شک کرتا ہے تو وہ پھر اس میں بھی شک کرسکتا ہے کہ رومن امپائر نامی کوئی سلطنت دُنیا میں رہ چکی ہے، اور کبھی مغل ہندوستان پر حکومت کر چکے ہیں، اور ''نپولین'' نام کا کوئی شخص بھی دنیا میں پایا گیا ہے۔ ایسے ایسے تاریخی حقائق پر شکوک کا اظہار کرنا علم کا نہیں، جہالت کا ثبوت ہے۔

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی طرف دُنیا میں بے شمار انسان بے شمار مقاصد لے کر رُجوع کرتے ہیں۔ ان سب کی ضروریات اور اغراض کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی مشورہ دینا آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ طالبوں کے اس ہُجوم میں مجھ کو صرف ان لوگوں سے دلچسپی ہے جو اس کو سمجھنا چاہتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں کہ یہ کتاب انسان کے مسائلِ زندگی میں اس کی کیا رہنمائی کرتی ہے۔ ایسے لوگوں کو میں یہاں طریقِ مطالعہءِ قرآن کے بارے میں کچھ مشورے دُوں گا اور کچھ ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کروں گا جو بالعُموم انسان کو اس معاملے میں پیش آتی ہیں۔

کوئی شخص چاہے قرآن پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، بہرحال اگر وہ اس کتاب کو فی الواقع سمجھنا چاہتا ہے تو اوّلیں کام اسے یہ کرنا چاہیے کہ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم کیے ہوئے تصوُّرات اور نظریّات سے، اور موافقانہ یا مخالفانہ اغراض سے جس حد تک ممکن ہو خالی کرلے اور سمجھنے کا خالص مقصد لے کر کُھلے دل سے اس کو پڑھنا شروع کرے۔ جو لوگ چند مخصُوص قسم کے خیالات ذہن میں لے کر اس کتاب کو پڑھتے ہیں، وہ اس کی سطروں کے درمیان اپنے ہی خیالات پڑھتے چلے جاتے ہیں، قرآن کی اُن کو ہوا بھی نہیں لگنے پاتی۔ یہ طریقِ مطالعہ کسی کتاب کو پڑھنے

کے لیے بھی صحیح نہیں ہے، مگر خُصُوصیّت کے ساتھ قرآن تو اس طرز کے پڑھنے والوں کے لیے اپنے معانی کے دروازے کھولتا ہی نہیں۔

پھر جو شخص محض سرسری سی واقفیّت بہم پہنچانا چاہتا ہو، اُس کے لیے تو شاید ایک دفعہ پڑھ لینا کافی ہو جائے، لیکن جو اس کی گہرائیوں میں اُترنا چاہے اس کے لیے دو چار دفعہ کا پڑھنا بھی کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کو بار بار پڑھنا چاہیے، ہر مرتبہ ایک خاص ڈھنگ سے پڑھنا چاہیے، اور ایک طالبِ علم کی طرح پنسل اور کاپی ساتھ لے کر بیٹھنا چاہیے، تاکہ ضروری نِکات نوٹ کرتا جائے۔ اِس طرح جو لوگ پڑھنے پر آمادہ ہوں، اُن کو کم از کم دو مرتبہ پُورے قرآن کو صرف اس غرض کے لیے پڑھنا چاہیے کہ ان کے سامنے بحیثیتِ مجموعی وہ پُورا نظامِ فکر وعمل آ جائے جسے یہ کتاب پیش کرنا چاہتی ہے۔ اِس ابتدائی مطالعے کے دَوران میں وہ قرآن کے پُورے منظر پر ایک جامع نظر حاصل کرنے کی کوشش کریں اور یہ دیکھتے جائیں کہ یہ کتاب کیا بُنیادی تصوّرات پیش کرتی ہے اور پھر ان تصوّرات پر کس قسم کا نظامِ زندگی تعمیر کرتی ہے۔ اِس اثنا میں اگر کسی مَقام پر کوئی سوال ذہن میں کھٹکے تو اس پر وہیں اُسی وقت کوئی فیصلہ نہ کر بیٹھیں بلکہ اسے نوٹ کر لیں اور صبر کے ساتھ آگے مطالعہ جاری رکھیں۔ اغلب یہ ہے کہ آگے کہیں نہ کہیں انھیں اس کا جواب مِل جائے گا۔ اگر جواب مل جائے تو اپنے سُؤال کے ساتھ اسے نوٹ کر لیں۔ لیکن اگر پہلے مطالعے کے دَوران میں انھیں اپنے کسی سوال کا جواب نہ ملے تو صبر کے ساتھ دُوسری بار پڑھیں۔ مَیں اپنے تجرِبے کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ دُوسری بار کے غائر مطالعے میں شاذونادر ہی کوئی سوال جواب طلب باقی رہ جاتا ہے۔

اِس طرح قرآن پر ایک جامع نظر حاصل کر لینے کے بعد تفصیلی مطالعے کی ابتدا کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں ناظر کو تعلیماتِ قرآن کا ایک ایک پہلو ذہن نشین کر کے نوٹ کرتے جانا چاہیے۔ مثلاً وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ انسانیّت کا کون سا نمونہ ہے جسے قرآن پسندیدہ قرار دیتا ہے اور کس نمونے کے انسان اس کے نزدیک مبغوض و مردُود ہیں۔ اس مضمُون کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لانے کے لیے اس کو چاہیے کہ اپنی کاپی پر ایک طرف ''پسندیدہ انسان'' اور دُوسری طرف ''ناپسندیدہ انسان'' کی خُصُوصیّات آمنے سامنے نوٹ کرتا چلا جائے۔ یا مثلاً وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ قرآن کے نزدیک انسان کی فلاح ونجات کا مدار کن اُمُور پر ہے، اور کیا چیزیں ہیں جن کو وہ انسان کے لیے نقصان اور ہلاکت اور بربادی کا موجب قرار دیتا ہے۔ اس مضمون کو بھی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ

جاننے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی کاپی پر ''مُوجباتِ فلاح'' اور ''مُوجباتِ خُسران'' کے دو عنوانات ایک دُوسرے کے مقابل قائم کر لے اور مطالعۂ قرآن کے دَوران میں روزانہ دونوں قسم کی چیزوں کو نوٹ کرتا جائے۔ علیٰ ہٰذا القیاس عقائد، اَخلاق، حُقوق، فرائض، معاشرت، تمدُّن، معیشت، سیاست، قانون، نظمِ جماعت، صلح، جنگ، اور دُوسرے مسائلِ زندگی میں سے ایک ایک کے متعلّق قرآن کی ہدایات کو آدمی نوٹ کرتا چلا جائے، اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ ان میں سے ہر ہر شعبے کی مجموعی شکل کیا بنتی ہے اور پھر ان سب کو ملا کر جوڑ دینے سے پُورا نقشۂ زندگی کس قسم کا بنتا ہے۔

پھر جب آدمی کسی خاص مسئلۂ زندگی کے بارے میں تحقیق کرنا چاہے کہ قرآن کا نقطۂ نظر اس کے متعلّق کیا ہے، تو اس کے لیے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اس مسئلے کے متعلّق قدیم و جدید لٹریچر کا گہرا مطالعہ کر کے واضح طور پر یہ معلوم کر لے کہ اس مسئلے کے بُنیادی نِکات کیا ہیں، انسان نے اب تک اس پر کیا سوچا اور سمجھا ہے، کیا اُمُور اس میں تصفیہ طلب ہیں، اور کہاں جا کر انسانی فکر کی گاڑی اٹک جاتی ہے۔ اس کے بعد انھی تصفیہ طلب مسائل کو نگاہ میں رکھ کر آدمی کو قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میرا تجربہ ہے کہ اس طرح جب آدمی کسی مسئلے کی تحقیق کے لیے قرآن پڑھنے بیٹھتا ہے تو اسے ایسی ایسی آیتوں میں اپنے سوالات کا جواب ملتا ہے جنھیں وہ اس سے پہلے بیسیوں مرتبہ پڑھ چکا ہوتا ہے اور کبھی اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ یہاں یہ مضمون بھی چھُپا ہُوا ہے۔

لیکن فہمِ قرآن کی اِن ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی رُوح سے پُوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریّات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دُنیا کے عام تصوُّرِ مذہب کے مطابق ایک نِری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رُمُوز حل کر لیے جائیں۔ جیسا کہ اس مقدِمے کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے، یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھِری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اُٹھوائی اور وقت کے عَلَم برداران کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک

سعید رُوح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیِ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جُو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اُٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پُکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تئیس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی، اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گُسل کش مکش کے دَوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیّت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کش مکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہُوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اسے تو پُوری طرح آپ اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اُٹھیں اور دعوت اِلَی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اُس طرح قدم اُٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تَجرِبات آپ کو پیش آئیں گے جو نُزُولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکّے اور حَبَش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و اُحُد سے لے کر حُنَین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابُوجَہل اور ابُولَہَب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا، منافقین اور یہُود بھی آپ کو ملیں گے، اور سابقینِ اوّلین سے لے کر مُؤَلَّفَۃُ القُلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اَور ہی قسم کا ''سُلوک'' ہے، جس کو میں ''سُلوکِ قرآنی'' کہتا ہوں۔ اِس سُلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے، قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اُتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لُغت اور نَحو اور معانی اور بیان کے کچھ نِکات سالک کی نگاہ سے چُھپے رہ جائیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی رُوح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بُخل برت جائے۔

پھر اسی کُلیّے کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اَخلاقی تعلیمات، اس کی مَعاشی اور تمدُّنی ہدایات، اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اُصُول و قوانین آدمی کی سمجھ میں اُس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے

ہی اجتماعی ادارے اس کی بنائی ہوئی رَوِش کے خلاف چل رہے ہوں۔

قرآن کے اس دعوے سے ہر کہ و مہ واقف ہے کہ وہ تمام نَوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔لیکن جب کوئی شخص اس کو پڑھنے بیٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا رُوئے سُخَن زیادہ تر اپنے زمانۂ نُزُول کے اہلِ عرب کی طرف ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ بنی آدم اور عامّۃ النّاس کو بھی پکارتا ہے،لیکن اکثر باتیں وہ ایسی کہتا ہے جو عرب کے مذاق، عرب ہی کے ماحول، عرب ہی کی تاریخ، اور عرب ہی کے رسم و رواج سے ربط و تعلّق رکھتی ہیں۔ اِن چیزوں کو دیکھ کر آدمی سوچنے لگتا ہے کہ جو چیز عام انسانوں کی ہدایت کے لیے اُتاری گئی تھی اس میں وقتی اور مَقامی اور قومی عُنصُر اتنا زیادہ کیوں ہے؟ اس معاملے کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ چیز اصل میں تو اپنے ہم عصر اہلِ عرب ہی کی اصلاح کے لیے تھی، لیکن بعد میں زبردستی کھینچ تان کر اسے تمام انسانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے کتابِ ہدایت قرار دے دیا گیا۔

جو شخص یہ اعتراض محض اعتراض کی خاطر نہیں اُٹھاتا، بلکہ فی الواقع اسے سمجھنا چاہتا ہے، اُسے مَیں مشورہ دُوں گا کہ وہ پہلے خود قرآن کو پڑھ کر ذرا اُن مَقامات پر نشان لگائے جہاں اُس نے کوئی ایسا عقیدہ، یا خیال، یا تصوُّر پیش کیا ہو، یا کوئی ایسا اَخلاقی اُصُول، یا عملی قاعدہ و ضابطہ بیان کیا ہو جو صرف عرب ہی کے لیے مخصُوص ہو، اور جس کو وقت اور زمانے اور مقام نے فی الواقع محدُود کر رکھا ہو۔محض یہ بات کہ وہ ایک خاص مقام اور زمانے کے لوگوں کو خطاب کر کے ان کے مُشرکانہ عقائد اور رُسُوم کی تردید کرتا ہے، اور انھی کے گردوپیش کی چیزوں کو موادِ اِستِدلال کے طور پر لے کر توحید کے دلائل قائم کرتا ہے، یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی دعوت اور اس کا اپیل بھی وقتی اور مقامی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ شرک کی تردید میں جو کچھ وہ کہتا ہے کیا وہ دُنیا کے ہر شرک پر اُسی طرح چسپاں نہیں ہوتا جس طرح مُشرکینِ عرب کے شرک پر چسپاں ہوتا تھا؟ کیا انھی دلائل کو ہم ہر زمانے اور ہر ملک کے مشرکین کی اصلاحِ خیال کے لیے استعمال نہیں کر سکتے؟ اور کیا اثباتِ توحید کے لیے قرآن کے طرزِ اِستِدلال کو تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ ہر وقت ہر جگہ کام میں نہیں لایا جا سکتا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک عالَم گیر تعلیم کو صرف اس بنا پر وقتی و مقامی قرار دیا جائے کہ ایک خاص وقت میں ایک خاص قوم کو

خطاب کر کے وہ پیش کی گئی تھی۔ دُنیا کا کوئی فلسفہ اور کوئی نظامِ زندگی اور کوئی مذہبِ فکر ایسا نہیں ہے جس کی ساری باتیں از اوّل تا آخر تجریدی (abstract) طرزِ بیان میں پیش کی گئی ہوں اور کسی متعیّن حالت یا صُورت پر اس کو چسپاں کر کے اُن کی توضیح نہ کی گئی ہو۔ ایسی مکمّل تجرید اوّل تو ممکن نہیں ہے، اور ممکن ہو بھی تو جو چیز اِس طریقے پر پیش کی جائے گی وہ صرف صفحۂ کاغذ ہی پر رہ جائے گی، انسانوں کی زندگی میں اس کا جذب ہو کر ایک عملی نظام میں تبدیل ہونا محال ہے۔

پھر کسی فکری و اَخلاقی اور تمدّنی تحریک کو اگر بین الاقوامی پیمانے پر پھیلانا مقصود ہو، تو اس کے لیے بھی یہ قطعاً ضروری نہیں ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ مفید بھی نہیں ہے، کہ شروع سے اس کو بالکل ہی بین الاقوامی بنانے کی کوشش کی جائے۔ درحقیقت اس کا صحیح عملی طریقہ صرف ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن افکار اور نظریّات اور اُصُولوں پر وہ تحریک انسانی زندگی کے نظام کو قائم کرنا چاہتی ہے، انھیں پُوری قوّت کے ساتھ خود اُس مُلک میں پیش کیا جائے جہاں سے اس کی دعوت اُٹھی ہو، اُن لوگوں کے ذہن نشین کیا جائے جن کی زبان اور مزاج اور عادات و خصائل سے اس تحریک کے داعی بخوبی واقف ہوں، اور پھر اپنے ہی ملک میں ان اُصُولوں کو عملاً برت کر اور ان پر ایک کامیاب نظامِ زندگی چلا کر دُنیا کے سامنے نمونہ پیش کیا جائے۔ تبھی دُوسری قومیں اس کی طرف توجّہ کریں گی اور ان کے ذہین آدمی خود آگے بڑھ کر اسے سمجھنے اور اپنے ملک میں رواج دینے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا محض یہ بات کہ کسی نظامِ فکر و عمل کو ابتداءً ایک ہی قوم کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اور اِستِدلال کا سارا زور اسی کو سمجھانے اور مطمئن کرنے پر صَرف کر دیا گیا تھا، اِس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ نظامِ فکر و عمل محض قومی ہے۔ فی الواقع جو خُصُوصیّات ایک قومی نظام کو ایک بین الاقوامی نظام سے اور ایک وقتی نظام کو ایک اَبَدی نظام سے مُمیّز کرتی ہیں وہ یہ ہیں کہ قومی نظام یا تو ایک قوم کی برتری اور اس کے مخصوص حُقوق کا مدّعی ہوتا ہے، یا اپنے اندر کچھ ایسے اُصُول اور نظریّات رکھتا ہے جو دُوسری اقوام میں نہیں چل سکتے۔ اس کے برعکس جو نظام بین الاقوامی ہوتا ہے، وہ تمام انسانوں کو برابر کا درجہ اور برابر کے حُقوق دینے کے لیے تیار ہوتا ہے اور اُس کے اُصُولوں میں بھی عالَم گیریّت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک وقتی نظام لازمی طور پر اپنی بُنیاد کچھ ایسے اُصُولوں پر رکھتا ہے جو زمانے کی چند پلٹیوں کے بعد صریحاً ناقابلِ عمل ہو جاتے ہیں، اور اس کے برعکس ایک

ابدی نظام کے اُصُول تمام بدلتے ہوئے حالات پر منطبق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان خُصُوصیّات کو نگاہ میں رکھ کر کوئی شخص خود قرآن کو پڑھے اور اُن چیزوں کو ذرا متعیّن کرنے کی کوشش کرے جن کی بنا پر واقعی یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ قرآن کا پیش کردہ نظام وقتی اور قومی ہے۔

قرآن کے متعلّق یہ بات بھی ایک عام ناظر کے کان میں پڑی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ ایک مفصّل ہدایت نامہ اور ایک کتابِ آئین ہے۔ مگر جب وہ اسے پڑھتا ہے تو اس میں معاشرت اور تمدُّن اور سیاست اور معیشت وغیرہ کے تفصیلی احکام و ضوابط اس کو نہیں ملتے۔ بلکہ وہ دیکھتا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے متعلق بھی، جن پر قرآن بار بار اِس قدر زور دیتا ہے، اس نے کوئی ایسا ضابطہ تجویز نہیں کیا ہے جس میں تمام ضروری احکام کی تفصیل درج ہو۔ یہ چیز بھی آدمی کے ذہن میں خَلْجان پیدا کرتی ہے کہ آخر یہ کس معنیٰ میں ہدایت نامہ ہے۔

اس معاملے میں ساری اُلجھن صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی کی نگاہ سے حقیقت کا ایک پہلو بالکل اوجھل رہ جاتا ہے، یعنی یہ کہ خدا نے صرف کتاب ہی نازل نہیں کی تھی بلکہ ایک پیغمبرؐ بھی مبعوث فرمایا تھا۔ اگر اصل اسکیم یہ ہو کہ بس ایک نقشۂ تعمیر لوگوں کو دے دیا جائے اور لوگ اس کے مطابق خود عمارت بنا لیں، تو اس صورت میں بلاشبہ تعمیر کے ایک ایک جُز کی تفصیل ہم کو ملنی چاہیے۔ لیکن جب تعمیری ہدایات کے ساتھ ایک انجینیر بھی سرکاری طور پر مقرر کر دیا جائے اور وہ ان ہدایات کے مطابق ایک عمارت بنا کر کھڑی کر دے، تو پھر انجینیر اور اس کی بنائی ہوئی عمارت کو نظر انداز کر کے صرف نقشے ہی میں تمام جُزئیات کی تفصیل تلاش کرنا، اور پھر اسے نہ پا کر نقشے کی ناتمامی کا شکوہ کرنا غلط ہے۔ قرآن جُزئیات کی کتاب نہیں ہے بلکہ اُصُول اور کُلّیات کی کتاب ہے۔ اُس کا اصل کام یہ ہے کہ نظامِ اسلامی کی فکری اور اَخلاقی بنیادوں کو پُوری وضاحت کے ساتھ نہ صرف پیش کرے بلکہ عقلی استدلال اور جذباتی اپیل، دونوں کے ذریعے سے خوب مستحکم بھی کر دے۔ اب رہی اسلامی زندگی کی عملی صُورت، تو اس معاملے میں وہ انسان کی رہنمائی اس طریقے سے نہیں کرتا کہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے متعلّق تفصیلی ضابطے اور قوانین بتائے، بلکہ وہ ہر شعبۂ زندگی کے حُدُودِ اربعہ بتا دیتا ہے اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگِ نشان کھڑے کر دیتا ہے، جو اس بات کا تعیّن کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اِن شعبوں کی تشکیل و تعمیر کن خُطوط پر

ہونی چاہیے۔ اِن ہدایات کے مطابق عملاً اسلامی زندگی کی صُورت گری کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ اُنھیں مامور ہی اِس لیے کیا گیا تھا کہ دُنیا کو اُس انفرادی سیرت و کردار اور اُس معاشرے اور ریاست کا نمونہ دکھا دیں جو قرآن کے دیے ہوئے اُصُولوں کی عملی تعبیر و تفسیر ہو۔

ایک اور سوال جو بالعُموم لوگوں کے ذہن میں کھٹکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن اُن لوگوں کی انتہائی مذمّت کرتا ہے جو کتابُ اللہ کے آجانے کے بعد تفرِقے اور اختلاف میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے دین کے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں، اور دُوسری طرف قرآن کے احکام کی تعبیر و تفسیر میں صرف مُتأخّرین ہی نہیں، ائمہ اور تابعین اور خود صحابہؓ تک کے درمیان اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ شاید کوئی ایک بھی احکامی آیت ایسی نہ ملے گی جس کی ایک تفسیر بالکل مُتَّفَق عَلَیہِ ہو۔ کیا یہ سب لوگ اُس مذمّت کے مِصداق ہیں جو قرآن میں وارد ہوئی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر وہ کون سا تفرِقہ و اختلاف ہے جس سے قرآن منع کرتا ہے؟

یہ ایک نہایت وسیع الاطراف مسئلہ ہے جس پر مفصّل بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں قرآن کے ایک عامی طالبِ علم کی اُلجھن دُور کرنے کے لیے صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ قرآن اُس صحّت بخش اختلافِ رائے کا مخالف نہیں ہے جو دین میں متفق اور اسلامی نظامِ جماعت میں متحد رہتے ہوئے محض احکام و قوانین کی تعبیر میں مخلصانہ تحقیق کی بنا پر کیا جائے، بلکہ وہ مذمّت اُس اختلاف کی کرتا ہے جو نفسانیت اور کج نگاہی سے شروع ہو اور فرقہ بندی و نزاعِ باہمی تک نوبت پہنچا دے۔ یہ دونوں قسم کے اختلاف نہ اپنی حقیقت میں یکساں ہیں اور نہ اپنے نتائج میں ایک دُوسرے سے کوئی مشابہت رکھتے ہیں کہ دونوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دیا جائے۔ پہلی قسم کا اختلاف تو ترقی کی جان اور زندگی کی رُوح ہے۔ وہ ہر اُس سوسائٹی میں پایا جائے گا جو عقل و فکر رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔ اس کا پایا جانا زندگی کی علامت ہے اور اس سے خالی صرف وہی سوسائٹی ہوسکتی ہے جو ذہین انسانوں سے نہیں بلکہ لکڑی کے کُندوں سے مُرَکَّب ہو۔ رہا دُوسری قسم کا اختلاف، تو ایک دُنیا جانتی ہے کہ اس نے جس گروہ میں بھی سر اُٹھایا اُس کو پراگندہ کر کے چھوڑا۔ اس کا رُونما ہونا صحّت کی نہیں بلکہ مرض کی علامت ہے، اور اس کے نتائج کبھی کسی اُمّت کے حق میں بھی مفید نہیں ہو سکتے۔

ان دونوں قسم کے اختلافات کا فرق واضح طور پر یوں سمجھیے کہ:

ایک صُورت تو وہ ہے جس میں خدا اور رسُولؐ کی اطاعت پر جماعت کے سب لوگ متفق ہوں، احکام کا ماخذ بھی بالاتفاق قرآن اور سنّت کو مانا جائے، اور پھر دو عالم کسی جُزوی مسئلے کی تحقیق میں، یا دو قاضی کسی مقدّمے کے فیصلے میں ایک دُوسرے سے اختلاف کریں، مگر ان میں سے کوئی بھی نہ تو اس مسئلے کو، اور اس میں اپنی رائے کو مدارِ دین بنائے اور نہ اس سے اختلاف کرنے والے کو دین سے خارج قرار دے، بلکہ دونوں اپنے اپنے دلائل دے کر اپنی حد تک تحقیق کا حق ادا کر دیں، اور یہ بات رائے عام پر، یا اگر عدالتی مسئلہ ہو تو ملک کی آخری عدالت پر، یا اگر اجتماعی معاملہ ہو تو نظامِ جماعت پر چھوڑ دیں کہ وہ دونوں رایوں میں سے جس کو چاہیں قبول کریں، یا دونوں کو جائز رکھیں۔

دوسری صُورت یہ ہے کہ اختلاف سرے سے دین کی بُنیادوں ہی میں کر ڈالا جائے، یا یہ کہ کوئی عالم یا صُوفی یا مُفتی یا مُتکلّم یا لیڈر کسی ایسے مسئلے میں جس کو خدا اور رسُول نے دین کا بُنیادی مسئلہ قرار نہیں دیا تھا، ایک رائے اختیار کرے اور خواہ مخواہ کھینچ تان کر اس کو دین کا بُنیادی مسئلہ بنا ڈالے، اور پھر جو اس سے اختلاف کرے اس کو خارج از دین و ملّت قرار دے، اور اپنے حامیوں کا ایک جتّھا بنا کر کہے کہ اصل اُمّتِ مُسلِمہ بس یہ ہے اور باقی سب جہنّمی ہیں، اور ہانک پُکار کر کہے کہ مُسلِم ہے تو بس اس جتّھے میں آجا ورنہ تو مُسلِم ہی نہیں ہے۔

قرآن نے جہاں کہیں بھی اختلاف اور فرقہ بندی کی مخالفت کی ہے، اُس سے اس کی مراد یہ دُوسری قسم کا اختلاف ہی ہے۔ رہا پہلی قسم کا اختلاف، تو اس کی متعدّد مثالیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آچکی تھیں، اور آپؐ نے صرف یہی نہیں کہ اس کو جائز رکھا، بلکہ اس کی تحسین بھی فرمائی۔ اس لیے کہ وہ اختلاف تو اس بات کا پتا دیتا ہے کہ جماعت میں غور وفکر اور تحقیق وتجسُّس اور فہم وتفقُّہ کی صلاحیّتیں موجود ہیں، اور جماعت کے ذہین لوگوں کو اپنے دین سے اور اس کے احکام سے دلچسپی ہے، اور ان کی ذہانتیں اپنے مسائلِ زندگی کا حل دین کے باہر نہیں بلکہ اس کے اندر ہی تلاش کرتی ہیں، اور جماعت بحیثیتِ مجموعی اِس زرّین قاعدے پر عامل ہے کہ اُصُول میں متفق رہ کر اپنی وحدت برقرار رکھے اور پھر اپنے اہلِ علم وفکر کو صحیح حُدُود کے اندر تحقیق واجتہاد کی آزادی دے کر ترقی کے مواقع بھی باقی رکھے۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللّٰہ، علیہ توکلت والیہ انیب

اس مُقدّمے میں تمام اُن مسائل کا اِستِقصا کرنا میرے پیشِ نظر نہیں ہے جو مطالعۂ قرآن کے دَوران میں ایک ناظِر کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان سوالات کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جو کسی نہ کسی آیت یا سُورت کے سامنے آنے پر ذہن کو کھٹکتا ہے، اور اس کا جواب تفہیمُ القرآن میں برسرِ موقع دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا ایسے سوالات کو چھوڑ کر مَیں نے یہاں صرف اُن جامع مسائل سے بحث کی ہے جو بحیثیتِ مجموعی پُورے قرآن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناظرینِ کرام سے میری درخواست ہے کہ صرف اس مقدّمے کو دیکھ کر ہی اس کے تشنہ ہونے کا فیصلہ نہ کر دیں، بلکہ پُوری کتاب کو دیکھنے کے بعد اگر ان کے ذہن میں کچھ سوالات جواب طلب باقی رہ جائیں، یا کسی سوال کے جواب کو وہ ناکافی پائیں تو مجھے اس سے مُطّلع فرمائیں۔

تفہیم القرآن

الفاتحہ ——— (۱)

و

البقرہ ——— (۲)

الفاتحہ

نام اِس کا نام ''الفاتحہ'' اِس کے مضمون کی مناسبت سے ہے۔ ''فاتحہ'' اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی مضمون، یا کتاب، یا کسی شے کا افتتاح ہو۔ دُوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ یہ نام ''دیباچہ'' اور آغازِ کلام کا ہم معنٰی ہے۔

زمانۂ نزول یہ نبوّتِ محمدیؐ کے بالکل ابتدائی زمانے کی سُورت ہے۔ بلکہ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی مکمل سورت جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، وہ یہی ہے۔ اِس سے پہلے صرف متفرق آیات نازل ہوئی تھیں جو سُورۂ عَلَق، سُورۂ مُزَّمِّل اور سورۂ مُدَّثِّر وغیرہ میں شامل ہیں۔

مضمون دراصل یہ سُورہ ایک دُعا ہے جو خدا نے ہر اُس انسان کو سکھائی ہے جو اس کی کتاب کا مُطالَعہ شروع کر رہا ہو۔ کتاب کی ابتدا میں اس کو رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم واقعی اس کتاب سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو تو پہلے خداوندِ عالَم سے یہ دعا کرو۔

انسان فطرتاً دُعا اُسی چیز کی کیا کرتا ہے جس کی طلب اور خواہش اس کے دل میں ہوتی ہے، اور اُسی صورت میں کرتا ہے جب کہ اُسے یہ احساس ہو کہ اس کی مطلوب چیز اُس ہستی کے اختیار میں ہے جس سے وہ دُعا کر رہا ہے۔ پس قرآن کی ابتدا میں اِس دُعا کی تعلیم دے کر گویا انسان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو راہِ راست کی جستجو کے لیے پڑھے، طالبِ حق کی سی ذہنیت لے کر پڑھے، اور یہ جان لے کہ علم کا سرچشمہ خداوندِ عالَم ہے، اس لیے اُسی سے رہنمائی کی درخواست کر کے پڑھنے کا آغاز کرے۔

اِس مضمون کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن اور سورۂ فاتحہ کے درمیان حقیقی تعلق کتاب اور اس کے مُقَدِّمے کا سا نہیں بلکہ دُعا اور جوابِ دُعا کا سا ہے۔ سُورۂ فاتحہ ایک دُعا ہے بندے کی جانب سے، اور قرآن اُس کا جواب ہے خدا کی جانب سے۔ بندہ دُعا کرتا ہے کہ اے پروردگار! میری رہنمائی کر۔ جواب میں پروردگار پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت و رہنمائی جس کی درخواست تو نے مجھ سے کی ہے۔

المنزل ۱

آیاتها ۷ — رکوعاتها ۱

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم[۱] ہے۔

تعریف اللہ ہی کے لیے[۲] ہے جو تمام کائنات کا رب[۳] ہے، رحمٰن اور رحیم[۴] ہے،

۱ – اِسلام جو تہذیب انسان کو سکھاتا ہے، اس کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہر کام کی ابتدا خدا کے نام سے کرے۔ اِس قاعدے کی پابندی اگر شعور اور خلوص کے ساتھ کی جائے تو اس سے لازماً تین فائدے حاصل ہوں گے: ایک یہ کہ آدمی بہت سے بُرے کاموں سے بچ جائے گا، کیونکہ خدا کا نام لینے کی عادت اُسے ہر کام شروع کرتے وقت یہ سوچنے پر مجبور کردے گی کہ کیا واقعی میں اس کام پر خدا کا نام لینے میں حق بجانب ہوں؟ دوسرے یہ کہ جائز اور صحیح اور نیک کاموں کی ابتدا کرتے ہوئے خدا کا نام لینے سے آدمی کی ذہنیت بالکل ٹھیک سَمت اختیار کرلے گی اور وہ ہمیشہ صحیح ترین نقطے سے اپنی حرکت کا آغاز کرے گا۔ تیسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب وہ خدا کے نام سے اپنا کام شروع کرے گا تو خدا کی تائید اور توفیق اس کے شاملِ حال ہوگی، اس کی سعی میں برکت ڈالی جائے گی اور شیطان کی فساد انگیزیوں سے اُس کو بچایا جائے گا۔ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ جب بندہ اس کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ بھی بندے کی طرف توجہ فرماتا ہے۔

۲ – جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، سُورۂ فاتحہ اصل میں تو ایک دُعا ہے، لیکن دُعا کی ابتدا اس ہستی کی تعریف سے کی جارہی ہے جس سے ہم دُعا مانگنا چاہتے ہیں۔ یہ گویا اس امر کی تعلیم ہے کہ دُعا جب مانگو تو مہذب طریقے سے مانگو۔ یہ کوئی تہذیب نہیں ہے کہ منہ کھولتے ہی جھٹ اپنا مطلب پیش کردیا۔ تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے دُعا کر رہے ہو، پہلے اُس کی خوبی کا، اس کے احسانات اور اس کے مرتبے کا اعتراف کرو۔

تعریف ہم جس کی بھی کرتے ہیں، دو وجوہ سے کیا کرتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ بجائے خود حُسن و خوبی اور کمال رکھتا ہو، قطعِ نظر اس سے کہ ہم پر اس کے ان فضائل کا کیا اثر ہے۔ دُوسرے، یہ کہ وہ ہمارا محسن ہو اور ہم اعترافِ نعمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی خوبیاں بیان کریں۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف ان دونوں حیثیتوں سے ہے۔ یہ ہماری قدر شناسی کا تقاضا بھی ہے اور احسان شناسی کا بھی کہ ہم اس کی تعریف میں رَطب اللّسان ہوں۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ تعریف اللہ کے لیے ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ ”تعریف اللہ ہی“ کے لیے ہے۔ یہ بات کہہ کر ایک بڑی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے، اور وہ حقیقت ایسی ہے جس کی پہلی ہی ضرب سے مخلوق پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ دُنیا میں جہاں، جس چیز اور جس شکل میں بھی کوئی حُسن، کوئی خوبی، کوئی کمال ہے، اس کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات

مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ؕ‏ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ؕ‏

روزِ جزا کا مالک[5] ہے۔

ہم تیری ہی[6] عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں[7]۔

ہے۔ کسی انسان، کسی فرشتے، کسی دیوتا، کسی سیارے، غرض کسی مخلوق کا کمال بھی ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کا عَطِیّہ ہے۔ پس اگر کوئی اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کے گرویدہ اور پرستار، احسان مند اور شکرگزار، نیاز مند اور خدمت گار بنیں، تو وہ خالقِ کمال ہے نہ کہ صاحبِ کمال۔

۳- ربّ کا لفظ عربی زبان میں تین معنوں میں بولا جاتا ہے: (۱) مالک اور آقا۔ (۲) مُربّی، پرورش کرنے والا، خبرگیری اور نگہبانی کرنے والا۔ (۳) فرمانروا، حاکم، مدبّر اور منتظم۔ اللہ تعالیٰ ان سب معنوں میں کائنات کا رب ہے۔

۴- انسان کا خاصّہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وہ مبالغے کے صیغوں میں اس کو بیان کرتا ہے، اور اگر ایک مبالغے کا لفظ بول کر وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس شے کی فراوانی کا حق ادا نہیں ہوا، تو پھر وہ اسی معنیٰ کا ایک اَور لفظ بولتا ہے، تاکہ وہ کمی پوری ہو جائے جو اس کے نزدیک مبالغے میں رہ گئی ہے۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں بھی یہی نکتہ پوشیدہ ہے۔ رحمٰن عربی زبان میں بڑے مبالغے کا صیغہ ہے۔ لیکن خدا کی رحمت اور مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی زیادہ ہے، اس قدر وسیع ہے، ایسی بے حدوحساب ہے کہ اس کے بیان میں بڑے سے بڑا مبالغے کا لفظ بول کر بھی جی نہیں بھرتا۔ اس لیے اس کی فراوانی کا حق ادا کرنے کے لیے پھر رحیم کا لفظ مزید استعمال کیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کی فیاضی کے بیان میں ''سخی'' کا لفظ بول کر جب تشنگی محسوس کرتے ہیں تو اس پر ''داتا'' کا اضافہ کرتے ہیں۔ رنگ کی تعریف میں جب ''گورے'' کو کافی نہیں پاتے تو اس پر ''چٹّے'' کا لفظ اور بڑھا دیتے ہیں۔ درازیِ قد کے ذکر میں جب ''لمبا'' کہنے سے تسلّی نہیں ہوتی تو اس کے بعد ''تڑنگا'' بھی کہتے ہیں۔

۵- یعنی اُس دن کا مالک جب کہ تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جمع کر کے ان کے کارنامۂ زندگی کا حساب لیا جائے گا اور ہر انسان کو اس کے عمل کا پورا صلہ یا بدلہ مل جائے گا۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن اور رحیم کہنے کے بعد مالکِ روزِ جزا کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ نرا مہربان ہی نہیں ہے بلکہ مُنصف بھی ہے، اور منصف بھی ایسا بااختیار منصف کہ آخری فیصلے کے روز وہی پورے اقتدار کا مالک ہوگا، نہ اس کی سزا میں کوئی مزاحم ہو سکے گا اور نہ جزا میں مانع۔ لہٰذا ہم اس کی رُبُوبیّت اور رحمت کی بنا پر اس سے محبّت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے انصاف کی بنا پر اس سے ڈرتے بھی ہیں اور یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ ہمارے انجام کی بھلائی اور بُرائی بالکلّیہ اُسی کے اختیار میں ہے۔

۶- عبادت کا لفظ بھی عربی زبان میں تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے: (۱) پُوجا اور پرستش۔ (۲) اطاعت اور

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَۙ ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۝ ع

ع ۱

ہمیں سیدھا راستہ دکھا[۸]، اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا[۹]، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں[۱۰]۔ ع

فرماں برداری۔ (۳) بندگی اور غلامی۔ اس مقام پر تینوں معنٰی بیک وقت مراد ہیں۔ یعنی ہم تیرے پرستار بھی ہیں، مطیع فرمان بھی اور بندہ وغلام بھی۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ہم تیرے ساتھ یہ تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ واقعی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ تعلق صرف تیرے ہی ساتھ ہے۔ اِن تینوں معنوں میں سے کسی معنٰی میں بھی کوئی دوسرا ہمارا معبُود نہیں ہے۔

۷ – یعنی تیرے ساتھ ہمارا تعلق محض عبادت ہی کا نہیں ہے بلکہ استعانت کا تعلق بھی ہم تیرے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ساری کائنات کا رب تُو ہی ہے، اور ساری طاقتیں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں، اور ساری نعمتوں کا تو ہی اکیلا مالک ہے، اس لیے ہم اپنی حاجتوں کی طلب میں تیری طرف ہی رُجوع کرتے ہیں، تیرے ہی آگے ہمارا ہاتھ پھیلتا ہے اور تیری مدد ہی پر ہمارا اعتماد ہے۔ اسی بنا پر ہم اپنی یہ درخواست لے کر تیری خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔

۸ – یعنی زندگی کے ہر شعبے میں خیال اور عمل اور برتاؤ کا وہ طریقہ ہمیں بتا جو بالکل صحیح ہو، جس میں غلط بینی اور غلط کاری اور بدانجامی کا خطرہ نہ ہو، جس پر چل کر ہم سچّی فلاح وسعادت حاصل کر سکیں ــــ یہ ہے وہ درخواست جو قرآن کا مُطالَعَہ شروع کرتے ہوئے بندہ اپنے خدا کے حضور پیش کرتا ہے۔ اس کی گزارش یہ ہے کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ قیاسی فلسفوں کی اس بھول بُھلَیّاں میں حقیقتِ نفس الامری کیا ہے، اَخلاق کے ان مختلف نظریّات میں صحیح نظامِ اَخلاق کون سا ہے، زندگی کی اِن بے شمار پگڈنڈیوں کے درمیان فکر وعمل کی سیدھی اور صاف شاہراہ کون سی ہے۔

۹ – یہ اُس سیدھے راستے کی تعریف ہے جس کا علم ہم اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں۔ یعنی وہ راستہ جس پر ہمیشہ سے تیرے منظورِ نظر لوگ چلتے رہے ہیں۔ وہ بے خطا راستہ کہ قدیم ترین زمانے سے آج تک جو شخص اور جو گروہ بھی اس پر چلا، وہ تیرے انعامات کا مستحق ہوا اور تیری نعمتوں سے مالا مال ہو کر رہا۔

۱۰ – یعنی ”انعام“ پانے والوں سے ہماری مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو بظاہر عارضی طور پر تیری دُنیوی نعمتوں سے سرفراز تو ہوتے ہیں مگر دراصل وہ تیرے غضب کے مستحق ہُوا کرتے ہیں اور اپنی فلاح وسعادت کی راہ گم کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سلبی تشریح سے یہ بات خود کھل جاتی ہے کہ ”انعام“ سے ہماری مراد حقیقی اور پائدار انعامات ہیں جو راست روی اور خدا کی خوشنودی کے نتیجے میں ملا کرتے ہیں، نہ کہ وہ عارضی اور نمایشی انعامات جو پہلے بھی فرعونوں اور نمرودوں اور قارونوں کو ملتے رہے ہیں اور آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے ظالموں اور بدکاروں اور گمراہوں کو ملے ہوئے ہیں۔

اَلبَقَرہ

نام اور وجہ تسمیہ اِس سورت کا نام ”بقرہ“ اِس لیے ہے کہ اس میں ایک جگہ گائے کا ذکر آیا ہے۔ قرآنِ مجید کی ہر سورت میں اس قدر وسیع مضامین بیان ہوئے ہیں کہ ان کے لیے مضمون کے لحاظ سے جامع عنوانات تجویز نہیں کیے جا سکتے۔ عربی زبان اگرچہ اپنی لغت کے اعتبار سے نہایت مال دار ہے، مگر بہرحال ہے تو انسانی زبان ہی۔ انسان جو زبانیں بھی بولتا ہے وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں کہ وہ ایسے الفاظ یا فقرے فراہم نہیں کر سکتیں جو ان وسیع مضامین کے لیے جامع عنوان بن سکتے ہوں۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے قرآن کی بیشتر سُورتوں کے لیے عنوانات کے بجائے نام تجویز فرمائے جو محض علامت کا کام دیتے ہیں۔ اس سُورت کو بقرہ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں گائے کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ”وہ سورت جس میں گائے کا ذکر آیا ہے۔“

زمانۂ نزول اِس سُورت کا بیشتر حصّہ ہجرتِ مدینہ کے بعد مَدَنی زندگی کے بالکل ابتدائی دَور میں نازل ہوا ہے، اور کمتر حصّہ ایسا ہے جو بعد میں نازل ہوا اور مناسبتِ مضمون کے لحاظ سے اس میں شامل کر دیا گیا۔ حتّٰی کہ سُود کی مُمانعت کے سلسلے میں جو آیات نازل ہوئی ہیں، وہ بھی اس میں شامل ہیں، حالانکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بالکل آخری زمانے میں اُتری تھیں۔ سورت کا خاتمہ جن آیات پر ہوا ہے، وہ ہجرت سے پہلے مکے میں نازل ہو چکی تھیں مگر مضمون کی مناسبت سے ان کو بھی اِسی سورت میں ضم کر دیا گیا ہے۔

شانِ نزول اِس سورت کو سمجھنے کے لیے پہلے اِس کا تاریخی پَس منظر اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

(۱) ہجرت سے قبل جب تک مکے میں اسلام کی دعوت دی جاتی رہی، خطاب بیشتر مشرکینِ عرب سے تھا، جن کے لیے اسلام کی آواز ایک نئی اور غیر مانوس آواز تھی۔ اب ہجرت کے بعد سابقہ یہودیوں سے پیش آیا جن کی بستیاں مدینے سے بالکل متّصل ہی واقع تھیں۔ یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے، اُس ضابطۂ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی طرف سے اُن کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اور اُصولاً اُن کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ لیکن صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اُن کو اصل دین سے بہت دور ہٹا دیا[1] تھا۔ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہو گئی تھی جن کے لیے تورات میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے رُسوم اور طریقے رواج پا گئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے تورات میں کوئی ثبوت نہ تھا۔ خود تورات کو اُنھوں نے انسانی کلام کے اندر خلط ملط

---

[1] اس وقت حضرت موسیٰ کو گزرے ہوئے تقریباً ۱۹ صدیاں گزر چکی تھیں۔ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰ نے ۱۲۷۲ قبلِ مسیح میں وفات پائی۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۶۱۰ بعدِ مسیح میں منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے۔

کر دیا تھا، اور خدا کا کلام جس حد تک لفظاً یا معناً محفوظ تھا، اس کو بھی انھوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی رُوح ان میں سے نکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیّت کا محض ایک بے جان ڈھانچا باقی تھا جس کو وہ سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے علما اور مشائخ، ان کے سردارانِ قوم اور ان کے عوام، سب کی اعتقادی، اَخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی، اور اپنے اس بگاڑ سے ان کو ایسی مَحبّت تھی کہ وہ کسی اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ انھیں دین کا سیدھا راستہ بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقے سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، مُوشگافیوں اور فرقہ بندیوں، اُنْتُخواں گیری و مغز افگنی، خدا فراموشی و دنیا پرستی کی بدولت انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصل نام ''مسلم'' تک بُھول گئے تھے، محض ''یہُودی'' بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انھوں نے محض نسلِ اسرائیل کی آبائی وِراثت بنا کر رکھ دیا تھا۔ پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اصل دین کی طرف دعوت دیں، چنانچہ سُورۂ بقرہ کے ابتدائی پندرہ سولہ رُکوع اسی دعوت پر مشتمل ہیں۔ ان میں یہودیوں کی تاریخ اور ان کی اَخلاقی و مذہبی حالت پر جس طرح تنقید کی گئی ہے، اور جس طرح ان کے بگڑے ہوئے مذہب و اخلاق کی نمایاں خُصوصیّات کے مقابلے میں حقیقی دین کے اُصُول پہلو بہ پہلو پیش کیے گئے ہیں، اس سے یہ بات بالکل آئینے کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک پیغمبر کی اُمّت کے بگاڑ کی نوعیت کیا ہوتی ہے، رسمی دین داری کے مقابلے میں حقیقی دین داری کس چیز کا نام ہے، دینِ حق کے بنیادی اُصُول کیا ہیں، اور خدا کی نگاہ میں اصل اہمیّت کن چیزوں کی ہے۔

(۲) مدینہ پہنچ کر اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ مکے میں تو معاملہ صرف اُصُولِ دین کی تبلیغ اور دین قبول کرنے والوں کی اخلاقی تربیت تک محدُود تھا، مگر جب ہجرت کے بعد عرب کے مختلف قبائل کے وہ سب لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہونے لگے اور انصار کی مدد سے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بُنیاد پڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے تمدُّن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست کے متعلق بھی اُصولی ہدایات دینی شروع کیں اور یہ بتایا کہ اسلام کی اساس پر یہ نیا نظامِ زندگی کس طرح تعمیر کیا جائے۔ اس سورت کے آخری ۲۳ رکوع زیادہ تر انھی ہدایات پر مشتمل ہیں، جن میں سے اکثر ابتدا ہی میں بھیج دی گئی تھیں اور بعض متفرق طور پر حسبِ ضرورت بعد میں بھیجی جاتی رہیں۔

(۳) ہجرت کے بعد اسلام اور کفر کی کش مکش بھی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہجرت سے پہلے اسلام کی دعوت خود کفر کے گھر میں دی جا رہی تھی اور متفرق قبائل میں سے جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے، وہ اپنی اپنی جگہ رہ کر ہی دین کی تبلیغ کرتے اور جواب میں مصائب اور مظالم کے تختۂ مشق بنتے تھے۔ مگر ہجرت کے بعد جب یہ منتشر مسلمان مدینے میں جمع ہو کر ایک جتھا بن گئے اور اُنھوں نے ایک چھوٹی سی آزاد ریاست قائم کر لی تو صورتِ حال یہ ہو گئی کہ ایک طرف ایک چھوٹی سی بستی تھی اور دُوسری طرف تمام عرب اس کا اِستیصال کر دینے پر تُلا ہُوا تھا۔ اب اِس مٹھی بھر جماعت کی کامیابی کا ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا انحصار بھی اس بات پر تھا

کہ اوّلاً، وہ پورے جوش وخروش کے ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے۔ ثانیاً، وہ مخالفین کا برسرِ باطل ہونا اس طرح ثابت ومُبَرہَن کر دے کہ کسی ذی عقل انسان کو اس میں شبہ نہ رہے۔ ثالثاً، بے خانماں ہونے اور تمام ملک کی عداوت ومُزاحمت سے دوچار ہونے کی بنا پر فقروفاقہ اور ہمہ وقت بے امنی و بے اطمینانی کی جو حالت ان پر طاری ہوگئی تھی اور جن خطرات میں وہ چاروں طرف سے گِھر گئے تھے، ان میں وہ ہراساں نہ ہوں، بلکہ پورے صبروثبات کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کریں اور اپنے عزم میں ذرا تزلزل نہ آنے دیں۔ رابعاً، وہ پوری دلیری کے ساتھ ہر اس مسلّح مزاحمت کا مسلّح مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوجائیں جو ان کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے کسی طاقت کی طرف سے کی جائے، اور اس بات کی ذرا پروا نہ کریں کہ مخالفین کی تعداد اور ان کی مادّی طاقت کتنی زیادہ ہے۔ خامساً، ان میں اتنی ہمّت پیدا کی جائے کہ اگر عرب کے لوگ اس نئے نظام کو، جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے، فہمایش سے قبول نہ کریں، تو انھیں جاہلیّت کے فاسد نظامِ زندگی کو بزور مٹا دینے میں بھی تأمّل نہ ہو۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے اِس سورت میں ان پانچوں اُمور کے متعلق ابتدائی ہدایات دی ہیں۔

(۴) دعوتِ اسلامی کے اس مرحلے میں ایک نیا عُنصر بھی ظاہر ہونا شروع ہوگیا تھا، اور یہ منافقین کا عُنصر تھا۔ اگرچہ نفاق کے ابتدائی آثار مکے کے آخری زمانے میں بھی نمایاں ہونے لگے تھے، مگر وہاں صرف اس قسم کے منافق پائے جاتے تھے جو اسلام کے برحق ہونے کے تو معترف تھے اور ایمان کا اقرار بھی کرتے تھے، لیکن اس کے لیے تیار نہ تھے کہ اس حق کی خاطر اپنے مفاد کی قربانی اور اپنے دُنیوی تعلقات کا انقطاع اور اُن مصائب وشدائد کو بھی برداشت کرلیں جو اس مسلکِ حق کو قبول کرنے کے ساتھ ہی نازل ہونے شروع ہوجاتے تھے۔ مدینہ پہنچ کر اِس قسم کے منافقین کے علاوہ چند اور قِسموں کے منافق بھی اسلامی جماعت میں پائے جانے لگے۔ ایک قسم کے منافق وہ تھے جو قطعاً اسلام کے منکر تھے اور محض فتنہ برپا کرنے کے لیے جماعتِ مسلمین میں داخل ہوجاتے تھے۔ دوسری قسم کے منافق وہ تھے جو اسلامی جماعت کے دائرہ اقتدار میں گِھر جانے کی وجہ سے اپنا مفاد اسی میں دیکھتے تھے کہ ایک طرف مسلمانوں میں بھی اپنا شمار کرائیں اور دوسری طرف مخالفینِ اسلام سے بھی ربط رکھیں، تاکہ دونوں طرف کے فوائد سے مُتمتّع ہوں اور دونوں طرف کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جو اسلام اور جاہلیّت کے درمیان متردّد تھے۔ انھیں اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان نہ تھا۔ مگر چونکہ ان کے قبیلے یا خاندان کے بیشتر لوگ مسلمان ہوچکے تھے، اس لیے یہ بھی مسلمان ہوگئے تھے۔ چوتھی قسم میں وہ لوگ شامل تھے جو امرِ حق ہونے کی حیثیت سے تو اسلام کے قائل ہوچکے تھے، مگر جاہلیت کے طریقے اور اَوہام اور رسمیں چھوڑنے اور اَخلاقی پابندیاں قبول کرنے اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بار اُٹھانے سے ان کا نفس انکار کرتا تھا۔

سورۂ بقرہ کے نُزول کے وقت ان مختلف اقسام کے منافقین کے ظہُور کی محض ابتدا تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف صرف اجمالی اشارات فرمائے ہیں۔ بعد میں جتنی جتنی اِن کی صفات اور حرکات نمایاں ہوتی گئیں، اُسی قدر تفصیل کے ساتھ بعد کی سورتوں میں ہر قسم کے منافقین کے متعلق ان کی نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ ہدایات بھیجی گئیں۔

۲۸۶ آیاتھا سُورَۃُ الْبَقَرَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۴۰ رکوعاتھا الجزء ۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الٓمّٓ ۞١ ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛ فِيۡهِ ۛ هُدًى معانقة ۱

الف، لام، میم[1]۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں[2]۔ ہدایت ہے

۱ – یہ حُرُوفِ مُقطّعات قرآنِ مجید کی بعض سُورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں۔ جس زمانے میں قرآنِ مجید نازل ہوا ہے، اُس دَور کے اسالیبِ بیان میں اِس طرح کے حُرُوفِ مُقطّعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔ خطیب اور شعرا دونوں اِس اُسلوب سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلامِ جاہلیّت کے جونمونے محفوظ ہیں، ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اِس استعمالِ عام کی وجہ سے یہ مُقطّعات کوئی چیستاں نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو، بلکہ سامعین بالعُموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ یہ بے معنٰی حُرُوف کیسے ہیں جو تم بعض سورتوں کی ابتدا میں بولتے ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ سے بھی ایسی کوئی رِوایَت منقول نہیں ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے معنٰی پوچھے ہوں۔ بعد میں یہ اُسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسّرین کے لیے ان کے معانی متعیّن کرنا مشکل ہوگیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حُرُوف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معنٰی نہ جانے گا تو اس کے راہِ راست پانے میں کوئی نقص رہ جائے گا۔ لہٰذا ایک عام ناظر کے لیے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو۔

۲ – اس کا ایک سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے کہ ”بے شک یہ اللہ کی کتاب ہے۔“ مگر ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کی کوئی بات نہیں ہے۔ دُنیا میں جتنی کتابیں اُمورِ مابعد الطبیعت اور حقائقِ ماورائے اِدراک سے بحث کرتی ہیں، وہ سب قیاس وگمان پر مبنی ہیں، اس لیے خود ان کے مصنف بھی اپنے بیانات کے بارے میں شک سے پاک نہیں ہوسکتے، خواہ وہ کتنے ہی یقین کا اظہار کریں۔ لیکن یہ ایسی کتاب ہے جو سراسر علمِ حقیقت پر مبنی ہے، اس کا مصنف وہ ہے جو تمام حقیقتوں کا علم رکھتا ہے، اس لیے فی الواقع اس میں شک کے لیے کوئی جگہ نہیں، یہ دُوسری بات ہے کہ انسان اپنی نادانی کی بنا پر اس کے بیانات میں شک کریں۔

لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ

اُن پرہیزگار لوگوں کے[۳] لیے جو غیب پر ایمان لاتے[۴] ہیں، نماز قائم کرتے ہیں[۵]، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں[۶]، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن)

۳- یعنی یہ کتاب ہے تو سراسر ہدایت و رہنمائی، مگر اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی میں چند صفات پائی جاتی ہوں۔ ان میں سے اوّلین صفت یہ ہے کہ آدمی ''پرہیزگار'' ہو۔ بھلائی اور بُرائی میں تمیز کرتا ہو۔ بُرائی سے بچنا چاہتا ہو۔ بھلائی کا طالب ہو اور اس پر عمل کرنے کا خواہش مند ہو۔ رہے وہ لوگ، جو دنیا میں جانوروں کی طرح جیتے ہوں، جنھیں کبھی یہ فکر لاحق نہ ہوتی ہو کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں، بس جدھر دنیا چل رہی ہو، یا جدھر خواہشِ نفس دھکیل دے، یا جدھر قدم اُٹھ جائیں، اسی طرف چل پڑتے ہوں، تو ایسے لوگوں کے لیے قرآن میں کوئی رہنمائی نہیں ہے۔

۴- یہ قرآن سے فائدہ اُٹھانے کے لیے دوسری شرط ہے۔ ''غیب'' سے مراد وہ حقیقتیں ہیں جو انسان کے حواس سے پوشیدہ ہیں اور کبھی براہِ راست عام انسانوں کے تجربہ و مُشاہدہ میں نہیں آتیں، مثلاً خدا کی ذات و صفات، ملائکہ، وحی، جنّت، دوزخ وغیرہ۔ اِن حقیقتوں کو بغیر دیکھے ماننا اور اس اعتماد پر ماننا کہ نبیؐ ان کی خبر دے رہا ہے، ایمان بالغیب ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان غیر محسوس حقیقتوں کو ماننے کے لیے تیار ہو، صرف وہی قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ رہا وہ شخص جو ماننے کے لیے دیکھنے اور چکھنے اور سُونگھنے کی شرط لگائے، اور جو کہے کہ میں کسی ایسی چیز کو نہیں مان سکتا جو ناپی اور تولی نہ جا سکتی ہو، تو وہ اس کتاب سے ہدایت نہیں پا سکتا۔

۵- یہ تیسری شرط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صرف مان کر بیٹھ جانے والے ہوں وہ قرآن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایمان لانے کے بعد فوراً ہی عملی اطاعت کے لیے آمادہ ہو جائے۔ اور عملی اطاعت کی اوّلین علامت اور دائمی علامت نماز ہے۔ ایمان لانے پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرتے کہ مُؤذِّن نماز کے لیے پکارتا ہے اور اسی وقت فیصلہ ہو جاتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والا اطاعت کے لیے بھی تیار ہے یا نہیں۔ پھر یہ مُؤذِّن روز پانچ وقت پکارتا رہتا ہے، اور جب بھی انسان اس کی پکار پر لبیک نہ کہے، اسی وقت ظاہر ہو جاتا ہے کہ مدعیِ ایمان اطاعت سے خارج ہو گیا ہے۔ پس ترکِ نماز دراصل ترکِ اطاعت ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جو شخص کسی کی ہدایت پر کاربند ہونے کے لیے تیار ہی نہ ہو، اُس کے لیے ہدایت دینا اور نہ دینا یکساں ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اقامتِ صلوٰۃ ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی طور پر نماز کا نظام باقاعدہ قائم کیا جائے۔ اگر کسی بستی میں ایک ایک شخص انفرادی طور پر نماز کا پابند ہو، لیکن جماعت کے ساتھ اس فرض کے ادا کرنے کا نظم نہ ہو، تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں

اِلَيۡكَ وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ ؕ ﴿۴﴾
اُولٰٓـئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنۡ رَّبِّهِمۡ ۖ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۵﴾

اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں،[۷] اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔[۸] ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

نماز قائم کی جا رہی ہے۔

۶ – یہ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے چوتھی شرط ہے کہ آدمی تنگ دل نہ ہو، زر پرست نہ ہو، اس کے مال میں خدا اور بندوں کے جو حُقوق مقرر کیے جائیں اُنھیں ادا کرنے کے لیے تیار ہو، جس چیز پر ایمان لایا ہے اس کی خاطر مالی قربانی کرنے میں بھی دریغ نہ کرے۔

۷ – یہ پانچویں شرط ہے کہ آدمی اُن تمام کتابوں کو برحق تسلیم کرے جو وحی کے ذریعے سے خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے پہلے کے انبیا پر مختلف زمانوں اور ملکوں میں نازل کیں۔ اس شرط کی بنا پر قرآن کی ہدایت کا دروازہ اُن سب لوگوں پر بند ہے جو سرے سے اس ضرورت ہی کے قائل نہ ہوں کہ انسان کو خدا کی طرف سے ہدایت ملنی چاہیے، یا اس ضرورت کے تو قائل ہوں مگر اس کے لیے وحی و رسالت کی طرف رُجوع کرنا غیر ضروری سمجھتے ہوں اور خود کچھ نظریات قائم کر کے انھی کو خدائی ہدایت قرار دے بیٹھیں، یا آسمانی کتابوں کے بھی قائل ہوں، مگر صرف اُس کتاب یا اُن کتابوں پر ایمان لائیں جنھیں ان کے باپ دادا مانتے چلے آئے ہیں، رہیں اُسی سرچشمے سے نکلی ہوئی دوسری ہدایات، تو وہ اُن کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ایسے سب لوگوں کو الگ کر کے قرآن اپنا چشمۂ فیض صرف اُن لوگوں کے لیے کھولتا ہے جو اپنے آپ کو خدائی ہدایت کا محتاج بھی مانتے ہوں، اور یہ بھی تسلیم کرتے ہوں کہ خدا کی یہ ہدایت ہر انسان کے پاس الگ الگ نہیں آتی بلکہ انبیا اور کُتُبِ آسمانی کے ذریعے سے ہی خلق تک پہنچتی ہے، اور پھر وہ کسی نسلی و قومی تعصّب میں بھی مُبتلا نہ ہوں بلکہ خالص حق کے پرستار ہوں، اس لیے حق جہاں جہاں جس شکل میں بھی آیا ہے، اس کے آگے سر جھکا دیں۔

۸ – یہ چھٹی اور آخری شرط ہے۔ ”آخرت“ ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق بہت سے عقائد کے مجمُوعے پر ہوتا ہے۔ اس میں حسبِ ذیل عقائد شامل ہیں:

(۱) یہ کہ انسان اِس دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اپنے تمام اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

(۲) یہ کہ دُنیا کا موجودہ نظام ابَدی نہیں ہے بلکہ ایک وقت پر، جسے صرف خدا ہی جانتا ہے، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(۳) یہ کہ اس عالَم کے خاتمے کے بعد خدا ایک دوسرا عالم بنائے گا اور اس میں پوری نوعِ انسانی کو، جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی، بیک وقت دوبارہ پیدا کرے گا، اور سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے گا، اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ
تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى
سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۷﴾ ع
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ

جن لوگوں نے (اِن باتوں کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا[9]، اُن کے لیے یکساں ہے، خواہ تم انھیں خبردار کرو یا نہ کرو، بہر حال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مُہر لگا دی[10] ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔ ع

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ

(۴) یہ کہ خدا کے اس فیصلے کی رُو سے جو لوگ نیک قرار پائیں گے وہ جنّت میں جائیں گے، اور جو لوگ بد ٹھیریں گے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

(۵) یہ کہ کامیابی و ناکامی کا اصلی معیار موجودہ زندگی کی خوش حالی و بدحالی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت کامیاب انسان وہ ہے جو خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب ٹھیرے، اور ناکام وہ ہے جو وہاں ناکام ہو۔

عقائد کے اِس مجموعے پر جن لوگوں کو یقین نہ ہو، وہ قرآن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، کیونکہ ان باتوں کا انکار تو درکنار، اگر کسی کے دل میں ان کی طرف سے شک اور تذبذب کی کیفیت بھی ہو، تو وہ اس راستے پر نہیں چل سکتا جو انسانی زندگی کے لیے قرآن نے تجویز کیا ہے۔

۹ – یعنی وہ چھ کی چھ شرطیں، جن کا ذکر اُوپر ہوا ہے، پوری نہ کیں، اور ان سب کو، یا اِن میں سے کسی ایک کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۰ – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے مُہر لگا دی تھی، اِس لیے انھوں نے تسلیم کرنے سے انکار کیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب اُنھوں نے اُن بنیادی اُمور کو رَدّ کر دیا جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے، اور اپنے لیے قرآن کے پیش کردہ راستے کے خلاف دوسرا راستہ پسند کر لیا، تو اللہ نے اُن کے دِلوں اور کانوں پر مُہر لگا دی۔ اِس مُہر لگنے کی کیفیت کا تجربہ ہر اُس شخص کو ہوگا جسے کبھی تبلیغ کا اتفاق ہوا ہو۔ جب کوئی شخص آپ کے پیش کردہ طریقے کو جانچنے کے بعد ایک دفعہ رَدّ کر دیتا ہے، تو اس کا ذہن کچھ اس طرح مخالف سَمت میں چل پڑتا ہے کہ پھر آپ کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، آپ کی دعوت کے لیے اس کے کان بہرے، اور آپ کے طریقے کی خوبیوں کے لیے اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، اور صریح طور پر محسوس ہوتا ہے

بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۞۸ يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَمَا يَخۡدَعُوۡنَ
اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ۞۹ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ
مَرَضًا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۙ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ۞۱۰ وَاِذَا قِيۡلَ
لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ۞۱۱
اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَلٰـكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ ۞۱۲ وَاِذَا

وقف لازم

مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں، مگر دراصل وہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انھیں اس کا شُعور نہیں[11] ہے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا[12]، اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں، اس کی پاداش میں ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ جب کبھی اُن سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو، تو انھوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ــــــ خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انھیں شُعور نہیں ہے۔ اور جب

کہ فی الواقع اس کے دل پر مُہر لگی ہوئی ہے۔

۱۱ – یعنی وہ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مُبتلا کر رہے ہیں کہ ان کی یہ منافقانہ رَوِش ان کے لیے مفید ہوگی، حالانکہ دراصل یہ ان کو دُنیا میں بھی نقصان پہنچائے گی اور آخرت میں بھی۔ دُنیا میں ایک منافق چند روز کے لیے تو لوگوں کو دھوکا دے سکتا ہے مگر ہمیشہ اس کا دھوکا نہیں چل سکتا۔ آخرِکار اس کی منافقت کا راز فاش ہو کر رہتا ہے، اور پھر معاشرے میں اس کی کوئی ساکھ باقی نہیں رہتی۔ رہی آخرت، تو وہاں ایمان کا زبانی دعویٰ کوئی قیمت نہیں رکھتا اگر عمل اس کے خلاف ہو۔

۱۲ – بیماری سے مراد منافقت کی بیماری ہے۔ اور اللہ کے اس بیماری میں اضافہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ منافقین کو ان کے نِفاق کی سزا فوراً نہیں دیتا بلکہ انھیں ڈھیل دیتا ہے اور اس ڈھیل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منافق لوگ اپنی چالوں کو بظاہر کامیاب ہوتے دیکھ کر اور زیادہ مکمل منافق بنتے چلے جاتے ہیں۔

قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ
السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾ وَ اِذَا
لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ
قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ اَللّٰهُ
يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾

ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان[۱۳] لاؤ، تو انھوں نے یہی جواب دیا: ”کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں[۱۴]؟“ —— خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں، مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔ جب یہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں[۱۵] سے ملتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں —— اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے، وہ اِن کی رسّی دراز کیے جاتا ہے، اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔

---

۱۳ – یعنی جس طرح تمھاری قوم کے دوسرے لوگ سچّائی اور خلوص کے ساتھ مسلمان ہوئے ہیں، اسی طرح تم بھی اگر اسلام قبول کرتے ہو تو ایمان داری کے ساتھ سچّے دل سے قبول کرو۔

۱۴ – وہ اپنے نزدیک ان لوگوں کو بے وقوف سمجھتے تھے جو سچائی کے ساتھ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو تکلیفوں اور مَشَقَّتوں اور خطرات میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کی رائے میں یہ سراسر احمقانہ فعل تھا کہ محض حق اور راستی کی خاطر تمام مُلک کی دشمنی مول لے لی جائے۔ ان کے خیال میں عقل مندی یہ تھی کہ آدمی حق اور باطل کی بحث میں نہ پڑے، بلکہ ہر معاملے میں صرف اپنے مفاد کو دیکھے۔

۱۵ – شیطان عربی زبان میں سرکش، متمرّد اور شوریدہ سر کو کہتے ہیں۔ انسان اور جِنّ، دونوں کے لیے یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر شیاطینِ جن کے لیے آیا ہے، لیکن بعض مَقامات پر شیطان صفت انسانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور سیاق وسباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں شیطان سے انسان مُراد ہیں اور کہاں جن۔ اِس مقام پر شیاطین کا لفظ اُن بڑے بڑے سرداروں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اس وقت اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَٰلَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت
تِّجَٰرَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى
اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ أَضَآءَتْ مَا حَوْلَهُۥ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ
وَتَرَكَهُمْ فِى ظُلُمَٰتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا
يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمَٰتٌ وَرَعْدٌ
وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَٰبِعَهُمْ فِىٓ ءَاذَانِهِم مِّنَ الصَّوَٰعِقِ

یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے، مگر یہ سودا ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ اِن کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اُس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا، تو اللہ نے اِن کا نورِ بصارت سَلب کر لیا اور انھیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔[16] یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں،[17] یہ اب نہ پلٹیں گے۔ یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے، یہ بجلی کے کڑاکے سُن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں اُنگلیاں

---

۱۶ – مطلب یہ ہے کہ جب ایک اللہ کے بندے نے روشنی پھیلائی اور حق کو باطل سے، صحیح کو غلط سے، راہِ راست کو گمراہیوں سے چھانٹ کر بالکل نمایاں کر دیا، تو جو لوگ دیدۂ بینا رکھتے تھے، ان پر تو ساری حقیقتیں روشن ہو گئیں، مگر یہ منافق، جو نفس پرستی میں اندھے ہو رہے تھے، ان کو اس روشنی میں کچھ نظر نہ آیا۔ "اللہ نے نورِ بصارت سلب کر لیا" کے الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کے تاریکی میں بھٹکنے کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے۔ اللہ نورِ بصارت اسی کا سلب کرتا ہے جو خود حق کا طالب نہیں ہوتا، خود ہدایت کے بجائے گمراہی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، خود صداقت کا روشن چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ جب اُنھوں نے نورِ حق سے منہ پھیر کر ظلمتِ باطل ہی میں بھٹکنا چاہا تو اللہ نے انھیں اسی کی توفیق عطا فرما دی۔

۱۷ – حق بات سننے کے لیے بہرے، حق گوئی کے لیے گونگے، حق بینی کے لیے اندھے۔

حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹ يَكَادُ الْبَرْقُ
يَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ
وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ
بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۰ ع ۲

ٹھونسے لیتے ہیں، اور اللہ اِن منکرینِ حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔[۱۸] چمک سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی اِن کی بصارت اُچک لے جائے گی۔ جب ذرا کچھ روشنی انھیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دُور چل لیتے ہیں، اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں[۱۹] ــــ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سَلب کر لیتا،[۲۰] یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ع

۱۸ – یعنی کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس کر وہ اپنے آپ کو کچھ دیر کے لیے اس غلط فہمی میں تو ڈال سکتے ہیں کہ ہلاکت سے بچ جائیں گے مگر فی الواقع اس طرح وہ بچ نہیں سکتے، کیونکہ اللہ اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ان پر محیط ہے۔

۱۹ – پہلی مثال اُن منافقین کی تھی جو دل میں قطعی منکر تھے اور کسی غرض و مَصلَحت سے مسلمان بن گئے تھے۔ اور یہ دُوسری مثال اُن کی ہے جو شک اور تذبذب اور ضُعفِ ایمان میں مبتلا تھے، کچھ حق کے قائل بھی تھے، مگر ایسی حق پرستی کے قائل نہ تھے کہ اس کی خاطر تکلیفوں اور مصیبتوں کو بھی برداشت کر جائیں۔ اس مثال میں بارش سے مراد اسلام ہے جو انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا۔ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک سے مُراد مشکلات و مصائب کا وہ ہجوم اور وہ سخت مُجاہَدہ ہے جو تحریکِ اسلامی کے مقابلے میں اہلِ جاہلیّت کی شدید مزاحمت کے سبب سے پیش آ رہا تھا۔ مثال کے آخری حصے میں ان منافقین کی اس کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب معاملہ ذرا سہل ہوتا ہے تو یہ چل پڑتے ہیں، اور جب مشکلات کے دَل بادَل چھانے لگتے ہیں، یا ایسے احکام دیے جاتے ہیں جن سے ان کی خواہشاتِ نفس اور ان کے تعصّباتِ جاہلیّت پر ضرب پڑتی ہے، تو ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۲۰ – یعنی جس طرح پہلی قسم کے منافقین کا نورِ بصارت اس نے بالکل سَلب کر لیا، اسی طرح اللہ ان کو بھی حق کے لیے اندھا بہرا بنا سکتا تھا۔ مگر اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ جو کسی حد تک دیکھنا اور سننا چاہتا ہو، اسے اُتنا بھی نہ دیکھنے سُننے دے۔ جس قدر حق دیکھنے اور حق سُننے کے لیے یہ تیار تھے، اسی قدر سماعت و بصارت اللہ نے ان کے پاس رہنے دی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝٢١ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ
بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا
لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝٢٢ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ
رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا

لوگو![21] بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب کی جو تمھارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں اُن سب کا خالق ہے، تمھارے بچنے کی توقع[22] اِسی صورت سے ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمھارے لیے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دُوسروں کو اللہ کا مدِّ مقابل[23] نہ ٹھیراؤ۔

اور اگر تمھیں اِس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو

۲۱ – اگرچہ قرآن کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام ہے، مگر اس دعوت سے فائدہ اُٹھانا یا نہ اُٹھانا لوگوں کی اپنی آمادگی پر اور اس آمادگی کے مطابق اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ لہٰذا پہلے انسانوں کے درمیان فرق کر کے واضح کر دیا گیا کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کس قسم کے نہیں اُٹھا سکتے۔ اِس کے بعد اب تمام نوعِ انسانی کے سامنے وہ اصل بات پیش کی جاتی ہے جس کی طرف بُلانے کے لیے قرآن آیا ہے۔

۲۲ – یعنی دنیا میں غلط بِینی و غلط کاری سے اور آخرت میں خدا کے عذاب سے بچنے کی توقع۔

۲۳ – یعنی جب تم خود بھی اِس بات کے قائل ہو اور تمھیں معلوم ہے کہ یہ سارے کام اللہ ہی کے ہیں، تو پھر تمھاری بندگی اسی کے لیے خاص ہونی چاہیے، دوسرا کون اس کا حق دار ہو سکتا ہے کہ تم اس کی بندگی بجا لاؤ؟ دوسروں کو اللہ کا مدِّمقابل ٹھیرانے سے مُراد یہ ہے کہ بندگی و عبادت کی مختلف اقسام میں سے کسی قسم کا رَویّہ خدا کے سوا دوسروں کے ساتھ برتا جائے۔ آگے چل کر خود قرآن ہی سے تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جائے گا کہ عبادت کی وہ اقسام کون کون سی ہیں جنھیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے اور جن میں دوسروں کو شریک ٹھیرانا وہ "شرک" ہے، جسے روکنے کے لیے قرآن آیا ہے۔

شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٣﴾ فَاِنْ لَّمْ
تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ
وَالْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٤﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۗ كُلَّمَا رُزِقُوْا
مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا
بِهٖ مُتَشَابِهًا ۗ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِيْهَا

بُلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو، مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔[۲۴] لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اُس آگ سے، جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر،[۲۵] جو مہیا کی گئی ہے منکرینِ حق کے لیے۔

اور اے پیغمبرؐ! جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کر لیں، انھیں خوش خبری دے دو کہ اُن کے لیے ایسے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جُلتے ہوں گے۔ جب کوئی پھل انھیں کھانے کو دیا جائے گا، تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیے جاتے تھے۔[۲۶] ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی،[۲۷] اور وہ وہاں

۲۴ – اِس سے پہلے مکے میں کئی بار یہ چیلنج دیا جا چکا تھا کہ اگر تم اِس قرآن کو انسان کی تصنیف سمجھتے ہو تو اس کے مانند کوئی کلام تصنیف کر کے دکھاؤ۔ اب مدینے پہنچ کر پھر اس کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ یُونس، آیت ۳۸۔ سورۂ ہُود، آیت ۱۳۔ بنی اسرائیل، آیت ۸۸۔ الطُّور، آیات ۳۳، ۳۴)

۲۵ – اِس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ وہاں صرف تم ہی دوزخ کا ایندھن نہ بنو گے، بلکہ تمھارے وہ بُت بھی وہاں تمھارے ساتھ ہی موجود ہوں گے جنھیں تم نے اپنا معبُود و مسجود بنا رکھا ہے۔ اس وقت تمھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ خدائی میں یہ کتنا دخل رکھتے تھے۔

۲۶ – یعنی نرالے اور اجنبی پھل نہ ہوں گے، جن سے وہ نامانوس ہوں۔ شکل میں اُنھی پھلوں سے ملتے جُلتے ہوں گے جن سے وہ دُنیا میں آشنا تھے۔ البتہ لذت میں وہ ان سے بدرجہا زیادہ بڑھے ہوئے ہوں گے۔ دیکھنے میں مثلاً آم اور انار

خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً
فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ
وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ
يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ

وقف لازم

ہمیشہ رہیں گے۔

ہاں، اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں[۲۸] دے۔ جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں، وہ انھی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے، اور جو ماننے والے نہیں ہیں، وہ انھیں سُن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے۔[۲۹] اور گمراہی میں وہ انھی کو مبتلا کرتا ہے، جو

اور سنترے ہی ہوں گے۔ اہلِ جنّت ہر پھل کو دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ آم ہے اور یہ انار ہے اور یہ سنترا۔ مگر مزے میں دُنیا کے آموں اور اناروں اور سنتروں کو ان سے کوئی نسبت نہ ہوگی۔

۲۷ – عربی متن میں اَزْوَاجٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں ''جوڑے''۔ اور یہ لفظ شوہر اور بیوی، دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شوہر کے لیے بیوی ''زوج'' ہے اور بیوی کے لیے شوہر ''زوج''۔ مگر وہاں یہ ازواج پاکیزگی کی صفت کے ساتھ ہوں گے۔ اگر دُنیا میں کوئی مرد نیک ہے اور اس کی بیوی نیک نہیں ہے، تو آخرت میں ان کا رشتہ کٹ جائے گا اور اس نیک مرد کو کوئی دُوسری نیک بیوی دے دی جائے گی۔ اگر یہاں کوئی عورت نیک ہے اور اس کا شوہر بد، تو وہاں وہ اِس بُرے شوہر کی صحبت سے خلاصی پا جائے گی اور کوئی نیک مرد اس کا شریکِ زندگی بنا دیا جائے گا۔ اور اگر یہاں کوئی شوہر اور بیوی دونوں نیک ہیں، تو وہاں ان کا یہی رشتہ اَبَدی و سرمدی ہو جائے گا۔

۲۸ – یہاں ایک اعتراض کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر توضیحِ مدّعا کے لیے مکڑی، مکھی، مچھر وغیرہ کی جو تمثیلیں دی گئی ہیں، اُن پر مخالفین کو اعتراض تھا کہ یہ کیسا کلامِ الٰہی ہے جس میں ایسی حقیر چیزوں کی تمثیلیں ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو اس میں یہ فضولیات نہ ہوتیں۔

۲۹ – یعنی جو لوگ بات کو سمجھنا نہیں چاہتے، حقیقت کی جستجو ہی نہیں رکھتے، اُن کی نگاہیں تو بس ظاہری الفاظ میں

اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝٢٦ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ
مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ
فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝٢٧ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ
وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ

فاسق ہیں[30]، اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں[31]، اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُسے کاٹتے ہیں[32]، اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں[33]۔ حقیقت میں یہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویّہ کیسے اختیار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تم کو زندگی عطا کی، پھر وہی تمھاری جان سَلب کرے گا، پھر وہی تمھیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا، پھر

اٹک کر رہ جاتی ہیں اور وہ ان چیزوں سے اُلٹے نتائج نکال کر حق سے اَور زیادہ دُور چلے جاتے ہیں۔ برعکس اس کے جو خود حقیقت کے طالب ہیں اور صحیح بصیرت رکھتے ہیں، ان کو انھی باتوں میں حکمت کے جوہر نظر آتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسی حکیمانہ باتیں اللہ ہی کی طرف سے ہوسکتی ہیں۔

۳۰ — فاسق: نافرمان، اطاعت کی حد سے نکل جانے والا۔

۳۱ — بادشاہ اپنے ملازموں اور رعایا کے نام جو فرمان یا ہدایات جاری کرتا ہے، ان کو عربی محاورے میں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ ان کی تعمیل رعایا پر واجب ہوتی ہے۔ یہاں عہد کا لفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے عہد سے مراد اس کا وہ مستقل فرمان ہے، جس کی رُو سے تمام نوعِ انسانی صرف اسی کی بندگی، اطاعت اور پرستش کرنے پر مامور ہے۔ ”مضبوط باندھ لینے کے بعد“ سے اشارہ اس طرف ہے کہ آدمؑ کی تخلیق کے وقت تمام نوعِ انسانی سے اس فرمان کی پابندی کا اقرار لے لیا گیا تھا۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۷۲ میں اس عہد و اقرار پر نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۲ — یعنی جن روابط کے قیام اور استحکام پر انسان کی اجتماعی و انفرادی فلاح کا انحصار ہے، اور جنھیں دُرست رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، ان پر یہ لوگ تیشہ چلاتے ہیں۔ اس مختصر سے جملے میں اس قدر وسعت ہے کہ انسانی تمدّن و اَخلاق کی پوری دنیا پر، جو دو آدمیوں کے تعلق سے لے کر عالمگیر بین الاقوامی تعلّقات تک پھیلی ہوئی ہے، صرف یہی ایک جملہ

اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ
جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ
هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ ع وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ

اسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔ وہی تو ہے، جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں، پھر اوپر کی طرف توجّہ فرمائی اور سات آسمان[۳۴] استوار کیے۔ اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔[۳۵] ع
پھر ذرا[۳۶] اس وقت کا تصوّر کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں[۳۷] سے کہا تھا کہ ”میں

حاوی ہو جاتا ہے۔ روابط کو کاٹنے سے مُراد محض تعلّقاتِ انسانی کا انقطاع ہی نہیں ہے، بلکہ تعلّقات کی صحیح اور جائز صُورتوں کے سوا جو صورتیں بھی اختیار کی جائیں گی، وہ سب اسی ذیل میں آ جائیں گی، کیونکہ ناجائز اور غلط روابط کا انجام وہی ہے جو قطعِ روابط کا ہے، یعنی بین الانسانی معاملات کی خرابی اور نظامِ اَخلاق وتمدّن کی بربادی۔

۳۳- ان تین جُملوں میں فِسق اور فاسق کی مکمل تعریف بیان کر دی گئی ہے۔ خدا اور بندے کے تعلق اور انسان اور انسان کے تعلق کو کاٹنے یا بگاڑنے کا لازمی نتیجہ فساد ہے، اور جو اس فساد کو برپا کرتا ہے، وہی فاسق ہے۔

۳۴- سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے، اس کا تعیُّن مشکل ہے۔ انسان ہر زمانے میں آسمان، یا بالفاظِ دیگر، ماورائے زمین کے متعلق اپنے مُشاہَدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصوّرات قائم کرتا رہا ہے، جو برابر بدلتے رہے ہیں۔ لہٰذا اُن میں سے کسی تصوّر کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعیّن کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بس مُجملاً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماورا جس قدر کائنات ہے، اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقے میں واقع ہے، وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔

۳۵- اس فقرے میں دو اہم حقیقتوں پر مُتنبِّہ فرمایا گیا ہے: ایک، یہ کہ تم اس خدا کے مقابلے میں کفر وبغاوت کا رَوِیَّہ اختیار کرنے کی جُرأت کیسے کرتے ہو جو تمھاری تمام حرکات سے باخبر ہے، جس سے تمھاری کوئی حرکت چُھپی نہیں رہ سکتی۔ دوسرے، یہ کہ جو خدا تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، جو درحقیقت علم کا سرچشمہ ہے، اس سے منہ موڑ کر بجز اس کے کہ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکو، اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ جب اس کے سوا علم کا اور کوئی منبع ہی نہیں ہے، جب اس کے سوا اور کہیں سے وہ روشنی نہیں مل سکتی جس میں تم اپنی زندگی کا راستہ صاف دیکھ سکو، تو آخر اُس سے رُوگردانی کرنے میں کیا فائدہ تم نے دیکھا ہے؟

۳۶- اُوپر کے رُکوع میں بندگیِ رب کی دعوت اِس بُنیاد پر دی گئی تھی کہ وہ تمھارا خالق ہے، پروردگار ہے،

جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ

زمین میں ایک خلیفہ[۳۸] بنانے والا ہوں۔" انھوں نے عرض کیا: "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں، جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خوں ریزیاں کرے گا؟[۳۹] آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح

اُسی کے قبضۂ قدرت میں تمھاری زندگی و موت ہے، اور جس کائنات میں تم رہتے ہو، اس کا مالک و مدبر وہی ہے، لہٰذا اس کی بندگی کے سوا تمھارے لیے اور کوئی دوسرا طریقہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ اب اس رکوع میں وہی دعوت اس بُنیاد پر دی جا رہی ہے کہ اس دُنیا میں تم کو خدا نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تمھارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اس کی بندگی کرو، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق کام کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کے اشاروں پر چلے، تو بدترین بغاوت کے مجرم ہوگے اور بدترین انجام دیکھو گے۔

اس سلسلے میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوعِ انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کیا گیا ہے جس کے معلوم ہونے کا کوئی دُوسرا ذریعہ انسان کو مُیسّر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں، وہ اُن نتائج سے بہت زیادہ قیمتی ہیں جو زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر اور انھیں قیاس و تخمین سے ربط دے کر آدمی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۳۷ - مَلَک کے اصل معنٰی عربی میں "پیامبر" کے ہیں۔ اسی کا لفظی ترجمہ فرستادہ یا فرشتہ ہے۔ یہ محض مجرّد قوتیں نہیں ہیں، جو تشخّص نہ رکھتی ہوں، بلکہ یہ شخصیّت رکھنے والی ہستیاں ہیں، جن سے اللہ اپنی اِس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے۔ یُوں سمجھنا چاہیے کہ یہ سلطنتِ الٰہی کے اہل کار ہیں جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ جاہل لوگ انھیں غلطی سے خدائی میں حصہ دار سمجھ بیٹھے اور بعض نے انھیں خدا کا رشتہ دار سمجھا اور ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔

۳۸ - خلیفہ: وہ جو کسی کی مِلک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے، بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے، یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے، تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

۳۹ - یہ فرشتوں کا اعتراض نہ تھا بلکہ اِستِفہام تھا۔ فرشتوں کی کیا مجال کہ خدا کی کسی تجویز پر اعتراض کریں۔

وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰ وَعَلَّمَ
اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ
اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۳۱ قَالُوْا

اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے[40] ہیں۔'' فرمایا: ''میں جانتا ہوں، جو کچھ تم نہیں[41] جانتے۔'' اس کے بعد اللہ نے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے[42]، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: ''اگر تمھارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا)، تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔'' انھوں نے عرض کیا:

وہ ''خلیفہ'' کے لفظ سے یہ تو سمجھ گئے تھے کہ اس زیر تجویز مخلوق کو زمین میں کچھ اختیارات سُپرد کیے جانے والے ہیں، مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ سلطنتِ کائنات کے اس نظام میں کسی بااختیار مخلوق کی گنجایش کیسے ہوسکتی ہے، اور اگر کسی کی طرف کچھ ذرا سے بھی اختیارات منتقل کر دیے جائیں، تو سلطنت کے جس حصّے میں بھی ایسا کیا جائے گا، وہاں کا انتظام خرابی سے کیسے بچ جائے گا۔ اسی بات کو وہ سمجھنا چاہتے تھے۔

۴۰ – اس فقرے سے فرشتوں کا مدّعا یہ نہ تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے، ہم اس کے مستحق ہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ حضور کے فرامین کی تعمیل ہو رہی ہے، آپ کے احکام بجا لانے میں ہم پوری طرح سرگرم ہیں، مرضیِ مبارک کے مطابق سارا جہان پاک صاف رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آپ کی حمد و ثنا اور آپ کی تسبیح و تقدیس بھی ہم خدامِ ادب کر رہے ہیں، اب کمی کس چیز کی ہے کہ اس کے لیے ایک خلیفہ کی ضرورت ہو؟ ہم اس کی مَصلحَت نہیں سمجھ سکے۔ (تسبیح کا لفظ ذُو مَعنَیین ہے۔ اس کے معنٰی پاکی بیان کرنے کے بھی ہیں اور سرگرمی کے ساتھ کام اور انہماک کے ساتھ سعی کرنے کے بھی۔ اسی طرح تقدیس کے بھی دو معنٰی ہیں: ایک، تقدس کا اظہار و بیان۔ دُوسرے، پاک کرنا)۔

۴۱ – یہ فرشتوں کے دوسرے شبہے کا جواب ہے۔ یعنی فرمایا کہ خلیفہ مقرر کرنے کی ضرورت و مَصلَحت مَیں جانتا ہوں، تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اپنی جن خدمات کا تم ذکر کر رہے ہو، وہ کافی نہیں ہیں، بلکہ ان سے بڑھ کر کچھ مطلوب ہے۔ اسی لیے زمین میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے جس کی طرف کچھ اختیارات منتقل کیے جائیں۔

۴۲ – انسان کے علم کی صُورت دراصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعے سے اشیا کے علم کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسمائے اشیا پر مشتمل ہیں۔ آدمؑ کو سارے نام سکھانا گویا ان کو تمام اشیا کا علم دینا تھا۔

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ
الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ
بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَاِذْ
قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى

"نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں، جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔[۴۳] حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔" پھر اللہ نے آدمؑ سے کہا: "تم اِنھیں اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔" جب اس نے ان کو اُن سب کے نام بتا دیے،[۴۴] تو اللہ نے فرمایا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی مجھے معلوم ہے، اور جو کچھ تم چھُپاتے ہو، اُسے بھی میں جانتا ہوں۔"

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ، تو سب جھک گئے،[۴۵] مگر ابلیس[۴۶] نے انکار کیا۔

۴۳ – ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے اور فرشتوں کی ہر صِنف کا علم صرف اسی شعبے تک محدود ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ مثلاً ہوا کے انتظام سے جو فرشتے متعلق ہیں، وہ ہوا کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں، مگر پانی کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہی حال دُوسرے شعبوں کے فرشتوں کا ہے۔ انسان کو ان کے برعکس جامع علم دیا گیا ہے۔ ایک ایک شعبے کے متعلق چاہے وہ اُس شعبے کے فرشتوں سے کم جانتا ہو، مگر مجموعی حیثیت سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے، وہ فرشتوں کو میسّر نہیں ہے۔

۴۴ – یہ مظاہرہ فرشتوں کے پہلے شبہے کا جواب تھا۔ گویا اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے انھیں بتا دیا کہ میں آدمؑ کو صرف اختیارات ہی نہیں دے رہا ہوں، بلکہ علم بھی دے رہا ہوں۔ اس کے تقرر سے فساد کا جو اندیشہ تمھیں ہوا، وہ اس معاملے کا صرف ایک پہلو ہے۔ دُوسرا پہلو صلاح کا بھی ہے اور وہ فساد کے پہلو سے زیادہ وزنی اور زیادہ بیش قیمت ہے۔ حکیم کا یہ کام نہیں ہے کہ چھوٹی خرابی کی وجہ سے بڑی بہتری کو نظر انداز کر دے۔

۴۵ – اِس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقۂ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں،

وَاسۡتَكۡبَرَ ۖ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلۡنَا يٰۤاٰدَمُ اسۡكُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُكَ الۡجَنَّةَ وَكُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا ۖ وَلَا تَقۡرَبَا

وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔[۴۷]

پھر ہم نے آدم سے کہا کہ "تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ، مگر اس

ان سب کو انسان کے لیے مطیع و مُسَخَّر ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ اس علاقے میں اللہ کے حکم سے انسان خلیفہ بنایا جا رہا تھا، اس لیے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط، جس کام میں بھی انسان اپنے اُن اختیارات کو، جو ہم اسے عطا کر رہے ہیں، استعمال کرنا چاہے اور ہم اپنی مَشِیَّت کے تحت اسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں، تو تمھارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرۂ عمل سے وہ کام متعلق ہو، وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے۔ وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے، نیکی کرنا چاہے یا بدی کے ارتکاب کے لیے جائے، دونوں صُورتوں میں جب تک ہم اسے اس کی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اِذن دے رہے ہیں، تمھیں اس کے لیے سازگاری کرنی ہوگی۔ مثال کے طور پر اِس کو یوں سمجھیے کہ ایک فرماں روا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی صُوبے یا ضلع کا حاکم مقرر کرتا ہے، تو اس علاقے میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں، ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں، اور جب تک فرماں روا کا منشا یہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع دے، اس وقت تک اس کا ساتھ دیتے رہیں، قطعِ نظر اس سے کہ وہ صحیح کام میں ان اختیارات کو استعمال کر رہا ہے یا غلط کام میں۔ البتہ جب جس کام کے بارے میں بھی فرماں روا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے، تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور انھیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ سارے علاقے کے اہل کاروں نے گویا ہڑتال کر دی ہے۔ حتّٰی کہ جس وقت فرماں روا کی طرف سے ان حاکم صاحب کی معزُولی اور گرفتاری کا حکم ہوتا ہے، تو وہی ماتحت وخُدّام جو کل تک ان کے اشاروں پر حرکت کر رہے تھے، ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر انھیں کُشاں کُشاں دارُالفاسقین کی طرف لے جاتے ہیں۔ فرشتوں کو آدمؑ کے لیے سربسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا تھا، اُس کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ ممکن ہے کہ صرف مسخّر ہو جانے ہی کو سجدے سے تعبیر کیا گیا ہو۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو، اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۴۶ – اِبۡلِیۡس: بلفظی ترجمہ "انتہائی مایوس"۔ اِصطلاحاً یہ اُس جِنّ کا نام ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدمؑ اور بنی آدم کے لیے مطیع و مُسَخَّر ہونے سے انکار کر دیا اور اللہ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی کہ اسے نسلِ انسانی کو بہکانے اور گمراہیوں کی طرف ترغیب دینے کا موقع دیا جائے۔ اسی کو "الشَّیۡطٰن" بھی کہا جاتا ہے۔ درحقیقت شیطان اور ابلیس بھی محض کسی مجرّد قوت کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ بھی انسان کی طرح ایک صاحبِ تشخُّص ہستی ہے۔ نیز کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی

هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٥﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ

درخت کا رُخ نہ کرنا[48]، ورنہ ظالموں[49] میں شمار ہو گے۔" آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت

چاہیے کہ یہ فرشتوں میں سے تھا۔ آگے چل کر قرآن نے خود تصریح کر دی ہے کہ وہ جِنوں میں سے تھا، جو فرشتوں سے الگ، مخلوقات کی ایک مستقل صِنف ہیں۔

۴۷ – اِن الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ابلیس سجدے سے انکار کرنے میں اکیلا نہ تھا، بلکہ جِنوں کی ایک جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو گئی تھی، اور ابلیس کا نام صرف اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ ان کا سردار اور اس بغاوت میں پیش پیش تھا۔ لیکن اِس آیت کا دُوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "وہ کافروں میں سے تھا۔" اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جِنّوں کی ایک جماعت پہلے سے ایسی موجود تھی جو سرکش و نافرمان تھی، اور ابلیس کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ قرآن میں بالعُموم "شیاطین" کا لفظ اِنھی جِنّوں اور ان کی ذُرّیّت (نسل) کے لیے استعمال ہوا ہے، اور جہاں شیاطین سے انسان مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ نہ ہو، وہاں یہی شیاطینِ جن مراد ہوتے ہیں۔

۴۸ – اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین، یعنی اپنی جائے تقرُّر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے، ان دونوں کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا، تاکہ ان کے رُجحانات کی آزمایش ہو جائے۔ اس آزمایش کے لیے ایک درخت کو چُن لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے قریب نہ پھٹکنا، اور اس کا انجام بھی بتا دیا گیا کہ ایسا کرو گے تو ہماری نگاہ میں ظالم قرار پاؤ گے۔ یہ بحث غیر ضروری ہے کہ وہ درخت کون سا تھا اور اس میں کیا خاص بات تھی کہ اس سے منع کیا گیا۔ منع کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس درخت کی خاصیّت میں کوئی خرابی تھی اور اس سے آدم وحوّا کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ اصل غرض اس بات کی آزمایش تھی کہ یہ شیطان کی ترغیبات کے مقابلے میں کس حد تک حکم کی پیروی پر قائم رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کسی ایک چیز کا منتخب کر لینا کافی تھا۔ اسی لیے اللہ نے درخت کے نام اور اس کی خاصیّت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

اس امتحان کے لیے جنت ہی کا مَقام سب سے زیادہ موزوں تھا۔ دراصل اسے امتحان گاہ بنانے کا مقصود یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنا تھا کہ تمھارے لیے تمھارے مرتبۂ انسانیت کے لحاظ سے جنت ہی لائق و مناسب مَقام ہے۔ لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلے میں اگر تم اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے منحرف ہو جاؤ گے، تو جس طرح ابتدا میں اس سے محروم کیے گئے تھے، اسی طرح آخر میں بھی محروم ہی رہو گے۔ اپنے اس مقامِ لائق کی، اپنی اِس فردوسِ گم گشتہ کی بازیافت تم صرف اسی طرح کر سکتے ہو کہ اپنے اس دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرو جو تمھیں فرماں برداری کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

۴۹ – ظالم کا لفظ نہایت معنیٰ خیز ہے۔ "ظلم" دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے۔ جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے، وہ درحقیقت تین بڑے بُنیادی حقوق تلف کرتا ہے: اوّلاً، خدا کا حق، کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے۔ ثانیاً، اُن تمام چیزوں کے حُقوق جن کو اس نے اس نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔

عَنۡهَا فَاَخۡرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيۡهِ ۖ وَقُلۡنَا اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ
عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى
اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ

کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انھیں اُس حالت سے نکلوا کر چھوڑا، جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ "اب تم سب یہاں سے اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو[۵۰] اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھیرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔" اس وقت آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی،[۵۱] جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا، کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور

اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ اشیا جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں، ان سب کا اس پر یہ حق تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے۔ مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیارات استعمال کیے، تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثالثاً، خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے، مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے، تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ انھی وُجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گناہ گار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

۵۰ – یعنی انسان کا دشمن شیطان، اور شیطان کا دشمن انسان۔ شیطان کا دشمنِ انسان ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اسے اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے ہٹانے اور تباہی میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا انسان کا دشمنِ شیطان ہونا، تو فی الواقع انسانیت تو اس سے دشمنی ہی کی مقتضی ہے، مگر خواہشاتِ نفس کے لیے جو ترغیبات وہ پیش کرتا ہے، ان سے دھوکا کھا کر آدمی اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ اس طرح کی دوستی کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ حقیقتاً دشمنی دوستی میں تبدیل ہو گئی، بلکہ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ ایک دشمن دوسرے دشمن سے شکست کھا گیا اور اس کے جال میں پھنس گیا۔

۵۱ – یعنی آدمؑ کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انھوں نے نافرمانی سے پھر فرماں برداری کی طرف رجوع کرنا چاہا، اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے رب سے اپنی خطا معاف کرائیں، تو انھیں وہ الفاظ نہ ملتے تھے جن کے ساتھ وہ خطا بخشی کے لیے دُعا کر سکتے۔ اللہ نے ان کے حال پر رحم فرما کر وہ الفاظ بتا دیے۔

توبہ کے اصل معنٰی رُجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں۔ بندہ کی طرف سے توبہ کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ سرکشی سے باز آ گیا، طریقِ بندگی کی طرف پلٹ آیا۔ اور خدا کی طرف سے توبہ کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجّہ ہو گیا، پھر سے نظرِ عنایت اس کی طرف مائل ہو گئی۔

الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ
هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

رحم فرمانے والا ہے۔[۵۲]

ہم نے کہا کہ "تم سب یہاں سے اُتر جاؤ۔[۵۳] پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا،

۵۲ – قرآن اِس نظریّے کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں، اور وہ بہرحال انسان کو بھگتنے ہی ہوں گے۔ یہ انسان کے اپنے خودساختہ گمراہ کُن نظریات میں سے ایک بڑا گمراہ کُن نظریہ ہے، کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ گناہ گارانہ زندگی میں مبتلا ہوگیا، اُس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیتا ہے، اور اگر اپنی غلطی پر مُتنبّہ ہونے کے بعد وہ سابق کی تلافی اور آیندہ کے لیے اصلاح کرنا چاہے، تو یہ اس سے کہتا ہے کہ تیرے بچنے کی اب کوئی اُمید نہیں، جو کچھ تو کر چکا ہے اس کے نتائج بہرحال تیری جان کے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور بُرائی کی سزا دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمھیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے وہ تمھاری بھلائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کا فضل ہے، چاہے عنایت فرمائے، چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس بُرائی پر تمھیں سزا ملتی ہے، وہ بھی بُرائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے کہ لازماً مُترتّب ہو کر ہی رہے، بلکہ اللہ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے اور چاہے سزا دے دے۔ البتہ اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت اس کی حکمت کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے، اس لیے اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا۔ جب کسی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر ایسا کرتا ہے کہ بندے نے سچّی نیت کے ساتھ اس کی رضا کے لیے بھلائی کی تھی۔ اور جس بھلائی کو رَد کر دیتا ہے، اُسے اس بنا پر رَد کرتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل بھلے کام کی سی تھی، مگر اندر اپنے رب کی رضاجوئی کا خالص جذبہ نہ تھا۔ اسی طرح وہ سزا اُس قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ جسارت کے ساتھ کیا جائے اور جس کے پیچھے شرمساری کے بجائے مزید ارتکابِ جُرم کی خواہش موجود ہو۔ اور اپنی رحمت سے معافی اُس قصور پر دیتا ہے جس کے بعد بندہ اپنے کیے پر شرمندہ اور آیندہ کے لیے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجرم، کٹّے سے کٹّے کافر کے لیے بھی خدا کے ہاں مایوسی و ناامیدی کا کوئی موقع نہیں، بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف، اپنی نافرمانی پر نادم، اور بغاوت کی رَوِش چھوڑ کر اطاعت کی رَوِش اختیار کرنے کے لیے تیار ہو۔

۵۳ – اِس فقرے کا دوبارہ اعادہ معنیٰ خیز ہے۔ اُوپر کے فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمؑ نے توبہ کی اور اللہ نے قبول کرلی۔ اِس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ آدمؑ اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے۔ گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھوڈالا گیا۔ نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا، نہ ان کی نسل کے دامن پر اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذ اللہ! خدا کو اپنا اِکلوتا بھیج کر نوعِ انسانی کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے سُولی پر چڑھوانا پڑتا۔ برعکس اس کے اللہ نے آدم علیہ السلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہ فرمایا، بلکہ اس کے بعد انھیں نبوّت سے بھی سرفراز کیا، تاکہ وہ اپنی نسل کو سیدھا راستہ بتا کر جائیں۔ اب جو

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٣٩ ع

ع ۴

اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات[۵۴] کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں[۵۵] گے۔'' ع

جنت سے نکلنے کا حکم پھر دُہرایا گیا، تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مُقتضا نہ تھا کہ آدمؑ کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اُتارا جاتا۔ زمین ان کے لیے دارُ العذاب نہ تھی، وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں اُتارے گئے، بلکہ انھیں زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ جنّت اُن کی اصلی جائے قیام نہ تھی۔ وہاں سے نکلنے کا حکم اُن کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اصل تجویز تو ان کو زمین ہی پر اُتارنے کی تھی۔ البتہ اس سے پہلے اُن کو اُس امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا، جس کا ذکر اُوپر حاشیہ ۴۸ میں کیا جا چکا ہے۔

۵۴ – ایات جمع ہے آیت کی۔ آیت کے اصل معنٰی اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہی ہے۔ کہیں آثارِ کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے، کیونکہ مظاہرِ قدرت میں سے ہر چیز اُس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستُور ہے۔ کہیں اُن معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیا علیہم السلام لے کر آتے تھے، کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرماں روائے کائنات کے نمایندے ہیں۔ کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے، کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے، اس کے محض مضامین ہی میں نہیں، اس کے الفاظ اور اندازِ بیان اور طرزِ عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مُصنّف کی شخصیّت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں—— ہر جگہ عبارت کے سِیاق وسَباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں ''آیت'' کا لفظ کس معنٰی میں آیا ہے۔

۵۵ – یہ نسلِ انسانی کے حق میں ابتدائے آفرینش سے قیامت تک کے لیے اللہ کا مستقل فرمان ہے اور اسی کو تیسرے رُکوع میں اللہ کے ''عہد'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں ہے، بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دوگُونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامُور ہے کہ اُس راستے کی پیروی کرے جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے۔ اور اس راستے کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں: یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست اللہ کی طرف سے وحی آئے، یا پھر وہ اُس انسان کا اتباع کرے جس کے پاس وحی آئی ہو۔ کوئی تیسری صُورت یہ معلوم ہونے کی نہیں ہے کہ رب کی رضا کس راہ میں ہے۔ اِن دوصُورتوں کے ماسوا ہر صُورت غلط ہے، بلکہ غلط ہی نہیں، سراسر بغاوت بھی ہے، جس کی سزا جہنّم کے سوا اور کچھ نہیں۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ

اے بنی اسرائیل![56] ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی،

قرآنِ مجید میں آدمؑ کی پیدائش اور نوعِ انسانی کی ابتدا کا یہ قصہ سات مقامات پر آیا ہے، جن میں سے پہلا مقام یہ ہے اور باقی مقامات حسبِ ذیل ہیں: الاعراف، رکوع ۲- الحجر، رکوع ۳- بنی اسرائیل، رکوع ۷- الکہف، رکوع ۷- طٰہٰ، رکوع ۷-صٓ، رکوع ۵- بائبل کی کتابِ پیدائش، باب اوّل، دوم وسوم میں بھی یہ قصہ بیان ہوا ہے، لیکن دونوں کا مقابلہ کرنے سے ہر صاحبِ نظر انسان محسُوس کرسکتا ہے کہ دونوں کتابوں میں کیا فرق ہے۔ (بقیہ حاشیہ مُلاحظہ ہو صفحہ ۲۲۶ پر)۔

۵۶ – اسرائیل کے معنیٰ ہیں: عبداللہ یا بندۂ خدا۔ یہ حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا، جو اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ وہ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ انھی کی نسل کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ پچھلے چار رُکوعوں میں تمہیدی تقریر تھی، جس کا خطاب تمام انسانوں کی طرف عام تھا۔ اب یہاں سے چودھویں رکوع تک مسلسل ایک تقریر اِس قوم کو خطاب کرتے ہوئے چلتی ہے، جس میں کہیں کہیں عیسائیوں اور مشرکینِ عرب کی طرف بھی کلام کا رُخ پھر گیا ہے اور موقع موقع سے اُن لوگوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لائے تھے۔ اس تقریر کو پڑھتے ہوئے حسبِ ذیل باتوں کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیے:

اوّلاً، اِس کا منشا یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروںؑ کی اُمت میں جو تھوڑے بہت لوگ ابھی ایسے باقی ہیں جن میں خیر وصلاح کا عُنصر موجود ہے، انھیں اُس صداقت پر ایمان لانے اور اُس کام میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے جس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھائے گئے تھے۔ اس لیے ان کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ قرآن اور یہ نبیؐ وہی پیغام اور وہی کام لے کر آیا ہے جو اس سے پہلے تمھارے انبیاؑ اور تمھارے پاس آنے والے صحیفے لائے تھے۔ پہلے یہ چیز تم کو دی گئی تھی تاکہ تم آپ بھی اس پر چلو اور دنیا کو بھی اس کی طرف بُلانے اور اس پر چلانے کی کوشش کرو۔ مگر تم دنیا کی رہنمائی تو کیا کرتے، خود بھی اس ہدایت پر قائم نہ رہے اور بگڑتے چلے گئے۔ تمھاری تاریخ اور تمھاری قوم کی موجودہ اَخلاقی و دینی حالت خود تمھارے بگاڑ پر گواہ ہے۔ اب اللہ نے وہی چیز دے کر اپنے ایک بندے کو بھیجا ہے اور وہی خدمت اس کے سپرد کی ہے۔ یہ کوئی بیگانہ اور اجنبی چیز نہیں ہے، تمھاری اپنی چیز ہے۔ لہٰذا جانتے بُوجھتے حق کی مُخالفت نہ کرو، بلکہ اسے قبول کرلو۔ جو کام تمھارے کرنے کا تھا، مگر تم نے نہ کیا، اسے کرنے کے لیے جو دوسرے لوگ اُٹھے ہیں، ان کا ساتھ دو۔

ثانیاً، اس کا منشا عام یہودیوں پر حُجّت تمام کرنا اور صاف صاف ان کی دینی و اَخلاقی حالت کو کھول کر رکھ دینا ہے۔ ان پر ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہ وہی دین ہے جو تمھارے انبیاؑ لے کر آئے تھے۔ اُصولِ دین میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں قرآن کی تعلیم تورات کی تعلیم سے مختلف ہو۔ ان پر ثابت کیا جا رہا ہے کہ جو ہدایت تمھیں دی گئی تھی، اس کی پیروی کرنے میں، اور جو رہنمائی کا منصب تمھیں دیا گیا تھا، اس کا حق ادا کرنے میں تم بُری طرح ناکام ہوئے ہو۔ اس کے ثبوت

وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ۚ وَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ ۝۴۰

میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا اُسے تم پورا کرو، تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا اُسے میں پورا کروں، اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔

میں ایسے واقعات سے اِستشہاد کیا گیا ہے جن کی تردید وہ نہ کر سکتے تھے۔ پھر جس طرح حق کو حق جاننے کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں سازشوں، وسوسہ اندازیوں، کج بحثیوں اور مکّاریوں سے کام لے رہے تھے، اور جن ترکیبوں سے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن کامیاب نہ ہونے پائے، ان سب کی پردہ دری کی جارہی ہے، جس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی ظاہری مذہبیّت محض ایک ڈھونگ ہے، جس کے نیچے دیانت اور حق پرستی کے بجائے ہٹ دھرمی، جاہلانہ عصبیّت اور نفس پرستی کام کر رہی ہے اور حقیقت میں وہ یہ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ نیکی کا کوئی کام پھل پھول سکے۔ اِس طرح اِتمامِ حُجّت کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود اس قوم میں جو صالح عُنصر تھا، اس کی آنکھیں کُھل گئیں، دوسری طرف مدینے کے عوام پر اور بالعُموم مشرکینِ عرب پر ان لوگوں کا جو مذہبی و اخلاقی اثر تھا، وہ ختم ہو گیا، اور تیسری طرف خود اپنے آپ کو بے نقاب دیکھ کر ان کی ہمتیں اتنی پست ہو گئیں کہ وہ اُس جرأت کے ساتھ کبھی مقابلے میں کھڑے نہ ہو سکے جس کے ساتھ ایک وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے اپنے حق پر ہونے کا یقین ہو۔

ثالثاً، پچھلے چار رُکوعوں میں نوعِ انسانی کو دعوتِ عام دیتے ہوئے جو کچھ کہا گیا تھا، اسی کے سلسلے میں ایک خاص قوم کی معیّن مثال لے کر بتایا جا رہا ہے کہ جو قوم خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑتی ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس توضیح کے لیے تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا میں صرف یہی ایک قوم ہے جو مسلسل چار ہزار برس سے تمام اقوامِ عالَم کے سامنے ایک زندہ نمونۂ عبرت بنی ہوئی ہے۔ ہدایتِ الٰہی پر چلنے اور نہ چلنے سے جتنے نشیب و فراز کسی قوم کی زندگی میں رُونما ہو سکتے ہیں، وہ سب اس قوم کی عبرت ناک سرگزشت میں نظر آ جاتے ہیں۔

رابعاً، اس سے پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سبق دینا مقصُود ہے کہ وہ اس انحطاط کے گڑھے میں گرنے سے بچیں جس میں پچھلے انبیاؑ کے پیرو گر گئے۔ یہُودیوں کی اَخلاقی کمزوریوں، مذہبی غلط فہمیوں اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی نشان دہی کر کے اس کے بالمقابل دینِ حق کے مقتضیات بیان کیے گئے ہیں، تاکہ مسلمان اپنا راستہ صاف دیکھ سکیں اور غلط راہوں سے بچ کر چلیں۔ اس سلسلے میں یہود و نصاریٰ پر تنقید کرتے ہوئے قرآن جو کچھ کہتا ہے اس کو پڑھتے وقت مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد رکھنی چاہیے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ تم بھی آخر کار پچھلی اُمّتوں ہی کی روش پر چل کر رہو گے، حتّٰی کہ اگر وہ کسی گوہ کے بِل میں گُھسے ہیں، تو تم بھی اسی میں گُھسو گے۔ صحابہؓ نے پوچھا: یا رسولؐ اللہ! کیا یہُود و نصاریٰ مراد ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: اور کون؟ نبیِ اکرمؐ کا یہ ارشاد محض ایک توبیخ نہ تھا بلکہ اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے آپؐ یہ جانتے تھے کہ انبیاؑ کی اُمتوں میں بگاڑ کن کن راستوں سے آیا اور کن کن شکلوں میں ظہُور کرتا رہا ہے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ
بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا
تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور مَیں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اُس کتاب کی تائید میں ہے جو تمھارے پاس پہلے سے موجود تھی، لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو[۵۷] اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مُشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بُوجھتے حق کو چُھپانے کی کوشش کرو۔[۵۸]

۵۷ – تھوڑی قیمت سے مُراد وہ دُنیوی فائدے ہیں جن کی خاطر یہ لوگ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات کو رَد کر رہے تھے۔ حق فروشی کے معاوضے میں خواہ انسان دنیا بھر کی دولت لے لے، بہرحال وہ تھوڑی قیمت ہی ہے، کیونکہ حق یقیناً اس سے گراں تر چیز ہے۔

۵۸ – اِس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اہلِ عرب بالعُموم ناخواندہ لوگ تھے اور ان کے مقابلے میں یہودیوں کے اندر ویسے بھی تعلیم کا چرچا زیادہ تھا، اور انفرادی طور پر ان میں ایسے ایسے جلیل القدر عالم پائے جاتے تھے جن کی شُہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے عربوں پر یہودیوں کا علمی رُعب بہت زیادہ تھا۔ پھر ان کے علما اور مشائخ نے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان جما کر اور اپنی جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کا کاروبار چلا کر اس رُعب کو اور بھی زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا تھا۔ خُصوصیّت کے ساتھ اہلِ مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے، کیونکہ ان کے آس پاس بڑے بڑے یہودی قبائل آباد تھے، رات دن کا ان سے میل جول تھا، اور اس میل جول میں وہ ان سے اُسی طرح شدّت کے ساتھ متأثّر تھے جس طرح ایک اَن پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ متمدّن اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخُّص رکھنے والے ہمسایوں سے متأثّر ہوا کرتی ہے۔ ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی، تو قدرتی بات تھی کہ اَن پڑھ عرب اہلِ کتاب یہُودیوں سے جا کر پُوچھتے کہ آپ لوگ بھی ایک نبی کے پیرو ہیں اور ایک کتاب کو مانتے ہیں، آپ ہمیں بتائیں کہ یہ صاحب جو ہمارے اندر نبوّت کا دعویٰ لے کر اُٹھے ہیں، اِن کے متعلق اور ان کی تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ چنانچہ یہ سوال مکے کے لوگوں نے بھی یہودیوں سے بارہا کیا، اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی بکثرت لوگ یہُودی علما کے پاس جا جا کر یہی بات پوچھتے تھے۔ مگر ان علما نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ توحید، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، غلط ہے، یا انبیا اور کتبِ آسمانی اور ملائکہ اور آخرت

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾
اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ
الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ

نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو[۵۹]، اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں، ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔ تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟ صبر اور نماز سے[۶۰] مدد لو،

کے بارے میں جو کچھ آپؐ کہہ رہے ہیں، اس میں کوئی غَلَطی ہے، یا وہ اَخلاقی اُصول، جن کی آپؐ تعلیم دے رہے ہیں، ان میں سے کوئی چیز غلط ہے۔ لیکن وہ صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں، وہ صحیح ہے۔ وہ نہ سچّائی کی کُھلی کُھلی تردید کر سکتے تھے، نہ سیدھی طرح اس کو سچّائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انھوں نے طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ ہر سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، آپؐ کی جماعت کے خلاف، اور آپؐ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے، کوئی الزام آپؐ پر چسپاں کر دیتے تھے، کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے جس سے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں، اور طرح طرح کے اُلجھن میں ڈالنے والے سوالات چھیڑ دیتے تھے، تاکہ لوگ ان میں خود بھی اُلجھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیروؤں کو بھی الجھانے کی کوشش کریں۔ ان کا یہی رَوِیّہ تھا، جس کی بنا پر ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو، اپنے جھوٹے پروپیگنڈے اور شریرانہ شبہات و اعتراضات سے حق کو دبانے اور چُھپانے کی کوشش نہ کرو، اور حق و باطل کو خَلط مَلط کر کے دُنیا کو دھوکا نہ دو۔

۵۹ – نماز اور زکوٰۃ ہر زمانے میں دینِ اسلام کے اہم ترین ارکان رہے ہیں۔ تمام انبیاءؑ کی طرح انبیائے بنی اسرائیل نے بھی اس کی سخت تاکید کی تھی۔ مگر یہُودی ان سے غافل ہو چکے تھے۔ نمازِ باجماعت کا نظام ان کے ہاں تقریباً بالکل درہم برہم ہو چکا تھا۔ قوم کی اکثریت انفرادی نماز کی بھی تارک ہو چکی تھی، اور زکوٰۃ دینے کے بجائے یہ لوگ سُود کھانے لگے تھے۔

۶۰ – یعنی اگر تمھیں نیکی کے راستے پر چلنے میں دُشواری محسُوس ہوتی ہے تو اس دُشواری کا علاج صبر اور نماز ہے، ان دو چیزوں سے تمھیں وہ طاقت ملے گی جس سے یہ راہ آسان ہو جائے گی۔

صَبْر کے لُغوی معنٰی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اس سے مُراد ارادے کی وہ مضبوطی، عَزم کی وہ پختگی اور خواہشاتِ نفس کا وہ اِنضباط ہے، جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب و ضمیر کے

إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿٤٥﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم
مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿٤٦﴾ ع يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا
نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٤٧﴾
وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ
مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٨﴾

بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگر ان فرماں بردار بندوں کے لیے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انھیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔[۶۱] ع

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اُس نعمت کو، جس سے میں نے تمھیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی۔[۶۲] اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی، نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا، اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔[۶۳]

پسند کیے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔ ارشادِ الٰہی کا مدّعا یہ ہے کہ اس اَخلاقی صفت کو اپنے اندر پرورش کرو اور اس کو باہر سے طاقت پہنچانے کے لیے نماز کی پابندی کرو۔

۶۱ – یعنی جو شخص خدا کا فرماں بردار نہ ہو اور آخرت کا عقیدہ نہ رکھتا ہو، اس کے لیے تو نماز کی پابندی ایک ایسی مصیبت ہے جسے وہ کبھی گوارا ہی نہیں کر سکتا۔ مگر جو برضا و رغبت خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کر چکا ہو اور جسے یہ خیال ہو کہ کبھی مر کر اپنے خدا کے سامنے جانا بھی ہے، اس کے لیے نماز ادا کرنا نہیں، بلکہ نماز کا چھوڑنا مشکل ہے۔

۶۲ – یہ اُس دَور کی طرف اشارہ ہے جب کہ تمام دُنیا کی قوموں میں ایک بنی اسرائیل کی قوم ہی ایسی تھی جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علمِ حق تھا اور جسے اقوامِ عالم کا امام و رہنما بنا دیا گیا تھا، تاکہ وہ بندگیِ رب کے راستے پر سب قوموں کو بلائے اور چلائے۔

۶۳ – بنی اسرائیل کے بگاڑ کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آ گئی تھی۔ وہ اس قسم کے خیالاتِ خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاؑ کی اولاد ہیں، بڑے بڑے اولیا، صُلَحا اور زُہّاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو انھی بزرگوں کے صدقے میں ہو جائے گی، ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا

وَاِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ
يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ‌ؕ وَفِىۡ ذٰلِكُمۡ بَلَاۤءٌ مِّنۡ
رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ وَاَغۡرَقۡنَآ اٰلَ
فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰٓى اَرۡبَعِيۡنَ لَيۡلَةً
ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوۡنَا

یاد کرو[۶۴] وہ وقت، جب ہم نے تم کو فرعونیوں[۶۵] کی غلامی سے نجات بخشی ـــ اُنھوں نے تمھیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، تمھارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمھاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے، اور اس حالت میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمایش تھی[۶۶]۔

یاد کرو وہ وقت، جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمھارے لیے راستہ بنایا، پھر اس میں سے تمھیں بخیریت گزروا دیا، پھر وہیں تمھاری آنکھوں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کیا۔

یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ کو چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر بُلایا[۶۷]، تو اس کے پیچھے تم بچھڑے کو اپنا معبود[۶۸] بنا بیٹھے۔ اُس وقت تم نے بڑی زیادتی کی تھی، مگر اس پر بھی ہم نے تمھیں معاف

کیسے پا سکتا ہے۔ اِنھی جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکّر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے نعمت یاد دلانے کے ساتھ فوراً ہی ان کی اِن غلط فہمیوں کو دُور کیا گیا ہے۔

۶۴ - یہاں سے بعد کے کئی رکوعوں تک مسلسل جن واقعات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں، وہ سب بنی اسرائیل کی تاریخ کے مشہور ترین واقعات ہیں، جنھیں اس قوم کا بچّہ بچّہ جانتا تھا۔ اسی لیے تفصیل بیان کرنے کے بجائے ایک ایک واقعے کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس تاریخی بیان میں دراصل یہ دکھانا مقصود ہے کہ ایک طرف یہ اور یہ احسانات ہیں جو خدا نے تم پر کیے، اور دُوسری طرف یہ اور یہ کرتوت ہیں جو ان احسانات کے جواب میں تم کرتے رہے۔

۶۵ - "اٰلِ فِرۡعَوۡنَ" کا ترجمہ ہم نے اس لفظ سے کیا ہے۔ اس میں خاندانِ فراعِنہ اور مصر کا حکمراں طبقہ دونوں شامل ہیں۔

۶۶ - آزمایش اس امر کی کہ اس بھٹّی سے تم خالص سونا بن کر نکلتے ہو یا نری کھوٹ بن کر رہ جاتے ہو۔ اور آزمایش اس امر کی کہ اتنی بڑی مصیبت سے اس معجزانہ طریقے پر نجات پانے کے بعد بھی تم اللہ کے شکر گزار بندے بنتے ہو یا نہیں۔

۶۷ - مصر سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ گئے، تو حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے

عَنۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى
الۡكِتٰبَ وَالۡفُرۡقَانَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى
لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اِنَّكُمۡ ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ بِاتِّخَاذِكُمُ الۡعِجۡلَ
فَتُوۡبُوۡٓا اِلٰى بَارِئِكُمۡ فَاقۡتُلُوۡٓا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ عِنۡدَ
بَارِئِكُمۡ ؕ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۵۴﴾

کر دیا کہ شاید اب تم شکر گزار بنو۔

یاد کرو کہ (ٹھیک اُس وقت جب تم یہ ظلم کر رہے تھے) ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور فُرقان[۶۹] عطا کی، تاکہ تم اس کے ذریعے سے سیدھا راستہ پا سکو۔

یاد کرو جب موسیٰ (یہ نعمت لیے ہوئے پلٹا، تو اُس) نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اُوپر سخت ظلم کیا ہے، لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو،[۷۰] اسی میں تمھارے خالق کے نزدیک تمھاری بہتری ہے۔" اُس وقت تمھارے خالق نے تمھاری توبہ قبول کر لی، کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

چالیس شب و روز کے لیے کوہِ طور پر طلب فرمایا، تاکہ وہاں اس قوم کے لیے، جو اَب آزاد ہو چکی تھی، قوانینِ شریعت اور عملی زندگی کی ہدایات عطا کی جائیں۔ (ملاحظہ ہو: بائبل، کتابِ خُروج، باب ۲۴ تا ۳۱)

۶۸ – گائے اور بیل کی پرستش کا مرض بنی اسرائیل کی ہمسایہ اقوام میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ مصر اور کنعان میں اس کا عام رواج تھا۔ حضرت یوسفؑ کے بعد بنی اسرائیل جب انحطاط میں مبتلا ہوئے اور رفتہ رفتہ قبطیوں کے غلام بن گئے تو انھوں نے من جملہ اور امراض کے ایک یہ مرض بھی اپنے حکمرانوں سے لے لیا تھا۔ (بچھڑے کی پرستش کا یہ واقعہ بائبل کتابِ خُروج، باب ۳۲ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے)۔

۶۹ – فُرقان: وہ چیز جس کے ذریعے سے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہو۔ اُردو میں اس کے مفہوم سے قریب تر لفظ "کسوٹی" ہے۔ یہاں فُرقان سے مُراد دین کا وہ علم اور فہم ہے، جس سے آدمی حق اور باطل میں تمیز کرتا ہے۔

۷۰ – یعنی اپنے اُن آدمیوں کو قتل کرو جنھوں نے گوسالے کو معبود بنایا اور اس کی پرستش کی۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۵ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۵۶ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا

یاد کرو جب تم نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ ہم تمھارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے، جب تک کہ اپنی آنکھوں سے عَلانیَہ خدا کو (تم سے کلام کرتے) نہ دیکھ لیں۔ اس وقت تمھارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقے نے تم کو آلیا۔ تم بے جان ہو کر گر چکے تھے، مگر پھر ہم نے تم کو جِلا اُٹھایا، شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گزار بن جاؤ۔[۷۱]

ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا،[۷۲] مَن و سلویٰ کی غذا تمھارے لیے فراہم کی[۷۳] اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں، انھیں کھاؤ، مگر تمھارے اسلاف نے جو کچھ کیا، وہ ہم پر ظلم نہ تھا،

---

۷۱ – یہ اشارہ جس واقعے کی طرف ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس شبانہ روز کی قرار داد پر جب حضرت موسیٰؑ طُور پر تشریف لے گئے تھے، تو آپ کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے ستر نمایندے بھی لے کر آئیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فُرقان عطا کی، تو آپ نے اسے ان نمایندوں کے سامنے پیش کیا۔ اس موقع پر قرآن کہتا ہے کہ ان میں سے بعض شریر کہنے لگے کہ ہم محض تمھارے بیان پر کیسے مان لیں کہ خدا تم سے ہم کلام ہوا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور انھیں سزا دی گئی۔ لیکن بائبل کہتی ہے کہ:

> ''اور انھوں نے اسرائیل کے خدا کو دیکھا اور اس کے پاؤں کے نیچے نیلم کے پتھر کا چبوترا سا تھا، جو آسمان کی مانند شفاف تھا۔ اور اُس نے بنی اسرائیل کے شُرفا پر اپنا ہاتھ نہ بڑھایا۔ سو انھوں نے خدا کو دیکھا اور کھایا اور پیا۔'' (خُروج، باب ۲۴، آیت ۱۰-۱۱)

لُطف یہ ہے کہ اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے خدا سے عرض کیا کہ مجھے اپنا جلال دکھا دے، تو اُس نے فرمایا کہ تُو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ (دیکھو: خُروج، باب ۳۳، آیت ۱۸-۲۳)

۷۲ – یعنی جزیرہ نمائے سینا میں، جہاں دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ تمھیں میسّر نہ تھی، ہم نے ابر سے تمھارے بچاؤ کا انتظام کیا۔ اس موقع پر خیال رہے کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نکل کر آئے تھے

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ
الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا
وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾

بلکہ انھوں نے آپ اپنے ہی اوپر ظلم کیا۔

پھر یاد کرو جب ہم نے کہا تھا کہ "یہ بستی[۷۴]، جو تمھارے سامنے ہے، اس میں داخل ہو جاؤ، اس کی پیداوار، جس طرح چاہو، مزے سے کھاؤ، مگر بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہونا اور کہتے جانا: حِطَّۃٌ حِطَّۃٌ[۷۵]، ہم تمھاری خطاؤں سے درگزر کریں گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے۔"

اور سینا کے علاقے میں مکانات کا تو کیا ذکر، سر چھپانے کے لیے ان کے پاس خیمے تک نہ تھے۔ اُس زمانے میں اگر خدا کی طرف سے ایک مدت تک آسمان کو ابر آلود نہ رکھا جاتا، تو یہ قوم دُھوپ سے ہلاک ہو جاتی۔

۷۳ – مَنّ اور سَلْویٰ وہ قدرتی غذائیں تھیں جو اس مہاجرت کے زمانے میں اُن لوگوں کو چالیس برس تک مسلسل ملتی رہیں۔ مَنّ دھنیے کے بیج جیسی ایک چیز تھی، جو اوس کی طرح گرتی اور زمین پر جم جاتی تھی۔ اور سَلْویٰ بٹیر کی قسم کے پرندے تھے۔ خدا کے فضل سے ان کی اتنی کثرت تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم محض انھی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت نہ اُٹھانی پڑی، حالانکہ آج کسی نہایت متمدّن ملک میں بھی اگر چند لاکھ مہاجر یکایک آ پڑیں، تو اُن کی خوراک کا انتظام مشکل ہو جاتا ہے۔ (مَنّ اور سَلْویٰ کی تفصیلی کیفیت کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل، کتابِ خُروج، باب ۱۶۔ گنتی، باب ۱۱، آیت ۷-۹ و ۳۱، ۳۲ و یشوع، باب ۵- آیت ۱۲)

۷۴ – یہ ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکا ہے کہ اس بستی سے مُراد کون سی بستی ہے۔ جس سلسلۂ واقعات میں یہ ذکر ہو رہا ہے، وہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے، جب کہ بنی اسرائیل ابھی جزیرہ نمائے سینا ہی میں تھے۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ یہ اسی جزیرہ نما کا کوئی شہر ہوگا۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اِس سے مُراد شِطّیم ہو، جو یَرِیحُو کے بالمقابل دریائے اُردُن کے مشرقی کنارے پر آباد تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ اس شہر کو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے اخیر زمانے میں فتح کیا اور وہاں بڑی بدکاریاں کیں، جن کے نتیجے میں خدا نے ان پر وبا بھیجی اور ۲۴ ہزار آدمی ہلاک کر دیے۔ (گنتی - باب ۲۵، آیت ۱-۸)

۷۵ – یعنی حکم یہ تھا کہ جابر و ظالم فاتحوں کی طرح اکڑتے ہوئے نہ گھسنا، بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ شان سے داخل ہونا، جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتحِ مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے۔ اور حِطَّۃٌ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جانا، دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتلِ عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگزر اور

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ع ۵۹ وَاِذِ
اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا
وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۶۰ وَ
اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ
يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَ

مگر جو بات کہی گئی تھی، ظالموں نے اُسے بدل کر کچھ اَور کر دیا۔ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ سزا تھی اُن نافرمانیوں کی، جو وہ کر رہے تھے۔ ع

یاد کرو، جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دُعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو۔ چنانچہ اس سے بارہ چشمے پُھوٹ[۷۶] نکلے اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔ اُس وقت یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو، اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔

یاد کرو، جب تم نے کہا تھا کہ "اے موسیٰؑ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار، ساگ، ترکاری، کھیرا، ککڑی، گیہوں، لہسن،

عام معافی کا اعلان کرتے جانا۔

۷۶ – وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیّاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اس میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ۱۲ چشموں میں یہ مصلحت تھی کہ بنی اسرائیل کے قبیلے بھی ۱۲ ہی تھے۔ خدا نے ہر ایک قبیلے کے لیے الگ چشمہ نکال دیا تاکہ ان کے درمیان پانی پر جھگڑا نہ ہو۔

عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ
هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ
عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ
الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع

پیاز، دال وغیرہ پیدا کرے۔" تو موسیٰؑ نے کہا: "کیا ایک بہتر چیز کے بجائے تم ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو؟[۷۷] اچھا، کسی شہری آبادی میں جا رہو۔ جو کچھ تم مانگتے ہو، وہاں مل جائے گا۔" آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلّت و خواری اور پستی و بدحالی اُن پر مسلّط ہوگئی اور وہ اللہ کے غضب میں گِھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اِس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے[۷۸] لگے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے[۷۹] لگے۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ حُدودِ شرع سے نکل نکل جاتے تھے۔ ع

۷۷ – یہ مطلب نہیں ہے کہ مَنّ و سلویٰ چھوڑ کر، جو بے مشقّت مل رہا ہے، وہ چیزیں مانگ رہے ہو جن کے لیے کھیتی باڑی کرنی پڑے گی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس بڑے مقصد کے لیے یہ صحرا نوَردی تم سے کرائی جا رہی ہے، اس کے مقابلے میں کیا تم کو کام و دَہن کی لذّت اتنی مرغوب ہے کہ اُس مقصد کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو اور ان چیزوں سے محرومی کچھ مدّت کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے؟ (تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: گنتی، باب ۱۱، آیت ۴-۹)

۷۸ – آیات سے کفر کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً، ایک یہ کہ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات میں سے جو بات اپنے خیالات یا خواہشات کے خلاف پائی، اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو یہ جانتے ہوئے کہ خدا نے فرمائی ہے، پوری ڈِھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکمِ الٰہی کی کچھ پروا نہ کی۔ تیسرے یہ کہ ارشادِ الٰہی کے مطلب و مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالا۔

۷۹ – بنی اسرائیل نے اپنے اِس جُرم کو اپنی تاریخ میں خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم بائبل سے چند واقعات یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) حضرت سلیمانؑ کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں (یروشلم کی دولتِ یہودیہ اور سامریہ کی دولتِ اسرائیل) میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آئی کہ یہودیہ کی ریاست نے

اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دِمشق کی ارامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرماں روا آسا کو سخت تنبیہ کی۔ مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔ (۲-تواریخ، باب ۱۶، آیت ۷-۱۰)

(۲) حضرت الیاس (اِیلیّاہ Elliah) علیہ السّلام نے جب بَعل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اور از سرِنَو توحید کی دعوت کا صُور پھونکنا شروع کیا تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اَخی اَب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کی جان کے پیچھے پڑ گیا، حتّٰی کہ انھیں جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ اس موقع پر جو دُعا حضرت الیاسؑ نے مانگی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

”بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا...... تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں، سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔“ (۱-سلاطین، باب ۱۹، آیت ۱۰)

(۳) ایک اور نبی حضرت مِیکایاہ کو اسی اَخی اَب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔ (۱-سلاطین، باب ۲۲، آیت ۲۶-۲۷)

(۴) پھر جب یہُودیہ کی ریاست میں عَلانِیَہ بُت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریاہ نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی، تو شاہِ یہُوداہ یوآس کے حکم سے انھیں عین ہیکلِ سلیمانی میں ”مَقدِس“ اور ”قربان گاہ“ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔ (۲-تواریخ، باب ۲۴، آیت ۲۱)

(۵) اس کے بعد جب سامریہ کی اسرائیلی ریاست اَشُوریوں کے ہاتھوں ختم ہو چکی اور یروشلم کی یہودی ریاست کے سر پر تباہی کا طوفان تُلا کھڑا تھا، تو ”یرمیاہ“ نبی اپنی قوم کے زوال پر ماتم کرنے اُٹھے اور کُوچے کُوچے انھوں نے پکارنا شروع کیا کہ سنبھل جاؤ، ورنہ تمھارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہوگا۔ مگر قوم کی طرف سے جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ ہر طرف سے ان پر لعنت اور پھٹکار کی بارش ہوئی، پیٹے گئے، قید کیے گئے، رسّی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیے گئے، تاکہ بھوک اور پیاس سے وہیں سوکھ سوکھ کر مر جائیں، اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ قوم کے غدّار ہیں، بیرونی دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں۔ (یرمیاہ، باب ۱۵، آیت ۱۰- باب ۱۸، آیت ۲۰-۲۳- باب ۲۰، آیت ۱-۱۸- باب ۳۶ تا باب ۴۰)

(۶) ایک اور نبی حضرت عاموس کے متعلق لکھا ہے کہ جب انھوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان حرکات کے بُرے انجام سے خبردار کیا، تو انھیں نوٹس دیا گیا کہ ملک سے نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوّت کرو۔ (عاموس، باب ۷، آیت ۱۰-۱۳)

(۷) حضرت یحییٰ (یُوحَنّا) علیہ السّلام نے جب ان بد اخلاقیوں کے خلاف آواز اُٹھائی جو یہودیہ کے فرماں روا ہیرودیس کے دربار میں کُھلّم کُھلّا ہو رہی تھیں، تو پہلے وہ قید کیے گئے، پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا۔ (مَرقس، باب ۶، آیت ۱۷-۲۹)

(۸) آخر میں حضرت عیسیٰؑ پر بنی اسرائیل کے علما اور سردارانِ قوم کا غصّہ بھڑکا، کیونکہ وہ انھیں ان کے گناہوں اور ان کی ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے اور ایمان و راستی کی تلقین کرتے تھے۔ اس قُصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا، رومی

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

یقین جانو کہ نبیِ عربیؐ کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اُس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔[۸۰]

عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ حاصل کیا گیا اور جب رومی حاکم پیلاطُس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمھاری خاطر یسُوع اور برابّا ڈاکو، دونوں میں سے کس کو رہا کروں، تو ان کے پُورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ برابّا کو چھوڑ دے اور یسُوع کو پھانسی پر لٹکا۔ (متّی، باب ۲۷۔ آیت ۲۰ تا ۲۶)

یہ ہے اس قوم کی داستانِ جرائم کا ایک نہایت شرم ناک باب جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں مختصراً اشارہ کیا گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس قوم نے اپنے فُسّاق و فُجّار کو سرداری و سربراہ کاری کے لیے اور اپنے صُلَحا و اَبرار کو جیل اور دار کے لیے پسند کیا ہو، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی لعنت کے لیے پسند نہ کرتا تو آخر اور کیا کرتا؟

۸۰ – سلسلۂ عبارت کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی تفصیلات بیان کرنا مقصُود نہیں ہے کہ کن کن باتوں کو آدمی مانے اور کیا کیا اعمال کرے تو خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہو۔ یہ چیزیں اپنے اپنے موقع پر تفصیل کے ساتھ آئیں گی۔ یہاں تو یہُودیوں کے اِس زَعْم باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ صرف یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے تھے۔ وہ اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ ان کے گروہ سے اللہ کا کوئی خاص رشتہ ہے جو دُوسرے انسانوں سے نہیں ہے، لہٰذا جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے وہ خواہ اعمال اور عقائد کے لحاظ سے کیسا ہی ہو، بہرحال نجات اس کے لیے مقدّر ہے، اور باقی تمام انسان، جو ان کے گروہ سے باہر ہیں، وہ صرف جہنّم کا ایندھن بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے ہاں اصل چیز تمھاری یہ گروہ بندیاں نہیں ہیں، بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے، وہ ایمان اور عملِ صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر حاضر ہوگا، وہ اپنے رب سے اپنا اجر پائے گا۔ خدا کے ہاں فیصلہ آدمی کی صفات پر ہوگا نہ کہ تمھاری مردم شماری کے رجسٹروں پر۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ
اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ
تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ
لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ
فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾ۚ فَجَعَلْنٰهَا

یاد کرو وہ وقت، جب ہم نے طُور کو تم پر اُٹھا کر تم سے پختہ عہد لیا تھا اور کہا تھا[۸۱] کہ ''جو کتاب ہم تمھیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامنا اور جو احکام و ہدایات اس میں درج ہیں انھیں یاد رکھنا۔ اسی ذریعے سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم تقویٰ کی روش پر چل سکو گے۔'' مگر اس کے بعد تم اپنے عہد سے پھر گئے۔ اس پر بھی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت نے تمھارا ساتھ نہ چھوڑا، ورنہ تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔

پھر تمھیں اپنی قوم کے اُن لوگوں کا قصّہ تو معلوم ہی ہے جنھوں نے سَبْت[۸۲] کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انھیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دُھتکار پھٹکار پڑے[۸۳]۔ اس طرح ہم نے

---

۸۱ – اس واقعے کو قرآن میں مختلف مقامات پر جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل میں یہ ایک مشہور و معرُوف واقعہ تھا۔ لیکن اب اس کی تفصیلی کیفیت معلوم کرنا مشکل ہے۔ بس مجملاً یوں سمجھنا چاہیے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورتِ حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آ پڑے گا۔ ایسا ہی کچھ نقشہ سورۂ اعراف، آیت ۱۷۱ میں کھینچا گیا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، حاشیہ ۱۳۲)

۸۲ – سَبْت، یعنی ہفتے کا دن۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتے کو آرام اور عبادت کے لیے مخصوص رکھیں۔ اس روز کسی قسم کا دُنیوی کام، حتّٰی کہ کھانا پکانے کا کام بھی نہ خود کریں، نہ اپنے خادموں سے لیں۔ اس باب میں یہاں تک تاکیدی احکام تھے کہ جو شخص اس مقدس دن کی حُرمت کو توڑے، وہ واجب القتل ہے۔ (مُلاحظہ ہو: خُروج، باب ۳۱، آیت ۱۲–۱۷) لیکن جب بنی اسرائیل پر اَخلاقی و دینی انحطاط کا دَور آیا تو وہ علی الاعلان سَبْت کی

نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَإِذْ
قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا
اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ
لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌ ۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ

اُن کے انجام کو اُس زمانے کے لوگوں اور بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے عبرت اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت بنا کر چھوڑا۔

پھر وہ واقعہ یاد کرو، جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے: کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسیٰؑ نے کہا: میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے: اچھا، اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔ موسیٰؑ نے کہا: اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو، نہ بچھیا، بلکہ اوسط عمر کی ہو۔ لہٰذا جو حکم دیا جاتا ہے، اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے: اپنے رب سے یہ اور پُوچھ دو کہ اُس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰؑ نے کہا: وہ فرماتا ہے

بے حُرمتی کرنے لگے، حتّٰی کہ اُن کے شہروں میں کُھلے بندوں سَبت کے روز تجارت ہونے لگی۔

۸۳ – اس واقعے کی تفصیل آگے سورۂ اعراف، رُکوع ۲۱ میں آتی ہے۔ ان کے بندر بنائے جانے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی اور بعض اس کے یہ معنٰی لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور اندازِ بیان سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اَخلاقی نہیں بلکہ جسمانی تھا۔ میرے نزدیک قرینِ قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہٖ اسی حال پر رہنے دیے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہو گئے ہوں گے۔

اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا
ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ
وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا
ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ
قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع وَاِذْ
قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾

زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے، جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے: اپنے رب سے صاف صاف پُوچھ کر بتاؤ کیسی گائے مطلوب ہے، ہمیں اس کی تعیین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔ اللہ نے چاہا، تو ہم اس کا پتا پالیں گے۔ موسیٰؑ نے جواب دیا: اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی، نہ زمین جوتتی ہے نہ پانی کھینچتی ہے، صحیح سالم اور بے داغ ہے۔ اس پر وہ پُکار اُٹھے کہ ہاں، اب تم نے ٹھیک پتا بتایا ہے۔ پھر انھوں نے اسے ذبح کیا، ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔[۸۴] ع

اور تمھیں یاد ہے وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی، پھر اس کے بارے میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام تھوپنے لگے تھے اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چُھپاتے ہو، اسے کھول کر رکھ دے گا۔

۸۴ – چونکہ ان لوگوں کو اپنی ہمسایہ قوموں سے گائے کی عظمت و تقدیس اور گاؤ پرستی کے مرض کی چُھوت لگ گئی تھی، اس لیے ان کو حکم دیا گیا کہ گائے ذبح کریں۔ ان کے ایمان کا امتحان ہی اسی طرح ہو سکتا تھا کہ اگر وہ واقعی اب خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے، تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس بت کو معبود سمجھتے رہے ہیں، اُسے اپنے ہاتھ سے توڑیں۔ یہ امتحان بہت کڑا امتحان تھا۔ دلوں میں پُوری طرح ایمان اُترا ہوا نہ تھا، اس لیے اُنھوں نے ٹالنے کی کوشش کی اور تفصیلات پوچھنے لگے۔ مگر جتنی جتنی تفصیلات وہ پوچھتے گئے، اتنے ہی گِھرتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخرِ کار اسی خاص قسم کی سنہری گائے پر، جسے اس زمانے میں پرستش کے لیے مختص کیا جاتا تھا، گویا انگلی رکھ کر بتا دیا گیا کہ اسے ذبح کرو۔ بائبل میں بھی اس واقعے

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ
كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ
الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا
لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

اُس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے ایک حصّے سے ضرب لگاؤ۔ دیکھو، اس طرح اللہ مُردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو[۸۵]۔ مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی آخر کار تمھارے دل سخت ہوگئے، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے، کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پُھوٹ بہتے ہیں، کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے، اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔ اللہ تمھارے کرتُوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔

کی طرف اشارہ ہے، مگر وہاں یہ ذکر نہیں ہے کہ بنی اسرائیل نے اس حکم کو کس کس طرح ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ (مُلاحظہ ہو: گنتی، باب ۱۹، آیت ۱-۱۰)

۸۵ – اِس مقام پر یہ بات تو بالکل صریح معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لیے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتا بتا دے۔ لیکن اس غَرَض کے لیے جو تدبیر بتائی گئی تھی، یعنی ''لاش کو اس کے ایک حصّے سے ضرب لگاؤ''، اس کے الفاظ میں کچھ اِبہام محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مُفسّرین نے بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اُوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح گویا بیک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک، یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انھیں دکھایا گیا۔ دُوسرے، یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبُودیت پر بھی ایک کاری ضرب لگی کہ اس نام نہاد معبُود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی، تو اسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہو جانی چاہیے تھی، نہ کہ اس کا ذبح ہونا اُلٹا مفید ثابت ہو۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٥﴾

اے مسلمانو! اب کیا اِن لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمھاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟[86] حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سُنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف[87] کی۔

۸۶ – یہ خطاب مدینے کے اُن نومسلموں سے ہے جو قریب کے زمانے ہی میں نبیِ عَرَبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ ان لوگوں کے کان میں پہلے سے نبوّت، کتاب، ملائکہ، آخرت، شریعت وغیرہ کی جو باتیں پڑی ہوئی تھیں، وہ سب انھوں نے اپنے ہمسایہ یہودیوں ہی سے سنی تھیں۔ اور یہ بھی انھوں نے یہودیوں ہی سے سنا تھا کہ دُنیا میں ایک پیغمبر اور آنے والے ہیں، اور یہ کہ جو لوگ ان کا ساتھ دیں گے وہ ساری دُنیا پر چھا جائیں گے۔ یہی معلومات تھیں جن کی بنا پر اہلِ مدینہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا سن کر آپؐ کی طرف خود متوجہ ہوئے اور جُوق در جُوق ایمان لائے۔ اب وہ متوقع تھے کہ جو لوگ پہلے ہی سے انبیا اور کُتُبِ آسمانی کے پیرو ہیں اور جن کی دی ہوئی خبروں کی بدولت ہی ہم کو نعمتِ ایمان میسر ہوئی ہے، وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے، بلکہ اس راہ میں پیش پیش ہوں گے۔ چنانچہ یہی توقعات لے کر یہ پُرجوش نومسلم اپنے یہودی دوستوں اور ہمسایوں کے پاس جاتے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ پھر جب وہ اس دعوت کا جواب انکار سے دیتے تو منافقین اور مخالفینِ اسلام اس سے یہ اِستِدلال کرتے تھے کہ معاملہ کچھ مُشتبَہ ہی معلوم ہوتا ہے، ورنہ اگر یہ واقعی نبی ہوتے تو آخر کیسے ممکن تھا کہ اہلِ کتاب کے علما اور مشائخ اور مقدس بزرگ جانتے بُوجھتے ایمان لانے سے منہ موڑتے اور خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کر لیتے۔ اِس بنا پر بنی اسرائیل کی تاریخی سرگزشت بیان کرنے کے بعد اب ان سادہ دل مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی سابق رِوایات یہ کچھ رہی ہیں، ان سے تم کچھ بہت زیادہ لمبی چوڑی توقعات نہ رکھو، ورنہ جب ان کے پتھر دلوں سے تمھاری دعوتِ حق ٹکرا کر واپس آئے گی، تو دل شکستہ ہو جاؤ گے۔ یہ لوگ تو صدیوں کے بگڑے ہوئے ہیں۔ اللہ کی جن آیات کو سُن کر تم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، انھی سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ان کی نسلیں بیت گئی ہیں۔ دینِ حق کو مسخ کر کے یہ اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال چکے ہیں اور اسی مسخ شدہ دین سے یہ نجات کی اُمیدیں باندھے بیٹھے ہیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ حق کی آواز بلند ہوتے ہی یہ ہر طرف سے دَوڑے چلے آئیں گے۔

۸۷ – ''ایک گروہ'' سے مُراد ان کے علما اور حاملینِ شریعت ہیں۔ ''کلام اللہ'' سے مراد تورات، زبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو ان کے انبیاؑ کے ذریعے سے پہنچیں۔ ''تحریف'' کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اصل معنٰی و مفہُوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنٰی پہنا دینا، جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ نیز الفاظ میں تغیُّر و تبدُّل کرنے کو بھی تحریف کہتے ہیں — علمائے بنی اسرائیل نے یہ دونوں طرح کی تحریفیں کلام الٰہی میں کی ہیں۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعۡضُهُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ
قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَهُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیۡکُمۡ لِیُحَآجُّوۡکُمۡ بِهٖ عِنۡدَ
رَبِّکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۶﴾ اَوَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ
وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۷﴾ وَ مِنۡهُمۡ اُمِّیُّوۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡکِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَ
اِنۡ هُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ ﴿۷۸﴾ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡهِمۡ ٭ ق النصف

(محمدؐ رسول اللہ پر) ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انھیں مانتے ہیں، اور جب آپس میں ایک دُوسرے سے تخلیے کی بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ بے وقوف ہو گئے ہو؟ اِن لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں، تاکہ تمھارے رب کے پاس تمھارے مقابلے میں انھیں حُجّت میں پیش کریں؟[۸۸] —— اور کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے؟ —— ان میں ایک دُوسرا گروہ اُمّیوں کا ہے، جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں، بس اپنی بے بُنیاد اُمّیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔[۸۹] پس ہلاکت اور تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوِشتہ لکھتے ہیں،

۸۸ - یعنی وہ آپس میں ایک دُوسرے سے کہتے تھے کہ تورات اور دیگر کُتُبِ آسمانی میں جو پیشین گوئیاں اِس نبی کے متعلق موجود ہیں، یا جو آیات اور تعلیمات ہماری مقدّس کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے ہماری موجودہ رَوِش پر گرفت ہو سکتی ہے، انھیں مسلمانوں کے سامنے بیان نہ کرو، ورنہ یہ تمھارے رب کے سامنے ان کو تمھارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے۔ یہ تھا اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فسادِ عقیدہ کا حال۔ گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر دُنیا میں وہ اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چُھپا لے گئے، تو آخرت میں ان پر مقدّمہ نہ چل سکے گا۔ اِسی لیے بعد کے جُملۂ معترضہ میں ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا تم اللہ کو بے خبر سمجھتے ہو۔

۸۹ - یہ ان کے عوام کا حال تھا۔ علمِ کتاب سے کورے تھے۔ کچھ نہ جانتے تھے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں دین کے کیا اُصُول بتائے ہیں، اَخلاق اور شرع کے کیا قواعد سکھائے ہیں، اور انسان کی فلاح و خُسران کا مدار کن چیزوں پر رکھا ہے۔ اس علم کے بغیر وہ اپنے مفروضات اور اپنی خواہشات کے مطابق گھڑی ہوئی باتوں کو دین سمجھے بیٹھے تھے اور

ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ
فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿٧٩﴾ وَ
قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۖ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ
عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ

پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے، تا کہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کرلیں[90]۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجبِ ہلاکت۔ وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھُونے والی نہیں اِلّا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے[91]۔ اِن سے پوچھو: کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے، جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا؟ یا بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ذمّے ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمھیں علم نہیں ہے کہ اُس نے ان کا ذمہ لیا ہے؟ آخر تمھیں دوزخ کی آگ کیوں نہ چھُوئے گی؟ جو بھی بدی کمائے گا اور اپنی خطا کاری کے چکّر میں پڑا رہے گا،

جھوٹی توقّعات پر جی رہے تھے۔

۹۰ – یہ اُن کے علما کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کلامِ الٰہی کے معانی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو، بلکہ یہ بھی کیا کہ بائبل میں اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اَوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو، اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلامِ الٰہی کے ساتھ خَلَط مَلَط کر دیا، اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی افسانہ، ہر مُفسّر کی تاویل، ہر مُتکلّم کا الٰہیاتی عقیدہ، اور ہر فقیہ کا قانونی اجتہاد، جس نے مجموعۂ کُتُبِ مقدسہ (بائبل) میں جگہ پالی، اللہ کا قول (word of God) بن کر رہ گیا۔ اُس پر ایمان لانا فرض ہو گیا اور اس سے پھِرنے کے معنی دین سے پھر جانے کے ہو گئے۔

۹۱ – یہ یہودیوں کی عام غلط فہمی کا بیان ہے، جس میں ان کے عامی اور عالم سب مُبتلا تھے۔ وہ

فَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا
خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۲﴾ ع وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ لَا
تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِى الۡقُرۡبٰى
وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ
مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۸۳﴾ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ
وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ
وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ

ع

وہ دوزخی ہے اور دوزخ ہی میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے، وہی جنّتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ع

یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتے داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا، مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔ پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔ مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو

سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کچھ کریں، بہرحال چونکہ ہم یہودی ہیں، لہٰذا جہنّم کی آگ ہم پر حرام ہے، اور بالفرض اگر ہم کو سزا دی بھی گئی، تو بس چند روز کے لیے وہاں بھیجے جائیں گے اور پھر سیدھے جنت کی طرف پلٹا دیے جائیں گے۔

اَنۡفُسَكُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ
عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ؕ وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ
مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ
بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ
الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا بِالۡاٰخِرَةِ

قتل کرتے ہو، اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو، ظلم و زیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو، اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمھارے پاس آتے ہیں، تو ان کی رہائی کے لیے فدیے کا لین دین کرتے ہو، حالانکہ انھیں ان کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصّے پر ایمان لاتے ہو اور دُوسرے حصّے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟[۹۲] پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دُنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے، جو تم کر رہے ہو — یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت بیچ کر دُنیا کی زندگی خرید لی ہے،

۹۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے مدینے کے اطراف کے یہودی قبائل نے اپنے ہمسایہ عرب قبیلوں (اَوس اور خَزرَج) سے حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ جب ایک عرب قبیلہ دُوسرے قبیلے سے برسرِ جنگ ہوتا، تو دونوں کے حلیف یہودی قبیلے بھی اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور ایک دُوسرے کے مقابلے میں نبرد آزما ہو جاتے تھے۔ یہ فعل صریح طور پر کتاب اللہ کے خلاف تھا اور وہ جانتے بُوجھتے کتاب اللہ کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ مگر لڑائی کے بعد جب ایک یہودی قبیلے کے اسیرانِ جنگ دُوسرے یہودی قبیلے کے ہاتھ آتے تھے، تو غالب قبیلہ فدیہ لے کر انھیں چھوڑتا اور مغلوب قبیلہ فدیہ دے کر انھیں چھڑاتا تھا، اور اس فدیے کے لین دین کو جائز ٹھیرانے کے لیے کتاب اللہ سے اِستدلال کیا جاتا تھا۔ گویا وہ کتاب اللہ کی اِس اجازت کو تو سر آنکھوں پر رکھتے تھے کہ اسیرانِ جنگ

ع
فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ
مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ
بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا
تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ
فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

لہٰذا نہ اِن کی سزا میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ انھیں کوئی مدد پہنچ سکے گی۔ ع

ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی، اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے، آخر کار عیسیٰؑ ابنِ مریم کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور رُوحِ پاک سے اس کی مدد کی[۹۳]۔ پھر یہ تمھارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمھاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمھارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی ہی کی، کسی کو جُھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا! ـــــ وہ کہتے ہیں: ہمارے دل محفوظ ہیں[۹۴]۔ نہیں، اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے، اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ـــــ اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے، اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟

کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے، مگر اس حکم کو ٹھکرا دیتے تھے کہ آپس میں جنگ ہی نہ کی جائے۔

۹۳ - ''رُوحِ پاک'' سے مراد علمِ وحی بھی ہے، اور جبریلؑ بھی جو وحی کا علم رکھتے تھے، اور خود حضرت مسیحؑ کی اپنی پاکیزہ رُوح بھی، جس کو اللہ نے قُدسی صفات بنایا تھا۔ ''روشن نشانیوں'' سے مُراد وہ کُھلی کُھلی علامات ہیں، جنھیں دیکھ کر ہر صداقت پسند طالبِ حق انسان یہ جان سکتا تھا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔

۹۴ - یعنی ہم اپنے عقیدہ وخیال میں اتنے پختہ ہیں کہ تم خواہ کچھ کہو، ہمارے دلوں پر تمھاری بات کا اثر نہ ہوگا۔ یہ وہی بات ہے جو تمام ایسے ہٹ دھرم لوگ کہا کرتے ہیں جن کے دل ودماغ پر جاہلانہ تعصّب کا تسلّط ہوتا ہے۔ وہ اسے عقیدے کی مضبوطی کا نام دے کر ایک خوبی شمار کرتے ہیں، حالانکہ اس سے بڑھ کر آدمی کے لیے کوئی عیب نہیں ہے کہ وہ

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ

باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نُصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز آگئی، جسے وہ پہچان بھی گئے، تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا[۹۵]۔ خدا کی لعنت ان مُنکرین پر، کیسا برا ذریعہ ہے جس سے یہ اپنے نفس کی تسلّی حاصل کرتے ہیں[۹۶] کہ جو ہدایت اللہ نے

اپنے موروثی عقائد و افکار پر جم جانے کا فیصلہ کر لے، خواہ ان کا غلط ہونا کیسے ہی قوی دلائل سے ثابت کر دیا جائے۔

۹۵ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی بے چینی کے ساتھ اُس نبی کے منتظر تھے جس کی بِعثت کی پیشین گوئیاں ان کے انبیاؑ نے کی تھیں۔ دُعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عُروج کا دَور شروع ہو۔ خود اہلِ مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بِعثتِ محمدؐی سے پہلے یہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی اُمّید پر جیا کرتے تھے اور ان کا آئے دن کا تکیۂ کلام یہی تھا کہ ''اچھا، اب تو جس جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کر لے، جب وہ نبی آئے گا تو ہم ان سب ظالموں کو دیکھ لیں گے۔'' اہلِ مدینہ یہ باتیں سُنے ہوئے تھے، اسی لیے جب انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا، کہیں یہ یہودی تم سے بازی نہ لے جائیں۔ چلو، پہلے ہم ہی اس نبی پر ایمان لے آئیں۔ مگر ان کے لیے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی، جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گِن رہے تھے، اس کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالف بن گئے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ''وہ اس کو پہچان بھی گئے''، تو اس کے متعدّد ثبوت اُسی زمانے میں مل گئے تھے۔ سب سے زیادہ معتبر شہادت اُمّ المؤمنین حضرت صَفِیّہؓ کی ہے، جو خود ایک بڑے یہودی عالم کی بیٹی اور ایک دُوسرے عالم کی بھتیجی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو میرے باپ اور چچا دونوں آپؐ سے ملنے گئے۔ بڑی دیر تک آپؐ سے گفتگو کی۔ پھر جب گھر واپس آئے، تو میں نے اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ گفتگو کرتے سنا:

چچا: کیا واقعی یہ وہی نبی ہے جس کی خبریں ہماری کتابوں میں دی گئی ہیں؟

والد: خدا کی قسم! ہاں۔

چچا: کیا تم کو اس کا یقین ہے؟

بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ
فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَ اِذَا
قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۭ قُلْ فَلِمَ
تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ

نازل کی ہے، اس کو قبول کرنے سے صرف اِس ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو خود چاہا، نواز دیا[۹۷]! لہٰذا اب یہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں، اور ایسے کافروں کے لیے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔

جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ، تو وہ کہتے ہیں: ''ہم تو صرف اُس چیز پر ایمان لاتے ہیں، جو ہمارے ہاں (یعنی نسلِ اسرائیل میں) اُتری ہے۔'' اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے، اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ حق ہے اور اُس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ اچھا، ان سے کہو: اگر تم اُس تعلیم ہی پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمھارے ہاں آئی تھی، تو اس سے پہلے اللہ کے اُن پیغمبروںؑ کو (جو خود بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے) کیوں قتل کرتے رہے؟

والد: ہاں۔

چچا: پھر کیا ارادہ ہے؟

والد: جب تک جان میں جان ہے، اس کی مُخالفت کروں گا اور اس کی بات چلنے نہ دوں گا۔

(ابنِ ہِشام، جلد دوم، صفحہ ۱۶۵، طبع جدید)

۹۶ – اِس آیت کا دُوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: ''کیسی بُری چیز ہے، جس کی خاطر انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا''، یعنی اپنی فلاح و سعادت اور اپنی نجات کو قربان کر دیا۔

جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ
خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَ
اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ
اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ
الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ

تمھارے پاس موسیٰؑ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آیا۔ پھر بھی تم ایسے ظالم تھے کہ اس کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ پھر ذرا اُس میثاق کو یاد کرو، جو طُور کو تمھارے اوپر اُٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں، ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو۔ تمھارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سُن لیا، مگر مانیں گے نہیں۔ اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہُوا تھا۔ کہو: اگر تم مومن ہو، تو یہ عجیب ایمان ہے جو ایسی بُری حرکات کا تمھیں حکم دیتا ہے۔

اِن سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے ہی لیے مخصوص ہے، تب تو تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو،[۹۸] اگر تم اپنے اس خیال میں سچّے ہو — یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے، اس لیے کہ اپنے ہاتھوں جو کچھ کما کر انھوں نے وہاں بھیجا ہے، اس کا اقتضا یہی ہے

۹۷ - یہ لوگ چاہتے تھے کہ آنے والا نبی ان کی قوم میں پیدا ہو۔ مگر جب وہ ایک دُوسری قوم میں پیدا ہوا، جسے وہ اپنے مقابلے میں ہیچ سمجھتے تھے، تو وہ اس کے انکار پر آمادہ ہو گئے۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ اللہ ان سے پوچھ کر نبی بھیجتا، جب اس نے ان سے نہ پوچھا اور اپنے فضل سے خود جسے چاہا، نواز دیا، تو وہ بگڑ بیٹھے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى
حَيٰوةٍ ۚۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ
سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ
بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ
بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾

معانقۃ ۲ ع

(کہ یہ وہاں جانے کی تمنّا نہ کریں)، اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔ تم انھیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے[۹۹]، حتّٰی کہ یہ اس معاملے میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہُوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیے، حالانکہ لمبی عمر بہرحال اُسے عذاب سے تو دُور نہیں پھینک سکتی۔ جیسے کچھ اعمال یہ کر رہے ہیں، اللہ تو انھیں دیکھ ہی رہا ہے۔ ع

ان سے کہو کہ جو کوئی جبریلؑ سے عداوت رکھتا ہو[۱۰۰]، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریلؑ نے اللہ ہی کے اِذن سے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے[۱۰۱]، جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے[۱۰۲] اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے[۱۰۳]۔

۹۸ – یہ ایک تعریض اور نہایت لطیف تعریض ہے اُن کی دُنیا پرستی پر۔ جن لوگوں کو واقعی دارِ آخرت سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے، وہ دُنیا پر مرے نہیں جاتے اور نہ موت سے ڈرتے ہیں۔ مگر یہودیوں کا حال اس کے برعکس تھا اور ہے۔

۹۹ – اصل میں عَلٰى حَيٰوةٍ کا لفظ ارشاد ہوا ہے، جس کے معنی ہیں: کسی نہ کسی طرح کی زندگی۔ یعنی انھیں محض زندگی کی حرص ہے، خواہ وہ کسی طرح کی زندگی ہو، عزّت اور شرافت کی ہو یا ذلّت اور کمینہ پن کی۔

۱۰۰ – یہودی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ پر ایمان لانے والوں ہی کو بُرا نہ کہتے تھے، بلکہ خدا کے برگزیدہ فرشتے جبریلؑ کو بھی گالیاں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ ہمارا دشمن ہے۔ وہ رحمت کا نہیں، عذاب کا فرشتہ ہے۔

۱۰۱ – یعنی اس بنا پر تمھاری گالیاں جبریلؑ پر نہیں بلکہ خداوندِ برتر کی ذات پر پڑتی ہیں۔

۱۰۲ – مطلب یہ ہے کہ یہ گالیاں تم اسی لیے تو دیتے ہو کہ جبریلؑ یہ قرآن لے کر آیا ہے، اور حال یہ ہے کہ یہ قرآن سراسر تورات کی تائید میں ہے۔ لہٰذا تمھاری گالیوں میں تورات بھی حصّے دار ہوئی۔

۱۰۳ – اِس میں لطیف اشارہ ہے اس مضمون کی طرف کہ نادانو! اصل میں تمھاری ساری ناراضی ہدایت اور راہِ راست

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ
اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا
يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ ۙۗ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ
اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

(اگر جبریل سے ان کی عداوت کا سبب یہی ہے، تو کہہ دو کہ) جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوںؑ اور جبریلؑ اور میکائیلؑ کے دشمن ہیں، اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔

ہم نے تمھاری طرف ایسی آیات نازل کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے والی ہیں۔ اور ان کی پیروی سے صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو فاسق ہیں۔ کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا ہے کہ جب انھوں نے کوئی عہد کیا، تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اُسے ضرور ہی بالائے طاق رکھ دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہی ہیں، جو سچے دل سے ایمان نہیں لاتے۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اُس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی، تو اِن اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پسِ پُشت ڈالا، گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔ اور لگے اُن چیزوں کی پیروی کرنے، جو شیاطین، سلیمانؑ کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے،[۱۰۴] حالانکہ سلیمانؑ نے کبھی کفر نہیں کیا،

کے خلاف ہے۔ تم لڑ رہے ہو اُس صحیح رہنمائی کے خلاف، جسے اگر سیدھی طرح مان لو تو تمھارے ہی لیے کامیابی کی بشارت ہو۔

۱۰۴ – شیاطین سے مراد شیاطینِ جنّ اور شیاطینِ اِنس دونوں ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں۔

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ
عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ
اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ

کُفر کے مُرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادُوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیچھے پڑے اُس چیز کے جو بابِل میں دو فرشتوں، ہارُوت و مارُوت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ (فرشتے) جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے، تو پہلے صاف طور پر مُتنبّہ کر دیا کرتے تھے کہ "دیکھ، ہم محض ایک آزمایش ہیں، تو کُفر میں مُبتلا نہ ہو۔"[۱۰۵] پھر بھی

جب بنی اسرائیل پر اَخلاقی و مادّی انحطاط کا دَور آیا اور غلامی، جہالت، نَکْبَت و اِفلاس اور ذلّت و پستی نے ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی و اُولُوالعزمی باقی نہ چھوڑی، تو ان کی توجُّہات جادو ٹونے اور طِلِسمات و "عملیات" اور تعویذ گنڈوں کی طرف مبذول ہونے لگیں۔ وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی مَشقّت اور جِدّوجُہد کے بغیر محض پھونکوں اور منتروں کے زور پر سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیاطین نے ان کو بہکانا شروع کیا کہ سلیمانؑ کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں تو سب کچھ چند نُقوش اور منتروں کا نتیجہ تھیں، اور وہ ہم تمھیں بتائے دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نعمتِ غیر مُترقّبہ سمجھ کر اِن چیزوں پر ٹوٹ پڑے، اور پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعیِ حق کی آواز انھوں نے سُن کر دی۔

۱۰۵ — اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پُوری قوم بابِل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمایش کے لیے بھیجا ہوگا۔ جس طرح قومِ لُوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے، اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انھوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دکان لگائی ہوگی اور دُوسری طرف وہ اِتمامِ حُجت کے لیے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو، ہم تمھارے لیے آزمایش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نُقوش اور تعویذات پر ٹُوٹے پڑتے ہوں گے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آ کر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گردوپیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آ کر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سِکھانا جو بجائے خود بُری تھی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سِکّے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں، تاکہ اسے عین حالتِ ارتکابِ جُرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عذر کی گنجایش باقی نہ رہنے دیں۔

مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ
بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا
يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ
خَلَاقٍ ۛؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ لوگ اُن سے وہ چیز سیکھتے تھے، جس سے شوہر اور بیوی میں جُدائی ڈال دیں[۱۰۶]۔ ظاہر تھا کہ اذنِ الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود ان کے لیے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی، اور انھیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا، اس کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں۔ کتنی بُری متاع تھی جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، کاش انھیں معلوم ہوتا!

۱۰۶- مطلب یہ ہے کہ اس منڈی میں سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی، وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس سے ایک آدمی دوسرے کی بیوی کو اس سے توڑ کر اپنے اوپر عاشق کر لے۔ یہ اَخلاقی زوال کا وہ انتہائی درجہ تھا، جس میں وہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اَخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا مرتبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے اور کسی منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں۔

اِزدِواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدُّن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی دُرستی پر پورے انسانی تمدُّن کی دُرستی کا، اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدُّن کی خرابی کا مدار ہے۔ لہٰذا وہ شخص بدترین مُفسِد ہے جو اُس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتا ہو جس کے قیام پر خود اُس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ابلیس اپنے مرکز سے زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ روانہ کرتا ہے۔ پھر وہ ایجنٹ واپس آ کر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے: میں نے فُلاں فتنہ برپا کیا۔ کوئی کہتا ہے: میں نے فُلاں شر کھڑا کیا۔ مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں جُدائی ڈال آیا ہوں۔ یہ سُن کر ابلیس اس کو گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو کام کر کے آیا ہے۔ اس حدیث پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے، انھیں کیوں حکم دیا گیا کہ عورت اور مرد کے درمیان جدائی ڈالنے کا ”عمل“ ان کے سامنے پیش کریں۔ دراصل یہی ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اَخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا۔

ع ۱۲ ۱۲

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝١٠٣ ع
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ

اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے، تو اللہ کے ہاں اس کا جو بدلہ ملتا، وہ ان کے لیے زیادہ بہتر تھا۔ کاش اُنھیں خبر ہوتی! ع

اے لوگو جو ایمان لائے[۱۰۷] ہو، رَاعِنَا نہ کہا کرو، بلکہ اُنْظُرْنَا کہو اور توجہ سے بات کو سنو،[۱۰۸]

۱۰۷ – اس رکوع اور اس کے بعد والے رُکوع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے والوں کو اُن شرارتوں سے خبردار کیا گیا ہے جو اسلام اور اسلامی جماعت کے خلاف یہودیوں کی طرف سے کی جا رہی تھیں، اُن شبہات کے جوابات دیے گئے ہیں جو یہ لوگ مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور اُن خاص خاص نکات پر کلام کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کی گفتگو میں زیرِ بحث آیا کرتے تھے۔ اس موقع پر یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے پہنچے اور ان اطراف میں اسلام کی دعوت پھیلنی شروع ہوئی، تو یہودی جگہ جگہ مسلمانوں کو مذہبی بحثوں میں اُلجھانے کی کوشش کرتے تھے، اپنی مُوشگافیوں اور تشکیکات اور سوال میں سے سوال نکالنے کی بیماری اِن سیدھے اور سچّے لوگوں کو بھی لگانا چاہتے تھے اور خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آ کر پُرفریب مکّارانہ باتیں کر کے اپنی گھٹیا درجے کی ذہنیّت کا ثبوت دیا کرتے تھے۔

۱۰۸ – یہودی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے، تو اپنے سلام اور کلام میں ہرممکن طریقے سے اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذُومعنیٰ الفاظ بولتے، زور سے کچھ کہتے اور زیرِلب کچھ اور کہہ دیتے، اور ظاہری ادب آداب برقرار رکھتے ہوئے درپردہ آپؐ کی توہین کرنے میں کوئی دَقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ قرآن میں آگے چل کر اس کی متعدّد مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں جس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے، یہ ایک ذُومعنیٰ لفظ تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران میں یہودیوں کو کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ٹھیریے، ذرا ہمیں یہ بات سمجھ لینے دیجیے، تو وہ رَاعِنَا کہتے تھے۔ اس لفظ کا ظاہری مفہوم تو یہ تھا کہ ذرا ہماری رعایت کیجیے، یا ہماری بات سن لیجیے۔ مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے مِلتا جُلتا ایک لفظ تھا، جس کے معنیٰ تھے: ”سُن، تو بہرا ہو جائے۔“ اور خود عربی میں اس کے ایک معنیٰ صاحبِ رعونت اور جاہل و احمق کے بھی تھے۔ اور گفتگو میں یہ ایسے موقع پر بھی بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کہ تم ہماری سنو، تو ہم تمھاری سنیں۔ اور ذرا زبان کو لچکا دے کر رَاعِیْنَا بھی بنا لیا جاتا تھا، جس کے معنیٰ ”اے ہمارے چرواہے“ کے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو اور اس کے بجائے اُنْظُرْنَا کہا کرو۔ یعنی ہماری طرف توجہ فرمائیے یا ذرا ہمیں سمجھ لینے دیجیے۔ پھر فرمایا کہ ”توجہ سے بات کو سنو“، یعنی یہودیوں کو تو بار بار

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ
الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾
مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ
اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ

یہ کافر تو عذابِ الیم کے مستحق ہیں۔ یہ لوگ جنھوں نے دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، خواہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں، ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو، مگر اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے چن لیتا ہے، اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی۔[109] کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟ کیا تمھیں خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی

یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبیؐ کی بات پر توجہ نہیں کرتے اور ان کی تقریر کے دَوران میں وہ اپنے ہی خیالات میں اُلجھے رہتے ہیں، مگر تمھیں غور سے نبی کی باتیں سُننی چاہییں، تاکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔

۱۰۹ - یہ ایک خاص شبہے کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے، تو اُن کے بعض احکام کی جگہ اِس میں دُوسرے احکام کیوں دیے گئے ہیں؟ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر تمھارا قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اُس تعلیم کے ایک حصّے کو بھول گئے جو انھیں دی گئی تھی۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی تعلیم ہو اور وہ حافظوں سے محو ہو جائے؟ یہ ساری باتیں وہ تحقیق کی خاطر نہیں، بلکہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے مِن جانبِ اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کر دوں اور جس چیز کو چاہوں، حافظوں سے محو کر دوں۔ مگر جس چیز کو مَیں منسوخ یا محو کرتا ہوں، اس سے بہتر چیز اس کی جگہ پر لاتا ہوں، یا کم از کم وہ اپنے محل میں اتنی ہی مفید

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا
نَصِیْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى
مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ
السَّبِیْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ
لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

فرماں روائی اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے سوا کوئی تمھاری خبر گیری کرنے اور تمھاری مدد کرنے والا نہیں ہے؟

پھر کیا تم اپنے رسولؐ سے اُس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو، جیسے اس سے پہلے موسٰیؑ سے کیے جا چکے ہیں؟[110] حالانکہ جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا، وہ راہِ راست سے بھٹک گیا۔ اہلِ کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمھیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے، مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمھارے لیے ان کی یہ خواہش ہے۔ اس کے جواب میں تم عفو و درگزر سے کام لو،[111] یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ (تعالیٰ)

اور مناسب ہوتی ہے جتنی پہلی چیز اپنے محل میں تھی۔

۱۱۰ – یہودی مُوشگافیاں کر کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور انھیں اکساتے تھے کہ اپنے نبیؐ سے یہ پوچھو اور یہ پوچھو اور یہ پوچھو۔ اس پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مُتَنَبِّہ فرما رہا ہے کہ اس معاملے میں یہودیوں کی روش اختیار کرنے سے بچو۔ اسی چیز پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی مسلمانوں کو بار بار مُتَنَبِّہ فرمایا کرتے تھے کہ قیل و قال سے اور بال کی کھال نکالنے سے پچھلی اُمّتیں تباہ ہو چکی ہیں، تم اس سے پرہیز کرو۔ جن سوالات کو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں چھیڑا، ان کی کھوج میں نہ لگو۔ بس جو حکم تمھیں دیا جاتا ہے، اس کی پیروی کرو اور جن اُمور سے منع کیا جاتا ہے، ان سے رُک جاؤ،

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا
تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ
هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ
اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ نماز قائم کرو اور زکوۃ دو۔ تم اپنی عاقبت کے لیے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے، اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو، وہ سب اللہ کی نظر میں ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ اُن کی تمنائیں ہیں[۱۱۲]۔ ان سے کہو: اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ دراصل نہ تمھاری کچھ خصوصیت ہے، نہ کسی اور کی۔ حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے، اس کے لیے اس کے رب کے پاس اُس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں ع

دُور از کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صَرف کرو۔

۱۱۱ – یعنی ان کے عناد اور حسد کو دیکھ کر مشتعل نہ ہو، اپنا توازُن نہ کھو بیٹھو، ان سے بحثیں اور مناظرے کرنے اور جھگڑنے میں اپنے قیمتی وقت اور اپنے وقار کو ضائع نہ کرو، صبر کے ساتھ دیکھتے رہو کہ اللہ کیا کرتا ہے۔ فضولیات میں اپنی قوتیں صَرف کرنے کے بجائے خدا کے ذکر اور بھلائی کے کاموں میں انھیں صَرف کرو کہ یہ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ہے، نہ کہ وہ۔

۱۱۲ – یعنی دراصل یہ ہیں تو محض ان کے دل کی خواہشیں اور آرزوئیں، مگر وہ انھیں بیان اس طرح کر رہے ہیں کہ گویا فی الواقع یہی کچھ ہونے والا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى
لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ
الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ
اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ
يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۬ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

یہودی کہتے ہیں: عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں: یہودیوں کے پاس کچھ نہیں ـــــ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں ـــــ اور اسی قسم کے دعوے ان لوگوں کے بھی ہیں، جن کے پاس کتاب کا علم نہیں[۱۱۳] ہے۔ یہ اختلافات جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں، ان کا فیصلہ اللہ قیامت کے روز کر دے گا۔

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو؟ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں، اور اگر وہاں جائیں بھی، تو ڈرتے ہوئے جائیں[۱۱۴]۔ ان کے لیے تو دُنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں

۱۱۳ – یعنی مشرکینِ عرب۔

۱۱۴ – یعنی بجائے اس کے کہ عبادت گاہیں اس قسم کے ظالم لوگوں کے قبضہ و اقتدار میں ہوں اور یہ اُن کے مُتوَلّی ہوں، ہونا یہ چاہیے کہ خدا پرست اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو اور وہی عبادت گاہوں کے مُتوَلّی رہیں، تاکہ یہ شریر لوگ اگر وہاں جائیں بھی، تو انھیں خوف ہو کہ شرارت کریں گے تو سزا پائیں گے ـــــ یہاں ایک لطیف اشارہ کفارِ مکّہ کے اِس ظلم کی طرف بھی ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کے اُن لوگوں کو جو اسلام لا چکے تھے، بیت اللہ میں عبادت کرنے سے روک دیا تھا۔

عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ
اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ۚ
بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُونَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيعُ
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهٗ كُنْ
فَيَكُونُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ أَوْ تَأْتِينَا

عذابِ عظیم۔

مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ جس طرف بھی تم رُخ کرو گے، اسی طرف اللہ کا رُخ ہے۔[۱۱۵] اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔[۱۱۶]

ان کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تمام موجودات اس کی مِلک ہیں، سب کے سب اس کے مطیعِ فرمان ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا موجِد ہے، اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے بس یہ حکم دیتا ہے کہ "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے۔

نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں

---

۱۱۵ – یعنی اللہ نہ شرقی ہے، نہ غربی۔ وہ تمام سَمتوں اور مقاموں کا مالک ہے، مگر خود کسی سَمت یا کسی مقام میں مُقیّد نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی عبادت کے لیے کسی سَمت یا کسی مقام کو مقرر کرنے کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ اللہ وہاں یا اس طرف رہتا ہے۔ اور نہ یہ کوئی جھگڑنے اور بحث کرنے کے قابل بات ہے کہ پہلے تم وہاں یا اس طرف عبادت کرتے تھے، اب تم نے اس جگہ یا سَمت کو کیوں بدل دیا۔

۱۱۶ – یعنی اللہ تعالیٰ محدود، تنگ دل، تنگ نظر اور تنگ دست نہیں ہے، جیسا کہ تم لوگوں نے اپنے اوپر قیاس کر کے اسے سمجھ رکھا ہے، بلکہ اس کی خدائی بھی وسیع ہے اور اس کا زاویۂ نظر اور دائرۂ فیض بھی وسیع، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا کون سا بندہ کہاں، کس وقت، کس نیت سے اس کو یاد کر رہا ہے۔

اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ
قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ
بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ
تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ

آتی ؟[۱۱۷] ایسی ہی باتیں اِن سے پہلے لوگ بھی کیا کرتے تھے۔ اِن سب (اگلے پچھلے گمراہوں) کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں[۱۱۸]۔ یقین لانے والوں کے لیے تو ہم نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں[۱۱۹]۔ (اس سے بڑھ کر نشانی کیا ہوگی کہ) ہم نے تم کو علمِ حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا[۱۲۰]۔ اب جو لوگ جہنّم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں، ان کی طرف سے تم ذمّہ دار و جواب دِہ نہیں ہو۔

یہودی اور عیسائی تم سے[۱۲۱] ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔ صاف کہہ دو

۱۱۷- اُن کا مطلب یہ تھا کہ خدا، یا تو خود ہمارے سامنے آ کر کہے کہ یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے احکام ہیں، تم لوگ ان کی پیروی کرو، یا پھر ہمیں کوئی ایسی نشانی دکھائی جائے، جس سے ہمیں یقین آ جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ خدا کی طرف سے ہے۔

۱۱۸- یعنی آج کے گمراہوں نے کوئی اعتراض اور کوئی مُطالبہ ایسا نہیں گھڑا ہے، جو ان سے پہلے کے گمراہ پیش نہ کر چکے ہوں۔ قدیم زمانے سے آج تک گمراہی کا ایک ہی مزاج ہے اور وہ بار بار ایک ہی قسم کے شبہات اور اعتراضات اور سوالات دُہراتی رہتی ہے۔

۱۱۹- یہ بات کہ خدا خود آ کر ہم سے بات کیوں نہیں کرتا، اس قدر مُہمَل تھی کہ اس کا جواب دینے کی حاجت نہ تھی۔ جواب صرف اس بات کا دیا گیا ہے کہ ہمیں نشانی کیوں نہیں دکھائی جاتی۔ اور جواب یہ ہے کہ نشانیاں تو بے شمار موجود ہیں، مگر جو ماننا چاہتا ہی نہ ہو، اسے آخر کون سی نشانی دکھائی جا سکتی ہے۔

۱۲۰- یعنی دُوسری نشانیوں کا کیا ذکر، نمایاں ترین نشانی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی شخصیّت ہے۔ آپؐ کے نبوت سے پہلے کے حالات، اور اُس قوم اور ملک کے حالات جس میں آپؐ پیدا ہوئے، اور وہ حالات جن میں آپؐ نے پرورش پائی اور ۴۰ برس زندگی بسر کی، اور پھر وہ عظیم الشان کارنامہ جو نبی ہونے کے بعد آپؐ نے انجام دیا، یہ سب کچھ

هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ
جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ وقف منزل
اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

کہ راستہ بس وہی ہے، جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اُس علم کے بعد، جو تمھارے پاس آچکا ہے، تم نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی، تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمھارے لیے نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اُسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اس پر سچّے دل سے ایمان لاتے ہیں[۱۲۲]۔ اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویّہ اختیار کریں، وہی اصل میں نقصان اُٹھانے والے ہیں ع

ایک ایسی روشن نشانی ہے جس کے بعد کسی اور نشانی کی حاجت نہیں رہتی۔

۱۲۱ – مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی ناراضی کا سبب یہ تو ہے نہیں کہ وہ سچّے طالبِ حق ہیں اور تم نے ان کے سامنے حق کو واضح کرنے میں کچھ کمی کی ہے۔ وہ تو اس لیے تم سے ناراض ہیں کہ تم نے اللہ کی آیات اور اس کے دین کے ساتھ وہ منافقانہ اور بازی گرانہ طرزِ عمل کیوں نہ اختیار کیا، خدا پرستی کے پردے میں وہ خود پرستی کیوں نہ کی، دین کے اُصول و احکام کو اپنے تخیّلات یا اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اُس دیدہ دلیری سے کیوں نہ کام لیا، وہ ریاکاری اور گندم نمائی و جَوفروشی کیوں نہ کی، جو خود ان کا اپنا شیوہ ہے۔ لٰہذا انھیں راضی کرنے کی فکر چھوڑ دو، کیونکہ جب تک تم ان کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرلو، دین کے ساتھ وہی معاملہ نہ کرنے لگو جو خود یہ کرتے ہیں، اور عقائد و اعمال کی اُنھی گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ جن میں یہ مبتلا ہیں، اس وقت تک ان کا تم سے راضی ہونا محال ہے۔

۱۲۲ – یہ اہلِ کتاب کے صالح عُنصر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ دیانت اور راستی کے ساتھ خدا کی کتاب کو پڑھتے ہیں۔ اس لیے جو کچھ کتاب اللہ کی رُو سے حق ہے، اُسے حق مان لیتے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ
فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ
شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اے بنی اسرائیل[۱۲۳]! یاد کرو میری وہ نعمت، جس سے میں نے تمھیں نوازا تھا، اور یہ کہ مَیں نے تمھیں دُنیا کی تمام قوموں پر فضیلت دی تھی۔ اور ڈرو اُس دن سے، جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ کوئی سفارش ہی آدمی کو فائدہ دے گی، اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔

۱۲۳- یہاں سے ایک دُوسرا سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے، جسے سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل اُمور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے:

(۱) حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انھوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستانِ عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں خلیفہ مقرر کیے۔ شرقِ اُردُن میں اپنے بھتیجے حضرت لُوطؑ کو، شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو، اور اندرُونِ عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا، جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں: ایک، حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دُوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ اُن کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثّر تھے، اس لیے وہ اپنا سلسلہ انھی سے جوڑتے تھے۔ دوسرے، حضرت اسحاقؑ کی اولاد، جن میں حضرات یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے انبیا علیہم السلام پیدا ہوئے، اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، حضرت یعقوبؑ کا نام چونکہ اسرائیل تھا، اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ اُن کی تبلیغ سے جن دُوسری قوموں نے اُن کا دین قبول کیا، انھوں نے یا تو اپنی انفرادیّت ہی اُن کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو اُن سے الگ رہے، مگر مذہباً اِن کے مُتّبع رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی وتنزّل کا دَور آیا، تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔

(۳) حضرت ابراہیمؑ کا اصل کام دُنیا کو اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت

کے مطابق انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام دُرست کرنا تھا۔ وہ خود اللہ کے مطیع تھے، اس کے دیے ہوئے علم کی پیروی کرتے تھے، دُنیا میں اُس علم کو پھیلاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سب انسان مالکِ کائنات کے مطیع ہو کر رہیں۔ یہی خدمت تھی، جس کے لیے وہ دنیا کے امام و پیشوا بنائے گئے تھے۔ اُن کے بعد یہ امامت کا منصب اُن کی نسل کی اُس شاخ کو ملا، جو حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ سے چلی اور بنی اسرائیل کہلائی۔ اسی میں انبیا پیدا ہوتے رہے، اسی کو راہِ راست کا علم دیا گیا، اسی کے سُپرد یہ خدمت کی گئی کہ اس راہِ راست کی طرف اقوامِ عالَم کی رہنمائی کرے، اور یہی وہ نعمت تھی، جسے اللہ تعالیٰ بار بار اس نسل کے لوگوں کو یاد دلا رہا ہے۔ اس شاخ نے حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بیت المَقدِس کو اپنا مرکز قرار دیا۔ اس لیے جب تک یہ شاخ امامت کے منصب پر قائم رہی، بیت المَقدِس ہی دعوت اِلی اللہ کا مرکز اور خدا پرستوں کا قبلہ رہا۔

(۴) پچھلے دس رُکوعوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے اُن کی تاریخی فردِ قرار دادِ جُرم اور ان کی وہ موجودہ حالت، جو نزُولِ قرآن کے وقت تھی، بے کم و کاست پیش کر دی ہے اور ان کو بتا دیا ہے کہ تم ہماری اُس نعمت کی انتہائی ناقدری کر چکے ہو جو ہم نے تمھیں دی تھی۔ تم نے صرف یہی نہیں کیا کہ منصبِ امامت کا حق ادا کرنا چھوڑ دیا، بلکہ خود بھی حق اور راستی سے پھر گئے، اور اب ایک نہایت قلیل عُنصرِ صالح کے سوا تمھاری پوری اُمّت میں کوئی صلاحیّت باقی نہیں رہی ہے۔

(۵) اس کے بعد اب انھیں بتایا جا رہا ہے کہ امامت ابراہیمؑ کے نُطفے کی میراث نہیں ہے، بلکہ یہ اس سچّی اطاعت و فرماں برداری کا پھل ہے، جس میں ہمارے اُس بندے نے اپنی ہستی کو گم کر دیا تھا، اور اس کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو ابراہیمؑ کے طریقے پر خود چلیں اور دُنیا کو اس طریقے پر چلانے کی خدمت انجام دیں۔ چونکہ تم اس طریقے سے ہٹ گئے ہو اور اس خدمت کی اہلیّت پُوری طرح کھو چکے ہو، لٰہذا تمھیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے۔

(۶) ساتھ ہی اشاروں اشاروں میں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ جو غیر اسرائیلی قومیں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اپنا تعلق جوڑتی ہیں، وہ بھی ابراہیمی طریقے سے ہٹی ہوئی ہیں۔ نیز مشرکینِ عرب بھی، جو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے اپنے تعلق پر فخر کرتے ہیں، محض نسل و نسب کے فخر کو لیے بیٹھے ہیں۔ ورنہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے طریقے سے اب ان کو دور کا واسطہ بھی نہیں رہا ہے۔ لٰہذا ان میں سے بھی کوئی امامت کا مستحق نہیں ہے۔

(۷) پھر یہ بات ارشاد ہوتی ہے کہ اب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی دُوسری شاخ، بنی اسماعیلؑ میں وہ رسولؐ پیدا کیا ہے، جس کے لیے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے دُعا کی تھی۔ اس کا طریقہ وہی ہے، جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور دُوسرے تمام انبیاؑ کا تھا۔ وہ اور اس کے پیرو تمام ان پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہیں جو دنیا میں خدا کی طرف سے آئے ہیں، اور اسی راستے کی طرف دنیا کو بلاتے ہیں جس کی طرف سارے انبیاؑ دعوت دیتے چلے آئے ہیں۔ لٰہذا اب امامت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اس رسول کی پیروی کریں۔

(۸) تبدیلیِ امامت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی قدرتی طور پر تحویلِ قبلہ کا اعلان ہونا بھی ضروری تھا۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ

یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا [۱۲۴] اور وہ اُن سب میں پُورا اُتر گیا، تو اس نے کہا: "میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" ابراہیمؑ نے عرض کیا: "اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟" اس نے جواب دیا: "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں [۱۲۵] ہے۔"

اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ

جب تک بنی اسرائیل کی امامت کا دور تھا، بیت المَقدِس مرکزِ دعوت رہا اور وہی قبلۂ اہلِ حق بھی رہا۔ خود نبی عَرَبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیرو بھی اس وقت تک بیت المَقدِس ہی کو قبلہ بنائے رہے۔ مگر جب بنی اسرائیل اس منصب سے باضابطہ معزول کر دیے گئے، تو بیت المَقدِس کی مرکزیت آپ سے آپ ختم ہوگئی۔ لہٰذا اعلان کیا گیا کہ اب وہ مَقام دینِ الٰہی کا مرکز ہے، جہاں سے اِس رسول کی دعوت کا ظہور ہوا ہے۔ اور چونکہ ابتدا میں ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا مرکز بھی یہی مَقام تھا، اس لیے اہلِ کتاب اور مشرکین، کسی کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ قبلہ ہونے کا زیادہ حق کعبے ہی کو پہنچتا ہے۔ ہٹ دھرمی کی بات دُوسری ہے کہ وہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی اعتراض کیے چلے جائیں۔

(۹) اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت اور کعبے کی مرکزیّت کا اعلان کرنے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے اُنیسویں رکوع سے آخر سورۂ بَقرہ تک مسلسل اس اُمّت کو وہ ہدایات دی ہیں، جن پر اسے عمل پیرا ہونا چاہیے۔

۱۲۴ – قرآن میں مختلف مَقامات پر اُن تمام سخت آزمایشوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے، جن سے گزر کر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے آپ کو اس بات کا اہل ثابت کیا تھا کہ اُنھیں بنی نوعِ انسان کا امام و رہنما بنایا جائے۔ جس وقت سے حق ان پر منکشف ہوا، اس وقت سے لے کر مرتے دم تک ان کی پوری زندگی سراسر قربانی ہی قربانی تھی۔ دنیا میں جتنی چیزیں ایسی ہیں، جن سے انسان محبّت کرتا ہے، اُن میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس کو حضرت ابراہیمؑ نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو۔ اور دنیا میں جتنے خطرات ایسے ہیں، جن سے آدمی ڈرتا ہے، ان میں سے کوئی خطرہ ایسا نہ تھا، جسے انھوں نے حق کی راہ میں نہ جھیلا ہو۔

۱۲۵ – یعنی یہ وعدہ تمھاری اولاد کے صرف اُس حصے سے تعلق رکھتا ہے جو صالح ہو۔ ان میں سے جو ظالم ہوں گے، اُن کے لیے یہ وعدہ نہیں ہے۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ گمراہ یہودی اور مشرک بنی اسمٰعیل

اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدۡنَاۤ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ اَنۡ طَهِّرَا بَيۡتِىَ
لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡعٰكِفِيۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ
رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ
اٰمَنَ مِنۡهُمۡ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنۡ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ
قَلِيۡلًا ثُمَّ اَضۡطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۲۶﴾

ابراہیمؑ جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اس مقام کو مستقل جائے نماز بنالو، اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رُکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔[۱۲۶]

اور یہ کہ ابراہیمؑ نے دُعا کی: ''اے میرے رب! اس شہر کو امن کا شہر بنا دے، اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں، انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔'' جواب میں اس کے رب نے فرمایا: ''اور جو نہ مانے گا، دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اُسے بھی دوں گا،[۱۲۷] مگر آخرکار اُسے عذابِ جہنّم کی طرف گھسیٹوں گا، اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔''

اس وعدے کے مصداق نہیں ہیں۔

۱۲۶ – پاک رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اُسے پاک رکھا جائے۔ خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانۂ خدا میں خدا کے سوا کسی دُوسرے کو مالک، معبُود، حاجت روا اور فریاد رَس کی حیثیت سے پکارا، اس نے حقیقت میں اُسے گندا کر دیا۔ یہ آیت ایک نہایت لطیف طریقے سے مشرکینِ قریش کے جُرم کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ ظالم لوگ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے وارث ہونے پر فخر تو کرتے ہیں، مگر وِراثت کا حق ادا کرنے کے بجائے اُلٹا اس حق کو پامال کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو وعدہ ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا، اس سے جس طرح بنی اسرائیل مُستثنیٰ ہو گئے ہیں، اسی طرح یہ مشرک بنی اسماعیل بھی اس سے مُستثنیٰ ہیں۔

۱۲۷ – حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب منصبِ امامت کے متعلق پوچھا تھا، تو ارشاد ہوا تھا کہ اس منصب کا وعدہ تمھاری اولاد کے صرف مومن و صالح لوگوں کے لیے ہے، ظالم اس سے مُستثنیٰ ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا
مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا
مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا
وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵ ۸ ۱۵
وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ

اور یاد کرو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اُٹھا رہے تھے، تو دعا کرتے جاتے تھے: "اے ہمارے رب! ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے، تُو سب کی سُننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب! ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیعِ فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اُٹھا، جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، تُو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب! ان لوگوں میں خود انھی کی قوم سے ایک ایسا رسول اُٹھائیو، جو انھیں تیری آیات سُنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے[۱۲۸]۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے[۱۲۹]۔" ع

اب کون ہے جو ابراہیمؑ کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کر لیا ہو، اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے؟

رزق کے لیے دُعا کرنے لگے، تو سابق فرمان کو پیشِ نظر رکھ کر اُنھوں نے صرف اپنی مومن اولاد ہی کے لیے دُعا کی، مگر اللہ تعالیٰ نے جواب میں اس غلط فہمی کو فوراً رفع فرما دیا اور انھیں بتایا کہ امامتِ صالحہ اور چیز ہے اور رزقِ دُنیا دُوسری چیز۔ امامتِ صالحہ صرف مومنینِ صالحین کو ملے گی، مگر رزقِ دُنیا مومن و کافر سب کو دیا جائے گا۔ اس سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ اگر کسی کو رزقِ دُنیا فراوانی کے ساتھ مل رہا ہو، تو وہ اس غلط فہمی میں نہ پڑے کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور وہی خدا کی طرف سے پیشوائی کا مستحق بھی ہے۔

۱۲۸ – زندگی سنوارنے میں خیالات، اخلاق، عادات، معاشرت، تمدّن، سیاست، غرض ہر چیز کو سنوارنا شامل ہے۔

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾
اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى
بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ
فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ
يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا
نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا

ابراہیمؑ تو وہ شخص ہے، جس کو ہم نے دنیا میں اپنے کام کے لیے چُن لیا تھا، اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا: ''مُسلم ہوجا''[۱۳۰]، تو اس نے فوراً کہا: ''میں مالکِ کائنات کا ''مسلم'' ہوگیا۔'' اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیّت یعقوبؑ[۱۳۱] اپنی اولاد کو کر گیا۔ اس نے کہا تھا کہ ''میرے بچّو! اللہ نے تمھارے لیے یہی دین[۱۳۲] پسند کیا ہے، لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔'' پھر کیا تم اس وقت موجود تھے، جب یعقوبؑ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پُوچھا: ''بچّو! میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟'' ان سب نے جواب دیا: ''ہم اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے، جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ نے

۱۲۹ – اس سے یہ بتانا مقصُود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا جواب ہے۔

۱۳۰ – مُسْلِم: وہ جو خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کر دے، خدا ہی کو اپنا مالک، آقا، حاکم اور معبُود مان لے، جو اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سُپرد کر دے اور اُس ہدایت کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے، جو خدا کی طرف سے آئی ہو۔ اس عقیدے اور اس طرزِ عمل کا نام ''اسلام'' ہے اور یہی تمام انبیاؑ کا دین تھا جو ابتدائے آفرینش سے دُنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں آئے۔

۱۳۱ – حضرت یعقوبؑ کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ بنی اسرائیل براہِ راست انھی کی اولاد تھے۔

۱۳۲ – دین، یعنی طریقِ زندگی، نظامِ حیات، وہ آئین جس پر انسان دُنیا میں اپنے پُورے طرزِ فکر اور طرزِ عمل

وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا
كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَ
قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا

خدا مانا ہے اور ہم اُسی کے مسلم ہیں۔[۱۳۳]''

وہ کچھ لوگ تھے، جو گزر گئے۔ جو کچھ انھوں نے کمایا، وہ اُن کے لیے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے، وہ تمھارے لیے ہے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔[۱۳۴]

یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو تو راہِ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ اِن سے کہو: ''نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ۔ اور ابراہیمؑ مشرکوں

کی بنا رکھے۔

۱۳۳ – بائبل میں حضرت یعقوبؑ کی وفات کا حال بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے، مگر حیرت ہے کہ اس وصیّت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ تَلمُود میں جو مفصّل وصیّت درج ہے، اس کا مضمون قرآن کے بیان سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں حضرت یعقوبؑ کے یہ الفاظ ہمیں ملتے ہیں:

> ''خداوند اپنے خدا کی بندگی کرتے رہنا، وہ تمھیں اُسی طرح تمام آفات سے بچائے گا، جس طرح تمھارے آبا و اجداد کو بچاتا رہا ہے...... اپنے بچوں کو خدا سے مَحبّت کرنے اور اس کے احکام بجا لانے کی تعلیم دینا، تاکہ ان کی مُہلتِ زندگی دراز ہو، کیوں کہ خدا ان لوگوں کی حفاظت کرتا ہے، جو حق کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اس کی راہوں پر ٹھیک ٹھیک چلتے ہیں۔'' جواب میں اُن کے لڑکوں نے کہا: ''جو کچھ آپ نے ہدایت فرمائی ہے، ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ خدا ہمارے ساتھ ہو!'' تب یعقوبؑ نے کہا: ''اگر تم خدا کی سیدھی راہ سے دائیں یا بائیں نہ مڑو گے، تو خدا ضرور تمھارے ساتھ رہے گا۔''

۱۳۴ – یعنی اگرچہ تم اُن کی اولاد سہی، مگر حقیقت میں تمھیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اُن کا نام لینے کا تمھیں کیا حق ہے جب کہ تم اُن کے طریقے سے پھر گئے۔ اللہ کے ہاں تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمھارے باپ دادا کیا کرتے تھے، بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ تم خود کیا کرتے رہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ''جو کچھ اُنھوں نے کمایا، وہ اُن کے لیے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے، وہ تمھارے لیے ہے''، یہ قرآن کا خاص اندازِ بیان ہے۔ ہم جس چیز کو فعل یا عمل کہتے ہیں، قرآن اپنی زبان میں اسے کسب یا کمائی کہتا ہے۔

كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ
اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِيَ
مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَاۤ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ

میں سے نہ تھا۔[۱۳۵] مسلمانو! کہو کہ: "ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق

ہمارا ہر عمل اپنا ایک اچھا یا بُرا نتیجہ رکھتا ہے، جو خدا کی خوشنودی یا ناراضی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ وہی نتیجہ ہماری کمائی ہے۔ چونکہ قرآن کی نگاہ میں اصل اہمیّت اسی نتیجے کی ہے، اس لیے اکثر وہ ہمارے کاموں کو عمل و فعل کے الفاظ سے تعبیر کرنے کے بجائے "کسب" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

۱۳۵ – اس جواب کی لطافت سمجھنے کے لیے دو باتیں نگاہ میں رکھیے:

ایک، یہ کہ یہُودیّت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ "یہُودیت" اپنے اِس نام اور اپنی مذہبی خُصُوصیّات اور رُسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبلِ مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور "عیسائیت" جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے، وہ تو حضرت مسیحؑ کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسرِ ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے، تو حضرت ابراہیمؑ اور دُوسرے انبیاؑ اور نیک لوگ، جو اِن مذہبوں کی پیدایش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو خود یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ "یہُودیّت" اور "عیسائیت" نہ تھی۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار اُن مذہبی خصوصیّات پر نہیں ہے، جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں، بلکہ دراصل اس کا مدار اُس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے، جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔

دُوسرے، یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ایک اللہ کے سوا کسی دُوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدائی کی صفات و خصوصیّات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھیرایا جائے۔ لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اُس راہِ راست سے منحرف ہوگئی ہیں، جس پر حضرت ابراہیمؑ چلتے تھے، کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہوگئی ہے۔

مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ
اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫

نہیں کرتے[۱۳۶] اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔"

پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم لائے ہو، تو ہدایت پر ہیں، اور اگر اس سے منہ پھیریں، تو کھُلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اطمینان رکھو کہ اُن کے مقابلے میں اللہ تمھاری حمایت کے لیے کافی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

کہو: "اللہ کا رنگ اختیار کرو۔[۱۳۷] اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟

۱۳۶- پیغمبروں کے درمیان تفریق نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُن کے درمیان اس لحاظ سے فرق نہیں کرتے کہ فُلاں حق پر تھا اور فُلاں حق پر نہ تھا، یا یہ کہ ہم فُلاں کو مانتے ہیں اور فُلاں کو نہیں مانتے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر بھی آئے ہیں، سب کے سب ایک ہی صداقت اور ایک ہی راہِ راست کی طرف بلانے آئے ہیں۔ لہٰذا جو شخص صحیح معنیٰ میں حق پرست ہے، اُس کے لیے تمام پیغمبروں کو برحق تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ جو لوگ کسی پیغمبر کو مانتے اور کسی کا انکار کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اُس پیغمبر کے بھی پیرو نہیں ہیں، جسے وہ مانتے ہیں، کیونکہ انھوں نے دراصل اُس عالمگیر صراطِ مستقیم کو نہیں پایا ہے، جسے حضرت موسیٰؑ، یا عیسیٰؑ، یا کسی دوسرے پیغمبر نے پیش کیا تھا، بلکہ وہ محض باپ دادا کی تقلید میں ایک پیغمبر کو مان رہے ہیں۔ اُن کا اصل مذہب نسل پرستی کا تعصّب اور آبا و اجداد کی اندھی تقلید ہے، نہ کہ کسی پیغمبر کی پیروی۔

۱۳۷- اس آیت کے دو ترجمے ہوسکتے ہیں: ایک، یہ کہ "ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کرلیا"، دوسرے، یہ کہ "اللہ کا رنگ اختیار کرو۔" مسیحیّت کے ظہور سے پہلے یہودیوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ جو شخص اُن کے مذہب میں داخل ہوتا، اُسے غسل دیتے تھے اور اِس غُسل کے معنیٰ ان کے ہاں یہ تھے کہ گویا اس کے گناہ دُھل گئے اور اس نے زندگی کا ایک نیا رنگ اختیار کرلیا۔ یہی چیز بعد میں مسیحیوں نے اختیار کرلی۔ اس کا اصطلاحی نام ان کے ہاں اِصطباغ (بپتسمہ) ہے اور یہ اِصطباغ نہ صرف اُن لوگوں کو دیا جاتا ہے جو اُن کے مذہب میں داخل ہوتے ہیں، بلکہ بچوں کو بھی دیا جاتا ہے۔ اسی کے متعلق قرآن کہتا ہے: اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے؟ اللہ کا رنگ اختیار کرو، جو کسی پانی سے نہیں چڑھتا، بلکہ اس کی بندگی کا طریقہ اختیار کرنے سے چڑھتا ہے۔

وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ
رَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ
مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ
وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ
ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً

اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔"

اے نبیؐ! ان سے کہو: "کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔[۱۳۸] ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں، تمھارے اعمال تمھارے لیے، اور ہم اللہ ہی کے لیے اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں۔[۱۳۹] یا پھر کیا تمھارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ سب کے سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟ کہو: "تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟[۱۴۰] اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے ذمّے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور

۱۳۸ — یعنی ہم یہی تو کہتے ہیں کہ اللہ ہی ہم سب کا رب ہے اور اسی کی فرماں برداری ہونی چاہیے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے کہ اس پر تم ہم سے جھگڑا کرو؟ جھگڑے کا اگر کوئی موقع ہے بھی، تو وہ ہمارے لیے ہے، نہ کہ تمھارے لیے، کیونکہ اللہ کے سوا دُوسروں کو بندگی کا مستحق تم ٹھیرا رہے ہو نہ کہ ہم۔

"اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ" کا ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "کیا تمھارا جھگڑا ہمارے ساتھ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ہے؟" اِس صُورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر واقعی تمھارا یہ جھگڑا نفسانی نہیں ہے، بلکہ خدا واسطے کا ہے، تو یہ بڑی آسانی سے طے ہوسکتا ہے۔

۱۳۹ — یعنی تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو اور ہم اپنے اعمال کے۔ تم نے اگر اپنی بندگی کو تقسیم کر رکھا ہے اور اللہ کے ساتھ دُوسروں کو بھی خدائی میں شریک ٹھیرا کر ان کی پرستش اور اطاعت بجا لاتے ہو، تو تمھیں ایسا کرنے کا اختیار ہے، اس کا انجام خود دیکھ لو گے۔ ہم تمھیں زبردستی اس سے روکنا نہیں چاہتے۔ لیکن ہم نے اپنی بندگی، اطاعت اور پرستش کو بالکل اللہ ہی کے لیے خالص کر دیا ہے۔ اگر تم تسلیم کرلو کہ ہمیں بھی ایسا کرنے کا اختیار ہے، تو خواہ مخواہ کا یہ جھگڑا آپ ہی ختم ہو جائے۔

۱۴۰ — یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے اُن جاہل عوام سے ہے جو واقعی اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ جلیل القدر

عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾
تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ
مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

الجزء ۲

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ
كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

وہ اُسے چھپائے؟ تمھاری حرکات سے اللہ غافل تو نہیں ہے[141] ـــــ وہ کچھ لوگ تھے، جو گزر چکے۔ اُن کی کمائی اُن کے لیے تھی اور تمھاری کمائی تمھارے لیے۔ تم سے اُن کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔" ع

نادان لوگ ضرور کہیں گے: اِنھیں کیا ہُوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے، اس سے یکایک پھر گئے[142]؟ اے نبیؐ! ان سے کہو: "مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے، سیدھی راہ دکھا دیتا ہے[143]۔" اور اِسی طرح تو ہم نے تمھیں ایک "اُمّتِ وَسَط" بنایا ہے

انبیاؑ سب کے سب یہودی یا عیسائی تھے۔

۱۴۱ — یہ خطاب اُن کے علما سے ہے، جو خود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت اپنی موجودہ خُصوصیّات کے ساتھ بہت بعد میں پیدا ہوئی ہیں، مگر اس کے باوجود وہ حق کو اپنے ہی فرقوں میں محدود سمجھتے تھے اور عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ انبیاؑ کے مدّتوں بعد جو عقیدے، جو طریقے اور جو اجتہادی ضابطے اور قاعدے ان کے فقہا، صُوفیہ اور متکلّمین نے وضع کیے، اُنھی کی پیروی پر انسان کی فلاح اور نجات کا مدار ہے۔ ان علما سے جب پوچھا جاتا تھا کہ اگر یہی بات ہے تو حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب وغیرہ انبیا علیہم السّلام آخر تمھارے اِن فرقوں میں سے کس سے تعلق رکھتے تھے، تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے، کیونکہ ان کا علم انھیں یہ کہنے کی تو اجازت نہ دیتا تھا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے ہی فرقے سے تھا۔ لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ مان لیتے کہ یہ انبیاؑ نہ یہودی تھے، نہ عیسائی، تو پھر ان کی حجت ہی ختم ہوئی جاتی تھی۔

۱۴۲ — نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد مدینۂ طیبہ میں سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المَقدِس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ پھر کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ؕ

تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔[۱۴۴]

۱۴۳ – یہ ان نادانوں کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اُن کے دماغ تنگ تھے، نظر محدود تھی، سَمت اور مَقام کے بندے بنے ہوئے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ خدا کسی خاص سَمت میں مُقیّد ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ان کے جاہلانہ اعتراض کی تردید میں یہی فرمایا گیا کہ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ کسی سَمت کو قبلہ بنانے کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اللہ اسی طرف ہے۔ جن لوگوں کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے، وہ اس قسم کی تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتے ہیں اور ان کے لیے عالمگیر حقیقتوں کے اِدراک کی راہ کُھل جاتی ہے۔ (مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۱۱۵ و ۱۱۶)

۱۴۴ – یہ اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا اعلان ہے۔ ''اسی طرح'' کا اشارہ دونوں طرف ہے: اللہ کی اُس رہنمائی کی طرف بھی، جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اِس مرتبے پر پہنچے کہ ''اُمّتِ وَسَط'' قرار دیے گئے، اور تحویلِ قبلہ کی طرف بھی کہ نادان اسے محض ایک سَمت سے دُوسری سَمت کی طرف پِھرنا سمجھ رہے ہیں، حالانکہ دراصل بیت المَقدِس سے کعبے کی طرف سَمتِ قبلہ کا پِھرنا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کیا اور اُمّتِ محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔

''اُمّتِ وَسَط'' کا لفظ اس قدر وسیع معنویّت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے، جو عدل و انصاف اور توسّط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تمھیں ''اُمّتِ وَسَط'' اس لیے بنایا گیا ہے کہ ''تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو''، تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا، اُس وقت رسولؐ ہمارے ذمہ دار نمایندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکرِ صحیح اور عملِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم ہم نے اُسے دی تھی، وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد رسولؐ کے قائم مَقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اُٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسولؐ نے جو کچھ تمھیں پہنچایا تھا، وہ تم نے انھیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسول نے تمھیں دکھایا تھا، وہ تم نے انھیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دُنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مَقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے، وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اُمّت کے لیے خدا ترسی، راست روی،

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ

پہلے جس طرف تم رُخ کرتے تھے، اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹا پھر جاتا ہے۔[۱۴۵] یہ معاملہ تھا تو بڑا سخت مگر اُن لوگوں کے لیے کچھ بھی سخت نہ ثابت ہُوا، جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے۔ اللہ تمھارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا،

عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے، اِسی طرح اِس اُمّت کو بھی تمام دنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے، حتّٰی کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ، ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنٰی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بڑی سخت تھی، حتّٰی کہ اگر وہ اِس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے، اُسی طرح دُنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمّہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت، جو تیرے رسولؐ کے ذریعے سے ہمیں پہنچی تھی، تیرے بندوں تک پہنچا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، تو ہم بہت بُری طرح پکڑے جائیں گے اور یہی امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا۔ ہماری امامت کے دَور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں، اُن سب کے لیے ائمّۂ شر اور شیاطینِ اِنس و جنّ کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت، ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا، تو تم کہاں مر گئے تھے۔

۱۴۵ – یعنی اس سے مقصود یہ دیکھنا تھا کہ کون لوگ ہیں جو جاہلیّت کے تعصُّبات اور خاک و خون کی غلامی میں مبتلا ہیں، اور کون ہیں جو ان بندشوں سے آزاد ہو کر حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہیں۔ ایک طرف اہلِ عرب اپنے وطنی و نسلی فخر میں مبتلا تھے اور عرب کے کعبے کو چھوڑ کر باہر کے بیت المَقْدِس کو قبلہ بنانا ان کی اِس قوم پرستی کے بُت پر ناقابلِ برداشت ضرب تھا۔ دُوسری طرف بنی اسرائیل اپنی نسل پرستی کے غرور میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنے آبائی قبلے کے سوا کسی دُوسرے قبلے کو برداشت کرنا ان کے لیے محال تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بت جن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہوں، وہ اُس راستے پر کیسے چل سکتے تھے، جس کی طرف اللہ کا رسولؐ انھیں بُلا رہا تھا۔ اس لیے اللہ نے ان بُت پرستوں کو سچے حق پرستوں سے الگ چھانٹ دینے کے لیے پہلے بیت المَقْدِس کو قبلہ مقرر کیا، تاکہ جو لوگ عَرَبیّت کے بت کی پرستش کرتے ہیں، وہ الگ ہو جائیں۔ پھر اس قبلے کو چھوڑ کر کعبے کو قبلہ بنایا، تاکہ جو اسرائیلیّت کے پرستار ہیں، وہ بھی الگ ہو جائیں۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدۡ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ
فِى السَّمَآءِ‌ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰٮهَا‌ ۖ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ
الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ‌ؕ وَحَيۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ‌ ؕ

یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے۔

یہ تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو، ہم اُسی قبلے کی طرف تمھیں پھیرے دیتے ہیں، جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجدِ حرام کی طرف رُخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔[۱۴۶]

اِس طرح صرف وہ لوگ رسولؐ کے ساتھ رہ گئے، جو کسی بت کے پرستار نہ تھے، محض خدا کے پرستار تھے۔

۱۴۶ - یہ ہے وہ اصل حکم، جو تحویلِ قبلہ کے بارے میں دیا گیا تھا۔ یہ حکم رجب یا شعبان ۲ ہجری میں نازل ہوا۔ ابنِ سعد کی رِوائِت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بِشرؓ بن بَراء بن مَعرُور کے ہاں دعوت پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ظہر کا وقت آ گیا اور آپؐ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکایک وحی کے ذریعے سے یہ آیت نازل ہوئی اور اسی وقت آپؐ اور آپؐ کی اقتدا میں جماعت کے تمام لوگ بیت المَقدِس سے کعبے کے رُخ پھر گئے۔ اس کے بعد مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں اس کی عام مُنادی کی گئی۔ بَراءؓ بن عازِب کہتے ہیں کہ ایک جگہ مُنادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رُکوع میں تھے۔ حکم سنتے ہی سب کے سب اسی حالت میں کعبے کی طرف مُڑ گئے۔ اَنسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ بنی سَلَمہ میں یہ اطلاع دُوسرے روز صبح کی نماز کے وقت پہنچی۔ لوگ ایک رکعت پڑھ چکے تھے کہ ان کے کانوں میں آواز پڑی: ”خبردار رہو! قبلہ بدل کر کعبے کی طرف کر دیا گیا ہے۔“ سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رُخ بدل دیا۔

خیال رہے کہ بیت المَقدِس مدینے سے عین شِمال میں ہے اور کعبہ بالکل جنوب میں۔ نماز باجماعت پڑھتے ہوئے قبلہ تبدیل کرنے میں لامحالہ امام کو چل کر مقتدیوں کے پیچھے آنا پڑا ہو گا اور مقتدیوں کو صرف رُخ ہی نہ بدلنا پڑا ہو گا، بلکہ کچھ نہ کچھ انھیں بھی چل کر اپنی صفیں دُرست کرنی پڑی ہوں گی۔ چنانچہ بعض رِوایات میں یہی تفصیل مذکور بھی ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ”ہم تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں“ اور یہ کہ ”ہم اسی قبلے کی طرف تمھیں پھیرے دیتے ہیں، جسے تم پسند کرتے ہو“، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم آنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اِس کے منتظر تھے۔ آپؐ خود یہ محسوس فرما رہے تھے کہ بنی اسرائیل کی امامت کا دَور ختم ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ بیت المَقدِس کی مرکزیّت بھی رخصت ہوئی۔ اب اصل مرکزِ ابراہیمی کی طرف رُخ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَ
مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ
وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وقف لازم

یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی، خوب جانتے ہیں کہ (تحویلِ قبلہ کا) یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے، مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم ان اہلِ کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ، ممکن نہیں کہ یہ تمھارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں، اور نہ تمھارے لیے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو، اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دُوسرے کے قبلے کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہے، اور اگر تم نے اس علم کے بعد، جو تمھارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی، تو یقیناً تمھارا شمار ظالموں میں ہوگا۔[۱۴۷]

مسجد حرام کے معنیٰ ہیں: حُرمت اور عزّت والی مسجد۔ اس سے مراد وہ عبادت گاہ ہے، جس کے وسط میں خانۂ کعبہ واقع ہے۔

کعبے کی طرف رُخ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی خواہ دُنیا کے کسی کونے میں ہو، اُسے بالکل ناک کی سیدھ میں کعبے کی طرف رُخ کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ہر وقت، ہر شخص کے لیے، ہر جگہ مشکل ہے۔ اسی لیے کعبے کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، نہ کہ کعبے کی سیدھ میں۔ قرآن کی رُو سے ہم اس بات کے لیے ضرور مُکلّف ہیں کہ حتّی الامکان صحیح سَمتِ کعبہ کی تحقیق کریں، مگر اس بات پر مُکلّف نہیں ہیں کہ ضرور بالکل ہی صحیح سَمت معلوم کرلیں۔ جس سَمت کے متعلق ہمیں امکانی تحقیق سے ظنِ غالب حاصل ہو جائے کہ یہ سَمتِ کعبہ ہے، اُدھر نماز پڑھنا یقیناً صحیح ہے۔ اور اگر کہیں آدمی کے لیے سَمتِ قبلہ کی تحقیق مشکل ہو، یا وہ کسی ایسی حالت میں ہو کہ قبلے کی طرف اپنی سَمت قائم نہ رکھ سکتا ہو (مثلاً ریل یا کشتی میں)، تو جس طرف اسے قبلے کا گمان ہو، یا جس طرف رخ کرنا اس کے لیے ممکن ہو، اسی طرف وہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ البتہ اگر دورانِ نماز میں صحیح سَمتِ قبلہ معلوم ہو جائے یا صحیح سَمت کی طرف نماز پڑھنا ممکن ہو جائے، تو نماز کی حالت ہی میں اس طرف پھر جانا چاہیے۔

۱۴۷ – مطلب یہ ہے کہ قبلے کے متعلق جو حُجّت و بحث یہ لوگ کرتے ہیں، اُس کا فیصلہ نہ تو اِس طرح ہو سکتا ہے کہ

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَهٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ
وَ اِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡهُمۡ لَیَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَ هُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلۡحَقُّ
مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۱۴۷﴾ ع وَ لِکُلٍّ وِّجۡهَةٌ
هُوَ مُوَلِّیۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یَاۡتِ
بِکُمُ اللّٰهُ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۴۸﴾

وقف منزل — ع ۱۷ — وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس مقام کو (جسے قبلہ بنایا گیا ہے) ایسا پہچانتے ہیں، جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۱۴۸، مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بُوجھتے حق کو چُھپا رہا ہے۔ یہ قطعی ایک امرِ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔ ع

ہر ایک کے لیے ایک رُخ ہے، جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو۱۴۹۔ جہاں بھی تم ہو گے، اللہ تمھیں پا لے گا۔ اُس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔

دلیل سے انھیں مطمئن کر دیا جائے، کیونکہ یہ تعصّب اور ہٹ دھرمی میں مُبتلا ہیں اور کسی دلیل سے بھی اُس قبلے کو چھوڑ نہیں سکتے، جسے یہ اپنی گروہ بندی کے تعصّبات کی بنا پر پکڑے ہوئے ہیں۔ اور نہ اس کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ان کے قبلے کو اختیار کر لو، کیونکہ ان کا کوئی ایک قبلہ نہیں ہے، جس پر یہ سارے گروہ متفق ہوں اور اسے اختیار کر لینے سے قبلے کا جھگڑا چُک جائے۔ مختلف گروہوں کے مختلف قبلے ہیں۔ ایک کا قبلہ اختیار کر کے بس ایک ہی گروہ کو راضی کر سکو گے۔ دُوسروں کا جھگڑا بدستور باقی رہے گا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے تمھارا یہ کام ہے ہی نہیں کہ تم لوگوں کو راضی کرتے پھرو اور ان سے لین دین کے اُصول پر مُصالحت کیا کرو۔ تمھارا کام تو یہ ہے کہ جو علم ہم نے تمھیں دیا ہے، سب سے بے پروا ہو کر صرف اُسی پر سختی کے ساتھ قائم ہو جاؤ۔ اس سے ہٹ کر کسی کو راضی کرنے کی فکر کرو گے، تو اپنے پیغمبری کے منصب پر ظلم کرو گے اور اُس نعمت کی ناشکری کرو گے، جو دنیا کا امام بنا کر ہم نے تمھیں بخشی ہے۔

۱۴۸ – یہ عرب کا محاورہ ہے۔ جس چیز کو آدمی یقینی طَور پر جانتا ہو اور اُس کے متعلق کسی قسم کا شک و اشتباہ نہ رکھتا ہو، اُسے یُوں کہتے ہیں کہ وہ اس چیز کو ایسا پہچانتا ہے، جیسا اپنی اولاد کو پہچانتا ہے۔ یعنی جس طرح اُسے اپنے بچوں کو پہچاننے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا، اسی طرح وہ بلا کسی شک کے یقینی طور پر اس چیز کو بھی جانتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے علما حقیقت میں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ کعبے کو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا اور اس کے برعکس بیت المقدس

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ
وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ
حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ
مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ
حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَ

تمھارا اگزر جس مقام سے بھی ہو، وہیں سے اپنا رُخ (نماز کے وقت) مسجدِ حرام کی طرف پھیر دو، کیونکہ یہ تمھارے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے، اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔اور جہاں سے بھی تمھارا گزر ہو، اپنا رُخ مسجدِ حرام ہی کی طرف پھیرا کرو، اور جہاں بھی تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو، تاکہ لوگوں کو تمھارے خلاف کوئی حُجّت نہ ملے[۱۵۰]۔۔۔ہاں جو ظالم ہیں، اُن کی زبان کسی حال میں بند نہ ہو گی۔تو اُن سے تم نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو۔۔۔اور

اُس کے ۱۳ سو برس بعد حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں تعمیر ہوا اور اُنھی کے زمانے میں قبلہ قرار پایا۔اس تاریخی واقعے میں ان کے لیے ذرّہ برابر کسی اشتباہ کی گنجایش نہ تھی۔

۱۴۹ – پہلے فقرے اور دُوسرے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے، جسے سامع خود تھوڑے سے غور و فکر سے بھر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز جسے پڑھنی ہوگی، اسے بہر حال کسی نہ کسی سَمت کی طرف تو رُخ کرنا ہی ہوگا۔مگر اصل چیز وہ رُخ نہیں ہے، جس طرف تم مڑتے ہو، بلکہ اصل چیز وہ بھلائیاں ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لیے تم نماز پڑھتے ہو۔لہٰذا سَمت اور مقام کی بحث میں پڑنے کے بجائے تمھیں فکر بھلائیوں کے حُصُول ہی کی ہونی چاہیے۔

۱۵۰ – یعنی ہمارے اس حکم کی پُوری پابندی کرو۔کبھی ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کوئی شخص مقررہ سَمت کے سوا کسی دُوسری سَمت کی طرف نماز پڑھتے دیکھا جائے۔ ورنہ تمھارے دُشمنوں کو تم پر یہ اعتراض کرنے کا موقع مل جائے گا کہ کیا خوب اُمّتِ وَسَط ہے، کیسے اچھے حق پرستی کے گواہ بنے ہیں، جو یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ یہ حکم ہمارے رب کی طرف سے آیا ہے اور پھر اس کی خلاف ورزی بھی کیے جاتے ہیں۔

لِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ
رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَ یُزَكِّیْكُمْ وَ یُعَلِّمُكُمُ
معانقة ۳ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾
۱۸ ع ۵ فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِیْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ ع یٰۤاَیُّهَا
الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ط اِنَّ اللّٰهَ مَعَ

اس لیے کہ مَیں تم پر اپنی نعمت پُوری کر دوں[۱۵۱] اور اس توقع پر کہ میرے اس حکم کی پیروی سے تم اسی[۱۵۲] طرح فلاح کا راستہ پاؤ گے جس طرح (تمھیں اِس چیز سے فلاح نصیب ہوئی کہ) میں نے تمھارے درمیان خود تم میں سے ایک رسولؐ بھیجا، جو تمھیں میری آیات سناتا ہے تمھاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے، جو تم نہ جانتے تھے۔ لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو، کفرانِ نعمت نہ کرو۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر[۱۵۳] اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے

۱۵۱ – نعمت سے مُراد وہی امامت اور پیشوائی کی نعمت ہے، جو بنی اسرائیل سے سَلب کر کے اس اُمّت کو دی گئی تھی۔ دُنیا میں ایک اُمّت کی راست روی کا یہ انتہائی ثمرہ ہے کہ وہ اللہ کے اَمرِ تشریعی سے اقوامِ عالم کی رہنما و پیشوا بنائی جائے اور نوعِ انسانی کو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلانے کی خدمت اس کے سُپرد کی جائے۔ یہ منصب جس اُمّت کو دیا گیا، حقیقت میں اُس پر اللہ کے فضل و انعام کی تکمیل ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ یہاں یہ فرما رہا ہے کہ تحویلِ قبلہ کا یہ حکم دراصل اس منصب پر تمھاری سرفرازی کا نشان ہے، لہٰذا تمھیں اس لیے بھی ہمارے اس حکم کی پیروی کرنی چاہیے کہ ناشکری و نافرمانی کرنے سے کہیں یہ منصب تم سے چھین نہ لیا جائے۔ اس کی پیروی کرو گے، تو یہ نعمت تم پر مکمل کر دی جائے گی۔

۱۵۲ – یعنی اس حکم کی پیروی کرتے ہوئے یہ اُمید رکھو۔ یہ شاہانہ اندازِ بیان ہے۔ بادشاہ کا اپنی شانِ بے نیازی کے ساتھ کسی نوکر سے یہ کہہ دینا کہ ہماری طرف سے فُلاں عنایت و مہربانی کے اُمیدوار رہو، اس بات کے لیے بالکل کافی ہوتا ہے کہ وہ ملازم اپنے گھر شادیانے بجوادے اور اسے مبارک بادیاں دی جانے لگیں۔

۱۵۳ – منصبِ امامت پر مامور کرنے کے بعد اب اس اُمّت کو ضروری ہدایات دی جا رہی ہیں۔ مگر تمام دُوسری

الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ
بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ
الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا

ساتھ ہے۔[۱۵۴] اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انھیں مُردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمھیں ان کی زندگی کا شُعور نہیں ہوتا۔[۱۵۵] اور ہم ضرور تمھیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مُبتلا کر کے تمھاری آزمائش کریں گے۔ اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ

باتوں سے پہلے انھیں جس بات پر مُتنبّہ کیا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ کوئی پھولوں کا بستر نہیں ہے، جس پر آپ حضرات لِٹائے جا رہے ہوں۔ یہ تو ایک عظیم الشّان اور پُرخطر خدمت ہے، جس کا بار اُٹھانے کے ساتھ ہی تم پر ہر قسم کے مصائب کی بارش ہوگی، سخت آزمایشوں میں ڈالے جاؤ گے، طرح طرح کے نقصانات اُٹھانے پڑیں گے۔ اور جب صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے خدا کی راہ میں بڑھتے چلے جاؤ گے، تب تم پر عنایات کی بارش ہوگی۔

۱۵۴- یعنی اس بھاری خدمت کا بوجھ اٹھانے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے، وہ تمھیں دو چیزوں سے حاصل ہوگی: ایک، یہ کہ صبر کی صفت اپنے اندر پرورش کرو۔ دوسرے، یہ کہ نماز کے عمل سے اپنے آپ کو مضبوط کرو۔ آگے چل کر مختلف مَقامات پر اس امر کی تشریحات ملیں گی کہ صبر بہت سے اہم ترین اَخلاقی اوصاف کے لیے ایک جامع عنوان ہے۔ اور حقیقت میں یہ وہ کلیدِ کامیابی ہے، جس کے بغیر کوئی شخص کسی مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح آگے چل کر نماز کے متعلق بھی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ وہ کس کس طرح افرادِ مومنین اور جماعتِ مومنین کو اس کارِ عظیم کے لیے تیار کرتی ہے۔

۱۵۵- موت کا لفظ اور اس کا تصوُّر انسان کے ذہن پر ایک ہمّت شکن اثر ڈالتا ہے۔ اس لیے اس بات سے منع کیا گیا کہ شُہدا فی سبیل اللہ کو مُردہ کہا جائے، کیونکہ اس سے جماعت کے لوگوں میں جذبۂ جہاد و قِتال اور رُوحِ جاں فروشی کے سرد پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے بجائے ہدایت کی گئی کہ اہلِ ایمان اپنے ذہن میں یہ تصوّر جمائے رکھیں کہ جو شخص خدا کی راہ میں جان دیتا ہے، وہ حقیقت میں حیاتِ جاوداں پاتا ہے۔ یہ تصوّر مطابقِ واقعہ بھی ہے اور اس سے رُوحِ شجاعت بھی تازہ ہوتی اور تازہ رہتی ہے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَؕ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓىٕكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ
مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ‌ قف وَ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ
الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ
اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَ مَنْ تَطَوَّعَ

''ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے[۱۵۶]''، انھیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں۔

یقیناً صفا اور مَروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عُمرہ کرے[۱۵۷]، اس کے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ اِن دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کر لے[۱۵۸] اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا

۱۵۶- کہنے سے مُراد صرف زبان سے یہ الفاظ کہنا نہیں ہے، بلکہ دل سے اس بات کا قائل ہونا ہے کہ ''ہم اللہ ہی کے ہیں''، اس لیے اللہ کی راہ میں ہماری جو چیز بھی قربان ہوئی، وہ گویا ٹھیک اپنے مَصرَف میں صَرف ہوئی، جس کی چیز تھی اسی کے کام آ گئی۔ اور یہ کہ ''اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹنا ہے''، یعنی بہرحال ہمیشہ اس دُنیا میں رہنا نہیں ہے۔ آخرکار، دیر یا سویر، جانا خدا ہی کے پاس ہے۔ لہٰذا کیوں نہ اس کی راہ میں جان لڑا کر اس کے حُضُور حاضر ہوں۔ یہ اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ ہم اپنے نفس کی پرورش میں لگے رہیں اور اسی حالت میں، اپنی موت ہی کے وقت پر کسی بیماری یا حادثے کے شکار ہو جائیں۔

۱۵۷- ذُوالحِجّہ کی مقرر تاریخوں میں کعبے کی جو زیارت کی جاتی ہے، اس کا نام حج ہے اور ان تاریخوں کے ماسوا دُوسرے کسی زمانے میں جو زیارت کی جائے وہ عُمرَہ ہے۔

۱۵۸- صَفَا اور مَروَہ مسجدِ حرام کے قریب دو پہاڑیاں ہیں، جن کے درمیان دوڑنا من جملہ اُن مَناسِک کے تھا، جو اللہ تعالیٰ نے حج کے لیے حضرت ابراہیمؑ کو سکھائے تھے۔ بعد میں جب مکہ اور آس پاس کے تمام علاقوں میں مُشرکانہ جاہلیّت پھیل گئی، تو صَفَا پر ''اِساف'' اور مَروَہ پر ''نائلہ'' کے اِستھان بنا لیے گئے اور ان کے گرد طواف ہونے لگا۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اسلام کی روشنی اہلِ عرب تک پہنچی، تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ سوال کھٹکنے لگا کہ آیا صَفَا اور مَروہ کی سَعْی حج کے اصلی مناسک میں سے ہے یا محض زمانۂ شرک کی ایجاد ہے، اور یہ کہ اس سَعْی سے کہیں ہم ایک مشرکانہ

خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ
مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ
لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ
اللّٰعِنُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا
فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

کام کرے گا[۱۵۹]، اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآنحالیکہ ہم انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی اُن پر لعنت بھیجتے ہیں[۱۶۰]۔ البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں اور جو کچھ چُھپاتے تھے، اُسے بیان کرنے لگیں، اُن کو میں معاف کر دُوں گا اور مَیں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

فعل کے مرتکب تو نہیں ہو جائیں گے۔ نیز حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ کے دلوں میں پہلے ہی سے سعی بین الصَّفا والمَرْوَہ کے بارے میں کراہت موجود تھی، کیونکہ وہ مَناۃ کے معتقد تھے اور اِساف و نائلہ کو نہیں مانتے تھے۔ اِنھی وُجوہ سے ضروری ہوا کہ مسجدِ حرام کو قبلہ مقرر کرنے کے موقع پر اُن غلط فہمیوں کو دُور کر دیا جائے جو صَفا و مَرْوَہ کے بارے میں پائی جاتی تھیں، اور لوگوں کو بتا دیا جائے کہ ان دونوں مقامات کے درمیان سعی کرنا حج کے اصلی مَناسِک میں سے ہے، اور یہ کہ ان مقامات کا تقدس خدا کی جانب سے ہے، نہ کہ اہلِ جاہلیّت کی من گھڑت۔

۱۵۹ – یعنی بہتر تو یہ ہے کہ یہ کام دلی رغبت کے ساتھ کرو، ورنہ حکم بجالانے کے لیے تو کرنا ہی ہوگا۔

۱۶۰ – علمائے یہود کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انھوں نے کتاب اللہ کے علم کی اشاعت کرنے کے بجائے اس کو ربّیوں اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود طبقے میں مقید کر رکھا تھا اور عامۂ خلائق تو درکنار، خود یہودی عوام تک کو اس کی ہوا نہ لگنے دیتے تھے۔ پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان کے اندر گمراہیاں پھیلیں، تو علما نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی، بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے ہر اُس ضلالت اور بدعت کو، جس کا رواج عام ہو جاتا، اپنے قول و عمل سے یا اپنے سُکوت سے اُلٹی سندِ جواز عطا کرنے لگے۔ اسی سے بچنے کی تاکید مسلمانوں کو کی جارہی ہے۔ دُنیا کی

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ

جن لوگوں نے کفر کا رَوِیّہ[۱۶۱] اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دی، ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا

ہدایت کا کام جس اُمّت کے سپرد کیا جائے، اُس کا فرض یہ ہے کہ اس ہدایت کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے، نہ یہ کہ بخیل کے مال کی طرح اسے چھپا رکھے۔

۱۶۱ – ''کفر'' کے اصلی معنیٰ چھپانے کے ہیں۔ اسی سے انکار کا مفہوم پیدا ہوا اور یہ لفظ ایمان کے مقابلے میں بولا جانے لگا۔ ایمان کے معنیٰ ہیں: ماننا، قُبول کرنا، تسلیم کر لینا۔ اس کے برعکس کفر کے معنیٰ ہیں: نہ ماننا، رَدّ کر دینا، انکار کرنا۔ قرآن کی رُو سے کفر کے رَوِیّے کی مختلف صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ انسان سرے سے خدا ہی کو نہ مانے، یا اُس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا مالک اور معبُود ماننے سے انکار کر دے، یا اسے واحد مالک اور معبُود نہ مانے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اُس کے احکام اور اُس کی ہدایات کو واحد مَنبعِ علم و قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

تیسرے یہ کہ اُصولاً اس بات کو بھی تسلیم کرلے کہ اسے اللہ ہی کی ہدایت پر چلنا چاہیے، مگر اللہ اپنی ہدایات اور اپنے احکام پہنچانے کے لیے جن پیغمبروں کو واسطہ بناتا ہے، انھیں تسلیم نہ کرے۔

چوتھے یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے اور اپنی پسند یا اپنے تعصُّبات کی بنا پر ان میں سے کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔

پانچویں یہ کہ پیغمبروں نے خدا کی طرف سے عقائد، اَخلاق اور قوانینِ حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں، اُن کو، یا اُن میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرے۔

چھٹے یہ کہ نظریّے کے طور پر تو ان سب چیزوں کو مان لے، مگر عملاً احکامِ الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے، اور دنیوی زندگی میں اپنے رَوِیّے کی بنا اطاعت پر نہیں بلکہ نافرمانی ہی پر رکھے۔

یہ سب مختلف طرزِ فکر و عمل اللہ کے مقابلے میں باغیانہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک رَوِیّے کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مَقامات پر قرآن میں کفر کا لفظ کُفرانِ نعمت کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوا ہے اور شُکر کے مقابلے میں بولا گیا ہے۔ شُکر کے معنیٰ یہ ہیں کہ نعمت جس نے دی ہے انسان اس کا احسان مند ہو، اس کے احسان کی قدر کرے، اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کی رضا کے مطابق استعمال کرے، اور اُس کا دل اپنے محسن کے لیے وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو۔ اس کے مقابلے میں کفر یا کفرانِ نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے مُحسن کا احسان ہی نہ مانے اور اسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی

عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ ﴿۱۶۲﴾ وَ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ
ع ۱۹ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۶۳﴾ ع اِنَّ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ
وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِىۡ تَجۡرِىۡ فِى الۡبَحۡرِ بِمَا يَنۡفَعُ
النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ
مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّتَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ
الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

میں تخفیف ہوگی اور نہ انھیں پھر کوئی دُوسری مُہلت دی جائے گی۔

تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے، اُس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ؑ (اِس حقیقت کو پہچاننے کے لیے اگر کوئی نشانی اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں، اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دُوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اُوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اِسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابعِ فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔[۱۶۲]

عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے، یا اُس کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اسے ضائع کر دے، یا اُس کی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے، یا اس کے احسانات کے باوجود اس کے ساتھ غدر اور بے وفائی کرے۔ اس نوع کے کفر کو ہماری زبان میں بالعموم احسان فراموشی، نمک حرامی، غداری اور ناشکرے پن کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱۶۲ – یعنی اگر انسان کائنات کے اس کارخانے کو، جو شب و روز اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، محض جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ عقل سے کام لے کر اس نظام پر غور کرے، اور ضد یا تعصّب سے آزاد ہو کر سوچے، تو یہ آثار جو اس کے مُشاہدے میں آ رہے ہیں، اس نتیجے پر پہنچانے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ یہ عظیم الشان نظام ایک ہی قادرِ مُطلق حکیم کے زیرِ فرمان ہے، تمام اختیار و اقتدار بالکل اُسی ایک کے ہاتھ میں ہے، کسی دُوسرے کی خود مختارانہ مداخلت یا مشارکت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ

(مگر وحدتِ خداوندی پر دلالت کرنے والے اِن کھُلے کھُلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دُوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِّمقابل بناتے ہیں[۱۶۳] اور اُن کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے ـــــ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں[۱۶۴] ـــــ کاش! جو کچھ عذاب کو سامنے دیکھ کر انھیں سُوجھنے والا ہے وہ

کے لیے اس نظام میں ذرہ برابر کوئی گنجایش نہیں، لہٰذا فی الحقیقت وہی ایک خدا تمام موجوداتِ عالَم کا خدا ہے، اس کے سوا کوئی دُوسری ہستی کسی قسم کے اختیارات رکھتی ہی نہیں کہ خدائی اور اُلوہیّت میں اس کا کوئی حصّہ ہو۔

۱۶۳- یعنی خدائی کی جو صفات اللہ کے لیے خاص ہیں، اُن میں سے بعض کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حُقوق ہیں، وہ سب یا اُن میں سے بعض حقوق یہ لوگ اُن دُوسرے بناوٹی معبُودوں کو ادا کرتے ہیں۔ مثلاً سلسلۂ اسباب پر حکمرانی، حاجت روائی، مشکل کُشائی، فریادرسی، دُعائیں سننا اور غیب وشہادت کی ہر چیز سے واقف ہونا، یہ سب اللہ کی مخصُوص صفات ہیں۔ اور یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اُسی کو مقتدرِ اعلیٰ مانیں، اُسی کے آگے اعترافِ بندگی میں سر جُھکائیں، اُسی کی طرف اپنی حاجتوں میں رُجوع کریں، اُسی کو مدد کے لیے پکاریں، اُسی پر بھروسا کریں، اُسی سے اُمیدیں وابستہ کریں اور اُسی سے ظاہر و باطن میں ڈریں۔ اِسی طرح مالک المُلک ہونے کی حیثیت سے یہ منصب بھی اللہ ہی کا ہے کہ اپنی رعیّت کے لیے حلال وحرام کے حُدُود مقرر کرے، ان کے فرائض وحقوق مُعیّن کرے، ان کو امرونہی کے احکام دے، اور انھیں یہ بتائے کہ اس کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے وسائل کو وہ کس طرح، کن کاموں میں، کن مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ اور یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ بندے اس کی حاکمیّت تسلیم کریں، اس کے حکم کو مَنبعِ قانون مانیں، اسی کو امرونہی کا مختار سمجھیں، اپنی زندگی کے معاملات میں اس کے فرمان کو فیصلہ کُن قرار دیں، اور ہدایت و رہنمائی کے لیے اُسی کی طرف رُجوع کریں۔ جو شخص خدا کی اِن صفات میں سے کسی صفت کو بھی کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے، اور اُس کے اِن حقوق میں سے کوئی ایک حق بھی کسی دُوسرے کو دیتا ہے، وہ دراصل اُسے خدا کا مدِّمقابل اور ہمسر بناتا ہے۔ اور اسی طرح جو شخص یا جو ادارہ اِن صفات میں سے کسی صِفَت کا مدّعی ہو اور ان حقوق میں سے کسی حق کا انسانوں سے مطالبہ کرتا ہو، وہ بھی دراصل خدا کا مدِّمقابل اور ہمسر بنتا ہے، خواہ زبان سے خدائی کا دعویٰ کرے یا نہ کرے۔

۱۶۴- یعنی ایمان کا اِقتضا یہ ہے کہ آدمی کے لیے اللہ کی رضا ہر دُوسرے کی رضا پر مقدّم ہو اور کسی چیز کی

ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ
شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا
مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ
وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع

آج ہی ان ظالموں کو سُوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔ جب وہ سزا دے گا اس وقت کیفیت یہ ہوگی کہ وہی پیشوا اور رہنما، جن کی دُنیا میں پیروی کی گئی تھی، اپنے پیروؤں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے، مگر سزا پا کر رہیں گے اور ان کے سارے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا۔ اور وہ لوگ جو دُنیا میں اُن کی پیروی کرتے تھے، کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں، ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے۔[۱۶۵] یُوں اللہ اِن لوگوں کے وہ اعمال جو یہ دُنیا میں کر رہے ہیں، ان کے سامنے اِس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے ؏

محبت بھی انسان کے دل میں یہ مرتبہ اور مقام حاصل نہ کرلے کہ وہ اللہ کی محبت پر اسے قربان نہ کر سکتا ہو۔

۱۶۵ – یہاں خاص طور پر گمراہ کرنے والے پیشواؤں اور لیڈروں اور اُن کے نادان پیروؤں کے انجام کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ جس غلطی میں مُبتلا ہو کر پچھلی اُمتیں بھٹک گئیں، اس سے مسلمان ہوشیار رہیں، اور رہبروں میں امتیاز کرنا سیکھیں، اور غلط رہبری کرنے والوں کے پیچھے چلنے سے بچیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ
وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ
لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ
اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾
وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا

لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انھیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو۔[۱۶۶] وہ تمھارا کھلا دشمن ہے، تمھیں بدی اور فُحش کا حکم دیتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلّق تمھیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ نے فرمائی ہیں۔[۱۶۷]

ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں اُن کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔[۱۶۸] اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انھی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟ یہ لوگ جنھوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے اِن کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا

۱۶۶ – یعنی کھانے پینے کے معاملے میں اُن تمام پابندیوں کو توڑ ڈالو جو توہّمات اور جاہلانہ رسموں کی بنا پر لگی ہوئی ہیں۔

۱۶۷ – یعنی ان وہمی رسموں اور پابندیوں کے متعلق یہ خیال کہ یہ سب مذہبی اُمور ہیں جو خدا کی طرف سے تعلیم کیے گئے ہیں، دراصل شیطانی اِغوا کا کرشمہ ہے۔ اس لیے کہ فی الواقع ان کے مِن جانبِ اللہ ہونے کی کوئی سند موجود نہیں ہے۔

۱۶۸ – یعنی ان پابندیوں کے لیے ان کے پاس کوئی سند اور کوئی حُجّت اس کے سوا نہیں ہے کہ باپ دادا سے

دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ یٰۤاَیُّهَا
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا
لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ

کچھ نہیں سُنتے۔[۱۶۹] یہ بہرے ہیں، گُونگے ہیں، اندھے ہیں، اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں اُنھیں بے تکلّف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔[۱۷۰] اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو

یُوں ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ نادان سمجھتے ہیں کہ کسی طریقے کی پیروی کے لیے یہ حُجّت بالکل کافی ہے۔

۱۶۹– اس تمثیل کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ ان لوگوں کی حالت اُن بے عقل جانوروں کی سی ہے جن کے گلّے اپنے اپنے چرواہوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں اور بغیر سمجھے بُوجھے ان کی صداؤں پر حرکت کرتے ہیں۔ اور دُوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کو دعوت و تبلیغ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا جانوروں کو پکارا جا رہا ہے جو فقط آواز سُنتے ہیں، مگر کچھ نہیں سمجھتے کہ کہنے والا اُن سے کیا کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے الفاظ ایسے جامع استعمال فرمائے ہیں کہ یہ دونوں پہلو ان کے تحت آ جاتے ہیں۔

۱۷۰– یعنی اگر تم ایمان لا کر صرف خدائی قانون کے پَیرو بن چکے ہو، جیسا کہ تمھارا دعویٰ ہے، تو پھر وہ ساری چُھوت چھات، اور زمانۂ جاہلیّت کی وہ ساری بندشیں اور پابندیاں توڑ ڈالو جو پنڈتوں اور پروہتوں نے، رِبّیوں اور پادریوں نے، جوگیوں اور راہبوں نے اور تمھارے باپ دادا نے قائم کی تھیں۔ جو کچھ خدا نے حرام کیا ہے اس سے تو ضرور بچو، مگر جن چیزوں کو خدا نے حلال کیا ہے، انھیں بغیر کسی کراہت اور رکاوٹ کے کھاؤ پیو۔ اسی مضمون کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ مَنْ صَلّٰی صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِیْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الخ یعنی جس نے وہی نماز پڑھی جو ہم پڑھتے ہیں اور اسی قبلے کی طرف رُخ کیا جس کی طرف ہم رُخ کرتے ہیں اور ہمارے ذبیحے کو کھایا، وہ مسلمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھنے اور قبلے کی طرف رُخ کرنے کے باوجود ایک شخص اس وقت تک اسلام میں پوری طرح جذب نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کھانے پینے کے معاملے میں پچھلی جاہلیت کی پابندیوں کو توڑ نہ دے اور اُن توہُّمات کی بندشوں سے آزاد نہ ہو جائے جو اہلِ جاہلیّت نے قائم کر رکھی تھیں۔ کیونکہ اُس کا اُن پابندیوں پر قائم رہنا اِس بات کی علامت ہے کہ ابھی تک اُس کی رگ و پے میں جاہلیّت کا زہر موجود ہے۔

الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ
اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ
يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ

وہ یہ ہے کہ مُردار نہ کھاؤ، خُون سے اور سُؤر کے گوشت سے پرہیز کرو، اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔[۱۷۱] ہاں جو شخص مجبُوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھا لے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[۱۷۲]

حق یہ ہے کہ جو لوگ اُن احکام کو چُھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کیے ہیں اور تھوڑے سے دُنیوی فائدوں پر انھیں بھینٹ چڑھاتے ہیں وہ دراصل اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں۔[۱۷۳]

---

۱۷۱ – اس کا اطلاق اُس جانور کے گوشت پر بھی ہوتا ہے جسے خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، اور اُس کھانے پر بھی ہوتا ہے جو اللہ کے سوا کسی اَور کے نام پر بطور نذر کے پکایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جانور ہو یا غلّہ یا اور کوئی کھانے کی چیز، دراصل اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اللہ ہی نے وہ چیز ہم کو عطا کی ہے۔ لہٰذا اعترافِ نعمت یا صدقہ، یا نذر و نیاز کے طور پر اگر کسی کا نام ان چیزوں پر لیا جا سکتا ہے تو وہ صرف اللہ ہی کا نام ہے۔ اس کے سوا کسی دُوسرے کا نام لینا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ ہم خدا کے بجائے یا خدا کے ساتھ اس کی بالاتری بھی تسلیم کر رہے ہیں اور اس کو بھی مُنعم سمجھتے ہیں۔

۱۷۲ – اس آیت میں حرام چیز کے استعمال کرنے کی اجازت تین شرطوں کے ساتھ دی گئی ہے: ایک، یہ کہ واقعی مجبُوری کی حالت ہو۔ مثلاً بھوک یا پیاس سے جان پر بن گئی ہو، یا بیماری کی وجہ سے جان کا خطرہ ہو اور اس حالت میں حرام چیز کے سوا اور کوئی چیز میسر نہ ہو۔ دوسرے، یہ کہ خدا کے قانون کو توڑنے کی خواہش دل میں موجود نہ ہو۔ تیسرے، یہ کہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ مثلاً حرام چیز کے چند لقمے یا چند قطرے یا چند گھونٹ اگر جان بچا سکتے ہوں تو ان سے زیادہ اس چیز کا استعمال نہ ہونے پائے۔

۱۷۳ – مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں میں یہ جتنے غلط توہّمات پھیلے ہیں اور باطل رسموں اور بے جا پابندیوں کی جو نئی شریعتیں بن گئی ہیں، ان سب کی ذمہ داری ان علما پر ہے جن کے پاس کتابِ الٰہی کا علم تھا مگر انھوں نے عامۂ خلائق تک

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى
وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ
بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا
فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا ع
وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ

قیامت کے روز اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا، نہ اُنھیں پاکیزہ ٹھیرائے گا،[۱۷۴] اور اُن کے لیے دردناک سزا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مُول لے لیا۔ کیسا عجیب ہے ان کا حوصلہ کہ جہنّم کا عذاب برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں! یہ سب کچھ اس وجہ سے ہُوا کہ اللہ نے توٹھیک ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلافات نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دُور نکل گئے۔ ع
نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلیے یا مغرب کی طرف،[۱۷۵] بلکہ نیکی یہ ہے

اس علم کو نہ پہنچایا۔ پھر جب لوگوں میں جہالت کی وجہ سے غلط طریقے رواج پانے لگے تو اس وقت بھی وہ ظالم منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ بلکہ ان میں سے بہتوں نے اپنا فائدہ اسی میں دیکھا کہ کتاب اللہ کے احکام پر پردہ ہی پڑا رہے۔

۱۷۴ – یہ دراصل ان پیشواؤں کے جھوٹے دعووں کی تردید اور ان غلط فہمیوں کا رد ہے جو اُنھوں نے عام لوگوں میں اپنے متعلق پھیلا رکھی ہیں۔ وہ ہر ممکن طریقے سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، اور لوگ بھی ان کے متعلق ایسا ہی گمان رکھتے ہیں کہ ان کی ہستیاں بڑی ہی پاکیزہ اور مقدس ہیں، اور جو اُن کا دامن گرفتہ ہو جائے گا، اس کی سفارش کر کے وہ اللہ کے ہاں اُسے بخشوا لیں گے۔ جواب میں اللہ فرماتا ہے کہ ہم انھیں ہرگز منہ نہ لگائیں گے اور نہ انھیں پاکیزہ قرار دیں گے۔

۱۷۵ – مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنے کو تو محض بطورِ تمثیل بیان کیا گیا ہے، دراصل مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ
وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ
وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا
عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۗ

کہ آدمی اللہ کو اور یومِ آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبّت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اُسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے لیے قتل کے مقدّموں میں قِصاص[۱۷۶] کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔

کہ مذہب کی چند ظاہری رسموں کو ادا کر دینا اور صرف ضابطے کی خانہ پُری کے طور پر چند مقرر مذہبی اعمال انجام دینا اور تقویٰ کی چند معروف شکلوں کا مظاہرہ کر دینا وہ حقیقی نیکی نہیں ہے، جو اللہ کے ہاں وزن اور قدر رکھتی ہے۔

۱۷۶ – قِصاص، یعنی خُون کا بدلہ، یہ کہ آدمی کے ساتھ وہی کیا جائے، جو اُس نے دُوسرے آدمی کے ساتھ کیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قاتل نے جس طریقے سے مقتول کو قتل کیا ہو، اُسی طریقے سے اس کو قتل کیا جائے، بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جان لینے کا جو فعل اُس نے مقتول کے ساتھ کیا ہے، وہی اُس کے ساتھ کیا جائے۔

اَلۡحُرُّ بِالۡحُرِّ وَالۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَالۡاُنۡثٰی بِالۡاُنۡثٰی ؕ فَمَنۡ عُفِیَ
لَہٗ مِنۡ اَخِیۡہِ شَیۡءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَیۡہِ بِاِحۡسَانٍ ؕ

آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے، اور عورت اِس جُرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قِصاص[۱۷۷] لیا جائے۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار[۱۷۸] ہو، تو مَعْرُوف طریقے[۱۷۹] کے مطابق خُوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خُوں بہا ادا کرے۔

۱۷۷- جاہلیّت کے زمانے میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے، اتنی ہی قیمت کا خون اُس خاندان، یا قبیلے، یا قوم سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اُسے مارا ہو۔ محض مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لے لینے سے ان کا دل ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ بیسیوں اور سیکڑوں سے لینا چاہتے تھے۔ ان کا کوئی معزز آدمی اگر دُوسرے گروہ کے کسی چھوٹے آدمی کے ہاتھوں مارا گیا ہو، تو وہ اصلی قاتل کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ قاتل کے قبیلے کا بھی کوئی ویسا ہی معزّز آدمی مارا جائے، یا اُس کے کئی آدمی ان کے مقتول پر سے صدقہ کیے جائیں۔ برعکس اس کے اگر مقتول اُن کی نگاہ میں کوئی ادنیٰ درجے کا شخص، اور قاتل کوئی زیادہ قدر و عزّت رکھنے والا شخص ہوتا، تو وہ اس بات کو گوارا نہ کرتے تھے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لی جائے۔ اور یہ حالت کچھ قدیم جاہلیت ہی میں نہ تھی۔ موجودہ زمانے میں جن قوموں کو انتہائی مہذّب سمجھا جاتا ہے، اُن کے باقاعدہ سرکاری اعلانات تک میں بسا اوقات یہ بات بغیر کسی شرم کے دنیا کو سنائی جاتی ہے کہ ہمارا ایک آدمی مارا جائے گا تو ہم قاتل کی قوم کے پچاس آدمیوں کی جان لیں گے۔ اکثر یہ خبریں ہمارے کان سنتے ہیں کہ ایک شخص کے قتل پر مغلوب قوم کے اتنے یرغمال گولی سے اُڑائے گئے۔ ایک ”مہذّب“ قوم نے اسی بیسویں صدی میں اپنے ایک فرد (سرلی اسٹیک) کے قتل کا بدلہ پوری مصری قوم سے لے کر چھوڑا۔ دُوسری طرف ان نام نہاد مہذّب قوموں کی باضابطہ عدالتوں تک کا یہ طرزِ عمل رہا ہے کہ اگر قاتل حاکم قوم کا فرد ہو اور مقتول کا تعلق محکوم قوم سے ہو، تو ان کے جج قِصاص کا فیصلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہی خرابیاں ہیں، جن کے سدِّباب کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل اور صرف قاتل ہی کی جان لی جائے، قطعِ نظر اس سے کہ قاتل کون ہے اور مقتول کون۔

۱۷۸- ”بھائی“ کا لفظ فرما کر نہایت لطیف طریقے سے نرمی کی سِفارش بھی کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے اور دُوسرے شخص کے درمیان باپ مارے کا بیر ہی سہی، مگر ہے تو وہ تمھارا انسانی بھائی۔ لہٰذا اگر اپنے ایک خطا کار بھائی کے مقابلے میں انتقام کے غصّے کو پی جاؤ، تو یہ تمھاری انسانیت کے زیادہ شایانِ شان ہے۔۔۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلامی قانونِ تعزیرات میں قتل تک کا معاملہ قابلِ راضی نامہ ہے۔ مقتول کے وارثوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ قاتل کو معاف

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ
ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ
يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ

یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے[۱۸۰]، اس کے لیے درد ناک سزا ہے ـــــ عقل وخِرَد رکھنے والو! تمھارے لیے قِصاص میں زندگی ہے[۱۸۱]۔ اُمّید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو، تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے

کر دیں اور اس صورت میں عدالت کے لیے جائز نہیں کہ قاتل کی جان ہی لینے پر اصرار کرے۔ البتہ جیسا کہ بعد کی آیت میں ارشاد ہوا، معافی کی صورت میں قاتل کو خوں بہا ادا کرنا ہوگا۔

۱۷۹ – ''مَعْرُوْف'' کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہُوا ہے۔ اس سے مراد وہ صحیح طریقِ کار ہے، جس سے بالعُموم انسان واقف ہوتے ہیں، جس کے متعلق ہر وہ شخص، جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو، یہ بول اُٹھے کہ بے شک حق اور انصاف یہی ہے اور یہی مناسب طریقِ عمل ہے۔ رواجِ عام (Common Law) کو بھی اسلامی اصطلاح میں ''عُرف'' اور ''معروف'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور وہ ایسے تمام معاملات میں معتبر ہے، جن کے بارے میں شریعت نے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔

۱۸۰ – مثلاً یہ کہ مقتول کا وارث خوں بہا وصول کر لینے کے بعد پھر انتقام لینے کی کوشش کرے، یا قاتل خوں بہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور مقتول کے وارث نے جو احسان اس کے ساتھ کیا ہے، اس کا بدلہ احسان فراموشی سے دے۔

۱۸۱ – یہ ایک دُوسری جاہلیّت کی تردید ہے، جو پہلے بھی بہت سے دماغوں میں موجود تھی اور آج بھی بکثرت پائی جاتی ہے۔ جس طرح اہلِ جاہلیت کا ایک گروہ انتقام کے پہلو میں افراط کی طرف چلا گیا، اسی طرح ایک دُوسرا گروہ عفو کے پہلو میں تفریط کی طرف گیا ہے اور اس نے سزائے موت کے خلاف اتنی تبلیغ کی ہے کہ بہت سے لوگ اس کو ایک نفرت انگیز چیز سمجھنے لگے ہیں اور دُنیا کے متعدد ملکوں نے اسے بالکل منسوخ کر دیا ہے۔ قرآن اسی پر اہلِ عقل کو مُخاطَب کر کے تنبیہ کرتا ہے کہ قِصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے۔ جو سوسائٹی انسانی جان کا احترام نہ کرنے والوں کی جان کو

وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ حَقًّا عَلَی الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنۡۢ بَدَّلَہٗ
بَعۡدَ مَا سَمِعَہٗ فَاِنَّمَاۤ اِثۡمُہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ یُبَدِّلُوۡنَہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ
سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۸۱﴾ؕ فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا
فَاَصۡلَحَ بَیۡنَہُمۡ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲ ۶

وصیّت کرے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔[۱۸۲] پھر جنھوں نے وصیت سنی اور بعد میں اُسے بدل ڈالا، تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہوگا۔ اللہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ البتہ جس کو یہ اندیشہ ہو کہ وصیّت کرنے والے نے نادانستہ یا قصداً حق تلفی کی ہے، اور پھر معاملے سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان وہ اصلاح کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

محترم ٹھیراتی ہے، وہ دراصل اپنی آستین میں سانپ پالتی ہے۔ تم ایک قاتل کی جان بچا کر بہت سے بے گناہ انسانوں کی جانیں خطرے میں ڈالتے ہو۔

۱۸۲ – یہ حکم اُس زمانے میں دیا گیا تھا، جب کہ وِراثت کی تقسیم کے لیے ابھی کوئی قانون مقرر نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت ہر شخص پر لازم کیا گیا کہ وہ اپنے وارثوں کے حصّے بذریعۂ وصیّت مقرر کر جائے، تاکہ اس کے مرنے کے بعد نہ تو خاندان میں جھگڑے ہوں اور نہ کسی حق دار کی حق تلفی ہونے پائے۔ بعد میں جب تقسیمِ وراثت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود ایک ضابطہ بنا دیا (جو آگے سورۂ نساء میں آنے والا ہے)، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ وصیّت اور احکامِ میراث کی توضیح میں حسبِ ذیل دو قاعدے بیان فرمائے:

ایک یہ کہ اب کوئی شخص کسی وارث کے حق میں وصیّت نہیں کر سکتا، یعنی جن رشتے داروں کے حصّے قرآن میں مقرر کر دیے گئے ہیں، ان کے حصوں میں نہ تو وصیّت کے ذریعے سے کوئی کمی یا بیشی کی جا سکتی ہے، نہ کسی وارث کو میراث سے محروم کیا جا سکتا ہے، اور نہ کسی وارث کو اس کے قانونی حصّے کے علاوہ کوئی چیز بذریعۂ وصیّت دی جا سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ وصیّت کل جائداد کے صرف ایک تہائی حصّے کی حد تک کی جا سکتی ہے۔

اِن دو تشریحی ہدایات کے بعد اب اس آیت کا منشا یہ قرار پاتا ہے کہ آدمی اپنا کم از کم دو تہائی مال تو اس لیے چھوڑ دے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ حسبِ قاعدہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی حد تک اسے اپنے اُن غیر وارث رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنی چاہیے، جو اس کے اپنے گھر میں یا اس کے

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ
عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا
مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ
مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ
طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے، جس طرح تم سے پہلے انبیا کے پیرووں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔[۱۸۳] چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دُوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے،[۱۸۴] تو یہ اُسی کے لیے بہتر ہے۔

خاندان میں مدد کے مستحق ہوں، یا جنھیں وہ خاندان کے باہر محتاجِ اعانت پاتا ہو، یا رفاہِ عام کے کاموں میں سے جس کی بھی وہ مدد کرنا چاہے۔ بعد کے لوگوں نے وصیّت کے اس حکم کو محض ایک سفارشی حکم قرار دے دیا، یہاں تک کہ بالعموم وصیّت کا طریقہ منسوخ ہی ہو کر رہ گیا۔ لیکن قرآنِ مجید میں اسے ایک حق قرار دیا گیا ہے، جو خدا کی طرف سے متقی لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔ اگر اس حق کو ادا کرنا شروع کر دیا جائے، تو بہت سے وہ سوالات خود ہی حل ہو جائیں، جو میراث کے بارے میں لوگوں کو اُلجھن میں ڈالتے ہیں۔ مثلاً اُن پوتوں اور نواسوں کا معاملہ جن کے ماں باپ دادا اور نانا کی زندگی میں مر جاتے ہیں۔

۱۸۳ – اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیّت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں مسلمانوں کو صرف ہر مہینے تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ پھر ۲ ہجری میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا، مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں، وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دُوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ یا دُودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لیے، جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا اور انھیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں جتنے رمضان میں اُن سے چھوٹ گئے ہیں۔

۱۸۴ – یعنی ایک سے زیادہ آدمیوں کو کھانا کھلائے، یا یہ کہ روزہ بھی رکھے اور مسکین کو کھانا بھی کھلائے۔

وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ

لیکن اگر تم سمجھو، تو تمھارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔ ۱۸۵

رمضان وہ مہینا ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے، جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے، اُس کو لازم ہے کہ اِس پُورے مہینے کے روزے رکھے۔ اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، تو وہ دُوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ ۱۸۶

۱۸۵ – یہاں تک وہ ابتدائی حکم ہے، جو رمضان کے روزوں کے متعلق ۲ ہجری میں جنگِ بدر سے پہلے نازل ہوا تھا۔ اس کے بعد کی آیات اس کے ایک سال بعد نازل ہوئیں اور مناسبتِ مضمون کی وجہ سے اسی سلسلۂ بیان میں شامل کر دی گئیں۔

۱۸۶ – سفر کی حالت میں روزہ رکھنا یا نہ رکھنا آدمی کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو صحابہؓ سفر میں جایا کرتے تھے، اُن میں سے کوئی روزہ رکھتا تھا اور کوئی نہ رکھتا تھا، اور دونوں گروہوں میں سے کوئی دُوسرے پر اعتراض نہ کرتا تھا۔ خود آنحضرتؐ نے بھی کبھی سفر میں روزہ رکھا ہے اور کبھی نہیں رکھا ہے۔ ایک سفر کے موقع پر ایک شخص بدحال ہو کر گر گیا اور اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر دریافت فرمایا: کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا: روزے سے ہے۔ فرمایا: یہ نیکی نہیں ہے۔ جنگ کے موقع پر تو آپؐ حکماً روزے سے روک دیا کرتے تھے، تاکہ دشمن سے لڑنے میں کمزوری لاحق نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی رِوایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو مرتبہ رمضان میں جنگ پر گئے۔ پہلی مرتبہ جنگِ بدر میں اور آخری مرتبہ فتحِ مکہ کے موقع پر، اور دونوں مرتبہ ہم نے روزے چھوڑ دیے۔ ابنِ عمرؓ کا بیان ہے کہ فتحِ مکہ کے موقع پر حضورؐ نے فرما دیا تھا کہ انه یوم قتال فافطروا۔ دُوسری رِوایات میں یہ الفاظ ہیں کہ انکم قد دنوتم من عدوکم فافطروا اقویٰ لکم۔ یعنی دشمن سے مقابلہ درپیش ہے، روزے چھوڑ دو، تاکہ تمھیں لڑنے کی قوت حاصل ہو۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

اللہ تمھارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ طریقہ تمھیں بتایا جارہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز کیا ہے، اُس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔[۱۸۷]

عام سفر کے معاملے میں یہ بات کہ کتنی مَسافت کے سفر پر روزہ چھوڑا جاسکتا ہے، حضوؐر کے کسی ارشاد سے واضح نہیں ہوتی اور صحابۂ کرامؓ کا عمل اس باب میں مختلف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ جس مَسافت پر عرفِ عام میں سفر کا اِطلاق ہوتا ہے اور جس میں مسافرانہ حالت انسان پر طاری ہوتی ہے، وہ افطار کے لیے کافی ہے۔

یہ امر مُتَّفَق عَلَیہ ہے کہ جس روز آدمی سفر کی ابتدا کر رہا ہو، اُس دن کا روزہ افطار کرلینے کا اُسے اختیار ہے۔ چاہے تو گھر سے کھانا کھا کر چلے، اور چاہے تو گھر سے نکلتے ہی کھالے۔ دونوں عمل صحابہؓ سے ثابت ہیں۔

یہ امر کہ اگر کسی شہر پر دشمن کا حملہ ہو، تو کیا لوگ مقیم ہونے کے باوجود جہاد کی خاطر روزہ چھوڑ سکتے ہیں، علما کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ بعض علما اس کی اجازت نہیں دیتے۔ مگر علّامہ ابنِ تیمیہؒ نے نہایت قوی دلائل کے ساتھ فتویٰ دیا تھا کہ ایسا کرنا بالکل جائز ہے۔

۱۸۷ - یعنی اللہ نے صرف رمضان ہی کے دنوں کو روزوں کے لیے مخصوص نہیں کر دیا ہے، بلکہ جو لوگ رمضان میں کسی عذرِ شرعی کی بنا پر روزے نہ رکھ سکیں، اُن کے لیے دُوسرے دنوں میں اُس کی قضا کرلینے کا راستہ بھی کھول دیا ہے، تاکہ قرآن کی جو نعمت اس نے تم کو دی ہے، اس کا شکر ادا کرنے کے قیمتی موقع سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ رمضان کے روزوں کو صرف عبادت اور صرف تقویٰ کی تربیت ہی نہیں قرار دیا گیا ہے، بلکہ اُنھیں مزید برآں اس عظیم الشان نعمتِ ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ بھی ٹھیرایا گیا ہے، جو قرآن کی شکل میں اُس نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دانش مند انسان کے لیے کسی نعمت کی شکر گزاری اور کسی احسان کے اعتراف کی بہترین صورت اگر ہوسکتی ہے، تو وہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرے، جس کے لیے عطا کرنے والے نے وہ نعمت عطا کی ہو۔ قرآن ہم کو اس لیے عطا فرمایا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کا راستہ جان کر خود اس پر چلیں اور دنیا کو اس پر چلائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم کو تیار کرنے کا بہترین ذریعہ روزہ ہے۔ لہٰذا نزولِ قرآن کے مہینے میں ہماری روزہ داری صرف عبادت ہی نہیں ہے، اور صرف اَخلاقی تربیت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ خود اِس نعمتِ قرآن کی بھی صحیح اور موزوں شکر گزاری ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ
الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ
يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى
نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ

اور اے نبیؐ! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو اُنھیں بتا دو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اُس کی پکار سُنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔[۱۸۸] یہ بات تم اُنھیں سُنا دو، شاید کہ وہ راہِ راست پالیں۔[۱۸۹]

تمھارے لیے روزوں کے زمانے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں، اور تم اُن کے لیے۔[۱۹۰] اللہ کو معلوم ہو گیا کہ

---

۱۸۸ – یعنی اگرچہ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے حواس سے مجھ کو محسوس کر سکتے ہو، لیکن یہ خیال نہ کرو کہ میں تم سے دُور ہوں۔ نہیں، میں اپنے ہر بندے سے اتنا قریب ہوں کہ جب وہ چاہے، مجھ سے عرض معروض کر سکتا ہے، حتّٰی کہ دل ہی دل میں وہ جو کچھ مجھ سے گزارش کرتا ہے، میں اُسے بھی سُن لیتا ہوں اور صرف سنتا ہی نہیں، فیصلہ بھی صادر کرتا ہوں۔ جن بے حقیقت اور بے اختیار ہستیوں کو تم نے اپنی نادانی سے الٰہ اور رب قرار دے رکھا ہے، اُن کے پاس تو تمھیں دوڑ دوڑ کر جانا پڑتا ہے اور پھر بھی نہ وہ تمھاری شُنوائی کر سکتے ہیں اور نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ تمھاری درخواستوں پر کوئی فیصلہ صادر کر سکیں۔ مگر میں کائناتِ بے پایاں کا فرماں روائے مُطلَق، تمام اختیارات اور تمام طاقتوں کا مالک، تم سے اتنا قریب ہوں کہ تم خود بغیر کسی واسطے اور وسیلے اور سِفارش کے براہِ راست ہر وقت اور ہر جگہ مجھ تک اپنی عرضیاں پہنچا سکتے ہو۔ لہٰذا تم اپنی اس نادانی کو چھوڑ دو کہ ایک ایک بے اختیار بناوٹی خدا کے دَر پر مارے مارے پھرتے ہو۔ میں جو دعوت تمھیں دے رہا ہوں، اس پر لبیک کہہ کر میرا دامن پکڑ لو، میری طرف رُجوع کرو، مجھ پر بھروسا کرو اور میری بندگی و اطاعت میں آ جاؤ۔

۱۸۹ – یعنی تمھارے ذریعے سے یہ حقیقتِ حال معلوم کر کے اُن کی آنکھیں کُھل جائیں اور وہ اس صحیح رَوِیّے کی طرف آ جائیں، جس میں ان کی اپنی ہی بھلائی ہے۔

اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠

تم لوگ چُپکے چُپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے، مگر اُس نے تمھارا قُصُور معاف کر دیا اور تم سے درگزر فرمایا۔ اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمھارے لیے جائز کر دیا ہے، اُسے حاصل کرو۔[191] نیز راتوں کو کھاؤ پیو[192] یہاں تک کہ تم کو سیاہیِ شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آجائے۔[193]

۱۹۰ – یعنی جس طرح لباس اور جسم کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ سکتا، بلکہ دونوں کا باہمی تعلق و اِتّصال بالکل غیر مُنفک ہوتا ہے، اسی طرح تمھارا اور تمھاری بیویوں کا تعلق بھی ہے۔

۱۹۱ – ابتدا میں اگرچہ اس قسم کا کوئی صاف حکم موجود نہ تھا کہ رمضان کی راتوں میں کوئی شخص اپنی بیوی سے مباشرت نہ کرے، لیکن لوگ اپنی جگہ یہی سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ پھر اس کے ناجائز یا مکروہ ہونے کا خیال دل میں لیے ہوئے بسا اوقات اپنی بیویوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ یہ گویا اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت کا ارتکاب تھا اور اس سے اندیشہ تھا کہ ایک مجرمانہ اور گناہ گارانہ ذہنیت اُن کے اندر پرورش پاتی رہے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے اس خیانت پر تنبیہ فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ فعل تمھارے لیے جائز ہے۔ لہٰذا اب اسے بُرا فعل سمجھتے ہوئے نہ کرو، بلکہ اللہ کی اجازت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے قلب و ضمیر کی پوری طہارت کے ساتھ کرو۔

۱۹۲ – اس بارے میں بھی لوگ ابتداءً غلط فہمی میں تھے۔ کسی کا خیال تھا کہ عشا کی نماز پڑھنے کے بعد سے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے، اور کوئی یہ سمجھتا تھا کہ رات کو جب تک آدمی جاگ رہا ہو، کھا پی سکتا ہے۔ جہاں سو گیا، پھر دوبارہ اُٹھ کر وہ کچھ نہیں کھا سکتا۔ یہ احکام لوگوں نے خود اپنے ذہن میں سمجھ رکھے تھے اور اس کی وجہ سے بسا اوقات بڑی تکلیفیں اُٹھاتے تھے۔ اِس آیت میں انھی غلط فہمیوں کو رفع کیا گیا ہے۔ اس میں روزے کی حد طُلوعِ فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک مقرر کر دی گئی اور غروبِ آفتاب سے طُلوعِ فجر تک رات بھر کھانے پینے اور مباشرت کرنے کے لیے آزادی دے دی گئی۔ اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کا قاعدہ مقرر فرما دیا، تاکہ طُلُوعِ فجر سے عین پہلے آدمی اچھی طرح کھا پی لے۔

۱۹۳ – اسلام نے اپنی عبادات کے لیے اوقات کا وہ معیار مقرر کیا ہے، جس سے دُنیا میں ہر وقت ہر مرتبۂ تمدّن کے لوگ ہر جگہ اوقات کی تعیین کر سکیں۔ وہ گھڑیوں کے لحاظ سے وقت مقرر کرنے کے بجائے اُن آثار کے لحاظ سے وقت

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ

تب یہ سب کام چھوڑ کر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔[۱۹۴] اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو، تو بیویوں

مقرر کرتا ہے جو آفاق میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر نادان لوگ اس طریقِ توقیت پر عُموماً یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قُطبَین کے قریب، جہاں رات اور دن کئی کئی مہینوں کے ہوتے ہیں، اوقات کی یہ تعیین کیسے چل سکے گی۔ حالانکہ یہ اعتراض دراصل علمِ جغرافیہ کی سرسری واقفیت کا نتیجہ ہے۔ حقیقت میں نہ وہاں چھ مہینوں کی رات اُس معنٰی میں ہوتی ہے اور نہ چھ مہینوں کا دن، جس معنٰی میں ہم خطِ اِستوا کے آس پاس رہنے والے لوگ دن اور رات کے لفظ بولتے ہیں۔ خواہ رات کا دَور ہو یا دن کا، بہرحال صبح و شام کے آثار وہاں پوری باقاعدگی کے ساتھ اُفق پر نمایاں ہوتے ہیں اور اُنھی کے لحاظ سے وہاں کے لوگ ہماری طرح اپنے سونے جاگنے اور کام کرنے اور تفریح کرنے کے اوقات مقرر کرتے ہیں۔ جب گھڑیوں کا رواج عام نہ تھا، تب بھی فِن لینڈ، ناروے اور گرین لینڈ وغیرہ ملکوں کے لوگ اپنے اوقات معلوم کرتے ہی تھے اور اس کا ذریعہ یہی اُفق کے آثار تھے۔ لہٰذا جس طرح دُوسرے تمام معاملات میں یہ آثار ان کے لیے تعیینِ اوقات کا کام دیتے ہیں، اسی طرح نماز اور سَحَر و افطار کے معاملے میں بھی دے سکتے ہیں۔

۱۹۴ – رات تک روزہ پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ جہاں رات کی سرحد شروع ہوتی ہے، وہیں تمھارے روزے کی سرحد ختم ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ رات کی سرحد غروبِ آفتاب سے شروع ہوتی ہے۔ لہٰذا غروبِ آفتاب ہی کے ساتھ افطار کر لینا چاہیے۔ سَحَر اور افطار کی صحیح علامت یہ ہے کہ جب رات کے آخری حصّے میں اُفق کے مشرقی کنارے پر سفیدۂ صبح کی باریک سی دھاری نمودار ہو کر اُوپر بڑھنے لگے، تو سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اور جب دن کے آخری حصّے میں مشرق کی جانب سے رات کی سیاہی بلند ہوتی نظر آئے تو افطار کا وقت آجاتا ہے۔ آج کل لوگ سَحَری اور افطار، دونوں کے معاملے میں شدّتِ احتیاط کی بنا پر کچھ بے جا تشدّد برتنے لگے ہیں۔ مگر شریعت نے ان دونوں اوقات کی کوئی ایسی حد بندی نہیں کی ہے جس سے چند سیکنڈ یا چند منٹ اِدھر اُدھر ہو جانے سے آدمی کا روزہ خراب ہو جاتا ہو۔ سَحَر میں سیاہیِ شب سے سپیدۂ سَحَر کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجایش اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک شخص کے لیے یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر عین طُلوعِ فجر کے وقت اس کی آنکھ کُھلی ہو تو وہ جلدی سے اُٹھ کر کچھ کھا پی لے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز آجائے تو فوراً چھوڑ نہ دے، بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے۔ اسی طرح افطار کے وقت میں بھی غروبِ آفتاب کے بعد خواہ مخواہ دن کی روشنی ختم ہونے کا انتظار کرتے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سورج ڈوبتے ہی بلال رضی اللہ عنہ کو آواز دیتے تھے کہ لاؤ ہمارا شربت۔ بلال رضی اللہ عنہ عرض کرتے کہ یارسول اللہ! ابھی تو دن چمک رہا ہے۔ آپؐ فرماتے کہ جب رات کی سیاہی مشرق سے اُٹھنے لگے، تو روزے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ

سے مباشرت نہ کرو۔[۱۹۵] یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان کے قریب نہ پھٹکنا۔[۱۹۶] اِس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لیے بصراحت بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ وہ غلط روّیے سے بچیں گے۔

اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دُوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے

۱۹۵ – معتکف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی رمضان کے آخری دس دن مسجد میں رہے اور یہ دن اللہ کے ذکر کے لیے مختص کر دے۔ اس اعتکاف کی حالت میں آدمی اپنی انسانی حاجات کے لیے مسجد سے باہر جا سکتا ہے، مگر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو شہوانی لذتوں سے روکے رکھے۔

۱۹۶ – یہ نہیں فرمایا کہ ان حدوں سے تجاوز نہ کرنا، بلکہ یہ فرمایا کہ ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مَقام سے مَعصِیَت کی حد شروع ہوتی ہے، عین اسی مَقام کے آخری کناروں پر گھومتے رہنا آدمی کے لیے خطرناک ہے۔ سلامتی اس میں ہے کہ آدمی سرحد سے دُور ہی رہے، تاکہ بُھولے سے بھی قدم اس کے پار نہ چلا جائے۔ یہی مضمون اُس حدیث میں بیان ہوا ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لِکل ملکٍ حِمیً وان حمی اللّٰہ محارمہ۔ فمن رتع حول الحمٰی یوشك ان یقع فیہ۔ عربی زبان میں حِمٰی اُس چراگاہ کو کہتے ہیں، جسے کوئی رئیس یا بادشاہ پبلک کے لیے ممنوع کر دیتا ہے۔ اس استعارے کو استعمال کرتے ہوئے حضورؐ فرماتے ہیں کہ ”ہر بادشاہ کی ایک حِمٰی ہوتی ہے اور اللہ کی حِمٰی اس کی وہ حدیں ہیں، جن سے اس نے حرام و حلال اور طاعت و معصیت کا فرق قائم کیا ہے۔ جو جانور حِمٰی کے گرد ہی چرتا رہے گا، ہو سکتا ہے کہ ایک روز وہ حِمٰی کے اندر داخل ہو جائے۔“ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ جو شریعت کی رُوح سے ناواقف ہیں، ہمیشہ اجازت کی آخری حدوں تک ہی جانے پر اصرار کرتے ہیں اور بہت سے علما و مشائخ بھی اسی غرض کے لیے سندیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جواز کی آخری حدیں انھیں بتایا کرتے ہیں، تاکہ وہ اُس باریک خطِ امتیاز ہی پر گُھومتے رہیں، جہاں اطاعت اور معصیت کے درمیان محض بال برابر فاصلہ رہ جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بکثرت لوگ معصیت، اور معصیت سے بھی بڑھ کر ضلالت میں مبتلا ہو رہے ہیں، کیونکہ ان باریک سرحدی خطوط کی تمیز اور ان کے کنارے پہنچ کر اپنے آپ کو قابو میں رکھنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ع ﴿۱۸۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ
لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ

ع ۲۳

ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمھیں دُوسروں کے مال کا کوئی حصّہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے ۔ [۱۹۷] ع

لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پُوچھتے ہیں۔ کہو: یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کی تعیین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔ [۱۹۸] نیز ان سے کہو: یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں

۱۹۷ – اس آیت کا ایک مفہُوم تو یہ ہے کہ حاکموں کو رشوت دے کر ناجائز فائدے اُٹھانے کی کوشش نہ کرو۔ اور دُوسرا مفہُوم یہ ہے کہ جب تم خود جانتے ہو کہ مال دُوسرے شخص کا ہے، تو محض اس لیے کہ اس کے پاس اپنی مِلکیّت کا کوئی ثبوت نہیں ہے، یا اس بنا پر کہ کسی اینچ پینچ سے تم اس کو کھا سکتے ہو، اس کا مُقدّمہ عدالت میں نہ لے جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ حاکمِ عدالت رُودادِ مقدّمہ کے لحاظ سے وہ مال تم کو دِلوا دے۔ مگر حاکم کا ایسا فیصلہ دراصل غلط بنائی ہوئی رُوداد سے دھوکا کھا جانے کا نتیجہ ہوگا۔ اس لیے عدالت سے اس کی مِلکیت کا حق حاصل کر لینے کے باوجود حقیقت میں تم اس کے جائز مالک نہ بن جاؤ گے۔ عنداللہ وہ تمھارے لیے حرام ہی رہے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما انا بشر وانتم تختصمون الی ولعل بعضکم یکون الحن بحجته من بعض، فاقضی له علی نحو ما اسمع منه ، فمن قضیت له بشیء من حق اخیه، فانما اقضی له قطعة من النار۔ یعنی میں بہرحال ایک انسان ہی تو ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ تم ایک مقدّمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے ایک فریق دوسرے کی بہ نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور اس کے دلائل سُن کر میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ اگر اس طرح اپنے کسی بھائی کے حق میں سے کوئی چیز تم نے میرے فیصلے کے ذریعے سے حاصل کی، تو دراصل تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے۔

۱۹۸ – چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک ایسا منظر ہے، جس نے ہر زمانے میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے اور اس کے متعلق طرح طرح کے اَوہام وتخیّلات اور رسوم دُنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔ اہلِ عرب میں بھی اس قسم کے اوہام موجود تھے۔ چاند سے اچھے یا بُرے شگون لینا، بعض تاریخوں کو سَعد اور بعض کو نحس سمجھنا، کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتدائے کار کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا مسعود خیال کرنا اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع وغروب اور اس کی کمی وبیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے، یہ سب

ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪
وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

پیچھے کی طرف سے داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لٰہذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ شاید کہ تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔[199]

اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں،[200] مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی

باتیں دُوسری جاہل قوموں کی طرح اہلِ عرب میں بھی پائی جاتی تھیں اور اس سلسلے میں مختلف توہُّم پرستانہ رسمیں اُن میں رائج تھیں۔ انھی چیزوں کی حقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کی گئی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ گھٹتا بڑھتا چاند تمھارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک قدرتی جنتری ہے، جو آسمان پر نمودار ہو کر دُنیا بھر کے لوگوں کو بیک وقت ان کی تاریخوں کا حساب بتاتی رہتی ہے۔ حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ عرب کی مذہبی، تمدُّنی اور مَعاشی زندگی میں اس کی اہمیّت سب سے بڑھ کر تھی۔ سال کے چار مہینے حج اور عمرے سے وابستہ تھے۔ اِن مہینوں میں لڑائیاں بند رہتیں، راستے محفوظ ہوتے اور امن کی وجہ سے کاروبار فروغ پاتے تھے۔

۱۹۹ – مِن جملہ ان توَہُّم پرستانہ رسموں کے، جو عرب میں رائج تھیں، ایک یہ بھی تھی کہ جب حج کے لیے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے، بلکہ پیچھے سے دیوار کُود کر یا دیوار میں کھڑکی سی بنا کر داخل ہوتے تھے۔ نیز سفر سے واپس آ کر بھی گھروں میں پیچھے سے داخل ہوا کرتے تھے۔ اس آیت میں نہ صرف اس رسم کی تردید کی گئی ہے، بلکہ تمام اَوہام پر یہ کہہ کر ضرب لگائی گئی ہے کہ نیکی دراصل اللہ سے ڈرنے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنے کا نام ہے۔ اُن بے معنٰی رسموں کو نیکی سے کوئی واسطہ نہیں، جو محض باپ دادا کی اندھی تقلید میں برتی جا رہی ہیں اور جن کا انسان کی سعادت وشقاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۰۰ – یعنی جو لوگ خدا کے کام میں تمھارا راستہ روکتے ہیں، اور اس بنا پر تمھارے دُشمن بن گئے ہیں کہ تم خدا کی ہدایت کے مطابق نظامِ زندگی کی اصلاح کرنا چاہتے ہو، اور اس اصلاحی کام کی مزاحمت میں جبر وظلم کی طاقتیں استعمال کر رہے ہیں، ان سے جنگ کرو۔ اس سے پہلے جب تک مسلمان کمزور اور منتشر تھے، ان کو صرف تبلیغ کا حکم تھا اور مخالفین کے ظلم وستم پر صبر کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ اب مدینے میں ان کی چھوٹی سی شہری ریاست بن جانے کے بعد پہلی مرتبہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جو لوگ اس دعوتِ اصلاح کی راہ میں مسلّح مزاحمت کرتے ہیں، ان کو تلوار کا جواب تلوار سے دو۔ اس کے

الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ
مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ
وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ
فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[۲۰۱] ان سے لڑو جہاں بھی تمھارا اُن سے مقابلہ پیش آئے اور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، اس لیے کہ قتل اگرچہ بُرا ہے، مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔[۲۰۲] اور مسجدِ حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں، تم بھی نہ لڑو، مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چُوکیں، تو تم بھی بے تکلّف انھیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں، تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[۲۰۳]

بعد ہی جنگِ بَدر پیش آئی اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

۲۰۱ – یعنی تمھاری جنگ نہ تو اپنی مادّی اغراض کے لیے ہو، نہ اُن لوگوں پر ہاتھ اُٹھاؤ، جو دینِ حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے، اور نہ لڑائی میں جاہلیّت کے طریقے استعمال کرو۔ عورتوں اور بچّوں اور بوڑھوں اور زخمیوں پر دست درازی کرنا، دشمن کے مقتولوں کا مُثلہ کرنا، کھیتوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا اور دُوسرے تمام وحشیانہ اور ظالمانہ افعال "حد سے گزرنے" کی تعریف میں آتے ہیں اور حدیث میں ان سب کی مُمانَعت وارد ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ قوت کا استعمال وہیں کیا جائے، جہاں وہ ناگزیر ہو، اور اُسی حد تک کیا جائے، جتنی اس کی ضرورت ہو۔

۲۰۲ – یہاں فتنے کا لفظ اُسی معنیٰ میں استعمال ہُوا ہے، جس میں انگریزی کا لفظ (persecution) استعمال ہوتا ہے، یعنی کسی گروہ یا شخص کو محض اس بنا پر ظلم و ستم کا نشانہ بنانا کہ اس نے رائج الوقت خیالات و نظریّات کی جگہ کچھ دُوسرے خیالات و نظریّات کو حق پا کر قبول کرلیا ہے اور وہ تنقید و تبلیغ کے ذریعے سے سوسائٹی کے موجود الوقت نظام میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ بلاشبہ انسانی خُون بہانا بہت بُرا فعل ہے، لیکن جب کوئی انسانی گروہ زبردستی اپنا فکری اِستبداد دُوسروں پر مسلّط کرے اور لوگوں کو قبولِ حق سے بجبر روکے اور اصلاح و تغیُّر کی جائز و معقول کوششوں کا مقابلہ دلائل سے کرنے کے بجائے حیوانی طاقت سے کرنے لگے، تو وہ قتل کی بہ نسبت زیادہ سخت بُرائی

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔[۲۰۴] پھر اگر وہ باز آ جائیں، تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔[۲۰۵]

کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے گروہ کو بزورِ شمشیر ہٹا دینا بالکل جائز ہے۔

۲۰۳ – یعنی تم جس خدا پر ایمان لائے ہو، اس کی صفت یہ ہے کہ بدتر سے بدتر مجرم اور گناہ گار کو بھی معاف کر دیتا ہے، جب کہ وہ اپنی باغیانہ روش سے باز آ جائے۔ یہی صفت تم اپنے اندر بھی پیدا کرو۔ تخلّقوا باخلاق اللّٰہ۔ تمھاری لڑائی انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے نہ ہو بلکہ خدا کے دین کا راستہ صاف کرنے کے لیے ہو۔ جب تک کوئی گروہ راہِ خدا میں مزاحم رہے، بس اُسی وقت تک اس سے تمھاری لڑائی بھی رہے، اور جب وہ اپنا رَوِیّہ چھوڑ دے، تو تمھارا ہاتھ بھی پھر اُس پر نہ اٹھے۔

۲۰۴ – یہاں فتنہ کا لفظ اُوپر کے معنٰی سے ذرا مختلف معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔ سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ اس مقام پر ”فتنے“ سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لیے ہو، اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ پھر جب ہم لفظ ”دین“ کی تحقیق کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنٰی ”اطاعت“ کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظامِ زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اُس کے احکام و قوانین کی پیروی میں اختیار کیا جائے۔ پس دین کی اس تشریح سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت، جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی و فرماں روائی قائم ہو، اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے کی حالت ہے اور اسلامی جنگ کا مَطْمَحِ نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی جگہ ایسی حالت قائم ہو، جس میں بندے صرف قانونِ الٰہی کے مطیع بن کر رہیں۔

۲۰۵ – باز آ جانے سے مراد کافروں کا اپنے کفر و شرک سے باز آ جانا نہیں، بلکہ فتنے سے باز آ جانا ہے۔ کافر، مشرک، دہریے، ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھتا ہے، رکھے اور جس کی چاہے عبادت کرے، یا کسی کی نہ کرے۔ اس گمراہی سے اس کو نکالنے کے لیے ہم اسے فہمایش اور نصیحت کریں گے، مگر اس سے لڑیں گے نہیں۔ لیکن اُسے یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کرے اور خدا کے بندوں کو غیر از خدا کسی کا بندہ بنائے۔ اس فتنے کو دفع کرنے کے لیے حسبِ موقع اور حسبِ امکان، تبلیغ اور شمشیر، دونوں سے کام لیا جائے گا اور مومن اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا، جب تک کفار اپنے اس فتنے سے باز نہ آ جائیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ اگر وہ باز آ جائیں، تو ”ظالموں کے سوا کسی پر دست درازی روا نہیں“، تو اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾

ماہِ حرام کا بدلہ ماہِ حرام ہی ہے اور تمام حُرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہو گا۔[۲۰۶] لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے، تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انھی لوگوں کے ساتھ ہے، جو اس کی حُدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

کہ جب نظامِ باطل کی جگہ نظامِ حق قائم ہو جائے، تو عام لوگوں کو تو معاف کر دیا جائے گا، لیکن ایسے لوگوں کو سزا دینے میں اہلِ حق بالکل حق بجانب ہوں گے، جنھوں نے اپنے دَورِ اقتدار میں نظامِ حق کا راستہ روکنے کے لیے ظلم وستم کی حد کر دی ہو، اگرچہ اس معاملے میں بھی مومنینِ صالحین کو زیب یہی دیتا ہے کہ عَفو و درگزر سے کام لیں اور فتح یاب ہو کر ظالموں سے انتقام نہ لیں۔ مگر جن کے جرائم کی فہرست بہت ہی زیادہ سیاہ ہو، اُن کو سزا دینا بالکل جائز ہے اور اس اجازت سے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فائدہ اٹھایا ہے، جن سے بڑھ کر عَفو و درگزر کسی کے شایانِ شان نہ تھا۔ چنانچہ جنگِ بَدر کے قیدیوں میں سے عُقبہ بن ابی مُعَیط اور نَضر بن حارث کا قتل اور فتحِ مکہ کے بعد آپؐ کا ۱۷ آدمیوں کو عَفوِ عام سے مُستثنیٰ فرمانا اور پھر ان میں سے چار کو سزائے موت دینا اسی اجازت پر مبنی تھا۔

۲۰۶ – اہلِ عرب میں حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے یہ قاعدہ چلا آ رہا تھا کہ ذی القعدہ، ذی الحجّہ اور مُحرّم کے تین مہینے حج کے لیے مختص تھے اور رجب کا مہینا عُمرے کے لیے خاص کیا گیا تھا، اور ان چار مہینوں میں جنگ اور قتل و غارت گری ممنوع تھی، تاکہ زائرینِ کعبہ امن و امان کے ساتھ خدا کے گھر تک جائیں اور اپنے گھروں کو واپس ہو سکیں۔ اِس بنا پر اِن مہینوں کو حرام مہینے کہا جاتا تھا، یعنی حرمت والے مہینے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ ماہِ حرام کی حرمت کا لحاظ کفار کریں، تو مسلمان بھی کریں اور اگر وہ اس حُرمت کو نظر انداز کر کے کسی حرام مہینے میں مسلمانوں پر دست درازی کر گزریں، تو پھر مسلمان بھی ماہِ حرام میں بدلہ لینے کے مجاز ہیں۔

اس اجازت کی ضرورت خاص طور پر اس وجہ سے پیش آ گئی تھی کہ اہلِ عرب نے جنگ وجَدَل اور لُوٹ مار کی خاطر نَسی کا قاعدہ بنا رکھا تھا، جس کی رُو سے وہ اگر کسی سے انتقام لینے کے لیے یا غارت گری کرنے کے لیے جنگ چھیڑنا چاہتے تھے، تو کسی حرام مہینے میں اُس پر چھاپا مار دیتے اور پھر اس مہینے کی جگہ کسی دُوسرے حلال مہینے کو حرام کر کے گویا اس حرمت کا بدلہ پورا کر دیتے تھے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کفار اپنے نَسی کے حیلے کو کام میں لا کر کسی حرام مہینے میں جنگی کارروائی کر بیٹھیں، تو اس صورت میں کیا کیا جائے۔ اسی سوال کا جواب اس

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ
وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ ع
وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ
وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ ؕ

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔[۲۰۷] احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔[۲۰۸]

اللہ کی خوشنودی کے لیے جب حج اور عُمرے کی نیت کرو، تو اُسے پُورا کرو، اور اگر کہیں گِھر جاؤ تو جو قربانی میسّر آئے، اللہ کی جناب میں پیش کرو،[۲۰۹] اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔[۲۱۰]

آیت میں دیا گیا ہے۔

۲۰۷ – اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مراد اللہ کے دین کو قائم کرنے کی سعی وجُہد میں مالی قربانیاں کرنا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا کے دین کو سربلند کرنے کے لیے اپنا مال خرچ نہ کرو گے اور اس کے مقابلے میں اپنے ذاتی مفاد کو عزیز رکھو گے، تو یہ تمھارے لیے دنیا میں بھی موجبِ ہلاکت ہوگا اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تم کفار سے مغلوب اور ذلیل ہو کر رہو گے اور آخرت میں تم سے سخت باز پرس ہوگی۔

۲۰۸ – احسان کا لفظ حُسن سے نکلا ہے، جس کے معنیٰ کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ عمل کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی کے سُپرد جو خدمت ہو، اُسے بس کر دے۔ اور دُوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے خوبی کے ساتھ کرے، اپنی پُوری قابلیت اور اپنے تمام وسائل اس میں صَرف کر دے اور دل و جان سے اس کی تکمیل کی کوشش کرے۔ پہلا درجہ محض طاعت کا درجہ ہے، جس کے لیے صرف تقویٰ اور خوف کافی ہو جاتا ہے۔ اور دُوسرا درجہ احسان کا درجہ ہے، جس کے لیے محبّت اور گہرا قلبی لگاؤ درکار ہوتا ہے۔

۲۰۹ – یعنی اگر راستے میں کوئی ایسا سبب پیش آجائے، جس کی وجہ سے آگے جانا غیر ممکن ہو اور مجبوراً رُک جانا پڑے، تو اُونٹ، گائے، بکری میں سے جو جانور بھی میسّر ہو، اللہ کے لیے قربان کر دو۔

۲۱۰ – اس امر میں اختلاف ہے کہ قربانی کے اپنی جگہ پہنچ جانے سے کیا مراد ہے۔ فقہائے حَنفیّہؒ کے نزدیک اس سے مراد حرم ہے، یعنی اگر آدمی راستے میں رُک جانے پر مجبور ہو، تو اپنی قربانی کا جانور یا اس کی قیمت بھیج دے، تاکہ اس کی طرف سے حُدودِ حرم میں قربانی کی جائے۔ اور امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک جہاں آدمی گِھر گیا ہو،

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ
فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ
اَمِنْتُمْ ۔ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ
مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي
الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ
ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر مُنڈوائے ، تو اُسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔[۲۱۱] پھر اگر تمھیں امن نصیب ہو جائے[۲۱۲] (اور تم حج سے پہلے مکّے پہنچ جاؤ)، تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عُمرے کا فائدہ اُٹھائے، وہ حسبِ مقدور قربانی دے، اور اگر قربانی میسّر نہ ہو، تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر، اِس طرح پُورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت اُن لوگوں کے لیے ہے، جن کے گھر بار مسجدِ حرام کے قریب نہ ہوں۔[۲۱۳]

وہیں قربانی کر دینا مراد ہے۔

سر مُونڈنے سے مراد حجامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک قربانی نہ کرلو، حجامت نہ کراؤ۔

۲۱۱ – حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت میں تین دن کے روزے رکھنے، یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلانے، یا کم از کم ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔

۲۱۲ – یعنی وہ سبب دور ہو جائے، جس کی وجہ سے مجبوراً تمھیں راستے میں رُک جانا پڑا تھا۔ چونکہ اُس زمانے میں حج کا راستہ بند ہونے اور حاجیوں کے رُک جانے کی وجہ زیادہ تر دشمنِ اسلام قبیلوں کی مزاحمت ہی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُوپر کی آیت میں ''گھِر جانے'' اور اس کے بالمقابل یہاں ''امن نصیب ہو جانے'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن جس طرح ''گھِر جانے'' کے مفہوم میں دشمن کی مزاحمت کے علاوہ دُوسرے تمام موانع شامل ہیں، اسی طرح ''امن نصیب ہو جانے'' کا مفہوم بھی ہر مانع و مزاحم چیز کے دُور ہو جانے پر حاوی ہے۔

ع ۲۴ ۸

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ع ﴿۱۹۶﴾ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ
مَّعْلُوْمٰتٌ ج فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ لا وَ
لَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ ط وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ط
وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَ اتَّقُوْنِ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کے اِن احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ع

حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص اِن مقرر مہینوں میں حج کی نیّت کرے، اُسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دَوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل[۲۱۴]، کوئی بد عملی[۲۱۵]، کوئی لڑائی جھگڑے[۲۱۶] کی بات سرزد نہ ہو۔ اور جو نیک کام تم کرو گے، وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔ سفرِ حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے جاوٴ، اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے۔ پس اے ہوش مندو! میری نافرمانی سے[۲۱۷] پرہیز کرو۔

---

۲۱۳ – عربِ جاہلیّت میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایک ہی سفر میں حج اور عُمرہ دونوں ادا کرنا گناہِ عظیم ہے۔ ان کی خود ساختہ شریعت میں عُمرے کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کرنا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قید کو اُڑا دیا اور باہر سے آنے والوں کے ساتھ یہ رعایت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں عُمرہ اور حج دونوں کر لیں۔ البتہ جو لوگ مکے کے آس پاس میقاتوں کی حُدود کے اندر رہتے ہوں، انھیں اس رعایت سے مُستثنیٰ کر دیا، کیونکہ ان کے لیے عُمرے کا سفر الگ اور حج کا سفر الگ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

حج کا زمانہ آنے تک عُمرے کا فائدہ اُٹھانے سے مُراد یہ ہے کہ آدمی عمرہ کر کے اِحرام کھول لے اور اُن پابندیوں سے آزاد ہو جائے، جو احرام کی حالت میں لگائی گئی ہیں۔ پھر جب حج کے دن آئیں، تو از سرِ نو احرام باندھ لے۔

۲۱۴ – احرام کی حالت میں میاں اور بیوی کے درمیان نہ صرف تعلقِ زن وشو ممنوع ہے، بلکہ اُن کے درمیان کوئی ایسی گفتگو بھی نہ ہونی چاہیے، جو رغبتِ شہوانی پر مبنی ہو۔

۲۱۵ – تمام معصیت کے افعال اگرچہ بجائے خود ناجائز ہیں، لیکن احرام کی حالت میں ان کا گناہ بہت سخت ہے۔

۲۱۶ – حتّیٰ کہ خادم کو ڈانٹنا تک جائز نہیں۔

۲۱۷ – جاہلیّت کے زمانے میں حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دُنیا دارانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور ایک مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خدا کے گھر کی طرف دنیا کا سامان لیے بغیر جائے گا۔ اس آیت میں

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ
فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ
الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ
لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ

اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ، تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں۔[۲۱۸] پھر جب عرفات سے چلو، تو مَشْعَرِ حرام (مُزْدَلفہ) کے پاس ٹھیر کر اللہ کو یاد کرو اور اُس طرح یاد کرو، جس کی ہدایت اس نے تمھیں دی ہے، ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔[۲۱۹] پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی

اُن کے اِس غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور انھیں بتایا گیا ہے کہ زادِ راہ نہ لینا کوئی خوبی نہیں ہے۔ اصل خوبی خدا کا خوف اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب اور زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے۔ جو مسافر اپنے اَخلاق دُرست نہیں رکھتا اور خدا سے بے خوف ہو کر بُرے اعمال کرتا ہے، وہ اگر زادِ راہ ساتھ نہ لے کر محض ظاہر میں فقیری کی نمایش کرتا ہے، تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ خدا اور خلق، دونوں کی نگاہ میں وہ ذلیل ہوگا اور اپنے اُس مذہبی کام کی بھی توہین کرے گا، جس کے لیے وہ سفر کر رہا ہے۔ لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے اخلاق دُرست ہوں، تو خدا کے ہاں بھی اس کی عزّت ہوگی اور خلق بھی اس کا احترام کرے گی، چاہے اس کا توشہ دان کھانے سے بھرا ہوا ہو۔

۲۱۸ – یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصوّر تھا کہ سفرِ حج کے دوران میں کسبِ مَعاش کے لیے کام کرنے کو وہ بُرا سمجھتے تھے، کیونکہ اُن کے نزدیک کسبِ مَعاش ایک دُنیا دارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دَوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔ قرآن اس خیال کی تردید کرتا ہے اور انھیں بتاتا ہے کہ ایک خدا پرست آدمی جب خدا کے قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی معاش کے لیے جِدّوجُہد کرتا ہے، تو دراصل اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے، اور کوئی گناہ نہیں اگر وہ اپنے رب کی رضا کے لیے سفر کرتے ہوئے اس کا فضل بھی تلاش کرتا جائے۔

۲۱۹ – یعنی جاہلیّت کے زمانے میں خدا کی عبادت کے ساتھ جن دُوسرے مشرکانہ اور جاہلانہ افعال کی آمیزش ہوتی تھی، ان سب کو چھوڑ دو اور اب جو ہدایت اللہ نے تمھیں بخشی ہے، اس کے مطابق خالصتاً اللہ تعالیٰ کی

النَّاسُ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٩٩﴾
فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ
اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا
وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ

پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو،[۲۲۰] یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو، تو جس طرح پہلے اپنے آبا و اجداد کا ذکر کرتے تھے، اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو، بلکہ اس سے بھی[۲۲۱] بڑھ کر۔ (مگر اللہ کو یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) اُن میں سے کوئی تو ایسا ہے، جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا ہی میں سب کچھ دے دے۔ ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ

عبادت کرو۔

۲۲۰ – حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے زمانے سے عرب کا معروف طریقۂ حج یہ تھا کہ ۹ ذی الحجہ کو مِنٰی سے عَرَفات جاتے تھے اور رات کو وہاں سے پلٹ کر مُزدَلِفہ میں ٹھیرتے تھے۔ مگر بعد کے زمانے میں جب رفتہ رفتہ قریش کی بَرَہْمَنِیَّت قائم ہوگئی، تو انھوں نے کہا: ہم اہلِ حرم ہیں، ہمارے مرتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ عام اہلِ عرب کے ساتھ عَرَفات تک جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے یہ شانِ امتیاز قائم کی کہ مُزدَلِفہ تک جا کر ہی پلٹ آتے اور عام لوگوں کو عرفات تک جانے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر یہی امتیاز بنی خُزَاعہ اور بنی کِنانہ اور اُن دُوسرے قبیلوں کو بھی حاصل ہوگیا، جن کے ساتھ قریش کے شادی بیاہ کے رشتے تھے۔ آخرِ کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو قبیلے قریش کے حلیف تھے، اُن کی شان بھی عام عربوں سے اُونچی ہوگئی اور انھوں نے بھی عَرَفات جانا چھوڑ دیا۔ اسی فخر وغُرور کا بُت اس آیت میں توڑا گیا ہے۔ آیت کا خطابِ خاص قریش اور ان کے رشتے دار اور حلیف قبائل کی طرف ہے اور خطابِ عام اُن سب کی طرف ہے، جو آیندہ کبھی اس قسم کے امتیازات اپنے لیے مخصوص کرنا چاہیں۔ اُن کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اَور سب لوگ جہاں تک جاتے ہیں، اُنھی کے ساتھ جاؤ، اُنھی کے ساتھ ٹھیرو، اُنھی کے ساتھ پلٹو، اور اب تک جاہلیّت کے فخر وغرور کی بنا پر سنّتِ ابراہیمی کی جو خلاف ورزی تم کرتے رہے ہو، اس پر اللہ سے معافی مانگو۔

۲۲۱ – اہلِ عرب حج سے فارغ ہو کر مِنٰی میں جلسے کرتے تھے، جن میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے باپ دادا کے کارنامے

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا
النصف عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ
سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ
تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۙ
لِمَنِ اتَّقٰی ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾
وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا

اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصّہ پائیں گے، اور اللہ کو حساب چُکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں، جو تمھیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہییں۔ پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں، اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھیر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں[۲۲۲]۔ بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں ــــ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمھاری پیشی ہونے والی ہے۔

انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے، جس کی باتیں دُنیا کی زندگی میں تمھیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں،

فخر کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ان جاہلانہ باتوں کو چھوڑو، پہلے جو وقت فضولیات میں صَرف کرتے تھے، اب اُسے اللہ کی یاد اور اس کے ذکر میں صَرف کرو۔ اِس ذکر سے مراد زمانۂ قیامِ مِنٰی کا ذکر ہے۔

۲۲۲- یعنی ایامِ تشریق میں مِنٰی سے مکّے کی طرف واپسی خواہ ۱۲ ذی الحجہ کو ہو یا تیرھویں تاریخ کو، دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں۔ اصل اہمیّت اس کی نہیں کہ تم ٹھیرے کتنے دن، بلکہ اس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے، ان میں خدا کے ساتھ تمھارے تعلق کا کیا حال رہا۔ خدا کا ذکر کرتے رہے یا میلوں ٹھیلوں میں لگے رہے۔

وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَ اِذَا
تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ
النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ
اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾
وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ
وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي

اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھیراتا ہے،[۲۲۳] مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے۔[۲۲۴] جب اُسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے،[۲۲۵] تو زمین میں اُس کی ساری دَوڑ دُھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسلِ انسانی کو تباہ کرے ــــ حالاں کہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا ــــ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر، تو اپنے وقار کا خیال اُس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے تو بس جہنّم ہی کافی ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ دُوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے، جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔ اے ایمان لانے والو! تم پُورے کے پُورے اسلام میں

۲۲۳ - یعنی کہتا ہے: خدا شاہد ہے کہ میں محض طالبِ خیر ہوں، اپنی ذاتی غرض کے لیے نہیں، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، یا لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کر رہا ہوں۔

۲۲۴ - ''اَلَدُّ الْخِصَامِ'' کے معنیٰ ہیں: ''وہ دشمن جو تمام دشمنوں سے زیادہ ٹیڑھا ہو۔'' یعنی جو حق کی مُخالفت میں ہر ممکن حربے سے کام لے۔ کسی جھوٹ، کسی بے ایمانی، کسی غدر و بدعہدی اور کسی ٹیڑھی سے ٹیڑھی چال کو بھی استعمال کرنے میں تأمّل نہ کرے۔

۲۲۵ - ''اِذَا تَوَلّٰی'' کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک وہ جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے، اور دوسرا مطلب

السِّلۡمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ‌ؕ اِنَّهٗ لَـكُمۡ عَدُوٌّ
مُّبِيۡنٌ ۞٢٠٨ فَاِنۡ زَلَـلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ
فَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۞٢٠٩ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّآ اَنۡ
يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةُ وَقُضِىَ الۡاَمۡرُ‌ؕ

آ جاؤ[۲۲۶] اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ جو صاف صاف ہدایات تمھارے پاس آ چکی ہیں، اگر ان کو پا لینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی، تو خُوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔[۲۲۷] (اِن ساری نصیحتوں اور ہدایتوں کے بعد بھی لوگ سیدھے نہ ہوں، تو) کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے فرشتوں کے پرے ساتھ لیے خود سامنے آ موجود ہو اور فیصلہ ہی کر ڈالا جائے[۲۲۸]؟ــــــ

یہ بھی نکلتا ہے کہ یہ مزے مزے کی دل لُبھانے والی باتیں بنا کر "جب وہ پلٹتا ہے"، تو عملاً یہ کرتوت دکھاتا ہے۔

۲۲۶ – یعنی کسی اِستثنا اور تحفّظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمھارے خیالات، تمھارے نظریّات، تمھارے عُلوم، تمھارے طور طریقے، تمھارے معاملات، اور تمھاری سعی وعمل کے راستے سب کے سب بالکل تابعِ اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے بعض حصّوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصّوں کو اس کی پیروی سے مُستثنیٰ کر لو۔

۲۲۷ – یعنی وہ زبردست طاقت بھی رکھتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اپنے مجرموں کو سزا کس طرح دے۔

۲۲۸ – یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ ان سے ایک اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس دُنیا میں انسان کی ساری آزمائش صرف اس بات کی ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں، اور ماننے کے بعد اتنی اَخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرماں برداری اختیار کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ کی بِعثت میں، کتابوں کی تنزیل میں، حتّٰی کہ معجزات تک میں عقل کے امتحان اور اَخلاقی قوت کی آزمائش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے پردہ نہیں کر دیا ہے کہ آدمی کے لیے مانے بغیر چارہ نہ رہے۔ کیونکہ اس کے بعد تو آزمائش بالکل بے معنیٰ ہو جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی بنا پر یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اُس وقت کا انتظار نہ کرو، جب اللہ اور اس کی سلطنت کے کارکن فرشتے خود سامنے آ جائیں گے، کیونکہ پھر تو فیصلہ ہی کر ڈالا جائے گا۔ ایمان لانے اور اطاعت میں سر جُھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اُسی وقت تک ہے، جب تک حقیقت

ع ٢٥

وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٢١٠﴾ ع سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ
مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ط وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا م وَالَّذِيْنَ

وقف لازم

آخرکار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور ہونے والے ہیں ع

بنی اسرائیل سے پُوچھو: کیسی کُھلی کُھلی نشانیاں ہم نے اُنھیں دِکھائی ہیں (اور پھر یہ بھی اُنھی سے پُوچھ لو کہ) اللہ کی نعمت پانے کے بعد جو قوم اس کو شقاوت سے بدلتی ہے اُسے اللہ کیسی سخت سزا دیتا ہے۔[٢٢٩]

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، اُن کے لیے دنیا کی زندگی بڑی محبوب و دل پسند بنا دی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، مگر قیامت کے روز

تمھارے حواس سے پوشیدہ ہے اور تم محض دلیل سے اس کو تسلیم کر کے اپنی دانش مندی کا، اور محض فہمایش سے اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر کے اپنی اَخلاقی طاقت کا ثبوت دیتے ہو۔ ورنہ جب حقیقت بے نقاب سامنے آجائے اور تم بچشمِ سر دیکھ لو کہ یہ خدا اپنے تختِ جلال پر متمکّن ہے، اور یہ ساری کائنات کی سلطنت اس کے فرمان پر چل رہی ہے، اور یہ فرشتے زمین و آسمان کے انتظام میں لگے ہوئے ہیں، اور یہ تمھاری ہستی اُس کے قبضۂ قدرت میں پوری بے بسی کے ساتھ جکڑی ہُوئی ہے، اس وقت تم ایمان لائے اور اطاعت پر آمادہ ہوئے، تو اس ایمان اور اطاعت کی قیمت ہی کیا ہے؟ اس وقت تو کوئی کٹّے سے کٹّا کافر اور بدتر سے بدتر مجرم و فاجر بھی انکار و نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایمان لانے اور اطاعت قبول کرنے کی مُہلت بس اُسی وقت تک ہے جب تک کہ پردہ کُشائی کی وہ ساعت نہیں آتی۔ جب وہ ساعت آ گئی، تو پھر نہ مُہلت ہے نہ آزمایش، بلکہ وہ فیصلے کا وقت ہے۔

٢٢٩ - اس سوال کے لیے بنی اسرائیل کا انتخاب دو وُجوہ سے کیا گیا ہے: ایک، یہ کہ آثارِ قدیمہ کے بے زبان کھنڈروں کی بہ نسبت ایک جیتی جاگتی قوم زیادہ بہتر سامان عبرت و بصیرت ہے۔ دوسرے، یہ کہ بنی اسرائیل وہ قوم ہے، جس کو کتاب اور نبوت کی مَشعل دے کر دُنیا کی رہنمائی کے منصب پر مامور کیا گیا تھا، اور پھر اس نے دُنیا پرستی، نِفاق اور علم و عمل کی ضلالتوں میں مبتلا ہو کر اس نعمت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ لہٰذا جو گروہ اس قوم کے بعد

اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ
حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ
مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ
اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ

پرہیزگار لوگ ہی اُن کے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے۔ رہا دُنیا کا رزق، تو اللہ کو اختیار ہے، جسے چاہے بے حساب دے۔

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رُونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج رَوی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے، اور اُن کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رُونما ہو گئے تھے، اُن کا فیصلہ کرے ــــــ (اور ان اختلافات کے رُونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں،) اختلاف اُن لوگوں نے کیا، جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ اُنھوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے[۲۳۰] ــــــ

امامت کے منصب پر مامور ہوا ہے، اس کو سب سے بہتر سبق اگر کسی کے انجام سے مل سکتا ہے، تو وہ یہی قوم ہے۔

۲۳۰– ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بُنیاد پر ''مذہب'' کی تاریخ مرتّب کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دُنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا، اس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کون سا ہے۔ اس کے بعد ایک مدّت تک نسلِ آدم راہِ راست پر قائم رہی اور ایک اُمّت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو

الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ
اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۵ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ
مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ
وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾
كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ
تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ
ع ۲۶ / ۱۰ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ ع يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ
الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ

ساتھی اہلِ ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی ــــــ اُس وقت اُنھیں تسلّی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

لوگ پُوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو۔ اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔

تمھیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمھیں ناگوار ہے ــــــ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمھارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے ع

لوگ پُوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو: اِس میں لڑنا بہت بُرا ہے، مگر

اسے قائم کرنے کی کوشش کرے، اور جو طاغوت اس کے راستے میں مزاحم ہو، اس کا زور توڑنے میں اپنے جسم و جان کی ساری قوتیں صَرف کردے۔

صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَ

راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اِس سے بھی زیادہ بُرا ہے اور فتنہ خوں ریزی سے شدید تر ہے۔[۲۳۲]

۲۳۲ – یہ بات ایک واقعے سے متعلق ہے۔ رجب ۲ ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ نَخلہ کی طرف بھیجا تھا (جو مکّے اور طائف کے درمیان ایک مقام ہے) اور اس کو ہدایت فرمادی تھی کہ قریش کی نقل و حرکت اور اُن کے آیندہ ارادوں کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ جنگ کی کوئی اجازت آپؐ نے نہیں دی تھی۔ لیکن ان لوگوں کو راستے میں قریش کا ایک چھوٹا سا تجارتی قافلہ ملا اور اس پر انھوں نے حملہ کر کے ایک آدمی کو قتل کر دیا اور باقی لوگوں کو اُن کے مال سمیت گرفتار کر کے مدینے لے آئے۔ یہ کارروائی ایسے وقت ہوئی، جب کہ رجب ختم اور شعبان شروع ہو رہا تھا اور یہ امر مُشتبَہ تھا کہ آیا حملہ رجب (یعنی ماہِ حرام) ہی میں ہوا ہے یا نہیں۔ لیکن قریش نے، اور ان سے دَر پردہ ملے ہوئے یہودیوں اور منافقینِ مدینہ نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے اس واقعے کو خوب شہرت دی اور سخت اعتراضات شروع کر دیے کہ یہ لوگ چلے ہیں بڑے اللہ والے بن کر، اور حال یہ ہے کہ ماہِ حرام تک میں خوں ریزی سے نہیں چُوکتے۔ اِنھی اعتراضات کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ ماہ حرام میں لڑنا بڑی بُری حرکت ہے، مگر اس پر اعتراض کرنا اُن لوگوں کے منہ کو تو زیب نہیں دیتا، جنھوں نے ۱۳ برس مسلسل اپنے سیکڑوں بھائیوں پر صرف اس لیے ظلم توڑے کہ وہ ایک خدا پر ایمان لائے تھے، پھر ان کو یہاں تک تنگ کیا کہ وہ جلاوطن ہونے پر مجبور ہو گئے، پھر اس پر بھی اکتفا نہ کیا اور اپنے ان بھائیوں کے لیے مسجدِ حرام تک جانے کا راستہ بھی بند کر دیا۔ حالانکہ مسجدِ حرام کسی کی مملوکہ جائداد نہیں ہے اور پچھلے دو ہزار برس میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کو اُس کی زیارت سے روکا گیا ہو۔ اب جن ظالموں کا نامۂ اعمال اِن کرتُوتوں سے سیاہ ہے، ان کا کیا منہ ہے کہ ایک معمولی سی سرحدی جھڑپ پر اس قدر زور شور کے اعتراضات کریں، حالانکہ اس جھڑپ میں جو کچھ ہوا ہے، وہ نبی کی اجازت کے بغیر ہوا ہے اور اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اسلامی جماعت کے چند آدمیوں سے ایک غیر ذمہ دارانہ فعل کا ارتکاب ہو گیا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی معلوم رہنی چاہیے کہ جب یہ دستہ قیدی اور مالِ غنیمت لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، تو آپؐ نے اسی وقت فرما دیا تھا کہ میں نے تم کو لڑنے کی اجازت تو نہیں دی تھی۔ نیز آپؐ نے ان کے لائے ہوئے مالِ غنیمت میں سے بیت المال کا حصّہ لینے سے بھی اِنکار فرما دیا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ ان کی یہ لُوٹ ناجائز ہے۔ عام مسلمانوں نے بھی اس فعل پر اپنے ان آدمیوں کو سخت ملامت کی تھی، اور مدینے میں کوئی ایسا نہ تھا، جس نے

لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ
اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ
فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ

وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتّٰی کہ اگر اُن کا بس چلے، تو تمھیں اِس دین سے پھیر لے جائیں۔ (اور یہ خُوب سمجھ لو) تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا، اس کے اعمال دُنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔[۲۳۳] بخلاف اِس کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے،[۲۳۴] وہ

انھیں اس پر داد دی ہو۔

۲۳۳ – مسلمانوں میں سے بعض سادہ لوح لوگ، جن کے ذہن پر نیکی اور صُلح پسندی کا ایک غلط تصوُّر مسلّط تھا، کفارِ مکّہ اور یہودیوں کے مذکورۂ بالا اعتراضات سے متاثّر ہو گئے تھے۔ اس آیت میں انھیں سمجھایا گیا ہے کہ تم اپنی ان باتوں سے یہ اُمید نہ رکھو کہ تمھارے اور ان کے درمیان صفائی ہو جائے گی۔ اُن کے اعتراضات صفائی کی غرض سے ہیں ہی نہیں۔ وہ تو دراصل کیچڑ اُچھالنا چاہتے ہیں۔ انھیں یہ بات کُھل رہی ہے کہ تم اِس دین پر ایمان کیوں لائے ہو اور اس کی طرف دُنیا کو دعوت کیوں دیتے ہو۔ پس جب تک وہ اپنے کفر پر اَڑے ہوئے ہیں اور تم اس دین پر قائم ہو، تمھارے اور ان کے درمیان صفائی کسی طرح نہ ہو سکے گی۔ اور ایسے دُشمنوں کو تم معمولی دُشمن بھی نہ سمجھو۔ جو تم سے مال و زر یا زمین چھیننا چاہتا ہے، وہ کم تر درجے کا دشمن ہے۔ مگر جو تمھیں دینِ حق سے پھیرنا چاہتا ہے، وہ تمھارا بدترین دُشمن ہے۔ کیونکہ پہلا تو صرف تمھاری دُنیا ہی خراب کرتا ہے، لیکن یہ دُوسرا تمھیں آخرت کے اَبدی عذاب میں دھکیل دینے پر تُلا ہوا ہے۔

۲۳۴ – جہاد کے معنٰی ہیں: کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صَرف کر دینا۔ یہ محض جنگ کا ہم معنٰی نہیں ہے۔ جنگ کے لیے تو قِتال کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی جِدّوجُہد شامل ہے۔ مجاہد وہ شخص ہے، جو ہر وقت اپنے مقصد کی دُھن میں لگا ہو، دماغ سے اسی کے لیے

يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ
عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫
وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ
الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ ۙ
فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ

رحمتِ الٰہی کے جائز اُمّیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انھیں نوازنے والا ہے۔

پُوچھتے ہیں: شراب اور جُوے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ اُن کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔[۲۳۵]

پُوچھتے ہیں: ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: جو کچھ تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دُنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔

پُوچھتے ہیں: یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو: جس طرزِ عمل میں ان کے لیے

تدبیریں سوچے، زبان وقلم سے اسی کی تبلیغ کرے، ہاتھ پاؤں سے اسی کے لیے دَوڑ دھوپ اور محنت کرے، اپنے تمام اِمکانی وسائل اُس کو فروغ دینے میں صَرف کر دے، اور ہر اُس مزاحمت کا پُوری قوّت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے، حتّٰی کہ جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے۔ اس کا نام ہے ''جہاد''۔ اور جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور اس غَرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کلِمہ سارے کلموں پر غالب ہو جائے۔ اس کے سوا اور کوئی غرض مجاہد کے پیشِ نظر نہ ہو۔

۲۳۵ – یہ شراب اور جُوئے کے متعلق پہلا حکم ہے، جس میں صرف اظہارِ ناپسندیدگی کر کے چھوڑ دیا گیا ہے،

لَهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ
مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ
مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا
الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ

بھلائی ہو، وہی اختیار کرنا بہتر ہے[۲۳۶]۔ اگر تم اپنا اور اُن کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو، تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں۔ آخر وہ تمھارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ بُرائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے، دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا، مگر وہ صاحبِ اختیار ہونے کے ساتھ صاحبِ حکمت بھی ہے۔

تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے،

تاکہ ذہن ان کی حرمت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ بعد میں شراب پی کر نماز پڑھنے کی ممانعت آئی۔ پھر شراب اور جُوئے اور اس نوعیت کی تمام چیزوں کو قطعی حرام کر دیا گیا۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ نساء، آیت ۴۳ و سورۂ مائدہ، آیت ۹۰)

۲۳۶ - اس آیت کے نُزول سے پہلے قرآن میں یتیموں کے حُقوق کی حفاظت کے متعلق بار بار سخت احکام آ چکے تھے اور یہاں تک فرما دیا گیا تھا کہ ”یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو“ اور یہ کہ ”جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں۔“ ان شدید احکام کی بنا پر وہ لوگ، جن کی تربیّت میں یتیم بچے تھے، اس قدر خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے ان کا کھانا پینا تک اپنے سے الگ کر دیا تھا، اور اس احتیاط پر بھی انھیں ڈر تھا کہ کہیں یتیموں کے مال کا کوئی حصّہ ان کے مال میں نہ مل جائے۔ اسی لیے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان بچوں کے ساتھ ہمارے معاملے کی صحیح صورت کیا ہے۔

وَّ لَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡۤا اِلَى
الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ
يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۲۱﴾ ع وَيَسۡئَلُوۡنَكَ عَنِ الۡمَحِيۡضِ ؕ قُلۡ هُوَ اَذًى ۙ
فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الۡمَحِيۡضِ ۙ وَلَا تَقۡرَبُوۡهُنَّ حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ ۚ

اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بُلاتے ہیں[۲۳۷] اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنّت اور مغفرت کی طرف بُلاتا ہے، اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے ؏

پُوچھتے ہیں: حیض کا کیا حکم ہے؟ کہو: وہ ایک گندگی کی حالت ہے[۲۳۸]۔ اس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں[۲۳۹]۔

---

۲۳۷ – یہ ہے علّت و مَصلَحت اُس حکم کی جو مشرکین کے ساتھ شادی بیاہ کا تعلق نہ رکھنے کے متعلق اُوپر بیان ہوا تھا۔ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا تعلق محض ایک شَہوانی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ ایک گہرا تمدُّنی، اَخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ مومن اور مشرک کے درمیان اگر یہ قلبی تعلق ہو، تو جہاں اس امر کا امکان ہے کہ مومن شوہر یا بیوی کے اثر سے مشرک شوہر یا بیوی پر اور اس کے خاندان اور آیندہ نسل پر اسلام کے عقائد اور طرزِ زندگی کا نقش ثبت ہوگا، وہیں اس امر کا بھی امکان ہے کہ مشرک شوہر یا بیوی کے خیالات اور طور طریقوں سے نہ صرف مومن شوہر یا بیوی، بلکہ اس کا خاندان اور دونوں کی نسل تک متأثّر ہو جائے گی، اور غالب امکان اس امر کا ہے کہ ایسے اِزدِواج سے اسلام اور کفر و شرک کی ایک ایسی معجون مرکّب اُس گھر اور اس خاندان میں پرورش پائے گی، جس کو غیر مسلم خواہ کتنا ہی پسند کریں، مگر اسلام کسی طرح پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جو شخص صحیح معنوں میں مومن ہو، وہ محض اپنے جذباتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ اس کے گھر اور اس کے خاندان میں کافرانہ و مشرکانہ خیالات اور طور طریقے پرورش پائیں اور وہ خود بھی نادانستہ اپنی زندگی کے کسی پہلو میں کفر و شرک سے متأثّر ہو جائے۔ اگر بالفرض ایک فردِ مومن کسی فردِ مشرک کے عشق میں بھی مبتلا ہو جائے، تب بھی اس کے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنی نسل اور خود اپنے دین و اَخلاق پر اپنے شخصی جذبات قربان کر دے۔

۲۳۸ – اصل میں اَذًی کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی گندگی کے بھی ہیں اور بیماری کے بھی۔ حیض صرف ایک گندگی ہی نہیں ہے، بلکہ طبّی حیثیت سے وہ ایک ایسی حالت ہے، جس میں عورت تندرستی کی بہ نسبت بیماری سے قریب تر

فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ اُس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔[۲۴۰] اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔ تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔ تمھیں اختیار ہے، جس طرح چاہو، اپنی کھیتی میں[۲۴۱] جاؤ، مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو[۲۴۲] اور اللہ کی ناراضی سے بچو۔

ہوتی ہے۔

۲۳۹ – قرآنِ مجید اس قسم کے معاملات کو استعاروں اور کِنایوں میں بیان کرتا ہے۔ اس لیے اس نے ’’الگ رہو‘‘ اور ’’قریب نہ جاؤ‘‘ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مگر اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھنے یا ایک جگہ کھانا کھانے سے بھی احتراز کیا جائے اور اسے بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے، جیسا کہ یہود اور ہُنود اور بعض دُوسری قوموں کا دستور ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی جو توضیح فرما دی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں صرف فعلِ مباشرت سے پرہیز کرنا چاہیے، باقی تمام تعلّقات بدستور برقرار رکھے جائیں۔

۲۴۰ – یہاں حکم سے مراد حکم شرعی نہیں ہے، بلکہ وہ فطری حکم مراد ہے، جو انسان اور حیوان سب کی جِبِلّت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور جس سے ہر متنفّس بالطبع واقف ہے۔

۲۴۱ – یعنی فطرت اللہ نے عورتوں کو مردوں کے لیے سیر گاہ نہیں بنایا ہے، بلکہ ان دونوں کے درمیان کھیت اور کسان کا سا تعلق ہے۔ کھیت میں کسان محض تفریح کے لیے نہیں جاتا، بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ اس سے پیداوار حاصل کرے۔ نسلِ انسانی کے کسان کو بھی انسانیت کی اس کھیتی میں اس لیے جانا چاہیے کہ وہ اس سے نسل کی پیداوار حاصل کرے۔ خدا کی شریعت کو اس سے بحث نہیں کہ تم اس کھیت میں کاشت کس طرح کرتے ہو، البتہ اس کا مطالبہ تم سے یہ ہے کہ جاؤ کھیت ہی میں، اور اس غرض کے لیے جاؤ کہ اس سے پیداوار حاصل کرنی ہے۔

۲۴۲ – جامع الفاظ ہیں، جن سے دو مطلب نکلتے ہیں اور دونوں کی یکساں اہمیّت ہے۔ ایک، یہ کہ اپنی نسل برقرار رکھنے کی کوشش کرو، تاکہ تمھارے دُنیا چھوڑنے سے پہلے تمھاری جگہ دُوسرے کام کرنے والے پیدا ہوں۔ دُوسرے، یہ کہ جس آنے والی نسل کو تم اپنی جگہ چھوڑنے والے ہو، اس کو دین، اَخلاق اور آدمیّت کے جوہروں سے آراستہ کرنے کی کوشش کرو۔ بعد کے فقرے میں اس بات پر بھی تنبیہ فرما دی ہے کہ اگر ان دونوں فرائض کے ادا کرنے میں تم نے قصداً

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۲۳ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ
عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ
وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۲۴ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ
وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۲۲۵
لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ

خُوب جان لو کہ تمھیں ایک دن اُس سے ملنا ہے۔ اور اے نبیؐ! جو تمھاری ہدایات کو مان لیں انھیں فلاح وسعادت کا مُژدہ سُنا دو۔

اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو، جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور بندگانِ خدا کی بھلائی کے کاموں سے باز رہنا ہو۔[۲۴۳] اللہ تمھاری ساری باتیں سُن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ جو بے معنیٰ قسمیں تم بلاارادہ کھالیا کرتے ہو، اُن پر اللہ گرفت نہیں کرتا،[۲۴۴] مگر جو قسمیں تم سچّے دل سے کھاتے ہو، اُن کی باز پُرس وہ ضرور کرے گا۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے۔

جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، اُن کے لیے چار مہینے کی مُہلت ہے۔[۲۴۵]

کوتاہی کی، تو اللہ تم سے باز پُرس کرے گا۔

۲۴۳ — احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کسی بات کی قسم کھائی ہو اور بعد میں اس پر واضح ہوجائے کہ اِس قسم کے توڑ دینے ہی میں خیر اور بھلائی ہے، اسے قسم توڑ دینی چاہیے اور کفّارہ ادا کرنا چاہیے۔ قسم توڑنے کا کفّارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا، یا انھیں کپڑے پہنانا، یا ایک غلام آزاد کرنا، یا تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ مائدہ، آیت ۸۹)

۲۴۴ — یعنی بطور تکیۂ کلام کے بلاارادہ جو قسمیں زبان سے نکل جاتی ہیں، ایسی قسموں پر نہ کفارہ ہے اور نہ ان پر مواخذہ ہوگا۔

۲۴۵ — اِصطلاحِ شرع میں اس کو اِیلا کہتے ہیں۔ میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات ہمیشہ خوش گوار تو نہیں رہ سکتے۔ بگاڑ کے اسباب پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ایسے بگاڑ کو خدا کی شریعت پسند نہیں کرتی کہ دونوں ایک دُوسرے

فَاِنۡ فَآءُوۡ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ
فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَالۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ

اگر انھوں نے رُجوع کرلیا، تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔[۲۴۶] اور اگر اُنھوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو[۲۴۷] جانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔[۲۴۸]

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ تین مرتبہ ایامِ ماہواری آنے تک اپنے آپ کو

کے ساتھ قانونی طور پر رشتۂ اِزدِواج میں تو بندھے رہیں، مگر عملاً ایک دُوسرے سے اس طرح الگ رہیں کہ گویا وہ میاں اور بیوی نہیں ہیں۔ ایسے بگاڑ کے لیے اللہ تعالیٰ نے چار مہینے کی مدت مقرر کر دی کہ یا تو اس دَوران میں اپنے تعلّقات درست کرلو، ورنہ اِزدِواج کا رشتہ منقطع کر دو، تاکہ دونوں ایک دُوسرے سے آزاد ہو کر جس سے نباہ کر سکیں، اس کے ساتھ نکاح کرلیں۔

آیت میں چونکہ ”قسم کھا لینے“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اس لیے فُقہائے حَنَفِیّہ اور شافعیہ نے اس آیت کا منشا یہ سمجھا ہے کہ جہاں شوہر نے بیوی سے تعلقِ زن وشو نہ رکھنے کی قسم کھائی ہو، صرف وہیں اس حکم کا اطلاق ہوگا، باقی رہا قسم کھائے بغیر تعلق منقطع کر لینا، تو یہ خواہ کتنی ہی طویل مدت کے لیے ہو، اس آیت کا حکم اُس صورت پر چسپاں نہ ہوگا۔ مگر فقہائے مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو، دونوں صورتوں میں ترکِ تعلق کے لیے یہی چار مہینے کی مدت ہے۔ ایک قول امام احمدؒ کا بھی اسی کی تائید میں ہے۔ (بِدایۃ المجتہد، جلد دوم، ص ۸۸، طبع مصر، ۱۳۳۹ھ)

حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ اور حسن بصریؒ کی رائے میں یہ حکم صرف اُس ترکِ تعلق کے لیے ہے، جو بگاڑ کی وجہ سے ہو۔ رہا کسی مَصلَحت سے شوہر کا بیوی کے ساتھ جسمانی رابطہ منقطع کر دینا، جبکہ تعلّقات خوش گوار ہوں، تو اس پر یہ حکم منطبق نہیں ہوتا۔ لیکن دوسرے فقہا کی رائے میں ہر وہ حلف جو شوہر اور بیوی کے درمیان رابطۂ جسمانی کو منقطع کردے، ایلا ہے اور اسے چار مہینے سے زیادہ قائم نہ رہنا چاہیے، خواہ ناراضی سے ہو یا رضامندی سے۔

۲۴۶ – بعض فقہا نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اگر وہ اس مدت کے اندر اپنی قسم توڑ دیں اور پھر سے تعلقِ زن وشو قائم کرلیں تو ان پر قَسم توڑنے کا کَفّارہ نہیں ہے، اللہ ویسے ہی معاف کر دے گا۔ لیکن اکثر فقہا کی رائے یہ ہے کہ قَسم توڑنے کا کَفّارہ دینا ہوگا۔ غَفُورٌ رحیم کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفارے سے تمھیں معاف کر دیا گیا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمھارے کفارے کو قبول کرلے گا اور ترکِ تعلق کے دَوران میں جو زیادتی دونوں نے ایک دُوسرے پر کی ہو، اسے معاف کر دیا جائے گا۔

۲۴۷ – حضرات عثمانؓ، ابنِ مسعودؓ، زیدؓ بن ثابت وغیرہم کے نزدیک رُجوع کا موقع چار مہینے کے اندر ہی ہے۔ اس مدت کا گزر جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کرلیا ہے، اس لیے مدت گزرتے ہی طلاق خود بخود

ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنۡ يَّكۡتُمۡنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِىۡۤ اَرۡحَامِهِنَّ اِنۡ كُنَّ يُؤۡمِنَّ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِىۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۖ وَلِلرِّجَالِ عَلَيۡهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ

روکے رکھیں اور اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے اُن کے رِحم میں جو کچھ خَلق فرمایا ہو، اُسے چھپائیں۔ اُنھیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے، اگر وہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔ اُن کے شوہر تعلّقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں، تو وہ اِس عدّت کے دوران میں انھیں پھر اپنی زوجیّت میں واپس لے لینے کے حق دار ہیں۔[۲۴۹]

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مَردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مَردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے۔ اور سب پر اللہ

واقع ہو جائے گی اور وہ ایک طلاقِ بائن ہوگی، یعنی دَورانِ عدّت میں شوہر کو رُجوع کا حق نہ ہوگا۔ البتہ اگر وہ دونوں چاہیں، تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ حضرات عمرؓ، علیؓ، ابنِ عباسؓ اور ابنِ عمرؓ سے بھی ایک قول اسی معنٰی میں منقول ہے اور فقہائے حَنَفِیّہ نے اسی رائے کو قبول کیا ہے۔

سعید بن مُسَیَّبؒ، مَکحُولؒ، زُہریؒ وغیرہ حضرات اس رائے سے یہاں تک تو متفق ہیں کہ چار مہینے کی مدّت گزرنے کے بعد خود بخود طلاق ہو جائے گی، مگر ان کے نزدیک وہ ایک طلاقِ رَجعی ہوگی، یعنی دَورانِ عدّت میں شوہر کو رجوع کر لینے کا حق ہوگا، اور رجوع نہ کرے تو عدّت گزر جانے کے بعد دونوں اگر چاہیں، تو نکاح کر سکیں گے۔

بخلاف اس کے حضرت عائشہؓ، ابوالدَّرداءؓ اور اکثر فقہائے مدینہ کی رائے یہ ہے کہ چار مہینے کی مدّت گزرنے کے بعد معاملہ عدالت میں پیش ہوگا اور حاکمِ عدالت شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو اس عورت کی طرف رُجوع کرے یا اُسے طلاق دے۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور ابنِ عمرؓ کا ایک قول اس کی تائید میں بھی ہے اور امام مالکؒ و شافعیؒ نے اسی کو قبول کیا ہے۔

۲۴۸ — یعنی اگر تم نے بیوی کو ناروا بات پر چھوڑا ہے، تو اللہ سے بے خوف نہ رہو، وہ تمھاری زیادتی سے ناواقف نہیں ہے۔

۲۴۹ — اس آیت کے حکم میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک جماعت کے نزدیک جب تک عورت تیسرے حیض سے فارغ ہو کر نہا نہ لے، اس وقت تک طلاقِ بائن نہ ہوگی اور شوہر کو رُجوع کا حق باقی رہے گا۔ حضرات

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٨﴾ ع اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔ع

طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے۔[250]

اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو اُس میں سے

ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، ابنِ عباسؓ، ابوموسیٰ اَشعَریؓ، ابنِ مسعودؓ اور بڑے بڑے صحابہؓ کی یہی رائے ہے اور فقہائے حَنَفِیّہ نے اسی کو قبول کیا ہے۔ بخلاف اِس کے، دُوسری جماعت کہتی ہے کہ عورت کو تیسری بار حیض آتے ہی شوہر کا حقِ رُجوع ساقط ہوجاتا ہے۔ یہ رائے حضرت عائشہؓ، ابنِ عمرؓ اور زیدؓ بن ثابت کی ہے اور فقہائے شافعیہ و مالکیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ حکم صرف اُس صورت سے متعلق ہے، جس میں شوہر نے عورت کو ایک یا دو طلاقیں دی ہوں۔ تین طلاقیں دینے کی صُورت میں شوہر کو حقِ رُجوع نہیں ہے۔

۲۵۰ – اس مختصری آیت میں ایک بہت بڑی معاشرتی خرابی کی، جو عربِ جاہلیّت میں رائج تھی، اصلاح کی گئی ہے۔ عرب میں قاعدہ یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو بے حدّوحساب طلاق دینے کا مجاز تھا۔ جس عورت سے اس کا شوہر بگڑ جاتا، اُس کو وہ بار بار طلاق دے کر رُجوع کرتا رہتا تھا، تاکہ نہ تو وہ غریب اس کے ساتھ بس ہی سکے اور نہ اس سے آزاد ہو کر کسی اَور سے نکاح ہی کر سکے۔ قرآنِ مجید کی یہ آیت اسی ظلم کا دروازہ بند کرتی ہے۔ اس آیت کی رُو سے ایک مرد ایک رشتۂ نکاح میں اپنی بیوی پر حد سے حد دو ہی مرتبہ طلاقِ رَجْعی کا حق استعمال کر سکتا ہے۔ جو شخص اپنی منکوحہ کو دو مرتبہ طلاق دے کر اس سے رُجوع کر چکا ہو، وہ اپنی عمر میں جب کبھی اس کو تیسری بار طلاق دے گا، عورت اس سے مستقل طور پر جدا ہو جائے گی۔

طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ عورت کو حالتِ طُہر میں ایک مرتبہ طلاق دی جائے۔ اگر جھگڑا ایسے زمانے میں ہوا ہو، جب کہ عورت ایّام ماہواری میں ہو تو اسی وقت طلاق دے بیٹھنا درست نہیں ہے، بلکہ ایامِ سے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ پھر ایک طلاق دینے کے بعد اگر چاہے، تو دوسرے طُہر میں دوبارہ ایک طلاق اور دے دے، ورنہ بہتر یہی ہے کہ پہلی ہی طلاق پر اکتفا کرے۔ اِس صورت میں شوہر کو یہ حق حاصل رہتا ہے کہ عدّت گزرنے سے پہلے پہلے جب چاہے رجوع کر لے، اور اگر عدّت گزر بھی جائے، تو دونوں کے لیے موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن تیسرے طُہر میں تیسری بار طلاق دینے کے بعد نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اِس کا ہی کوئی موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں

شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ
اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ
اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٢٩﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ

کچھ واپس[۲۵۱] لے لو۔ البتّہ یہ صُورت مُستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حُدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حُدودِ الٰہی پر قائم نہ رہیں گے، تو اُن دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں کوئی مضایقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے[۲۵۲]۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حُدود ہیں، اِن سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو لوگ حُدودِ الٰہی سے تجاوز کریں، وہی ظالم ہیں۔

پھر اگر (دوبار طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی، تو وہ عورت پھر اس کے لیے

دے ڈالی جائیں، جیسا کہ آج کل جُہلا کا عام طریقہ ہے، تو یہ شریعت کی رُو سے سخت گناہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی مَذمّت فرمائی ہے، اور حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے کہ جو شخص بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا، آپ اس کو دُرّے لگاتے تھے۔ تاہم گناہ ہونے کے باوجود، ائمّۂ اربعہ کے نزدیک تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور طلاقِ مُغلَّظ ہو جاتی ہے۔

۲۵۱ – یعنی مَہر اور وہ زیور اور کپڑے وغیرہ، جو شوہر اپنی بیوی کو دے چکا ہو، ان میں سے کوئی چیز بھی واپس مانگنے کا اسے حق نہیں ہے۔ یہ بات ویسے بھی اسلام کے اَخلاقی اصولوں کی ضد ہے کہ کوئی شخص کسی ایسی چیز کو، جسے وہ دوسرے شخص کو ہِبہ یا ہدیہ وتحفہ کے طور پر دے چکا ہو، واپس مانگے۔ اس ذلیل حرکت کو حدیث میں اُس کتّے کے فعل سے تشبیہ دی گئی ہے، جو اپنی ہی قے کو خود چاٹ لے۔ مگر خُصُوصیّت کے ساتھ ایک شوہر کے لیے تو یہ بہت ہی شرم ناک ہے کہ وہ طلاق دے کر رُخصت کرتے وقت اپنی بیوی سے وہ سب کچھ رکھوا لینا چاہے جو اس نے کبھی اسے خود دیا تھا۔ اس کے برعکس اسلام نے یہ اَخلاق سکھائے ہیں کہ آدمی جس عورت کو طلاق دے، اُسے رخصت کرتے وقت کچھ نہ کچھ دے کر رُخصت کرے۔ جیسا کہ آگے آیت ۲۴۱ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

۲۵۲ – شریعت کی اصطلاح میں اسے ”خُلع“ کہتے ہیں، یعنی ایک عورت کا اپنے شوہر کو کچھ دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کرنا۔ اس معاملے میں اگر عورت اور مرد کے درمیان گھر کے گھر ہی میں کوئی معاملہ طے ہو جائے، تو جو کچھ طے ہوا ہو،

مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ
فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْفٍ ۠ وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ

حلال نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ اس کا نکاح کسی دُوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے۔[۲۵۳] تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حُدودِ الٰہی پر قائم رہیں گے، تو ان کے لیے ایک دُوسرے کی طرف رُجوع کر لینے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، جنھیں وہ اُن لوگوں کی ہدایت کے لیے واضح کر رہا ہے، جو (اس کی حدوں کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عِدّت پوری ہونے کو آجائے، تو یا بھلے طریقے سے انھیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انھیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور

وہی نافذ ہوگا۔ لیکن اگر عدالت میں معاملہ جائے، تو عدالت صرف اس امر کی تحقیق کرے گی کہ آیا فی الواقع یہ عورت اُس مرد سے اس حد تک مُتَنَفِّر ہو چکی ہے کہ اُس کے ساتھ اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق ہو جانے پر عدالت کو اختیار ہے کہ حالات کے لحاظ سے جو فدیہ چاہے، تجویز کرے، اور اس فدیے کو قبول کر کے شوہر کو اسے طلاق دینا ہوگا۔ بالعُموم فقہا نے اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ جو مال شوہر نے اس عورت کو دیا ہو، اس کی واپسی سے بڑھ کر کوئی فدیہ اسے دلوایا جائے۔

خُلع کی صورت میں جو طلاق دی جاتی ہے، وہ رَجعی نہیں ہے، بلکہ بائنہ ہے۔ چونکہ عورت نے معاوضہ دے کر اس طلاق کو گویا خریدا ہے، اس لیے شوہر کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ اس طلاق سے رجوع کر سکے۔ البتہ اگر یہی مرد و عورت پھر ایک دُوسرے سے راضی ہو جائیں اور دوبارہ نکاح کرنا چاہیں، تو ایسا کرنا ان کے لیے بالکل جائز ہے۔

جُمہور کے نزدیک خُلع کی عدّت وہی ہے جو طلاق کی ہے۔ مگر ابوداؤد، ترمذی اور ابنِ ماجہ وغیرہ میں متعدّد رِوایات ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدّت ایک ہی حیض قرار دی تھی اور اسی کے مطابق حضرت عثمانؓ نے ایک مُقدّمے کا فیصلہ کیا۔ (ابنِ کثیر، جلد اوّل، ص ۲۷۶)

۲۵۳ – احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنی مُطلّقہ بیوی کو اپنے لیے حلال کرنے کی خاطر کسی سے سازش کے طور پر اس کا نکاح کرائے اور پہلے سے یہ طے کرے کہ وہ نکاح کے بعد اسے طلاق دے دے گا، تو یہ سراسر ایک ناجائز

مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ
هُزُوًا ۫ وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ
الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ (ع ۲۹/۳ الثلثة)
فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ

جو ایسا کرے گا، وہ درحقیقت آپ اپنے ہی اُوپر ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔[۲۵۴] بُھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمتِ عظمیٰ سے تمھیں سرفراز کیا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اُس نے تم پر نازل کی ہے، اس کا احترام ملحوظ رکھو۔[۲۵۵] اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔ ع

جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عِدّت پُوری کرلیں، تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیرِ تجویز شوہروں سے نکاح کرلیں، جب کہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر

فعل ہے۔ ایسا نکاح، نکاح نہ ہوگا، بلکہ محض ایک بدکاری ہوگی اور ایسے سازشی نکاح و طلاق سے عورت ہرگز اپنے سابق شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی۔ حضرت علی اور ابنِ مسعود اور ابوہُرَیرہ اور عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم کی مُتّفقہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے سے حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

۲۵۴ – یعنی ایسا کرنا دُرست نہیں ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دے اور عدّت گزرنے سے پہلے محض اس لیے رُجوع کرلے کہ اسے پھر ستانے اور دِق کرنے کا موقع ہاتھ آجائے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرماتا ہے کہ رُجوع کرتے ہو تو اس نیّت سے کرو کہ اب حُسنِ سلوک سے رہنا ہے۔ ورنہ بہتر یہ ہے کہ شریفانہ طریقے سے رُخصت کردو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حاشیہ نمبر ۲۵۰)

۲۵۵ – یعنی اس حقیقت کو فراموش نہ کردو کہ اللہ نے تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے کر دُنیا کی رہنمائی کے عظیم الشان منصب پر مامور کیا ہے۔ تم "اُمّتِ وَسَط" بنائے گئے ہو۔ تمھیں نیکی اور راستی کا گواہ بنا کر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمھارا یہ کام نہیں ہے کہ حیلہ بازیوں سے آیاتِ الٰہی کا کھیل بناؤ، قانون کے الفاظ سے رُوحِ قانون کے خلاف ناجائز فائدے اُٹھاؤ اور دُنیا کو راہِ راست دکھانے کے بجائے خود اپنے گھروں میں ظالم اور بدراہ بن کر رہو۔

بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ
اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ
حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى
الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ
نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ

راضی ہوں[۲۵۶]۔ تمھیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا، اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لانے والے ہو۔ تمھارے لیے شایستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پُوری مدّتِ رضاعت تک دودھ پیے، تو مائیں اپنے بچّوں کو کامل دو سال دُودھ پلائیں[۲۵۷]۔ اِس صُورت میں بچّے کے باپ کو معروف طریقے سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اِس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچّہ اس کا ہے، اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے

۲۵۶- یعنی اگر کسی عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہو اور زمانۂ عدّت کے اندر اس سے رُجوع نہ کیا ہو، پھر عدّت گزر جانے کے بعد وہ دونوں آپس میں دوبارہ نکاح کرنے پر راضی ہوں، تو عورت کے رشتے داروں کو اس میں مانع نہ ہونا چاہیے۔ نیز اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہو اور عورت عدّت کے بعد اس سے آزاد ہو کر کہیں دوسری جگہ اپنا نکاح کرنا چاہتی ہو، تو اُس سابق شوہر کو ایسی کمینہ حرکت نہ کرنی چاہیے کہ اس کے نکاح میں مانع ہو اور یہ کوشش کرتا پھرے کہ جس عورت کو اس نے چھوڑا ہے، اُسے کوئی نکاح میں لانا قبول نہ کرے۔

۲۵۷- یہ اُس صورت کا حکم ہے، جب کہ زوجین ایک دُوسرے سے علیٰحدہ ہو چکے ہوں، خواہ طلاق کے

لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ
تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ
تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾
وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ
بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ

تنگ کیا جائے کہ بچّہ اس کا ہے ــــ دُودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچّے کے باپ پر ہے، ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے[۲۵۸] ــــ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دُودھ چھڑانا چاہیں، تو ایسا کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ اور اگر تمھارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دُودھ پلوانے کا ہو، تو اِس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو، وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔

تم میں سے جو لوگ مر جائیں، اُن کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں، تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے، دس دن روکے رکھیں[۲۵۹]۔ پھر جب ان کی عِدّت پُوری ہو جائے، تو

ذریعے سے یا خُلع یا فسخ اور تفریق کے ذریعے سے، اور عورت کی گود میں دُودھ پیتا بچّہ ہو۔

۲۵۸ – یعنی اگر باپ مر جائے، تو جو اس کی جگہ بچّے کا ولی ہو، اُسے یہ حق ادا کرنا ہوگا۔

۲۵۹ – یہ عدّتِ وفات اُن عورتوں کے لیے بھی ہے جن سے شوہروں کی خَلْوَتِ صحیحہ نہ ہوئی ہو۔ البتہ حاملہ عورت اس سے مُستثنٰی ہے۔ اس کی عِدّتِ وفات وضعِ حمل تک ہے، خواہ وضعِ حمل شوہر کی وفات کے بعد ہی ہو جائے، یا اِس میں کئی مہینے صَرف ہوں۔

''اپنے آپ کو روکے رکھیں'' سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس مدّت میں نکاح نہ کریں، بلکہ اس سے مراد اپنے آپ کو

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَ
اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ
بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ
اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ
تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ
الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

انھیں اختیار ہے، اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے جو چاہیں، کریں۔ تم پر اس کی کوئی ذمّے داری نہیں۔ اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔ زمانۂ عِدّت میں خواہ تم اُن بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کر دو، خواہ دل میں چُھپائے رکھو، دونوں صورتوں میں کوئی مضایقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ اُن کا خیال تو تمھارے دل میں آئے گا ہی۔ مگر دیکھو! خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا۔ اگر کوئی بات کرنی ہے، تو معروف طریقے سے کرو۔ اور عقدِ نکاح باندھنے کا فیصلہ اُس وقت تک نہ کرو، جب تک کہ عدت پُوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمھارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔

زینت سے بھی روکے رکھنا ہے۔ چنانچہ احادیث میں واضح طور پر یہ احکام ملتے ہیں کہ زمانۂ عِدّت میں عورت کو رنگین کپڑے اور زیور پہننے سے، مہندی اور سُرمہ اور خوشبو اور خضاب لگانے سے، اور بالوں کی آرایش سے پرہیز کرنا چاہیے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا اس زمانے میں عورت گھر سے نکل سکتی ہے یا نہیں۔ حضرات عمرؓ، عثمانؓ، ابنِ عمرؓ، زیدؓ بن ثابت، ابنِ مسعودؓ، اُمِّ سَلَمہؓ، سعید بن مُسَیّبؒ، ابراہیم نَخَعی، محمد بن سیرین اور ائمۂ اربعہ رحمہم اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ زمانۂ عدّت میں عورت کو اُسی گھر میں رہنا چاہیے جہاں اس کے شوہر نے وفات پائی ہو۔ دن کے وقت کسی ضرورت سے وہ باہر جاسکتی ہے، مگر قیام اس کا اُسی گھر میں ہونا چاہیے۔ اِس کے برعکس حضرت عائشہؓ، ابنِ عباسؓ، حضرت علیؓ، جابر بن عبداللہؓ، عطاء، طاؤس، حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز اور تمام اہل الظاہر اس بات کے قائل ہیں کہ عورت اپنی عدّت کا زمانہ جہاں

ع ۳۰ ۱۴
فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع لَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا
لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ
وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا
عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ
وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ
يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ

لہٰذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بُردبار ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگزر فرماتا ہے۔ع

تم پر کچھ گناہ نہیں، اگر اپنی عورتوں کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مَہر مقرر ہو۔ اس صُورت میں اُنھیں کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہیے[۲۶۰]۔ خوش حال آدمی اپنی مَقدرَت کے مطابق اور غریب اپنی مَقدِرَت کے مطابق معروف طریقے سے دے۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔ اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو، لیکن مَہر مقرر کیا جا چکا ہو، تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا۔ یہ اَور بات ہے کہ عورت نرمی برتے (اور مَہر نہ لے) یا وہ مرد، جس کے اختیار میں عقدِ نکاح ہے، نرمی سے کام لے (اور پُورا مَہر دے دے)، اور تم (یعنی مرد)

چاہے گزار سکتی ہے اور اس زمانے میں سفر بھی کر سکتی ہے۔

۲۶۰- اس طرح رشتہ جوڑنے کے بعد توڑ دینے سے بہر حال عورت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو پہنچتا ہی ہے، اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ حسبِ مَقدرَت اس کی تلافی کرو۔

تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ
وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ

نرمی سے کام لو، تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بُھولو۔[۲۶۱] تمھارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔

اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو،[۲۶۲] خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسنِ صلوٰۃ کی جامع ہو۔[۲۶۳] اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو، جیسے فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔ بدامنی کی حالت ہو تو

۲۶۱ – یعنی انسانی تعلّقات کی بہتری و خوش گواری کے لیے لوگوں کا باہم فیّاضانہ برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہر ایک شخص ٹھیک ٹھیک اپنے قانونی حق ہی پر اَڑا رہے، تو اجتماعی زندگی کبھی خوش گوار نہیں ہو سکتی۔

۲۶۲ – قوانینِ تمدُّن و معاشرت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس تقریر کو نماز کی تاکید پر ختم فرماتا ہے، کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر خدا کا خوف، نیکی و پاکیزگی کے جذبات اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا مادّہ پیدا کرتی ہے اور اُسے راستی پر قائم رکھتی ہے۔ یہ چیز نہ ہو تو انسان کبھی الٰہی قوانین کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور آخر کار اسی نافرمانی کی رَو میں بہ نکلتا ہے جس پر یہودی بہ نکلے۔

۲۶۳ – اصل میں لفظ ’’صَلٰوۃِ الْوُسْطٰی‘‘ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد بعض مفسّرین نے صبح کی نماز لی ہے، بعض نے ظہر، بعض نے مغرب اور بعض نے عشا۔ لیکن ان میں سے کوئی قول بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ صرف اہلِ تاویل کا اِستِنباط ہے۔ سب سے زیادہ اقوال نمازِ عصر کے حق میں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی نماز کو صلوٰۃِ وسطٰی قرار دیا ہے۔ لیکن جس واقعے سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ جنگِ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے حملے نے اس درجہ مشغول رکھا کہ سورج ڈوبنے کو آ گیا اور آپؐ نمازِ عصر نہ پڑھ سکے۔ اُس وقت آپؐ نے فرمایا کہ ’’خدا ان لوگوں کی قبریں اور ان کے گھر آگ سے بھر دے، انھوں نے ہماری صلوٰۃِ وسطٰی فوت کرا دی۔‘‘ اِس سے یہ سمجھا گیا کہ آپؐ نے نمازِ عصر کو صلوٰۃِ وسطٰی فرمایا ہے، حالانکہ اس کا یہ مطلب ہمارے نزدیک زیادہ قرینِ صواب ہے کہ اس مشغولیت نے اعلیٰ درجے کی نماز ہم سے فوت کرا دی، ناوقت پڑھنی پڑے گی، جلدی جلدی ادا کرنی ہوگی، خُشوع و خُضوع اور اطمینان و سکون کے ساتھ نہ پڑھ سکیں گے۔

وُسطٰی کے معنی بیچ والی چیز کے بھی ہیں اور ایسی چیز کے بھی جو اعلیٰ اور اشرف ہو۔ صلوٰۃِ وسطٰی سے مراد بیچ کی نماز

فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ
تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ
اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ
فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ
مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ
بِالْمَعْرُوْفِ ۗ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ

خواہ پیدل ہو، خواہ سوار، جس طرح ممکن ہو، نماز پڑھو۔ اور جب امن میسّر آ جائے، تو اللہ کو اُس طریقے سے یاد کرو، جو اُس نے تمھیں سکھا دیا ہے، جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔

تم میں سے[۲۶۴] جو لوگ وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں، اُن کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیّت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان و نفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں، تو اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے وہ جو کچھ بھی کریں، اس کی کوئی ذمّہ داری تم پر نہیں ہے، اللہ سب پر غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ اِسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، انھیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متّقی لوگوں پر۔

اِس طرح اللہ اپنے احکام تمھیں صاف صاف بتاتا ہے۔

بھی ہو سکتی ہے اور ایسی نماز بھی جو صحیح وقت پر پورے خشوع اور توجہ الی اللہ کے ساتھ پڑھی جائے، اور جس میں نماز کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ بعد کا فقرہ کہ "اللہ کے آگے فرماں بردار بندوں کی طرح کھڑے ہو"، خود اس کی تفسیر کر رہا ہے۔

۲۶۴- سلسلۂ تقریر اُوپر ختم ہو چکا تھا، یہ کلام اس کے تتمّے اور ضمیمے کے طور پر ہے۔

ع ۳۱ ۱۵

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ؏ ﴿۲۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۠ قف
ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا

اُمّید ہے کہ تم سمجھ بُوجھ کر کام کرو گے۔ ؏

تم[۲۶۵] نے اُن لوگوں کے حال پر بھی کچھ غور کیا، جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے؟ اللہ نے اُن سے فرمایا: مر جاؤ۔ پھر اُس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی۔[۲۶۶] حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے ـــــ مسلمانو! اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ

---

۲۶۵ – یہاں سے ایک دُوسرا سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے، جس میں مسلمانوں کو راہِ خدا میں جہاد اور مالی قربانیاں کرنے پر اُبھارا گیا ہے اور انھیں اُن کمزوریوں سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، جن کی وجہ سے آخر کار بنی اسرائیل زوال و انحطاط سے دوچار ہوئے۔ اس مقام کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مسلمان اس وقت مکّے سے نکالے جا چکے تھے، سال ڈیڑھ سال سے مدینے میں پناہ گزیں تھے، اور کفّار کے مظالم سے تنگ آ کر خود بار بار مطالبہ کر چکے تھے کہ ہمیں لڑنے کی اجازت دی جائے۔ مگر جب انھیں لڑائی کا حکم دے دیا گیا، تو اب ان میں سے بعض لوگ کسمسا رہے تھے، جیسا کہ چھبیسویں رُکوع کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ اِس لیے یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو اہم واقعات سے اُنھیں عبرت دلائی گئی ہے۔

۲۶۶ – یہ اشارہ بنی اسرائیل کے واقعۂ خُروج کی طرف ہے۔ سورۂ مائدہ کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں مصر سے نکلے تھے۔ دشت و بیاباں میں بے خانماں پھر رہے تھے۔ خود ایک ٹھکانے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر جب اللہ کے ایما سے حضرت موسیٰؑ نے ان کو حکم دیا کہ ظالم کنعانیوں کو ارضِ فلسطین سے نکال دو اور اس علاقے کو فتح کر لو، تو انھوں نے بُزدلی دکھائی اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے انھیں چالیس سال تک زمین میں سرگرداں پھرنے کے لیے چھوڑ دیا، یہاں تک کہ ان کی ایک نسل ختم ہوگئی اور دُوسری نسل صحراؤں کی گود میں پَل کر اُٹھی۔ تب اللہ تعالیٰ نے اُنھیں کنعانیوں پر غلبہ عطا کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی معاملے کو موت اور دوبارہ زندگی

اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا
حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ
وَيَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْۤ
اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا
مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ

وقف لازم

اللہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حَسَن[267] دے تاکہ اللہ اُسے کئی گُنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے؟ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی، اور اُسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔

پھر تم نے اُس معاملے پر بھی غور کیا، جو موسیٰؑ کے بعد سردارانِ بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا؟ اُنھوں نے اپنے نبی سے کہا: ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔[268] نبی نے پوچھا: کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ تم کو لڑائی کا

کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

۲۶۷ – ”قرضِ حَسَن“ کا لفظی ترجمہ ”اچھا قرض“ ہے، اور اس سے مراد ایسا قرض ہے، جو خالص نیکی کے جذبے سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے۔ اس طرح جو مال راہِ خدا میں خرچ کیا جائے، اسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمّے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا، بلکہ اس سے کئی گُنا زیادہ دُوں گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ ہو قرضِ حَسَن، یعنی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے، بلکہ محض اللہ کی خاطر اُن کاموں میں صَرف کیا جائے، جن کو وہ پسند کرتا ہے۔

۲۶۸ – یہ تقریباً ایک ہزار برس قبلِ مسیح کا واقعہ ہے۔ اُس وقت بنی اسرائیل پر عَمالِقَہ چیرہ دست ہو گئے تھے اور انھوں نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ سموئیل نبی اس زمانے میں بنی اسرائیل کے درمیان حکومت کرتے تھے، مگر وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اس لیے سردارانِ بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص اُن کا سربراہِ کار ہو، جس کی قیادت میں وہ جنگ کر سکیں۔ لیکن اُس وقت بنی اسرائیل میں اس قدر جاہلیّت آ چکی تھی اور وہ غیر مسلم قوموں کے طور طریقوں سے اتنے متاثّر ہو چکے تھے کہ خلافت اور بادشاہی کا فرق اُن کے

ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے درخواست جو کی، وہ خلیفہ کے تقرر کی نہیں، بلکہ ایک بادشاہ کے تقرر کی تھی۔ اس سلسلے میں بائبل کی کتاب سموئیل اوّل میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

''سموئیل زندگی بھر اسرائیلیوں کی عدالت کرتا رہا...... تب سب اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہنے لگے: دیکھ، تُو ضعیف ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب تُو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دے، جو اور قوموں کی طرح ہماری عدالت کرے...... یہ بات سموئیل کو بُری لگی اور سموئیل نے خداوند سے دُعا کی، اور خداوند نے سموئیل سے کہا کہ جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں، تو اس کو مان، کیوں کہ انھوں نے تیری نہیں، بلکہ میری حقارت کی ہے کہ میں اُن کا بادشاہ نہ رہوں...... اور سموئیل نے ان لوگوں کو، جو اس سے بادشاہ کے طالب تھے، خداوند کی سب باتیں کہہ سُنائیں اور اس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کرے گا، اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمھارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتھوں کے لیے اور اپنے رسالے میں نوکر رکھے گا اور وہ اس کے رتھوں کے آگے دَوڑیں گے، اور وہ ان کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا، اور بعض سے ہل جُتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور رتھوں کے ساز بنوائے گا، اور تمھاری بیٹیوں کو لے کر گُندھن اور باورچن اور نان پُز بنائے گا، اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو، جو اچھے سے اچھے ہوں گے، لے کر اپنے خدمت گاروں کو عطا کرے گا، اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصّہ لے کر اپنے خواجوں اور خادموں کو دے گا، اور تمھارے نوکر چاکروں اور لونڈیوں اور تمھارے شکیل جوانوں اور تمھارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا، اور وہ تمھاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصّہ لے گا۔ سو، تم اس کے غلام بن جاؤ گے اور تم اُس دن اس بادشاہ کے سبب سے، جسے تم نے اپنے لیے چُنا ہوگا، فریاد کرو گے، پر اس دن خداوند تم کو جواب نہ دے گا۔ تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات نہ سنی اور کہنے لگے: نہیں، ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں، جو ہمارے اُوپر ہو، تاکہ ہم بھی اور قوموں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہماری طرف سے لڑائی کرے...... خداوند نے سموئیل کو فرمایا: تو اُن کی بات مان اور اُن کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر۔'' (باب ۷، آیت ۱۵ تا باب ۸، آیت ۲۲)

''پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا...... جب تم نے دیکھا کہ بنی عمّون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا، تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے، حالانکہ خداوند تمھارا خدا تمھارا بادشاہ تھا۔ سو اَب اس بادشاہ کو دیکھو، جسے تم نے چُن لیا اور جس کے لیے تم نے درخواست کی تھی۔ دیکھو، خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے اور اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو اور تم اور وہ بادشاہ بھی، جو تم پر سلطنت کرتا ہے، خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو، تو خیر، پر اگر تم خداوند کی بات نہ مانو، بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو، تو خداوند کا ہاتھ تمھارے خلاف ہوگا، جیسے وہ تمھارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا...... اور تم جان لو گے اور دیکھ بھی لو گے کہ تم نے خداوند کے حضور اپنے لیے بادشاہ مانگنے

عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ
عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ

حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو۔ وہ کہنے لگے: بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم راہِ خدا میں نہ لڑیں، جب کہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچّے ہم سے جُدا کر دیے گئے ہیں۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا، تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے، اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔

اُن کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالُوت[۲۶۹] کو تمھارے لیے بادشاہ

سے کتنی بڑی شرارت کی...... اب رہا میں، سو خدا نہ کرے کہ تمھارے لیے دعا کرنے سے باز آ کر خداوند کا گناہ گار ٹھیروں، بلکہ میں وہی راہ، جو اچھی اور سیدھی ہے، تم کو بتاؤں گا۔'' (باب ۱۲، آیت ۱۲ تا ۲۳)

کتابِ سموئیل کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادشاہت کے قیام کا یہ مطالبہ اللہ اور اس کے نبی کو پسند نہ تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ قرآنِ مجید میں اس مقام پر سردارانِ بنی اسرائیل کے اس مطالبے کی مذمّت کیوں نہیں کی گئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اس قصّے کا ذکر جس غرض کے لیے کیا ہے، اس سے یہ مسئلہ غیر متعلق ہے کہ ان کا مطالبہ صحیح تھا یا نہ تھا۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ بنی اسرائیل کس قدر بُزدل ہو گئے تھے اور ان میں کس قدر نفسانیّت آ گئی تھی اور ان کے اندر اَخلاقی اِنضباط کی کتنی کمی تھی، جس کے سبب سے آخرِکار وہ گر گئے۔ اور اس ذکر کی غرض یہ ہے کہ مسلمان اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے اندر یہ کمزوریاں پرورش نہ کریں۔

۲۶۹ – بائبل میں اِس کا نام ساؤل لکھا ہے۔ یہ قبیلہ بن یمین کا ایک ۳۰ سالہ نوجوان تھا۔ ''بنی اسرائیل میں اُس سے خوب صورت کوئی شخص نہ تھا۔ وہ ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے۔'' اپنے باپ کے گم شدہ گدھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ راستے میں جب سموئیل نبی کی قیام گاہ کے قریب پہنچا، تو اللہ تعالیٰ نے نبی کو اشارہ کیا کہ یہی شخص ہے جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا ہے۔ چنانچہ سموئیل نبی اُسے اپنے گھر لائے، تیل کی کُپّی لے کر اس کے سر پر اُنڈیلی اور اُسے چوما اور کہا کہ ''خداوند نے تجھے مسح کیا، تاکہ تُو اس کی میراث کا پیشوا ہو۔'' اس کے بعد انھوں نے بنی اسرائیل کا اجتماعِ عام کر کے اس کی بادشاہی کا اعلان کیا۔ (۱-سموئیل، باب ۹ و ۱۰)

طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ
اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ
اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ
وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ
لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ

مقرّر کیا ہے۔ یہ سُن کر وہ بولے: ''ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حق دار ہو گیا؟ اُس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مال دار آدمی نہیں ہے۔'' نبی نے جواب دیا: ''اللہ نے تمھارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی و جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا مُلک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اُس کے علم میں ہے۔'' اس کے ساتھ ان کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا کہ ''خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمھیں واپس مل جائے گا، جس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے لیے سُکونِ قلب کا سامان ہے، جس میں آلِ موسٰی اور آلِ ہارُون کے چھوڑے ہوئے تبرّکات ہیں، اور جس کو اس وقت فرشتے

یہ بنی اسرائیل میں دُوسرا شخص تھا، جس کو خدا کے حکم سے ''مسیح'' کر کے پیشوائی کے منصب پر مقرر کیا گیا۔ اس سے پہلے حضرت ہارونؑ سردار کاہن (chief priest) کی حیثیت سے مسح کیے گئے تھے، اِس کے بعد تیسرے ممسوح یا مسیح حضرت داؤد علیہ السّلام ہوئے، اور چوتھے مسیح حضرت عیسٰی علیہ السّلام۔ لیکن طالُوت کے متعلق ایسی کوئی تصریح قرآن یا حدیث میں نہیں ہے کہ وہ نبوّت کے منصب پر بھی سرفراز ہوا تھا۔ محض بادشاہی کے لیے نامزد کیا جانا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اُسے نبی تسلیم کیا جائے۔

الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع
فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ
فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ

سنبھالے ہوئے ہیں۔[۲۷۰] اگر تم مومن ہو، تو یہ تمھارے لیے بہت بڑی نشانی ہے ؏

پھر جب طالُوت لشکر لے کر چلا، تو اُس نے کہا: ''ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمھاری آزمایش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیے گا، وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے

۲۷۰- بائبل کا بیان اس باب میں قرآن سے کسی حد تک مختلف ہے۔ تاہم اُس سے اصل واقعے کی تفصیلات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صندوق، جسے بنی اسرائیل اصطلاحاً ''عہد کا صندوق'' کہتے تھے، ایک لڑائی کے موقع پر فِلِستی مشرکین نے بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا۔ لیکن یہ مشرکین کے جس شہر اور جس بستی میں رکھا گیا، وہاں وبائیں پھُوٹ پڑیں۔ آخرِ کار انھوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی پر رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا۔ غالباً اسی معاملے کی طرف قرآن اِن الفاظ میں اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت وہ صندوق فرشتوں کی حفاظت میں تھا، کیونکہ وہ گاڑی بغیر کسی گاڑی بان کے ہانک دی گئی تھی اور اللہ کے حکم سے یہ فرشتوں ہی کا کام تھا کہ وہ اُسے چلا کر بنی اسرائیل کی طرف لے آئے۔ رہا یہ ارشاد کہ ''اس صندوق میں تمھارے لیے سُکونِ قلب کا سامان ہے''، تو بائبل کے بیان سے اس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل اس کو بڑا متبرّک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ جب وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، تو پوری قوم کی ہمّت ٹوٹ گئی اور ہر اسرائیلی یہ خیال کرنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے پھر گئی ہے اور اب ہمارے بُرے دن آ گئے ہیں۔ پس اُس صندوق کا واپس آنا اِس قوم کے لیے بڑی تقویتِ قلب کا موجب تھا اور یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے ان کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر بندھ سکتی تھیں۔

''آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرّکات'' جو اس صندوق میں رکھے ہُوئے تھے، ان سے مراد پتھر کی وہ تختیاں ہیں، جو طورِ سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ تورات کا وہ اصل نسخہ بھی اس میں تھا، جسے حضرت موسیٰؑ نے خود لکھوا کر بنی لاوی کے سُپرد کیا تھا۔ نیز ایک بوتل میں مَنّ بھی بھر کر اس میں رکھ دیا گیا تھا، تاکہ آیندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کے اُس احسان کو یاد کریں، جو صحرا میں اس نے ان کے باپ دادا پر کیا تھا۔ اور غالباً حضرت موسیٰؑ کا وہ عصا بھی اس کے اندر تھا، جو خدا کے عظیم الشان معجزات کا مظہر بنا تھا۔

فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ
اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ
قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ
يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ
فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا
بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا

جو اس سے پیاس نہ بُجھائے، ہاں ایک آدھ چُلّو کوئی پی لے، تو پی لے۔“ مگر ایک گروہِ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔[۲۷۱]

پھر جب طالُوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے، تو اُنھوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالُوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔[۲۷۲] لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے، انھوں نے کہا: ”بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔“ اور جب وہ جالُوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے پر نکلے، تو انھوں نے دُعا کی: ”اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا

---

۲۷۱ – ممکن ہے اس سے مراد دریائے اُردُن ہو یا کوئی اور ندی یا نالا۔ طالوت بنی اسرائیل کے لشکر کو لے کر اس کے پار اُترنا چاہتا تھا، مگر چونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی قوم کے اندر اَخلاقی انضباط بہت کم رہ گیا ہے، اس لیے اس نے کار آمد اور ناکارہ لوگوں کو مُمیّز کرنے کے لیے یہ آزمایش تجویز کی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ تھوڑی دیر کے لیے اپنی پیاس تک ضبط نہ کر سکیں، اُن پر کیا بھروسا کیا جا سکتا ہے کہ اُس دشمن کے مقابلے میں پامردی دکھائیں گے، جس سے پہلے ہی وہ شکست کھا چکے ہیں۔

۲۷۲ – غالبًا یہ کہنے والے وہی لوگ ہوں گے، جنھوں نے دریا پر پہلے ہی اپنی بے صبری کا مُظاہرہ کر دیا تھا۔

صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ
الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ
وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ
وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ
الۡاَرۡضُ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۵۱﴾

فیضان کر، ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔“ آخر کار اللہ کے اذن سے اُنھوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤدؑ نے جالُوت کو قتل کر دیا [۲۷۳] اور اللہ نے اُسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا، اس کو علم دیا ـــــــ اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا، تو زمین کا نظام بگڑ جاتا، [۲۷۴] لیکن دُنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اِس طرح دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)۔

۲۷۳ – داؤد علیہ السّلام اس وقت ایک کم سِن نوجوان تھے۔ اتفاق سے طالوت کے لشکر میں عین اس وقت پہنچے، جب کہ فِلِستیوں کی فوج کا گراں ڈِیل پہلوان جالوت (جولیَت) بنی اسرائیل کی فوج کو دعوتِ مُبارزَت دے رہا تھا اور اسرائیلیوں میں سے کسی کی ہمّت نہ پڑتی تھی کہ اس کے مقابلے کو نکلے۔ حضرت داؤدؑ یہ رنگ دیکھ کر بے محابا اس کے مقابلے پر میدان میں جا پہنچے اور اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعے نے اُنھیں تمام اسرائیلیوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیا، طالوت نے اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی اور آخر کار وہی اسرائیلیوں کے فرماں روا ہوئے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سموئیل اوّل، باب ۱۷ و ۱۸)

۲۷۴ – یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے یہ ضابطہ بنا رکھا ہے کہ وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک حدِ خاص تک تو زمین میں غلبہ و طاقت حاصل کرنے دیتا ہے، مگر جب کوئی گروہ حد سے بڑھنے لگتا ہے، تو کسی دُوسرے گروہ کے ذریعے سے وہ اس کا زور توڑ دیتا ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ ایک قوم اور ایک پارٹی ہی کا اقتدار زمین میں ہمیشہ قائم رکھا جاتا اور اس کی قہرمانی لازوال ہوتی، تو یقیناً ملکِ خدا میں

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

الجزء ۳ وقف لازم

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ
اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ
الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ
وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ
شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ ع ۳۳

یہ اللہ کی آیات ہیں، جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سُنا رہے ہیں اور تم یقیناً اُن لوگوں میں سے ہو، جو رسُول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسول (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے ان کو ایک دُوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے۔ ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہم کلام ہوا، کسی کو اس نے دُوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیے، اور آخر میں عیسیٰؑ ابنِ مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور رُوحِ پاک سے اس کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا، تو ممکن نہ تھا کہ اِن رسولوں کے بعد جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے، وہ آپس میں لڑتے۔ مگر (اللہ کی مشیّت یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو جبراً اختلاف سے روکے، اس وجہ سے) انھوں نے باہم اختلاف کیا، پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں، اللہ چاہتا، تو وہ ہرگز نہ لڑتے، مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔[275] ع

فسادِ عظیم برپا ہو جاتا۔

۲۷۵ – مطلب یہ ہے کہ رسُولوں کے ذریعے سے علم حاصل ہو جانے کے بعد جو اختلافات لوگوں کے درمیان رُونما ہوئے اور اختلافات سے بڑھ کر لڑائیوں تک جو نوبتیں پہنچیں، تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ معاذ اللہ! خدا بے بس تھا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ۬

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو کچھ مال و متاع ہم نے تم کو بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو[۲۷۶] قبل اس کے کہ وہ دن آئے، جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ اور ظالم اصل میں وہی ہیں، جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔[۲۷۷]

اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔[۲۷۸]

اور اس کے پاس ان اختلافات اور لڑائیوں کو روکنے کا زور نہ تھا۔ نہیں، اگر وہ چاہتا، تو کسی کی مجال نہ تھی کہ انبیاؑ کی دعوت سے سرتابی کرسکتا اور کُفر و بغاوت کی راہ چل سکتا اور اس کی زمین میں فساد برپا کرسکتا۔ مگر اس کی مَشیّت یہ تھی ہی نہیں کہ انسانوں سے ارادہ و اختیار کی آزادی چھین لے اور انھیں ایک خاص رَوِش پر چلنے کے لیے مجبور کردے۔ اس نے امتحان کی غرض سے انھیں زمین پر پیدا کیا تھا، اس لیے اس نے ان کو اعتقاد و عمل کی راہوں میں اِنتخاب کی آزادی عطا کی اور انبیاؑ کو لوگوں پر کوتوال بنا کر نہیں بھیجا کہ زبردستی انھیں ایمان و اطاعت کی طرف کھینچ لائیں، بلکہ اس لیے بھیجا کہ دلائل اور بیّنات سے لوگوں کو راستی کی طرف بلانے کی کوشش کریں۔ پس جس قدر اختلافات اور لڑائیوں کے ہنگامے ہوئے، وہ سب اس وجہ سے ہوئے کہ اللہ نے لوگوں کو ارادے کی جو آزادی عطا کی تھی، اس سے کام لے کر لوگوں نے یہ مختلف راہیں اختیار کرلیں، نہ اس وجہ سے کہ اللہ ان کو راستی پر چلانا چاہتا تھا، مگر معاذ اللہ! اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

۲۷۶ – مراد راہِ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کی راہ اختیار کی ہے، انھیں اس مقصد کے لیے، جس پر وہ ایمان لائے ہیں، مالی قربانیاں برداشت کرنی چاہییں۔

۲۷۷ – یہاں کفر کی روش اختیار کرنے والوں سے مُراد یا تو وہ لوگ ہیں، جو خدا کے حکم کی اطاعت سے انکار کریں اور اپنے مال کو اس کی خوشنودی سے عزیز تر رکھیں۔ یا وہ لوگ، جو اُس دن پر اعتقاد نہ رکھتے ہوں، جس کے آنے کا خوف دلایا گیا ہے۔ یا پھر وہ لوگ جو اس خیالِ خام میں مُبتلا ہوں کہ آخرت میں انھیں کسی نہ کسی طرح نجات خرید لینے کا اور دوستی و سفارش سے کام نکال لے جانے کا موقع حاصل ہو ہی جائے گا۔

۲۷۸ – یعنی نادان لوگوں نے اپنی جگہ چاہے کتنے ہی خدا اور معبُود بنا رکھے ہوں، مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ خدائی پوری کی پوری بلاشرکتِ غیرے اس غیر فانی ذات کی ہے، جو کسی کی بخشی ہوئی زندگی سے نہیں، بلکہ آپ اپنی ہی حیات سے

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ
مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ
وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ

وہ نہ سوتا ہے، اور نہ اُسے اُونگھ لگتی ہے۔[۲۷۹] زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے۔[۲۸۰] کون ہے جو اُس کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟[۲۸۱] جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے اور اُس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کی گرفتِ اِدراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی اُن کو دینا چاہے۔[۲۸۲]

زندہ ہے اور جس کے بل بُوتے ہی پر کائنات کا یہ سارا نظام قائم ہے۔ اپنی سلطنت میں خداوندی کے جملہ اختیارات کا مالک وہ خود ہی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کی صفات میں اُس کا شریک ہے، نہ اس کے اختیارات میں، اور نہ اس کے حُقوق میں۔ لہٰذا اس کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ شریک ٹھیرا کر زمین یا آسمان میں جہاں بھی کسی اَور کو معبُود (الٰہ) بنایا جا رہا ہے، ایک جھوٹ گھڑا جا رہا ہے اور حقیقت کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔

۲۷۹ – یہ اُن لوگوں کے خیالات کی تردید ہے، جو خداوندِ عالَم کی ہستی کو اپنی ناقص ہستیوں پر قیاس کرتے ہیں اور اس کی طرف وہ کمزوریاں منسوب کرتے ہیں، جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً بائبل کا یہ بیان کہ خدا نے چھ دن میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ (کتابِ خُروج، باب ۲۰، آیت ۱۱)

۲۸۰ – یعنی وہ زمین و آسمان کا اور ہر اُس چیز کا مالک ہے، جو زمین و آسمان میں ہے۔ اس کی مِلکیّت میں، اس کی تدبیر میں اور اُس کی پادشاہی و حکمرانی میں کسی کا قطعاً کوئی حصّہ نہیں۔ اس کے بعد کائنات میں جس دُوسری ہستی کا بھی تم تصوّر کر سکتے ہو، وہ بہرحال اِس کائنات کی ایک فرد ہی ہوگی، اور جو اس کائنات کا فرد ہے، وہ اللہ کا مملوک اور غلام ہے، نہ کہ اُس کا شریک اور ہمسر۔

۲۸۱ – یہ اُن مشرکین کے خیالات کا اِبطال ہے، جو بزرگ انسانوں یا فرشتوں یا دُوسری ہستیوں کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بڑا زور چلتا ہے، جس بات پر اَڑ بیٹھیں، وہ منوا کر چھوڑتے ہیں، اور جو کام چاہیں خدا سے لے سکتے ہیں۔ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ زور چلانا تو درکنار، کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر اور کوئی مقرّب ترین فرشتہ اُس پادشاہِ ارض و سما کے دربار میں بلا اجازت زبان تک کھولنے کی جُرأت نہیں رکھتا۔

۲۸۲ – اس حقیقت کے اظہار سے شرک کی بنیادوں پر ایک اور ضرب لگتی ہے۔ اُوپر کے فقروں میں اللہ تعالیٰ کی غیر محدود

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ
وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ

اُس کی حکومت[۲۸۳] آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور اُن کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔[۲۸۴]

دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں[۲۸۵] ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے

حاکمیّت اور اس کے مُطلق اختیارات کا تصوُّر پیش کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی حکومت میں نہ تو کوئی بالاستقلال شریک ہے اور نہ کسی کا اس کے ہاں ایسا زور چلتا ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ اب ایک دُوسری حیثیت سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے کام میں دخل دے کیسے سکتا ہے، جب کہ کسی دُوسرے کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظامِ کائنات اور اس کی مَصلحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں یا جنّ یا فرشتے یا دوسری مخلوقات، سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں۔ پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جُز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اٹل سفارش چل سکے تو سارا نظامِ عالَم دَرہم بَرہم ہو جائے۔ نظامِ عالَم تو رہا درکنار، بندے تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کی مصلحتوں کو بھی خداوندِ عالم ہی پوری طرح جانتا ہے اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اُس خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں، جو علم کا اصلی سرچشمہ ہے۔

۲۸۳ – اصل میں لفظ ''کُرسی'' استعمال ہوا ہے، جسے بالعُموم حکومت و اقتدار کے لیے اِستعارے کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اُردو زبان میں بھی اکثر کرسی کا لفظ بول کر حاکمانہ اختیارات مُراد لیتے ہیں۔

۲۸۴ – یہ آیت ''آیت الکرسیؔ'' کے نام سے مشہور ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ایسی مکمّل معرفت بخشی گئی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اِسی بنا پر حدیث میں اس کو قرآن کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔

اِس مَقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں خداوندِ عالَم کی ذات وصفات کا ذکر کس مناسبت سے آیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مرتبہ پھر اُس تقریر پر نگاہ ڈال لیجیے، جو رکوع ۳۲ سے چل رہی ہے۔ پہلے مسلمانوں کو دینِ حق کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر اُکسایا گیا ہے اور اُن کمزوریوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے تھے۔ پھر یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ فتح و کامیابی کا مدار تعداد اور ساز وسامان کی کثرت پر نہیں، بلکہ ایمان، صبر وضبط اور پختگیِ عزم پر ہے۔ پھر جنگ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جو حکمت وابستہ ہے، اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ دُنیا کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے وہ ہمیشہ انسانوں کے ایک گروہ کو دُوسرے گروہ کے ذریعے سے دفع کرتا رہتا ہے، ورنہ اگر ایک ہی گروہ کو غلبہ واقتدار کا دائمی پٹا مل جاتا، تو دُوسروں کے لیے جینا دشوار ہو جاتا۔ پھر اس شبہے کو دفع کیا گیا ہے، جو ناواقف لوگوں کے دلوں میں اکثر کھٹکتا ہے کہ اگر اللہ نے اپنے پیغمبر اختلافات کو مٹانے اور نزاعات کا سدِّباب کرنے ہی کے لیے بھیجے تھے اور ان کی

الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ
فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ

الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت [۲۸۶] کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹُوٹنے والا نہیں، اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں، اُن کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے

آمد کے باوجود نہ اختلافات مٹے، نہ نزاعات ختم ہوئے، تو کیا اللہ ایسا ہی بے بس تھا کہ اُس نے اِن خرابیوں کو دُور کرنا چاہا اور نہ کر سکا۔ اِس کے جواب میں بتا دیا گیا کہ اختلافات کو بجبر روک دینا اور نوعِ انسانی کو ایک خاص راستے پر بزور چلانا اللہ کی مَشِیّت ہی میں نہ تھا، ورنہ انسان کی کیا مجال تھی کہ اُس کی مَشِیّت کے خلاف چلتا۔ پھر ایک فقرے میں اُس اصل مضمون کی طرف اشارہ کر دیا گیا جس سے تقریر کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ انسانوں کے عقائد و نظریات اور مَسالک و مذاہب خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، بہرحال حقیقتِ نفسُ الامری، جس پر زمین و آسمان کا نظام قائم ہے، یہ ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ انسانوں کی غلط فہمیوں سے اس حقیقت میں ذرّہ برابر کوئی فرق نہیں آتا۔ مگر اللہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ اس کے ماننے پر لوگوں کو زبردستی مجبُور کیا جائے۔ جو اُسے مان لے گا، وہ خود ہی فائدے میں رہے گا اور جو اس سے منہ موڑے گا، وہ آپ نقصان اُٹھائے گا۔

۲۸۵ – یہاں ''دین'' سے مراد اللہ کے متعلّق وہ عقیدہ ہے جو اُوپر آیت الکرسی میں بیان ہوا ہے، اور وہ پورا نظامِ زندگی ہے جو اس عقیدے پر بنتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ''اسلام'' کا یہ اعتقادی اور اخلاقی و عملی نظام کسی پر زبردستی نہیں ٹھونسا جا سکتا۔ یہ ایسی چیز ہی نہیں ہے جو کسی کے سر جبراً منڈھی جا سکے۔

۲۸۶ – ''طاغوت'' لُغت کے اعتبار سے ہر اُس شخص کو کہا جائے گا، جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اِصطلاح میں طاغوت سے مُراد وہ بندہ ہے، جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ خدا کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں: پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اُصولاً اس کی فرماں برداری ہی کو حق مانے، مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اِس کا نام فِسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری سے اُصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اَور کی بندگی کرنے لگے۔ یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اس کے مُلک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے، اسی کا نام طاغوت ہے، اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اس

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ
يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵۷ع اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَاۗجَّ اِبْرٰھٖمَ فِيْ

ع ۳۴ ۳

روشنی میں نکال لاتا ہے۔[۲۸۷] اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، اُن کے حامی و مددگار طاغوت[۲۸۸] ہیں اور وہ انھیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ ع

کیا[۲۸۹] تم نے اُس شخص کے حال پر غور نہیں کیا، جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا؟[۲۹۰]

طاغوت کا منکر نہ ہو۔

۲۸۷ – تاریکیوں سے مُراد جہالت کی تاریکیاں ہیں، جن میں بھٹک کر انسان اپنی فلاح وسعادت کی راہ سے دُور نکل جاتا ہے اور حقیقت کے خلاف چل کر اپنی تمام قوتوں اور کوششوں کو غلط راستوں میں صَرف کرنے لگتا ہے۔ اور نور سے مُراد علمِ حق ہے، جس کی روشنی میں انسان اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنی زندگی کے مقصد کو صاف صاف دیکھ کر علیٰ وجہ البصیرت ایک صحیح راہِ عمل پر گامزن ہوتا ہے۔

۲۸۸ – ”طاغوت“ یہاں طَوَاغِیت کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی خدا سے منہ موڑ کر انسان ایک ہی طاغوت کے چنگل میں نہیں پھنستا، بلکہ بہت سے طَوَاغِیت اس پر مسلّط ہو جاتے ہیں۔ ایک طاغوت شیطان ہے، جو اس کے سامنے نت نئی جھوٹی ترغیبات کا سدا بہار سبز باغ پیش کرتا ہے۔ دُوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے، جو اسے جذبات وخواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے لیے پھرتا ہے۔ اور بے شمار طاغوت باہر کی دُنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بیوی اور بچے، اَعزّہ اور اقربا، برادری اور خاندان، دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم، پیشوا اور رہنما، حکومت اور حکام، یہ سب اس کے لیے طاغوت ہی طاغوت ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتا ہے اور بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکّر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی سے بچے۔

۲۸۹ – اُوپر دعویٰ کیا گیا تھا کہ مومن کا حامی و مددگار اللہ ہوتا ہے اور وہ اُسے تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے، اور کافر کے مددگار طاغوت ہوتے ہیں اور وہ اسے روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ اب اسی کی توضیح کے لیے تین واقعات مثال کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے پہلی مثال ایک ایسے شخص کی ہے،

رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ

وقف لازم

جھگڑا اِس بات پر کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے، اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔[291] جب ابراہیمؑ نے کہا کہ ”میرا رب وہ ہے، جس کے اختیار میں زندگی اور

جس کے سامنے واضح دلائل کے ساتھ حقیقت پیش کی گئی اور وہ اس کے سامنے لاجواب بھی ہوگیا۔ مگر چونکہ اس نے طاغوت کے ہاتھ میں اپنی نکیل دے رکھی تھی، اس لیے وضوحِ حق کے بعد بھی وہ روشنی میں نہ آیا اور تاریکیوں ہی میں بھٹکتا رہ گیا۔ بعد کی دو مثالیں دو ایسے اشخاص کی ہیں، جنھوں نے اللہ کا سہارا پکڑا تھا، سو اللہ ان کو تاریکیوں سے اس طرح روشنی میں نکال لایا کہ پردۂ غیب میں چُھپی ہوئی حقیقتوں تک کا ان کو عینی مُشاہَدہ کرا دیا۔

۲۹۰ – اس شخص سے مُراد نُمرود ہے، جو حضرت ابراہیمؑ کے وطن (عراق) کا بادشاہ تھا۔ جس واقعے کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، اس کی طرف کوئی اشارہ بائبل میں نہیں ہے۔ مگر تَلْمُود میں یہ پورا واقعہ موجود ہے اور بڑی حد تک قرآن کے مطابق ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ نمرود کے ہاں سلطنت کے سب سے بڑے عہدے دار (chief officer of the state) کا منصب رکھتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب کُھلّم کُھلّا شرک کی مُخالَفت اور توحید کی تبلیغ شروع کی اور بت خانے میں گُھس کر بُتوں کو توڑ ڈالا، تو اُن کے باپ نے خود ان کا مُقدّمہ بادشاہ کے دربار میں پیش کیا اور پھر وہ گفتگو ہوئی، جو یہاں بیان کی گئی ہے۔

۲۹۱ – یعنی اس جھگڑنے میں جو بات مابِہِ النِّزاع تھی، وہ یہ تھی کہ ابراہیمؑ اپنا رب کس کو مانتے ہیں۔ اور یہ نزاع اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ اُس جھگڑنے والے شخص، یعنی نمرود کو خدا نے حکومت عطا کر رکھی تھی۔ اِن دو فقروں میں جھگڑے کی نوعیّت کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل حقیقتوں پر نگاہ رہنی ضروری ہے:

(۱) قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام مشرک سوسائٹیوں کی یہ مشترک خصوصیّت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو رب الارباب اور خدائے خدایگان کی حیثیت سے تو مانتے ہیں، مگر صرف اُسی کو رب اور تنہا اُسی کو خدا اور معبُود نہیں مانتے۔

(۲) خدائی کو مشرکین نے ہمیشہ دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک فوق الفطری (supernatural) خدائی، جو سلسلۂ اسباب پر حکمراں ہے اور جس کی طرف انسان اپنی حاجات اور مشکلات میں دستگیری کے لیے رُجوع کرتا ہے۔ اس خدائی میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارواح اور فرشتوں اور جِنّوں اور سیّاروں اور دُوسری بہت سی ہستیوں کو شریک ٹھیراتے ہیں، ان سے دُعائیں مانگتے ہیں، ان کے سامنے مراسمِ پرستش بجا لاتے ہیں، اور ان کے آستانوں پر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ دوسری تمدُّنی اور سیاسی معاملات کی خدائی (یعنی حاکمیّت)، جو قوانینِ حیات مقرر کرنے کی مجاز اور اطاعتِ امر کی مستحق ہو، اور جسے دُنیوی معاملات میں فرماں روائی کے مُطلَق اختیارات حاصل ہوں۔ اِس دوسری قسم کی خدائی کو دُنیا کے تمام مشرکین نے قریب قریب ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ سے سلب کر کے، یا اس کے ساتھ، شاہی خاندانوں اور مذہبی پروہتوں اور سوسائٹی کے

يُمِيتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحۡىٖ وَاُمِيۡتُ ؕ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاۡتِىۡ
بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىۡ كَفَرَ ؕ

موت ہے، تو اُس نے جواب دیا: "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔" ابراہیمؑ نے کہا: "اچھا، اللہ سُورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اُسے مغرب سے نکال لا۔" یہ سُن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا، ۲۹۲

اگلے پچھلے بڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اکثر شاہی خاندان اِسی دُوسرے معنیٰ میں خدائی کے مدّعی ہوئے ہیں، اور اسے مستحکم کرنے کے لیے اُنھوں نے بالعُموم پہلے معنیٰ والے خداؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اور مذہبی طبقے اس معاملے میں ان کے ساتھ شریکِ سازش رہے ہیں۔

(۳) نمرود کا دعوائے خدائی بھی اِسی دُوسری قسم کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبّر وہ خود ہے۔ اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسبابِ عالَم کے پورے سلسلے پر اسی کی حکومت چل رہی ہے۔ بلکہ اسے دعویٰ اس امر کا تھا کہ اِس ملکِ عراق کا اور اس کے باشندوں کا حاکمِ مُطلَق مَیں ہوں، میری زبان قانون ہے، میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دِہ ہوں، اور عراق کا ہر وہ باشندہ باغی و غدّار ہے، جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے، یا میرے سوا کسی اَور کو رب تسلیم کرے۔

(۴) ابراہیم علیہ السلام نے جب کہا کہ میں صرف ایک رب العالمین ہی کو خدا اور معبُود اور رب مانتا ہوں، اور اس کے سوا سب کی خدائی اور رُبوبیّت کا قطعی طور پر منکر ہوں، تو سوال صرف یہی پیدا نہیں ہُوا کہ قومی مذہب اور مذہبی معبُودوں کے بارے میں ان کا یہ نیا عقیدہ کہاں تک قابلِ برداشت ہے، بلکہ یہ سوال بھی اُٹھ کھڑا ہوا کہ قومی ریاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر اس عقیدے کی جوزَد پڑتی ہے، اُسے کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جُرمِ بغاوت کے الزام میں نمرود کے سامنے پیش کیے گئے۔

۲۹۲ – اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلے فقرے ہی سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی دُوسرا نہیں ہو سکتا، تاہم نمرود اس کا جواب ڈِھٹائی سے دے گیا۔ لیکن دُوسرے فقرے کے بعد اس کے لیے مزید ڈِھٹائی سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اُسی خدا کے زیرِ فرمان ہیں، جس کو ابراہیمؑ نے رب مانا ہے۔ پھر وہ کہتا تو آخر کیا کہتا؟ مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی، اس کو تسلیم کر لینے کے معنیٰ اپنی مُطلَقُ العِنان فرماں روائی سے دست بردار ہو جانے کے تھے، جس کے لیے اس کے نفس کا طاغوت تیار نہ تھا۔ لہٰذا وہ صرف ششدر ہی ہو کر رہ گیا، خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق پرستی کی روشنی میں نہ آیا۔ اگر اس طاغوت کے بجائے اس نے خدا کو اپنا ولی و مددگار بنایا ہوتا، تو اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی اس تبلیغ کے بعد راہِ راست کُھل جاتی۔

تلمُود کا بیان ہے کہ اس کے بعد اس بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ قید کر دیے گئے۔ دس روز تک وہ

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۸﴾ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى
قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ
بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ
لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ
مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ

مگر اللہ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا۔

یا پھر مثال کے طور پر اُس شخص کو دیکھو، جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا، جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔[۲۹۳] اُس نے کہا: ”یہ آبادی، جو ہلاک ہو چکی ہے، اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟“[۲۹۴] اس پر اللہ نے اس کی رُوح قبض کر لی اور وہ سَو برس تک مُردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پُوچھا: ”بتاؤ، کتنی مدّت پڑے رہے ہو؟“ اُس نے کہا: ”ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔“ فرمایا: ”تم پر سَو برس اِسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیّر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے

جیل میں رہے۔ پھر بادشاہ کی کونسل نے اُن کو زندہ جلانے کا فیصلہ کیا اور ان کے آگ میں پھینکے جانے کا وہ واقعہ پیش آیا، جو سورہ انبیاء، رکوع ۵، العنکبوت، رکوع ۲، ۳، اور الصّافات، رکوع ۴ میں بیان ہوا ہے۔

۲۹۳ – یہ ایک غیر ضروری بحث ہے کہ وہ شخص کون تھا اور وہ بستی کون سی تھی۔ اصل مدّعا، جس کے لیے یہاں یہ ذکر لایا گیا ہے، صرف یہ بتانا ہے کہ جس نے اللہ کو اپنا ولی بنایا تھا، اُسے اللہ نے کس طرح روشنی عطا کی۔ شخص اور مقام، دونوں کی تعیین کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ، نہ اس کا کوئی فائدہ۔ البتہ بعد کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن صاحب کا یہ ذکر ہے، وہ ضرور کوئی نبی ہوں گے۔

۲۹۴ – اس سوال کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بزرگ حیات بعد الموت کے منکر تھے یا انھیں اس میں شک تھا، بلکہ دراصل وہ حقیقت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے، جیسا کہ انبیاؑ کو کرایا جاتا رہا ہے۔

اِلٰی حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ
كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ
اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ
اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى
وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ
فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ
ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع

ع ۳۵ ۳

گدھے کو بھی دیکھو (کہ اِس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے)۔ اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں[۲۹۵]۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اُٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔'' اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہوگئی، تو اس نے کہا: ''میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اور وہ واقعہ بھی پیشِ نظر رہے، جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ ''میرے مالک! مجھے دکھا دے، تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔'' فرمایا: ''کیا تُو ایمان نہیں رکھتا؟'' اُس نے عرض کیا: ''ایمان تو رکھتا ہوں، مگر دل کا اِطمینان درکار ہے۔''[۲۹۶] فرمایا: ''اچھا، تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک ایک جُز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت بااقتدار اور حکیم ہے۔''[۲۹۷] ع

۲۹۵ – ایک ایسے شخص کا زندہ پلٹ کر آنا جسے دُنیا سو برس پہلے مُردہ سمجھ چکی تھی، خود اس کو اپنے ہم عصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بنا دینے کے لیے کافی تھا۔

۲۹۶ – یعنی وہ اطمینان، جو مشاہدۂ عینی سے حاصل ہوتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ

جولوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صَرف کرتے ہیں[۲۹۸]، اُن کے خرچ کی مثال ایسی ہے[۲۹۹]، جیسے

۲۹۷ – اس واقعے اور اُوپر کے واقعے کی بعض لوگوں نے عجیب عجیب تاویلیں کی ہیں۔ لیکن انبیا علیہم السلام کے ساتھ اللہ کا جو معاملہ ہے، اُسے اگر اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے، تو کسی کھینچ تان کی ضرورت پیش نہیں آ سکتی۔ عام اہلِ ایمان کو اِس زندگی میں جو خدمت انجام دینی ہے، اس کے لیے تو محض ایمان بالغیب (بے دیکھے ماننا) کافی ہے۔ لیکن انبیاؑ کو جو خدمت اللہ نے سُپرد کی تھی، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے وہ حقیقتیں دیکھ لیتے جن پر ایمان لانے کی دعوت انھیں دُنیا کو دینی تھی۔ اُن کو دُنیا سے پورے زور کے ساتھ یہ کہنا تھا کہ تم لوگ تو قیاسات دوڑاتے ہو، مگر ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں۔ تمھارے پاس گمان ہے اور ہمارے پاس علم ہے، تم اندھے ہو اور ہم بینا ہیں۔ اِسی لیے انبیاؑ کے سامنے فرشتے عیاناً آئے ہیں، ان کو آسمان و زمین کے نظامِ حکومت (ملکوت) کا مُشاہدہ کرایا گیا ہے، ان کو جنت اور دوزخ آنکھوں سے دکھائی گئی ہے، اور بَعث بعد الموت کا ان کے سامنے مظاہرہ کر کے دکھایا گیا ہے۔ ایمان بالغیب کی منزل سے یہ حضرات منصبِ نبوت پر مامور ہونے سے پہلے گزر چکے ہوتے ہیں۔ نبی ہونے کے بعد ان کو ایمان بالشہادت کی نعمت دی جاتی ہے اور یہ نعمت اُنھی کے ساتھ مخصوص ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ نمبر ۳۳۰ و ۳۴۴)

۲۹۸ – اب پھر سلسلۂ کلام اسی مضمون کی طرف عود کرتا ہے، جو رکوع ۳۲ میں چھیڑا گیا تھا۔ اس تقریر کی ابتدا میں اہلِ ایمان کو دعوت دی گئی تھی کہ جس مقصدِ عظیم پر تم ایمان لائے ہو، اس کی خاطر جان و مال کی قربانیاں برداشت کرو۔ مگر کوئی گروہ جب تک کہ اُس کا مَعاشی نقطۂ نظر بالکل ہی تبدیل نہ ہو جائے، اس بات پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی ذاتی یا قومی اغراض سے بالاتر ہو کر محض ایک اعلیٰ درجے کے اَخلاقی مقصد کی خاطر اپنا مال بے دریغ صَرف کرنے لگے۔ مادّہ پرست لوگ، جو پیسا کمانے کے لیے جیتے ہوں اور پیسے پیسے پر جان دیتے ہوں اور جن کی نگاہ ہر وقت نفع و نقصان کی میزان ہی پر جمی رہتی ہو، کبھی اس قابل نہیں ہو سکتے کہ مقاصدِ عالیہ کے لیے کچھ کر سکیں۔ وہ بظاہر اَخلاقی مقاصد کے لیے کچھ خرچ کرتے بھی ہیں، تو پہلے اپنی ذات یا اپنی برادری یا اپنی قوم کے مادّی منافع کا حساب لگا لیتے ہیں۔ اِس ذہنیّت کے ساتھ اُس دین کی راہ پر انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جس کا مطالبہ یہ ہے کہ دُنیوی فائدے اور نقصان سے بے پروا ہو کر محض اللہ کا کَلِمہ بلند کرنے کے لیے اپنا وقت، اپنی قوتیں اور اپنی کمائیاں خرچ کرو۔ ایسے مسلک کی پیروی کے لیے تو دُوسری ہی قسم کے اَخلاقیات درکار ہیں۔ اس کے لیے نظر کی وسعت، حوصلے کی فراخی، دل کی کُشادگی اور سب سے بڑھ کر خالص خدا طَلَبی کی ضرورت ہے، اور اجتماعی زندگی کے نظام میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ افراد کے اندر مادّہ پرستانہ اخلاقیات کے بجائے یہ اخلاقی اوصاف نَشو و نَما پائیں۔ چنانچہ یہاں سے مسلسل تین رُکوعوں تک اسی ذہنیّت کی تخلیق کے لیے ہدایات

حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ
يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيۡنَ
يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتۡبِعُوۡنَ مَآ اَنۡفَقُوۡا
مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ
وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ

ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اِسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے، افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔[۳۰۰] جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ دُکھ دیتے ہیں، اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔[۳۰۱] ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اُس خیرات سے

دی گئی ہیں۔

۲۹۹ – مال کا خرچ خواہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں ہو، یا اپنے بال بچّوں کا پیٹ پالنے میں، یا اپنے اَعِزّہ و اقربا کی خبر گیری میں، یا محتاجوں کی اعانت میں، یا رفاہِ عام کے کاموں میں، یا اشاعتِ دین اور جہاد کے مقاصد میں، بہرحال اگر وہ قانونِ الٰہی کے مطابق ہو اور خالص خدا کی رضا کے لیے ہو تو اس کا شمار اللہ ہی کی راہ میں ہو گا۔

۳۰۰ – یعنی جس قدر خلوص اور جتنے گہرے جذبے کے ساتھ انسان اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا، اتنا ہی اللہ کی طرف سے اس کا اجر زیادہ ہو گا۔ جو خدا ایک دانے میں اتنی برکت دیتا ہے کہ اس سے سات سو دانے اُگ سکتے ہیں، اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ تمھاری خیرات کو بھی اسی طرح نَشو ونُما بخشے اور ایک روپے کے خرچ کو اتنی ترقی دے کہ اس کا اجر سات سو گُنا ہو کر تمھاری طرف پلٹے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اللہ کی دو صفات ارشاد فرمائی گئی ہیں: ایک، یہ کہ وہ فراخ دست ہے، اس کا ہاتھ تنگ نہیں ہے کہ تمھارا عمل فی الواقع جتنی ترقی اور جتنے اجر کا مستحق ہو، وہ نہ دے سکے۔ دوسرے، یہ کہ وہ علیم ہے، بے خبر نہیں ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اور جس جذبے سے کرتے ہو، اس سے وہ ناواقف رہ جائے اور تمھارا اجر مارا جائے۔

۳۰۱ – یعنی نہ تو اُن کے لیے اس بات کا کوئی خطرہ ہے کہ ان کا اجر ضائع ہو جائے گا اور نہ کبھی یہ نوبت

صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿٢٦٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ
مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ
كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ

بہتر ہے، جس کے پیچھے دُکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بُردباری اُس کی صفت[۳۰۲] ہے۔ اَے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جَتا کر اور دُکھ دے کر اُس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو، جو اپنا مال محض لوگوں کے دِکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے، نہ آخرت پر۔[۳۰۳] اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا، تو ساری مٹی بہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔[۳۰۴]

آئے گی کہ وہ اپنے اس خرچ پر پشیمان ہوں۔

۳۰۲– اس ایک فقرے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک، یہ کہ اللہ تمھاری خیرات کا حاجت مند نہیں ہے۔ دُوسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ خود بُردبار ہے، اس لیے اُسے پسند بھی وہی لوگ ہیں، جو چھچھورے اور کم ظرف نہ ہوں، بلکہ فراخ حوصلہ اور بُردبار ہوں۔ جو خدا تم پر زندگی کے اسباب و وسائل کا بے حساب فیضان کر رہا ہے اور تمھارے قصوروں کے باوجود تمھیں بار بار بخشتا ہے، وہ ایسے لوگوں کو کیونکر پسند کر سکتا ہے، جو کسی غریب کو ایک روٹی کھلا دیں، تو احسان جَتا جَتا کر اس کی عزّتِ نفس کو خاک میں ملا دیں۔ اسی بنا پر حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو قیامت کے روز شرفِ ہم کلامی اور نظرِ عنایت سے محروم رکھے گا، جو اپنے عَطیّے پر احسان جتاتا ہو۔

۳۰۳– اس کی ریاکاری خود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ اُس کا محض لوگوں کو دکھانے کے لیے عمل کرنا صریحاً یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ خلق ہی اس کی خدا ہے جس سے وہ اجر چاہتا ہے، اللہ سے نہ اس کو اجر کی توقع ہے اور نہ اسے یقین ہے کہ ایک روز اعمال کا حساب ہوگا اور اجر عطا کیے جائیں گے۔

۳۰۴– اس تمثیل میں بارش سے مراد خیرات ہے۔ چٹان سے مراد اُس نیت اور اُس جذبے کی خرابی ہے، جس کے ساتھ خیرات کی گئی ہے۔ مٹی کی ہلکی تہ سے مراد نیکی کی وہ ظاہری شکل ہے، جس کے نیچے نیت کی خرابی چھپی ہوئی ہے۔ اس توضیح کے بعد مثال اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔ بارش کا فطری اقتضا تو یہی ہے کہ اس سے روئیدگی ہو اور

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ
اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ
فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ

ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں، اس سے کچھ بھی اُن کے ہاتھ نہیں آتا، اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے[۳۰۵]۔ بخلاف اِس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضاجوئی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی سطحِ مُرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اُس کے لیے کافی ہو جائے[۳۰۶]۔ تم جو کچھ کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو،

کھیتی نشوونما پائے۔ لیکن جب روئیدگی قبول کرنے والی زمین محض برائے نام اُوپر ہی اُوپر ہو، اور اس اُوپری تہ کے نیچے نِری پتھر کی ایک چٹان رکھی ہوئی ہو، تو بارش مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مُضِر ہوگی۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ بھلائیوں کو نشوونما دینے کی قوت رکھتی ہے، مگر اس کے نافع ہونے کے لیے حقیقی نیک نیتی شرط ہے۔ نیت نیک نہ ہو تو ابرِکرم کا فیضان بجز اس کے کہ محض ضیاعِ مال ہے، اور کچھ نہیں۔

۳۰۵ - یہاں ''کافر'' کا لفظ ناشکرے اور منکرِ نعمت کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ جو شخص اللہ کی دی ہوئی نعمت کو اس کی راہ میں اس کی رضا کے لیے خرچ کرنے کے بجائے خَلق کی خوشنودی کے لیے صرف کرتا ہے، یا اگر خدا کی راہ میں کچھ مال دیتا بھی ہے، تو اس کے ساتھ اذِیّت بھی دیتا ہے، وہ دراصل ناشُکرا اور اپنے خدا کا احسان فراموش ہے۔ اور جب کہ وہ خود ہی خدا کی رضا کا طالب نہیں ہے تو اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ اُسے خواہ مخواہ اپنی رضا کا راستہ دکھائے۔

۳۰۶ - ''زور کی بارش'' سے مراد وہ خیرات ہے جو انتہائی جذبۂ خیر اور کمال درجے کی نیک نیتی کے ساتھ کی جائے۔

مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ اَعۡنَابٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۙ لَہٗ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ
الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَہُ الۡکِبَرُ وَ لَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ ۪ۖ فَاَصَابَہَاۤ
اِعۡصَارٌ فِیۡہِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ
الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۶۶﴾ ع یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ
طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ وَ مِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۪ وَ لَا

ع ۳۶

نہروں سے سیراب، کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہُوا، اور وہ عین اُس وقت ایک تیز بگولے کی زد میں آ کر جُھلس جائے، جب کہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچّے ابھی کسی لائق نہ ہوں؟ ۳۰۷ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور و فکر کرو۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمھارے لیے نکالا ہے، اُس میں سے بہتر حصّہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں

اور ہلکی پھوار سے مراد ایسی خیرات ہے، جس کے اندر جذبۂ خیر کی شدّت نہ ہو۔

۳۰۷ – یعنی اگر تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھاری عمر بھر کی کمائی ایک ایسے نازک موقع پر تباہ ہو جائے، جب کہ تم اُس سے فائدہ اُٹھانے کے سب سے زیادہ محتاج ہو اور از سرِ نو کمائی کرنے کا موقع بھی باقی نہ رہا ہو، تو یہ بات تم کیسے پسند کر رہے ہو کہ دُنیا میں مدّت العمر کام کرنے کے بعد آخرت کی زندگی میں تم اِس طرح قدم رکھو کہ وہاں پہنچ کر یکایک تمھیں معلوم ہو کہ تمھارا پورا کارنامۂ حیات یہاں کوئی قیمت نہیں رکھتا، جو کچھ تم نے دُنیا کے لیے کمایا تھا، وہ دُنیا ہی میں رہ گیا، آخرت کے لیے کچھ کما کر لائے ہی نہیں کہ یہاں اُس کے پھل کھا سکو۔ وہاں تمھیں اس کا کوئی موقع نہ ملے گا کہ از سرِ نَو اب آخرت کے لیے کمائی کرو۔ آخرت کے لیے کام کرنے کا جو کچھ بھی موقع ہے، اِسی دُنیا میں ہے۔ یہاں اگر تم آخرت کی فکر کیے بغیر ساری عمر دُنیا ہی کی دُھن میں لگے رہے اور اپنی تمام قوتیں اور کوششیں دُنیوی فائدے تلاش کرنے ہی میں کھپاتے رہے، تو آفتابِ زندگی کے غروب ہونے پر تمھاری حالت بعینہٖ اُس بُڈھے کی طرح حسرت ناک ہو گی، جس کی عمر بھر کی کمائی اور جس کی زندگی کا سہارا ایک باغ تھا اور وہ باغ عین عالَمِ پیری میں اُس وقت جل گیا، جب کہ نہ وہ خود نئے سرے سے باغ لگا سکتا ہے اور نہ اُس کی اولاد ہی اس قابل ہے کہ اس کی مدد کر سکے۔

تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ
اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾
اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ
يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾
يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ
اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

دینے کے لیے بُری سے بُری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمھیں دے، تو تم ہرگز اُسے لینا گوارا نہ کرو گے اِلّا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔ تمھیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے۔[۳۰۸] شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرم ناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمھیں اپنی بخشش اور فضل کی اُمید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جس کو حکمت ملی، اُسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔[۳۰۹] اِن باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں، جو دانش مند ہیں۔

۳۰۸– ظاہر ہے کہ جو خود اعلیٰ درجے کی صفات سے مُتَّصِف ہو، وہ بُرے اوصاف رکھنے والوں کو پسند نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ خود فیّاض ہے اور اپنی مخلوق پر ہر آن بخشش و عطا کے دریا بہا رہا ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ وہ تنگ نظر، کم حوصلہ اور پست اَخلاق لوگوں سے محبّت کرے۔

۳۰۹– حکمت سے مراد صحیح بصیرت اور صحیح قوّتِ فیصلہ ہے۔ یہاں اس ارشاد سے مقصُود یہ بتانا ہے کہ جس شخص کے پاس حکمت کی دولت ہوگی، وہ ہرگز شیطان کی بتائی ہوئی راہ پر نہ جائے گا، بلکہ اُس راہِ کشادہ کو اختیار کرے گا جو اللہ نے دکھائی ہے۔ شیطان کے تنگ نظر مریدوں کی نگاہ میں یہ بڑی ہوشیاری اور عقل مندی ہے کہ آدمی اپنی دولت کو سنبھال سنبھال کر رکھے اور ہر وقت مزید کمائی کی فکر ہی میں لگا رہے۔ لیکن جن لوگوں نے اللہ سے بصیرت کا نور پایا ہے، اُن کی نظر میں یہ عین بے وقوفی ہے۔ حکمت و دانائی اُن کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کمائے، اُسے اپنی متوسط ضروریات پوری کرنے کے بعد دل کھول کر بھلائی کے کاموں میں خرچ کرے۔ پہلا شخص ممکن ہے کہ دُنیا کی اس چند روزہ

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو، اللہ کو اُس کا علم ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔[۳۱۰] اگر اپنے صدقات عَلانیَہ دو، تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو، تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔[۳۱۱] تمھاری بہت سی بُرائیاں اِس طرزِ عمل سے محو ہو جاتی ہیں۔[۳۱۲] اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو بہرحال اُس کی خبر ہے۔

زندگی میں دُوسرے کی بہ نسبت بہت زیادہ خوش حال ہو، لیکن انسان کے لیے یہ دنیا کی زندگی پُوری زندگی نہیں، بلکہ اصل زندگی کا ایک نہایت چھوٹا سا جُز ہے۔ اس چھوٹے سے جُز کی خوش حالی کے لیے جو شخص بڑی اور بے پایاں زندگی کی بدحالی مول لیتا ہے، وہ حقیقت میں سخت بے وقوف ہے۔ عقل مند دراصل وہی ہے، جس نے اس مختصر زندگی کی مہلت سے فائدہ اُٹھا کر تھوڑے سرمایے ہی سے اُس ہمیشگی کی زندگی میں اپنی خوش حالی کا بندوبست کر لیا۔

۳۱۰- خرچ خواہ راہِ خدا میں کیا ہو یا راہِ شیطان میں، اور نذر خواہ اللہ کے لیے مانی ہو یا غیراللہ کے لیے، دونوں صورتوں میں آدمی کی نیّت اور اس کے فعل سے اللہ خوب واقف ہے۔ جنھوں نے اُس کے لیے خرچ کیا ہوگا اور اس کی خاطر نذر مانی ہوگی، وہ اس کا اجر پائیں گے، اور جن ظالموں نے شیطانی راہوں میں خرچ کیا ہوگا اور اللہ کو چھوڑ کر دُوسروں کے لیے نذریں مانی ہوں گی، اُن کو خدا کی سزا سے بچانے کے لیے کوئی مددگار نہ ملے گا۔

نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے بر آنے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اُوپر لازم کر لے، جو اس کے ذمّے فرض نہ ہو۔ اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو، اور اللہ سے مانگی گئی ہو، اور اس کے بر آنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے، وہ اللہ ہی کے لیے ہو، تو ایسی نذر اللہ کی اطاعت میں ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو، تو ایسی نذر کا ماننا معصیت اور اس کا پورا کرنا مُوجبِ عذاب ہے۔

۳۱۱- جو صدقہ فرض ہو، اس کو عَلانیَہ دینا افضل ہے، اور جو صدقہ فرض کے ماسوا ہو، اس کا اخفا زیادہ بہتر ہے۔ یہی اُصول تمام اعمال کے لیے ہے کہ فرائض کا عَلانیَہ انجام دینا فضیلت رکھتا ہے اور نوافل کو چُھپا کر کرنا اَولیٰ ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا
تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ
اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا
تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا
يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ؗ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ
مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ

لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمّے داری تم پر نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔ اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمھارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے، اس کا پُورا پُورا اجر تمھیں دیا جائے گا اور تمھاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔[۳۱۳]

خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گِھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسبِ مَعاش کے لیے زمین میں کوئی دَوڑ دُھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر

۳۱۲– یعنی چُھپا کر نیکیاں کرنے سے آدمی کے نفس و اَخلاق کی مسلسل اصلاح ہوتی چلی جاتی ہے، اس کے اَوصافِ حمیدہ خوب نشوونُما پاتے ہیں، اس کی بُری صفات رفتہ رفتہ مِٹ جاتی ہیں، اور یہی چیز اس کو اللہ کے ہاں اتنا مقبول بنا دیتی ہے کہ جو تھوڑے بہت گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ہوتے بھی ہیں، انھیں اس کی خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔

۳۱۳– ابتدا میں مسلمان اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور عام غیر مسلم اہلِ حاجت کی مدد کرنے میں تأمّل کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ صرف مسلمان حاجت مندوں ہی کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس آیت میں ان کی یہ

اِلۡحَافًا ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ﴿۲۷۳﴾ ع اَلَّذِيۡنَ
يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمۡ
اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۴﴾
اَلَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَقُوۡمُ الَّذِىۡ

وقف منزل

کچھ مانگیں۔ اُن کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا[۳۱۴] ع

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔ مگر جو لوگ سُود[۳۱۵] کھاتے ہیں، اُن کا حال اُس شخص کا سا ہوتا ہے،

غلط فہمی دُور کی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں ہدایت اُتار دینے کی ذمّہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم حق بات پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سُبک دوش ہو چکے۔ اب یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ ان کو بصیرت کا نور عطا کرے یا نہ کرے۔ رہا دُنیوی مال و متاع سے اُن کی حاجتیں پوری کرنا، تو اس میں تم محض اس وجہ سے تأمّل نہ کرو کہ اُنھوں نے ہدایت قبول نہیں کی ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے جس حاجت مند انسان کی بھی مدد کرو گے، اس کا اجر اللہ تمھیں دے گا۔

۳۱۴– اِس گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کے دین کی خدمت میں اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیتے ہیں اور سارا وقت دینی خدمات میں صَرف کر دینے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہتے کہ اپنی مَعاش پیدا کرنے کے لیے کوئی جِدّ و جُہد کر سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس قسم کے رضا کاروں کا ایک مستقل گروہ تھا، جو تاریخ میں اصحابِ صُفّہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تین چار سو آدمی تھے، جو اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ آ گئے تھے۔ ہمہ وقت حضورؐ کے ساتھ رہتے تھے۔ ہر خدمت کے لیے ہر وقت حاضر تھے۔ حضورؐ جس مہم پر چاہتے، انھیں بھیج دیتے تھے، اور جب مدینے سے باہر کوئی کام نہ ہوتا، اس وقت یہ مدینے ہی میں رہ کر دین کا علم حاصل کرتے اور دُوسرے بندگانِ خدا کو اس کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ پورا وقت دینے والے کارکن تھے اور اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لیے اپنے ذاتی وسائل نہ رکھتے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ خاص طور پر ان کی مدد کرنا اِنفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف ہے۔

۳۱۵– اصل میں لفظ ''رِبٰوا'' استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ عربی میں زیادتی اور اضافے کے ہیں۔ اِصطلاحاً اہلِ عرب اِس لفظ کو اُس زائد رقم کے لیے استعمال کرتے تھے جو ایک قرض خواہ اپنے قرض دار سے ایک طے شدہ شرح کے مطابق اصل کے علاوہ وصول کرتا ہے۔ اِسی کو ہماری زبان میں سُود کہتے ہیں۔ نُزولِ قرآن کے وقت سُودی معاملات کی جو شکلیں رائج تھیں اور جنھیں اہلِ عرب ''رِبٰوا'' کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، وہ یہ تھیں کہ مثلاً ایک شخص دُوسرے شخص کے ہاتھ کوئی

يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ وقف لازم

جسے شیطان نے چھُو کر باؤلا کر دیا ہو۔[۳۱۶] اور اس حالت میں اُن کے مُبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ”تجارت بھی تو آخر سُود ہی جیسی چیز ہے“[۳۱۷]، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سُود کو حرام۔[۳۱۸]

چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدّت مقرر کر دیتا۔ اگر وہ مدّت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی، تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ یا مثلاً ایک شخص دُوسرے شخص کو قرض دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی مدّت میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنی ہوگی۔ یا مثلاً قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدّت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی اور اگر اس مدّت میں اصل رقم مع اضافہ کے ادا نہ ہوتی، تو مزید مُہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔ اِسی نوعیت کے معاملات کا حکم یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔

۳۱۶ – اہلِ عرب دیوانے آدمی کو ”مجنُون“ (یعنی آسیب زدہ) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، اور جب کسی شخص کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے، تو یوں کہتے کہ اسے جِنّ لگ گیا ہے۔ اسی محاورے کو استعمال کرتے ہوئے قرآن سُودخوار کو اُس شخص سے تشبیہ دیتا ہے جو مخبوط الحواس ہو گیا ہو۔ یعنی جس طرح وہ شخص عقل سے خارج ہو کر غیر معتدل حرکات کرنے لگتا ہے، اسی طرح سُودخوار بھی روپے کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے اور اپنی خود غرضی کے جُنون میں کچھ پروا نہیں کرتا کہ اس کی سُودخواری سے کس کس طرح انسانی محبّت، اخوّت اور ہمدردی کی جڑیں کٹ رہی ہیں، اجتماعی فلاح و بہبود پر کس قدر تباہ کُن اثر پڑ رہا ہے، اور کتنے لوگوں کی بدحالی سے وہ اپنی خوشحالی کا سامان کر رہا ہے۔ یہ اس کی دیوانگی کا حال اِس دُنیا میں ہے۔ اور چونکہ آخرت میں انسان اُسی حالت میں اُٹھایا جائے گا جس حالت پر اُس نے دُنیا میں جان دی ہے، اِس لیے سُودخوار آدمی قیامت کے روز ایک باؤلے، مخبوط الحواس انسان کی صورت میں اُٹھے گا۔

۳۱۷ – یعنی ان کے نظریّے کی خرابی یہ ہے کہ تجارت میں اصل لاگت پر جو منافع لیا جاتا ہے، اس کی نوعیّت اور سُود کی نوعیت کا فرق وہ نہیں سمجھتے، اور دونوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھ کر یوں اِستدلال کرتے ہیں کہ جب تجارت میں لگے ہوئے روپے کا منافع جائز ہے، تو قرض پر دیے ہوئے روپے کا منافع کیوں ناجائز ہو۔ اِسی طرح کے دلائل موجودہ زمانے کے سُودخوار بھی سُود کے حق میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس روپے سے خود فائدہ اٹھا سکتا تھا، اسے وہ قرض پر دُوسرے شخص کے حوالے کرتا ہے۔ وہ دوسرا شخص بھی بہرحال اس سے فائدہ ہی اُٹھاتا ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قرض دینے والے کے روپے سے جو فائدہ قرض لینے والا اُٹھا رہا ہے، اس میں سے ایک حصّہ وہ قرض دینے والے کو نہ ادا کرے؟ مگر یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ دنیا میں جتنے کاروبار ہیں، خواہ وہ تجارت کے ہوں یا صنعت وحرفت

کے یا زراعت کے، اور خواہ انھیں آدمی صرف اپنی محنت سے کرتا ہو، یا اپنے سرمایے اور محنت ہر دو سے، اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس میں آدمی نقصان کا خطرہ (risk) مول نہ لیتا ہو اور جس میں آدمی کے لیے لازماً ایک مقرر منافع کی ضمانت ہو۔ پھر آخر پوری کاروباری دُنیا میں ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا کیوں ہو جو نقصان کے خطرے سے بچ کر ایک مقرر اور لازمی منافع کا حق دار قرار پائے؟ غیر نفع بخش اغراض کے لیے قرض لینے والے کا معاملہ تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیجیے، اور شرح کی کمی بیشی کے مسئلے سے بھی قطعِ نظر کر لیجیے۔ معاملہ اُسی قرض کا سہی جو نفع بخش کاموں میں لگانے کے لیے لیا جائے، اور شرح بھی تھوڑی ہی سہی۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ ایک کاروبار میں اپنا وقت، اپنی محنت، اپنی قابلیت اور اپنا سرمایہ رات دن کھپا رہے ہیں، اور جن کی سعی و کوشش کے بَل پر ہی اس کاروبار کا بار آور ہونا موقوف ہے، ان کے لیے تو ایک مقرر منافع کی ضمانت نہ ہو، بلکہ نقصان کا سارا خطرہ بالکل اُنھی کے سر ہو، مگر جس نے صرف اپنا روپیا انھیں قرض دے دیا ہو، وہ بے خطر ایک طے شدہ منافع وُصول کرتا چلا جائے! یہ آخر کس عقل، کس مَنطِق، کس اُصولِ انصاف اور کس اُصولِ مَعاشیات کی رُو سے درست ہے؟ اور یہ کس بنا پر صحیح ہے کہ ایک شخص ایک کارخانے کو بیس سال کے لیے ایک رقم قرض دے اور آج ہی یہ طے کر لے کہ آیندہ ۲۰ سال تک وہ برابر ۵ فی صد سالانہ کے حساب سے اپنا منافع لینے کا حق دار ہوگا، حالانکہ وہ کارخانہ جو مال تیار کرتا ہے اس کے متعلق کسی کو بھی نہیں معلوم کہ مارکیٹ میں اس کی قیمتوں کے اندر آیندہ بیس سال میں کتنا اتار چڑھاؤ ہوگا؟ اور یہ کس طرح دُرست ہے کہ ایک قوم کے سارے ہی طبقے ایک لڑائی میں خطرات اور نقصانات اور قربانیاں برداشت کریں، مگر ساری قوم کے اندر سے صرف ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا ہو جو اپنے دیے ہوئے جنگی قرض پر اپنی ہی قوم سے لڑائی کے ایک صدی بعد تک سُود وُصول کرتا رہے؟

۳۱۸– تجارت اور سُود کا اُصولی فرق، جس کی بنا پر دونوں کی مَعاشی اور اَخلاقی حیثیت ایک نہیں ہو سکتی، یہ ہے:

(۱) تجارت میں بائع اور مُشتری کے درمیان منافع کا مُساویانہ تبادلہ ہوتا ہے، کیونکہ مشتری اس چیز سے نفع اُٹھاتا ہے جو اُس نے بائع سے خریدی ہے اور بائع اپنی اُس محنت، ذہانت اور وقت کی اُجرت لیتا ہے، جس کو اس نے مُشتری کے لیے وہ چیز مہیّا کرنے میں صَرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے، سُودی لین دین میں مَنافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سُود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لے لیتا ہے، جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے، لیکن اس کے مقابلے میں سُود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے، جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر اس نے سرمایہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہے، تب تو ظاہر ہے کہ مُہلت اس کے لیے قطعی نافع نہیں ہے۔ اور اگر وہ تجارت، یا زراعت، یا صَنعت وحِرفَت میں لگانے کے لیے سرمایہ لیتا ہے، تب بھی مُہلت میں جس طرح اس کے لیے نفع کا امکان ہے، اُسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دُوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے، یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

(۲) تجارت میں بائع مُشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے، بہرحال وہ جو کچھ لیتا ہے، ایک ہی بار لیتا ہے۔ لیکن سُود کے معاملے میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُس کا

فَمَنۡ جَآءَهٗ مَوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ فَانۡتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ
وَاَمۡرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا

لٰہذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آیندہ کے لیے وہ سُودخواری سے باز آجائے، تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، سوکھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔[۳۱۹] اور جو اِس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے، وہ جہنمی ہے، جہاں وہ

منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو، بہرطور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا۔ مگر دائن اس فائدے کے بدلے میں جو نفع اُٹھاتا ہے، اس کے لیے کوئی حد نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مدیون کی پوری کمائی، اس کے تمام وسائلِ معیشت، حتّٰی کہ اس کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک ہضم کر لے اور پھر بھی اس کا مطالبہ باقی رہ جائے۔

(۳) تجارت میں شے اور اس کی قیمت کا تبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد مُشتری کو کوئی چیز بائع کو واپس دینی نہیں ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرایے میں اصل شے، جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے، صَرف نہیں ہوتی، بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہٖ مالکِ جائداد کو واپس دے دی جاتی ہے۔ لیکن سود کے معاملہ میں قرض دار سرمایے کو صَرف کر چکتا ہے اور پھر اس کو وہ صَرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافے کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت وحرفت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت صَرف کر کے اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سُودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت ومشقّت کے دوسروں کی کمائی میں شریکِ غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اِصطلاحی ''شریک'' کی نہیں ہوتی جو نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے، اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسُب سے ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلالحاظِ نفع ونقصان اور بلالحاظِ تناسُبِ نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعوے دار ہوتا ہے۔

اِن وجوہ سے تجارت کی مَعاشی حیثیت اور سُود کی مَعاشی حیثیت میں اتنا عظیم الشان فرق ہو جاتا ہے کہ تجارت انسانی تمدُّن کی تعمیر کرنے والی قوت بن جاتی ہے اور اس کے برعکس سُود اس کی تخریب کرنے کا موجب بنتا ہے۔ پھر اخلاقی حیثیت سے یہ سُود کی عین فطرت ہے کہ وہ افراد میں بُخل، خودغرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے، اور ہمدردی و امدادِ باہمی کی رُوح کو فنا کر دیتا ہے۔ اس بِنا پر سُود مَعاشی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے نوعِ انسانی کے لیے تباہ کُن ہے۔

۳۱۹۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ اس نے کھالیا، اسے اللہ معاف کر دے گا، بلکہ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''جو کھا چکا سو کھا چکا'' کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کھا چکا، اسے

خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ

ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سُود کا مَٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نَشْو و نَما دیتا ہے۔[۳۲۰] اور اللہ

معاف کر دیا گیا، بلکہ اس سے محض قانونی رعایت مراد ہے۔ یعنی جو سُود پہلے کھایا جا چکا ہے، اسے واپس دینے کا قانوناً مطالبہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اگر اس کا مطالبہ کیا جائے تو مقدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے جو کہیں جا کر ختم نہ ہو۔ مگر اَخلاقی حیثیت سے اُس مال کی نجاست بدستور باقی رہے گی جو کسی شخص نے سُودی کاروبار سے سمیٹا ہو۔ اگر وہ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والا ہو گا اور اس کا مَعاشی و اخلاقی نقطۂ نظر واقعی اسلام قبول کرنے سے تبدیل ہو چکا ہو گا، تو وہ خود اپنی اس دولت کو، جو حرام ذرائع سے آئی تھی، اپنی ذات پر خرچ کرنے سے پرہیز کرے گا اور کوشش کرے گا کہ جہاں تک ان حق داروں کا پتا چلایا جا سکتا ہے، جن کا مال اس کے پاس ہے، اس حد تک ان کا مال انھیں واپس کر دیا جائے، اور جس حصّۂ مال کے مستحقین کی تحقیق نہ ہو سکے، اسے اجتماعی فلاح و بہبود پر صرف کیا جائے۔ یہی عمل اسے خدا کی سزا سے بچا سکے گا۔ رہا وہ شخص جو پہلے کمائے ہوئے مال سے بدستور لطف اُٹھاتا رہے، تو بعید نہیں کہ وہ اپنی اس حرام خوری کی سزا پا کر رہے۔

۳۲۰۔ اِس آیت میں ایک ایسی صداقت بیان کی گئی ہے، جو اَخلاقی و رُوحانی حیثیت سے بھی سراسر حق ہے اور مَعاشی و تمدُّنی حیثیت سے بھی۔ اگرچہ بظاہر سُود سے دولت بڑھتی نظر آتی ہے اور صدقات سے گھٹتی ہُوئی محسوس ہوتی ہے، لیکن درحقیقت معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ خدا کا قانونِ فطرت یہی ہے کہ سُود اخلاقی و رُوحانی اور مَعاشی و تمدُّنی ترقی میں نہ صرف مانع ہوتا ہے بلکہ تنزُّل کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور اس کے برعکس صدقات سے (جن میں قرضِ حَسَن بھی شامل ہے) اخلاق و رُوحانیت اور تمدُّن و معیشت، ہر چیز کو نَشْو و نَما نصیب ہوتا ہے۔

اخلاقی و رُوحانی حیثیت سے دیکھیے، تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ سُود دراصل خود غَرضی، بخل، تنگ دلی اور سنگ دلی جیسی صفات کا نتیجہ ہے اور وہ اِنھی صفات کو انسان میں نَشْو و نَما بھی دیتا ہے۔ اس کے برعکس صدقات نتیجہ ہیں فیّاضی، ہمدردی، فراخ دِلی اور عالی ظرفی جیسی صفات کا، اور صدقات پر عمل کرتے رہنے سے یہی صفات انسان کے اندر پرورش پاتی ہیں۔ کون ہے جو اخلاقی صفات کے ان دونوں مجموعوں میں سے پہلے مجموعے کو بدترین اور دُوسرے کو بہترین نہ مانتا ہو؟

تمدّنی حیثیت سے دیکھیے، تو بادنیٰ تأمّل یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں آ جائے گی کہ جس سوسائٹی میں افراد ایک دُوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں، کوئی شخص اپنی ذاتی غرض اور اپنے ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے، ایک آدمی کی حاجت مندی کو دوسرا آدمی اپنے لیے نفع اندوزی کا موقع سمجھے اور اس کا پورا فائدہ اٹھائے، اور مال دار طبقوں کا مفاد عامّۃ الناس کے مفاد کی ضد ہو جائے، ایسی سوسائٹی کبھی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اس کے افراد میں آپس کی مَحبّت کے بجائے باہمی بُغض و حسد اور بے دردی و بے تعلقی نَشْو و نَما پائے گی۔ اس کے اجزا ہمیشہ انتشار و پراگندگی کی طرف مائل رہیں گے۔ اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورتِ حال کے لیے مددگار ہو جائیں، تو ایسی سوسائٹی کے اجزا کا باہم متصادم

ہو جانا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے برعکس جس سوسائٹی کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو، جس کے افراد ایک دُوسرے کے ساتھ فیّاضی کا معاملہ کریں، جس میں ہر شخص دُوسرے کی حاجت کے موقع پر فراخ دلی کے ساتھ مدد کا ہاتھ بڑھائے، اور جس میں باوسیلہ لوگ بے وسیلہ لوگوں سے ہمدردانہ اعانت یا کم از کم منصفانہ تعاون کا طریقہ برتیں، ایسی سوسائٹی میں آپس کی محبّت، خیر خواہی اور دلچسپی نشوونما پائے گی۔ اس کے اجزا ایک دُوسرے کے ساتھ پیوستہ اور ایک دوسرے کے پُشتیبان ہوں گے۔ اس میں اندرونی نزاع و تصادُم کو راہ پانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار پہلی قسم کی سوسائٹی کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہوگی۔

اب مَعاشی حیثیت سے دیکھیے۔ معاشیات کے نقطۂ نظر سے سُودی قرض کی دو قسمیں ہیں: ایک، وہ قرض جو اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے مجبُور اور حاجت مند لوگ لیتے ہیں۔ دوسرا، وہ قرض جو تجارت اور صنعت وحِرفت اور زراعت وغیرہ کاموں پر لگانے کے لیے پیشہ ور لوگ لیتے ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم کے قرض کو تو ایک دُنیا جانتی ہے کہ اس پر سُود وصول کرنے کا طریقہ نہایت تباہ کُن ہے۔ دُنیا کا کوئی مُلک ایسا نہیں ہے جس میں مہاجن افراد اور مہاجنی ادارے اس ذریعے سے غریب مزدوروں، کاشتکاروں اور قلیل المعاش عوام کا خون نہ چوس رہے ہوں۔ سُود کی وجہ سے اس قسم کا قرض ادا کرنا ان لوگوں کے لیے سخت مشکل، بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر ایک قرض کو ادا کرنے کے لیے وہ دوسرا اور تیسرا قرض لیتے چلے جاتے ہیں۔ اصل رقم سے کئی کئی گنا سُود دے چکنے پر بھی اصل رقم جُوں کی تُوں باقی رہتی ہے۔ محنت پیشہ آدمی کی آمدنی کا بیشتر حصّہ مہاجن لے جاتا ہے اور اس غریب کی اپنی کمائی میں سے اس کے پاس اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ پالنے کے لیے بھی کافی روپیا نہیں بچتا۔ یہ چیز رفتہ رفتہ اپنے کام سے کارکنوں کی دلچسپی ختم کر دیتی ہے۔ کیونکہ جب ان کی محنت کا پھل دُوسرا لے اُڑے تو وہ کبھی دل لگا کر محنت نہیں کر سکتے۔ پھر سودی قرض کے جال میں پھنسے ہوئے لوگوں کو ہر وقت کی فکر اور پریشانی اس قدر گُھلا دیتی ہے، اور تنگ دستی کی وجہ سے ان کے لیے صحیح غذا اور علاج اس قدر مشکل ہو جاتا ہے، کہ ان کی صحّتیں کبھی دُرست نہیں رہ سکتیں۔ اس طرح سودی قرض کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ چند افراد تو لاکھوں آدمیوں کا خون چُوس چُوس کر موٹے ہوتے رہتے ہیں، مگر بحیثیتِ مجموعی پوری قوم کی پیدایشِ دولت اپنے امکانی معیار کی بہ نسبت بہت گھٹ جاتی ہے، اور مآلِ کار میں خود وہ خون چُوسنے والے افراد بھی اس کے نقصانات سے نہیں بچ سکتے۔ کیونکہ ان کی اس خود غرضی سے غریب عوام کو جو تکلیفیں پہنچتی ہیں، ان کی بدولت مال دار لوگوں کے خلاف غصے اور نفرت کا ایک طوفان دلوں میں اُٹھتا اور گُھٹتا رہتا ہے، اور کسی انقلابی ہیجان کے موقع پر جب یہ آتش فشاں پھٹتا ہے تو ان ظالم مال داروں کو اپنے مال کے ساتھ اپنی جان اور آبرو تک سے ہاتھ دھونا پڑ جاتا ہے۔

رہا دُوسری قسم کا قرض جو کاروبار میں لگانے کے لیے لیا جاتا ہے، تو اس پر ایک مقرر شرحِ سُود کے عائد ہونے سے جو بے شمار نقصانات پہنچتے ہیں، ان میں سے چند نمایاں ترین یہ ہیں:

(۱) جو کام رائج الوقت شرحِ سود کے برابر نفع نہ لا سکتے ہوں، چاہے ملک اور قوم کے لیے کتنے ہی ضروری اور مفید ہوں، ان پر لگانے کے لیے روپیا نہیں ملتا اور ملک کے تمام مالی وسائل کا بہاؤ ایسے کاموں کی طرف ہو جاتا ہے، جو

لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ

کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔[۳۲۱] ہاں، جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور

بازار کی شرحِ سُود کے برابر یا اس سے زیادہ نفع لا سکتے ہوں، چاہے اجتماعی حیثیت سے ان کی ضرورت اور ان کا فائدہ بہت کم ہو یا کچھ بھی نہ ہو۔

(۲) جن کاموں کے لیے سُود پر سرمایہ ملتا ہے، خواہ وہ تجارتی کام ہوں یا صنعتی یا زراعتی، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس میں اس امر کی ضمانت موجود ہو کہ ہمیشہ تمام حالات میں اس کا منافع ایک مقرر میعاد، مثلاً پانچ، چھ یا دس فی صد تک یا اس سے اُوپر اُوپر ہی رہے گا اور کبھی اس سے نیچے نہیں گرے گا۔ اِس کی ضمانت ہونا تو درکنار، کسی کاروبار میں سرے سے اِسی بات کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے کہ اس میں ضرور منافع ہی ہوگا، نقصان کبھی نہ ہوگا۔ لہٰذا کسی کاروبار میں ایسے سرمایے کا لگنا جس پر سرمایہ دار کو ایک مقرر شرح کے مطابق منافع دینے کی ضمانت دی گئی ہو، نقصان اور خطرے کے پہلوؤں سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔

(۳) چونکہ سرمایہ دینے والا کاروبار کے نفع و نقصان میں شریک نہیں ہوتا بلکہ صرف منافع اور وہ بھی ایک مقرر شرحِ منافع کی ضمانت پر روپیا دیتا ہے، اس وجہ سے کاروبار کی بھلائی اور بُرائی سے اس کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ انتہائی خود غرضی کے ساتھ صرف اپنے منافع پر نگاہ رکھتا ہے، اور جب کبھی اسے ذرا سا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ منڈی پر کَساد بازاری کا حملہ ہونے والا ہے، تو وہ سب سے پہلے اپنا روپیا کھینچنے کی فکر کرتا ہے۔ اِس طرح کبھی تو محض اس کے خود غرضانہ اندیشوں ہی کی بدولت دنیا پر کَساد بازاری کا واقعی حملہ ہو جاتا ہے، اور کبھی اگر دُوسرے اسباب سے کَساد بازاری آ گئی ہو تو سرمایہ دار کی خود غرضی اس کو بڑھا کر انتہائی تباہ کُن حد تک پہنچا دیتی ہے۔

سُود کے یہ تین نقصانات تو ایسے صریح ہیں کہ کوئی شخص جو علم المعیشت سے تھوڑا سا مَس بھی رکھتا ہو، ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد یہ مانے بغیر کیا چارہ ہے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کے قانونِ فطرت کی رُو سے سود معاشی دولت کو بڑھاتا نہیں بلکہ گھٹاتا ہے۔

اب ایک نظر صدقات کے مَعاشی اثرات و نتائج کو بھی دیکھ لیجیے۔ اگر سوسائٹی کے خوشحال افراد کا طریق کار یہ ہو کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات خریدیں، پھر جو روپیا ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ بچے، اسے غریبوں میں بانٹ دیں، تاکہ وہ بھی اپنی ضروریات خرید سکیں، پھر اس پر بھی جو روپیا بچ جائے، اسے یا تو کاروباری لوگوں کو بلا سُود قرض دیں، یا شرکت کے اُصول پر ان کے ساتھ نفع و نقصان میں حصہ دار بن جائیں، یا حکومت کے پاس جمع کر دیں کہ وہ اجتماعی خدمات کے لیے ان کو استعمال کرے، تو ہر شخص تھوڑے سے غور و فکر ہی سے اندازہ کر سکتا ہے کہ ایسی سوسائٹی میں تجارت اور صنعت اور زراعت، ہر چیز کو بے انتہا فروغ حاصل ہوگا۔ اُس کے عام افراد کی خوش حالی

اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا
اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ

نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اُن کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔[۳۲۲]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سُود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمھارے خلاف اعلانِ جنگ[۳۲۳] ہے۔ اب بھی توبہ کرلو (اور سُود چھوڑ دو) تو

کا معیار بلند ہوتا چلا جائے گا اور اس میں بحیثیتِ مجموعی دولت کی پیداوار اُس سوسائٹی کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ ہوگی جس کے اندر سُود کا رواج ہو۔

۳۲۱- ظاہر ہے کہ سُود پر روپیا وہی شخص چلا سکتا ہے جس کو دولت کی تقسیم میں اس کی حقیقی ضرورت سے زیادہ حصّہ ملا ہو۔ یہ ضرورت سے زیادہ حصّہ، جو ایک شخص کو ملتا ہے، قرآن کے نقطۂ نظر سے دراصل اللہ کا فضل ہے۔ اور اللہ کے فضل کا صحیح شکر یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے بندے پر فضل فرمایا ہے، اسی طرح بندہ بھی اللہ کے دوسرے بندوں پر فضل کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ کے فضل کو اس غرض کے لیے استعمال کرتا ہے کہ جو بندے دولت کی تقسیم میں اپنی ضرورت سے کم حصّہ پا رہے ہیں، ان کے قلیل حصّے میں سے بھی وہ اپنی دولت کے زور پر ایک ایک جُز اپنی طرف کھینچ لے، تو حقیقت میں وہ ناشُکرا بھی ہے اور ظالم، جفا کار اور بدعمل بھی۔

۳۲۲- اس رُکوع میں اللہ تعالیٰ بار بار دو قسم کے کرداروں کو بالمقابل پیش کر رہا ہے۔ ایک کردار خود غرض، زر پرست، شائیلاک قسم کے انسان کا ہے، جو خدا اور خَلق دونوں کے حُقوق سے بے پروا ہو کر روپیا گننے اور گن گن کر سنبھالنے اور ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے اس کو بڑھانے اور اس کی بڑھوتری کا حساب لگانے میں منہمک ہو۔ دُوسرا کردار ایک خدا پرست، فیّاض اور ہمدرد انسان کا کردار ہے، جو خدا اور خلقِ خدا دونوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہو، اپنی قوتِ بازو سے کما کر خود کھائے اور دُوسرے بندگانِ خدا کو کھلائے اور دل کھول کر نیک کاموں میں خرچ کرے۔ پہلی قسم کا کردار خدا کو سخت ناپسند ہے۔ دنیا میں اس کردار پر کوئی صالح سوسائٹی نہیں بن سکتی، اور آخرت میں ایسے کردار کے لیے غم واندوہ

فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنْ
كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى
اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع ۳۸

اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو۔ نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ تمھارا قرض دار تنگ دست ہو، تو ہاتھ کُھلنے تک اُسے مہلت دو، اور جو صدقہ کر دو، تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔[۳۲۴] اُس دن کی رُسوائی و مصیبت سے بچو، جب کہ تم اللہ کی طرف واپس ہو گے، وہاں ہر شخص کو اُس کی کمائی ہوئی نیکی یا بدی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم ہرگز نہ ہو گا ؏

کُلفت و مصیبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اللہ کو دُوسری قسم کا کردار پسند ہے، اسی سے دُنیا میں صالح سوسائٹی بنتی ہے اور وہی آخرت میں انسان کے لیے موجبِ فلاح ہے۔

۳۲۳- یہ آیت فتحِ مکہ کے بعد نازل ہوئی اور مضمون کی مناسبت سے اِس سلسلۂ کلام میں داخل کر دی گئی۔ اس سے پہلے اگرچہ سُود ایک ناپسندیدہ چیز سمجھا جاتا تھا، مگر قانوناً اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس آیت کے نُزول کے بعد اسلامی حکومت کے دائرے میں سودی کاروبار ایک فوجداری جُرم بن گیا۔ عرب کے جو قبیلے سُود کھاتے تھے، ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عُمّال کے ذریعے سے آگاہ فرما دیا کہ اگر اب وہ اس لین دین سے باز نہ آئے، تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ نجران کے عیسائیوں کو جب اسلامی حکومت کے تحت اندرونی خود مختاری دی گئی، تو مُعاہدے میں یہ تصریح کر دی گئی کہ اگر تم سُودی کاروبار کرو گے، تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا اور ہمارے اور تمھارے درمیان حالتِ جنگ قائم ہو جائے گی۔ آیت کے آخری الفاظ کی بنا پر ابنِ عباسؓ، حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ اور ربیع بن اَنَسؒ کی رائے یہ ہے کہ جو شخص دار الاسلام میں سُود کھائے، اسے توبہ پر مجبور کیا جائے، اور اگر باز نہ آئے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ دُوسرے فقہا کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا کافی ہے۔ جب تک وہ سُود خواری چھوڑ دینے کا عہد نہ کرے، اسے نہ چھوڑا جائے۔

۳۲۴- اسی آیت سے شریعت میں یہ حکم نکالا گیا ہے کہ جو شخص ادائے قرض سے عاجز ہو گیا ہو، اسلامی عدالت اس کے قرض خواہوں کو مجبور کرے گی کہ اُسے مہلت دیں، اور بعض حالات میں وہ پورا قرض یا قرض کا ایک حصّہ معاف بھی کرانے کی مجاز ہو گی۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کے کاروبار میں گھاٹا آ گیا اور اس پر قرضوں کا بار بہت چڑھ گیا۔ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپؐ نے لوگوں سے اپیل کی کہ اپنے اس بھائی کی مدد کرو۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے اس کو مالی امداد دی۔ مگر

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى
فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ
كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ
شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا
اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب کسی مقرر مدّت کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین[325] کرو، تو اسے لکھ لیا کرو۔[326] فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو، اُسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ وہ لکھے اور املاوہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے (یعنی قرض لینے والا)، اور اُسے اللہ، اپنے رب سے ڈرنا چاہیے کہ جو معاملہ طے ہُوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو، یا املا نہ کرا سکتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔

قرضے پھر بھی صاف نہ ہوسکے۔ تب آپؐ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا کہ جو کچھ حاضر ہے، بس وہی لے کراسے چھوڑ دو، اس سے زیادہ تمھیں نہیں دلوایا جاسکتا۔ فقہانے تصریح کی ہے کہ ایک شخص کے رہنے کا مکان، کھانے کے برتن، پہننے کے کپڑے اور وہ آلات جن سے وہ اپنی روزی کماتا ہو، کسی حالت میں قُرق نہیں کیے جاسکتے۔

۳۲۵- اس سے یہ حکم نکلتا ہے کہ قرض کے معاملے میں مدت کی تعیین ہونی چاہیے۔

۳۲۶- عُموماً دوستوں اور عزیزوں کے درمیان قرض کے معاملات میں دستاویز لکھنے اور گواہیاں لینے کو معیوب اور بے اعتمادی کی دلیل خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ قرض اور تجارتی قراردادوں کو تحریر میں لانا چاہیے اور اس پر شہادت ثبت کرالینی چاہیے، تاکہ لوگوں کے درمیان معاملات صاف رہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ تین قسم کے آدمی ایسے ہیں، جو اللہ سے فریاد کرتے ہیں، مگر ان کی فریاد سُنی نہیں جاتی۔ ایک وہ شخص جس کی بیوی بدخُلق ہو اور وہ اس کو طلاق نہ دے۔ دُوسرا، وہ شخص جو یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے اس کا مال اس کے حوالے کردے۔ تیسرا، وہ شخص جو کسی کو اپنا مال قرض

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا
رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ
اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ
الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا
اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ
لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً
حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا

پھر اپنے مَردوں میں سے[۳۲۷] دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تا کہ ایک بُھول جائے، تو دوسری اُسے یاد دلا دے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہییں، جن کی گواہی تمھارے درمیان مقبول ہو۔[۳۲۸] گواہوں کو جب گواہ بننے کے لیے کہا جائے، تو انھیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کی تعیین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوا لینے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمھارے لیے زیادہ مبنی بر انصاف ہے، اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، اور تمھارے شکوک وشبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست تم لوگ آپس میں کرتے ہو، اس کو نہ لکھا جائے تو

دے اور اس پر گواہ نہ بنائے۔

۳۲۷- یعنی مسلمان مردوں میں سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں گواہ بنانا اختیاری فعل ہو، وہاں مسلمان صرف مسلمانوں ہی کو اپنا گواہ بنائیں۔ البتہ ذمّیوں کے گواہ ذمّی بھی ہو سکتے ہیں۔

۳۲۸- مطلب یہ ہے کہ ہر کَس و ناکَس گواہ ہونے کے لیے موزوں نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگوں کو گواہ بنایا جائے جو اپنے اَخلاق و دیانت کے لحاظ سے بالعُموم لوگوں کے درمیان قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہوں۔

تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ
وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَ اِنْ
كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ

کوئی حرج نہیں،[۳۲۹] مگر تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کر لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے۔[۳۳۰] ایسا کرو گے، تو گناہ کا ارتکاب کرو گے۔ اللہ کے غضب سے بچو۔ وہ تم کو صحیح طریقِ عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔

اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب نہ ملے، تو رہن بالقبض پر معاملہ کرو۔[۳۳۱]

۳۲۹- مطلب یہ ہے کہ اگرچہ روز مرّہ کی خرید و فروخت میں بھی معاملۂ بیع کا تحریر میں آ جانا بہتر ہے، جیسا کہ آج کل کیش میمو لکھنے کا طریقہ رائج ہے، تاہم ایسا کرنا لازم نہیں ہے۔ اِسی طرح ہمسایہ تاجر ایک دوسرے سے رات دن جو لین دین کرتے رہتے ہیں، اس کو بھی اگر تحریر میں نہ لایا جائے تو کوئی مضایقہ نہیں۔

۳۳۰- اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو دستاویز لکھنے یا اس پر گواہ بننے کے لیے مجبور نہ کیا جائے، اور یہ بھی کہ کوئی فریق کاتب یا گواہ کو اس بنا پر نہ ستائے کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف صحیح شہادت دیتا ہے۔

۳۳۱- یہ مطلب نہیں ہے کہ رَہن کا معاملہ صرف سفر ہی میں ہو سکتا ہے، بلکہ ایسی صورت چونکہ زیادہ تر سفر میں پیش آتی ہے، اس لیے خاص طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ نیز معاملۂ رہن کے لیے یہ شرط بھی نہیں ہے کہ جب دستاویز لکھنا ممکن نہ ہو، صرف اسی صورت میں رہن کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب محض دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے کے لیے آمادہ نہ ہو، تو قرض کا طالب اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر روپیا لے لے۔ لیکن قرآنِ مجید چونکہ اپنے پیرووں کو فیّاضی کی تعلیم دینا چاہتا ہے، اور یہ بات بلند اَخلاق سے فروتر ہے کہ ایک شخص مال رکھتا ہو اور وہ ایک ضرورت مند آدمی کو اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر قرض نہ دے، اس لیے قرآن نے قصداً اِس دوسری صورت کا ذکر نہیں کیا۔

اس سلسلے میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی

ع فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ
وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ
اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِىْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ

اگر تم میں سے کوئی شخص دُوسرے پر بھروسا کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے، تو جس پر بھروسا کیا گیا ہے، اسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اللہ، اپنے رب سے ڈرے۔

اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ۔[۳۳۲] جو شہادت چھپاتا ہے، اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے۔ اور اللہ تمھارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ ع

آسمانوں[۳۳۳] اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے۔[۳۳۴] تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو یا چھپاؤ

واپسی کا اطمینان ہو جائے۔ اسے اپنے دیے ہوئے مال کے معاوضے میں شے مَرہُونہ سے فائدہ اُٹھانے کا حق نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص رہن لیے ہوئے مکان میں خود رہتا ہے یا اس کا کرایہ کھاتا ہے، تو دراصل سُود کھاتا ہے۔ قرض پر براہِ راست سُود لینے اور رَہن لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانے میں اُصولاً کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی جانور رہن لیا گیا ہو تو اس کا دودھ استعمال کیا جاسکتا ہے، اور اس سے سواری و بار برداری کی خدمت لی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ دراصل اُس چارے کا معاوضہ ہے جو مُرتَہِن اس جانور کو کھلاتا ہے۔

۳۳۲– شہادت دینے سے گریز کرنا، یا شہادت میں صحیح واقعات کے اظہار سے پرہیز کرنا، دونوں پر ''شہادت چھُپانے'' کا اطلاق ہوتا ہے۔

۳۳۳– یہ خاتمۂ کلام ہے۔ اس لیے جس طرح سورت کا آغاز دین کی بنیادی تعلیمات سے کیا گیا تھا، اسی طرح سورت کو ختم کرتے ہوئے بھی اُن تمام اُصولی امور کو بیان کر دیا گیا ہے جن پر دینِ اسلام کی اساس قائم ہے۔ تقابُل کے لیے اس سورہ کے پہلے رکوع کو سامنے رکھ لیا جائے تو زیادہ مفید ہوگا۔

۳۳۴– یہ دین کی اوّلین بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مالکِ زمین و آسمان ہونا اور اُن تمام چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں، اللہ ہی کی مِلک ہونا، دراصل یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بنا پر انسان کے لیے کوئی دوسرا طرزِ عمل اس کے سوا جائز اور صحیح نہیں ہوسکتا کہ وہ اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھُکا دے۔

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ
يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ
وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

اللہ بہرحال ان کا حساب تم سے لے لے گا۔[۳۳۵] پھر اُسے اختیار ہے، جسے چاہے، معاف کر دے اور جسے چاہے، سزا دے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۳۳۶]

رسولؐ اُس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اِس رسولؐ کے ماننے والے ہیں، انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ”ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دُوسرے سے الگ نہیں کرتے، ہم نے حکم سُنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک! ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔“[۳۳۷]

۳۳۵- اس فقرے میں مزید دو باتیں ارشاد ہوئیں: ایک، یہ کہ ہر انسان فرداً فرداً اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دِہ ہے۔ دُوسرے، یہ کہ جس پادشاہِ زمین و آسمان کے سامنے انسان جواب دِہ ہے، وہ غیب و شہادت کا علم رکھنے والا ہے، حتّٰی کہ دلوں کے چھُپے ہوئے ارادے اور خیالات تک اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

۳۳۶- یہ اللہ کے اختیارِ مطلق کا بیان ہے۔ اُس کو کسی قانون نے باندھ نہیں رکھا ہے کہ اُس کے مطابق عمل کرنے پر وہ مجبور ہو، بلکہ وہ مالکِ مختار ہے۔ سزا دینے اور معاف کرنے کے کُلّی اختیارات اس کو حاصل ہیں۔

۳۳۷- اس آیت میں تفصیلات سے قطعِ نظر کر کے اسلام کے عقائد اور اسلامی طرزِ عمل کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے: اللہ کو، اس کے فرشتوں کو، اور اس کی کتابوں کو ماننا۔ اس کے تمام رسولوں کو تسلیم کرنا، بغیر اس کے کہ ان کے درمیان فرق کیا جائے (یعنی کسی کو مانا جائے اور کسی کو نہ مانا جائے)۔ اور اس امر کو تسلیم کرنا کہ آخرِ کار ہمیں اس کے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ

اللہ کسی متنفّس پر اُس کی مَقدِرَت سے بڑھ کر ذمّہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔[۳۳۸] ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے، اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے، اس کا وبال اسی پر ہے۔[۳۳۹] (ایمان لانے والو! تم یوں دُعا کیا کرو) اے ہمارے رب! ہم سے بُھول چُوک میں جو قصور ہو جائیں، ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال، جو تُو نے ہم سے پہلے لوگوں پر

حضور میں حاضر ہونا ہے۔ یہ پانچ اُمور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔ اِن عقائد کو قبول کرنے کے بعد ایک مسلمان کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم پہنچے، اسے وہ بسر وچشم قبول کرے، اس کی اطاعت کرے، اور اپنے حُسنِ عمل پر غرّہ نہ کرے، بلکہ اللہ سے عَفو و درگزر کی درخواست کرتا رہے۔

۳۳۸- یعنی اللہ کے ہاں انسان کی ذمّہ داری اس کی مَقدِرَت کے لحاظ سے ہے۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ بندہ ایک کام کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اور اللہ اس سے باز پُرس کرے کہ تو نے فُلاں کام کیوں نہ کیا۔ یا ایک چیز سے بچنا فی الحقیقت اس کی مَقدِرَت سے باہر ہو اور اللہ اس پر مؤاخذہ کرے کہ تو نے اس سے پرہیز کیوں نہ کیا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اپنی مَقدِرَت کا فیصلہ کرنے والا انسان خود نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ ہی کر سکتا ہے کہ ایک شخص فی الحقیقت کس چیز کی قدرت رکھتا تھا اور کس چیز کی نہ رکھتا تھا۔

۳۳۹- یہ اللہ کے قانونِ مجازات کا دوسرا قاعدۂ کُلیّہ ہے۔ ہر آدمی انعام اُسی خدمت پر پائے گا جو اس نے خود انجام دی ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص کی خدمات پر دُوسرا انعام پائے۔ اور اسی طرح ہر شخص اسی قصور میں پکڑا جائے گا جس کا وہ خود مرتکب ہوا ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کے قصور میں دوسرا پکڑا جائے۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک آدمی نے کسی نیک کام کی بنا رکھی ہو اور دنیا میں ہزاروں سال تک اس کام کے اثرات چلتے رہیں اور یہ سب اس کے کارنامے میں لکھے جائیں۔ اور ایک دُوسرے شخص نے کسی بُرائی کی بنا رکھی ہو اور صدیوں تک دنیا میں اس کا اثر جاری رہے اور وہ اس ظالمِ اوّل کے حساب میں درج ہوتا رہے۔ لیکن یہ اچھا یا برا، جو کچھ بھی پھل ہوگا، اسی کی سعی اور اسی کے کسب کا نتیجہ ہوگا۔ بہرحال یہ ممکن نہیں ہے کہ جس بھلائی یا جس برائی میں آدمی کی نیت اور سعی و عمل کا کوئی حصہ نہ ہو، اس کی جزا یا سزا اسے مل جائے۔ مُکافاتِ عمل کوئی قابلِ انتقال چیز نہیں ہے۔

مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع

ڈالے تھے۔[۳۴۰] پروردگار! جس بار کو اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے، وہ ہم پر نہ رکھ۔[۳۴۱] ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔[۳۴۲] ع

۳۴۰- یعنی ہمارے پیش رووں کو تیری راہ میں جو آزمایشیں پیش آئیں، جن زبردست ابتلاؤں سے وہ گزرے، جن مشکلات سے انھیں سابقہ پڑا، اُن سے ہمیں بچا۔ اگرچہ اللہ کی سنّت یہی رہی ہے کہ جس نے بھی حق و صداقت کی پیروی کا عزم کیا ہے، اُسے سخت آزمایشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اور جب آزمایشیں پیش آئیں تو مومن کا کام یہی ہے کہ پورے استقلال سے ان کا مقابلہ کرے۔ لیکن بہرحال مومن کو اللہ سے دُعا یہی کرنی چاہیے کہ وہ اس کے لیے حق پرستی کی راہ کو آسان کر دے۔

۳۴۱- یعنی مشکلات کا اتنا ہی بار ہم پر ڈال، جسے ہم سہار لے جائیں۔ آزمایشیں بس اتنی ہی بھیج کہ ان میں ہم پُورے اُتر جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری قوتِ برداشت سے بڑھ کر سختیاں ہم پر نازل ہوں اور ہمارے قدم راہِ حق سے ڈگمگا جائیں۔

۳۴۲- اس دُعا کی پوری رُوح کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یہ آیات ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج کے موقع پر نازل ہوئی تھیں، جبکہ مکّے میں کفرو اسلام کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، مسلمانوں پر مصائب و مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، اور صرف مکہ ہی نہیں، بلکہ سرزمینِ عرب پر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی بندۂ خدا نے دینِ حق کی پیروی اختیار کی ہو اور اس کے لیے خدا کی سرزمین پر سانس لینا دشوار نہ کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ اپنے مالک سے اس طرح دعا مانگا کرو۔ ظاہر ہے کہ دینے والا خود ہی جب مانگنے کا ڈھنگ بتائے، تو ملنے کا یقین آپ سے آپ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ دعا اس وقت مسلمانوں کے لیے غیر معمولی تسکینِ قلب کی موجب ہوئی۔ علاوہ بریں اس دعا میں ضمناً مسلمانوں کو یہ بھی تلقین کر دی گئی کہ وہ اپنے جذبات کو کسی نامناسب رُخ پر نہ بہنے دیں، بلکہ انھیں اس دُعا کے سانچے میں ڈھال لیں۔ ایک طرف اُن روح فرسا مظالم کو دیکھیے، جو محض حق پرستی کے جرم میں اُن لوگوں پر توڑے جا رہے تھے، اور دُوسری طرف اِس دُعا کو دیکھیے، جس میں

دشمنوں کے خلاف کسی تلخی کا شائبہ تک نہیں۔ ایک طرف اُن جسمانی تکلیفوں اور مالی نقصانات کو دیکھیے، جن میں یہ لوگ مبتلا تھے، اور دُوسری طرف اِس دُعا کو دیکھیے، جس میں کسی دُنیوی مفاد کی طلب کا ادنیٰ نشان تک نہیں ہے۔ ایک طرف اِن حق پرستوں کی انتہائی خستہ حالی کو دیکھیے، اور دُوسری طرف ان بلند اور پاکیزہ جذبات کو دیکھیے، جن سے یہ دُعا لبریز ہے۔ اس تقابُل ہی سے صحیح اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُس وقت اہلِ ایمان کو کس طرز کی اَخلاقی و رُوحانی تَربِیَت دی جا رہی تھی۔

(بقیہ حاشیہ ۵۵)

آدم علیہ السّلام کی تخلیق کے وقت اللہ اور فرشتوں کی گفتگو کا ذکر تَلْمُود میں بھی آیا ہے، مگر وہ بھی اس معنوی رُوح سے خالی ہے جو قرآن کے بیان کردہ قصّے میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ اس میں یہ لطیفہ بھی پایا جاتا ہے کہ جب فرشتوں نے اللہ سے پوچھا: ''انسانوں کو آخر کیوں پیدا کیا جا رہا ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: ''تاکہ ان میں نیک لوگ پیدا ہوں۔'' بدلوگوں کا ذکر اللہ نے نہیں کیا۔ ورنہ فرشتے انسان کی تخلیق کی منظوری نہ دیتے۔

Talmudic Miscellany, Paul Isaac Hershon - LONDON 1880, P 294-95

تفہیم القرآن

آلِ عمران

(۳)

آلِ عمران

نام اس سورت میں ایک مقام پر ''آلِ عمران'' کا ذکر آیا ہے۔ اسی کو علامت کے طور پر اس کا نام قرار دے دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول اور اجزائے مضمون اِس میں چار تقریریں شامل ہیں:

پہلی تقریر آغازِ سورت سے چوتھے رکوع کی ابتدائی دو آیتوں تک ہے، اور وہ غالباً جنگِ بَدر کے بعد قریبی زمانے ہی میں نازل ہوئی ہے۔

دوسری تقریر آیت اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَۙ (اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے کام کے لیے منتخب کیا تھا) سے شروع ہوتی ہے اور چھٹے رکوع کے اختتام پر ختم ہوتی ہے۔ یہ ۹ھ میں وفدِ نجران کی آمد کے موقع پر نازل ہوئی۔

تیسری تقریر ساتویں رُکوع کے آغاز سے لے کر بارھویں رکوع کے اختتام تک چلتی ہے، اور اس کا زمانہ پہلی تقریر سے متّصل ہی معلوم ہوتا ہے۔

چوتھی تقریر تیرھویں رکوع سے ختمِ سورت تک جنگِ اُحُد کے بعد نازل ہوئی ہے۔

خطاب اور مَباحِث اِن مختلف تقریروں کو ملا کر جو چیز ایک مسلسل مضمون بناتی ہے، وہ مقصد و مُدّعا اور مرکزی مضمون کی یکسانی ہے۔ سورت کا خطاب خُصُوصیّت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے: ایک، اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ)۔ دُوسرے، وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔

پہلے گروہ کو اُسی طرز پر مزید تبلیغ کی گئی ہے جس کا سلسلہ سورۂ بَقَرہ میں شروع کیا گیا تھا۔ اُن کی اعتقادی گمراہیوں اور اَخلاقی خرابیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے انھیں بتایا گیا ہے کہ یہ رسول اور یہ قرآن اُسی دین کی طرف بُلا رہا ہے، جس کی دعوت شروع سے تمام انبیاؑ دیتے چلے آئے ہیں اور جو فطرت اللہ کے مطابق ایک ہی دینِ حق ہے۔ اس دین کے سیدھے رستے سے ہٹ کر جو راہیں تم نے اختیار کی ہیں، وہ خود اُن کتابوں کی رُو سے بھی صحیح نہیں ہیں، جن کو تم کُتُبِ آسمانی تسلیم کرتے ہو۔ لہٰذا اس صداقت کو قبول کرو جس کے صداقت ہونے سے تم خود بھی انکار نہیں کر سکتے۔

دُوسرے گروہ کو، جو اَب بہترین اُمّت ہونے کی حیثیت سے حق کا عَلَم بردار اور دُنیا کی اصلاح کا

ذمّہ دار بنایا جا چکا ہے، اُسی سلسلے میں مزید ہدایات دی گئی ہیں، جو سورۂ بَقَرہ میں شروع ہوا تھا۔ انھیں پچھلی اُمتوں کے مذہبی و اَخلاقی زوال کا عبرتناک نقشہ دکھا کر مُتنَبِّہ کیا گیا ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے سے بچیں۔ انھیں بتایا گیا ہے کہ ایک مصلح جماعت ہونے کی حیثیت سے وہ کس طرح کام کریں اور اُن اہلِ کتاب اور منافق مسلمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں، جو خدا کے راستے میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈال رہے تھے۔ انھیں اپنی اُن کمزوریوں کی اصلاح پر بھی متوجّہ کیا گیا ہے، جن کا ظہور جنگِ اُحُد کے سلسلے میں ہوا تھا۔

اس طرح یہ سورت نہ صرف آپ اپنے مختلف اجزا میں مسلسل و مربوط ہے، بلکہ سورۂ بقرہ کے ساتھ بھی اس کا ایسا قریبی تعلق نظر آتا ہے کہ یہ بالکل اس کا تتمّہ معلوم ہوتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا فطری مَقام بَقَرہ سے متّصل ہی ہے۔

شانِ نزول سورت کا تاریخی پَس منظر یہ ہے:

(۱) سورۂ بقرہ میں اِس دینِ حق پر ایمان لانے والوں کو جن آزمایشوں اور مصائب و مشکلات سے قبل از وقت مُتنَبِّہ کر دیا گیا تھا، وہ پوری شدّت کے ساتھ پیش آ چکی تھیں۔ جنگِ بَدر میں اگرچہ اہلِ ایمان کو فتح حاصل ہوئی تھی، لیکن یہ جنگ گویا بھِڑوں کے چھتّے میں پتھر مارنے کی ہم معنٰی تھی۔ اس اوّلین مسلّح مقابلے نے عرب کی اُن سب طاقتوں کو چونکا دیا تھا، جو اس نئی تحریک سے عداوت رکھتی تھیں۔ ہر طرف طوفان کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، مسلمانوں پر ایک دائمی خوف اور بے اطمینانی کی حالت طاری تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مدینے کی یہ چھوٹی سی بستی، جس نے گرد و پیش کی ساری دنیا سے لڑائی مول لے لی ہے، صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالی جائے گی۔ اِن حالات کا مدینے کی مَعاشی حالت پر بھی نہایت بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ اوّل تو ایک چھوٹے سے قصبے میں، جس کی آبادی چند سو گھروں سے زیادہ نہ تھی، یکایک مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کے آ جانے ہی سے مَعاشی توازُن بگڑ چکا تھا۔ اس پر مزید مصیبت اس حالتِ جنگ کی وجہ سے نازل ہوگئی۔

(۲) ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ جو مُعاہدے کیے تھے، ان لوگوں نے اُن معاہدات کا ذرّہ برابر پاس نہ کیا۔ جنگِ بَدر کے موقع پر ان اہلِ کتاب کی ہمدردیاں توحید و نبوت اور کتاب و آخرت کے ماننے والے مسلمانوں کے بجائے بُت پوجنے والے مشرکین کے ساتھ تھیں۔ بدر کے بعد یہ لوگ کُھلّم کُھلّا قریش اور دُوسرے قبائلِ عرب کو مسلمانوں کے خلاف جوش دِلا دِلا کر بدلہ لینے پر اُکسانے لگے۔ خصوصاً بنی نَضِیر کے سردار کَعب بن اشرف نے تو اس سلسلے میں اپنی مخالفانہ کوششوں کو اندھی عداوت، بلکہ کمینہ پن کی حد تک پہنچا دیا۔ اہلِ مدینہ کے ساتھ ان یہودیوں کے ہمسائگی اور دوستی کے جو تعلقات صدیوں سے چلے آ رہے تھے، اُن کا پاس و لحاظ بھی انھوں نے اُٹھا دیا۔ آخرکار جب اُن کی شرارتیں اور عہد شکنیاں حدِ برداشت سے گزر گئیں، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بَدر کے چند مہینے بعد

بنی قَینُقاع پر، جو اِن یہودی قبیلوں میں سب سے زیادہ شریر لوگ تھے، حملہ کر دیا اور اُنھیں اطرافِ مدینہ سے نکال باہر کیا۔ لیکن اس سے دُوسرے یہودی قبائل کی آتشِ عناد اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ انھوں نے مدینے کے منافق مسلمانوں اور حجاز کے مشرک قبیلوں کے ساتھ ساز باز کر کے اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر طرف خطرات ہی خطرات پیدا کر دیے، حتّٰی کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے متعلق ہر وقت یہ اندیشہ رہنے لگا کہ نہ معلوم کب آپؐ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے۔ صحابۂ کرامؓ اس زمانے میں بالعُموم ہتھیار بند سوتے تھے۔ شب خون کے ڈر سے راتوں کو پہرے دیے جاتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی کہیں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تو صحابۂ کرامؓ گھبرا کر آپؐ کو ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔

(۳) بدر کی شکست کے بعد قریش کے دلوں میں آپ ہی انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس پر مزید تیل یہودیوں نے چھڑکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی سال بعد مکّے سے تین ہزار کا لشکرِ جرّار مدینے پر حملہ آور ہوگیا اور اُحُد کے دامن میں وہ لڑائی پیش آئی، جو جنگِ اُحُد کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہزار آدمی مدینے سے نکلے تھے۔ مگر راستے میں سے تین سو منافق یکایک الگ ہو کر مدینے کی طرف پلٹ گئے۔ اور جو سات سو آدمی آپؐ کے ساتھ رہ گئے تھے، ان میں بھی منافقین کی ایک چھوٹی سی پارٹی شامل رہی، جس نے دَورانِ جنگ میں مسلمانوں کے درمیان فتنہ برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اپنے گھر میں اتنے کثیر التعداد مارِ آستین موجود ہیں اور وہ اس طرح باہر کے دُشمنوں کے ساتھ مل کر خود اپنے بھائی بندوں کو نقصان پہنچانے پر تُلے ہوئے ہیں۔

(۴) جنگِ اُحُد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی، اس میں اگرچہ منافقین کی تدبیروں کا ایک بڑا حصّہ تھا، لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کا حصّہ بھی کچھ کم نہ تھا، اور یہ ایک قُدرَتی بات تھی کہ ایک خاص طرزِ فکر اور نظامِ اَخلاق پر جو جماعت ابھی تازہ تازہ ہی بنی تھی، جس کی اَخلاقی تربِیَت ابھی مکمل نہ ہو سکی تھی، اور جسے اپنے عقیدہ و مسلک کی حمایت میں لڑنے کا یہ دُوسرا ہی موقع پیش آیا تھا، اس کے کام میں بعض کمزوریوں کا ظہور بھی ہوتا۔ اس لیے یہ ضرورت پیش آئی کہ جنگ کے بعد اس جنگ کی پوری سرگُزَشت پر ایک مفصّل تبصرہ کیا جائے، اور اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جو کمزوریاں مسلمانوں کے اندر پائی گئی تھیں، ان میں سے ایک ایک کی نشان دِہی کر کے اس کی اصلاح کے متعلق ہدایات دی جائیں۔ اس سلسلے میں یہ بات نظر میں رکھنے کے لائق ہے کہ اس جنگ پر قرآن کا تبصرہ اُن تبصروں سے کتنا مختلف ہے، جو دُنیوی جنرل اپنی لڑائیوں کے بعد کیا کرتے ہیں۔

---

۲۰۰ اٰیاتہا

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ

۲۰ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾

ا، ل، م۔ اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو نظامِ کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں[۱] ہے۔

اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی، جو حق لے کر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے[۲]،

---

۱ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۷۸۔

۲ – عام طور پر لوگ تورات سے مراد بائبل کے پُرانے عہد نامے کی ابتدائی پانچ کتابیں، اور انجیل سے مراد نئے عہد نامے کی چار مشہور انجیلیں لے لیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ اُلجھن پیش آتی ہے کہ کیا فی الواقع یہ کتابیں کلامِ الٰہی ہیں؟ اور کیا واقعی قرآن اُن سب باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو ان میں درج ہیں؟ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ تورات بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ اُن کے اندر مندرج ہے، اور انجیل نئے عہد نامہ کی اناجیلِ اربعہ کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے اندر پائی جاتی ہے۔

دراصل تورات سے مراد وہ احکام ہیں، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بِعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دَوران میں اُن پر نازل ہوئے۔ اُن میں سے دس احکام تو وہ تھے، جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی لوحوں پر کَندہ کر کے انھیں دیے تھے۔ باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰؑ نے لکھوا کر اس کی ۱۲ نقلیں بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلوں کو دے دی تھیں، اور ایک نقل بنی لاوِی کے حوالے کی تھی، تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کتاب کا نام "تورات" تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المَقدِس کی پہلی تباہی کے وقت تک محفوظ تھی۔ اس کی ایک کاپی جو بنی لاوی کے حوالے کی گئی تھی، پتھر کی لوحوں سمیت، عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی اور بنی اسرائیل اس کو "توریت" ہی کے نام سے جانتے تھے۔ لیکن اس سے اُن کی غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکلِ سلیمانی کی مَرمّت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (یعنی ہیکل کے سجّادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا) خِلقیاہ کو ایک جگہ توریت رکھی ہوئی مل گئی اور اس نے ایک عجوبے کی طرح اسے شاہی مُنشی کو دیا اور شاہی مُنشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا، جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہے۔

(مُلاحظہ ہو: ۲-سلاطین، باب ۲۲، آیت ۸ تا ۱۳) یہی وجہ ہے کہ جب بُختِ نَصَّر نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل سمیت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، تو بنی اسرائیل نے تورات کے وہ اصل نسخے، جو اُن کے ہاں طاقِ نِسیاں پر رکھے ہوئے تھے اور بہت تھوڑی تعداد میں تھے، ہمیشہ کے لیے گم کر دیے۔ پھر جب عَزرا کاہن (عُزَیرؑ) کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بچے کُھچے لوگ بابِل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المَقدِس تعمیر ہوا، تو عَزرا نے اپنی قوم کے چند دُوسرے بزرگوں کی مدد سے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مُرتّب کی، جو اَب بائبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے چار باب، یعنی خُروج، اَحبار، گِنتی اور اِستِثنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں، اور اس سیرت ہی میں تاریخِ نُزول کی ترتیب کے مطابق تورات کی وہ آیات بھی حسبِ موقع درج کر دی گئی ہیں، جو عَزرا اور ان کے مددگار بزرگوں کو دستیاب ہوسکیں۔ پس دراصل اب تورات اُن منتشر اجزا کا نام ہے، جو سیرتِ موسیٰ علیہ السلام کے اندر بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم انھیں صرف اِس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اِس تاریخی بیان کے دَوران میں جہاں کہیں سیرتِ موسوی کا مصنف کہتا ہے کہ خدا نے موسیٰؑ سے یہ فرمایا، یا موسیٰؑ نے کہا کہ خداوند تمھارا خدا یہ کہتا ہے، وہاں سے تورات کا ایک جُز شروع ہوتا ہے، اور جہاں پھر سیرت کی تقریر شروع ہو جاتی ہے، وہاں وہ جُز ختم ہو جاتا ہے۔ بیچ میں جہاں کہیں کوئی چیز بائبل کے مصنّف نے تفسیر وتشریح کے طور پر بڑھا دی ہے، وہاں ایک عام آدمی کے لیے یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصّہ ہے، یا شرح وتفسیر۔ تاہم جو لوگ کُتُبِ آسمانی میں بصیرت رکھتے ہیں، وہ ایک حد تک صحت کے ساتھ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان اجزا میں کہاں کہاں تفسیری وتشریحی اضافے مُلحق کر دیے گئے ہیں۔

قرآن اِنھی منتشر اجزا کو ''تورات'' کہتا ہے، اور انھی کی وہ تصدیق کرتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان اجزا کو جمع کر کے جب قرآن سے ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو بجز اس کے کہ بعض بعض مَقامات پر جُزوی احکام میں اختلاف ہے، اُصولی تعلیمات میں دونوں کتابوں کے درمیان یک سرِ مُو فرق نہیں پایا جاتا۔ آج بھی ایک ناظر صریح طور پر محسوس کر سکتا ہے کہ یہ دونوں چشمے ایک ہی منبع سے نکلے ہوئے ہیں۔

اسی طرح انجیل دراصل نام ہے اُن الہامی خطبات اور اقوال کا، جو مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ڈھائی تین برس میں بحیثیتِ نبی ارشاد فرمائے۔ وہ کلماتِ طیّبات آپ کی زندگی میں لکھے اور مرتّب کیے گئے تھے یا نہیں، اس کے متعلق اب ہمارے پاس کوئی ذریعۂ معلومات نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں نے انھیں نوٹ کر لیا ہو، اور ممکن ہے کہ سننے والے معتقدین نے ان کو زبانی یاد کر رکھا ہو۔ بہرحال ایک مدّت کے بعد جب آنجناب کی سیرتِ پاک پر مختلف رسالے لکھے گئے، تو ان میں تاریخی بیان کے ساتھ ساتھ وہ خطبات اور ارشادات بھی جگہ جگہ حسبِ موقع درج کر دیے گئے، جو ان رسالوں کے مصنّفین تک زبانی روایات اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے سے پہنچے تھے۔ آج مَتّی، مَرقُس، لُوقا اور یُوحَنّا کی جن کتابوں کو اناجیل کہا جاتا ہے، دراصل انجیل وہ نہیں ہیں، بلکہ انجیل حضرت مسیحؑ کے وہ ارشادات ہیں، جو ان کے اندر درج ہیں۔ ہمارے پاس ان کو پہچاننے اور مصنّفینِ سیرت کے اپنے کلام سے ان کو مُمیّز کرنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جہاں سیرت کا مصنف کہتا ہے کہ مسیحؑ نے یہ فرمایا یا لوگوں کو یہ تعلیم دی، صرف وہی مَقامات اصل انجیل کے اجزا ہیں۔ قرآن انھی اجزا کے مجموعے کو

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا
بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴
اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ۝۵ هُوَ
الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۶ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ

اور اس نے وہ کسوٹی اتاری ہے (جو حق اور باطل کا فرق دکھانے والی ہے)۔ اب جو لوگ اللہ کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں، ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی۔ اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور بُرائی کا بدلہ دینے والا ہے۔

زمین اور آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں[۳]۔ وہی تو ہے جو تمھاری ماؤں کے پیٹ میں تمھاری صورتیں، جیسی چاہتا ہے، بناتا ہے[۴]۔ اس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ وہی خدا ہے، جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔

''انجیل'' کہتا ہے اور انھی کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ آج کوئی شخص ان بکھرے ہوئے اجزا کو مرتّب کر کے قرآن سے ان کا مقابلہ کر کے دیکھے، تو وہ دونوں میں بہت ہی کم فرق پائے گا، اور جو تھوڑا بہت فرق محسوس ہوگا، وہ بھی غیر متعصّبانہ غور و تأمّل کے بعد بآسانی حل کیا جا سکے گا۔

۳- یعنی وہ کائنات کی تمام حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔ لہٰذا جو کتاب اس نے نازل کی ہو، وہ سراسر حق ہی ہونی چاہیے۔ بلکہ خالص حق صرف اسی کتاب میں انسان کو میسر آ سکتا ہے، جو اُس علیم و دانا کی طرف سے نازل ہو۔

۴- اس میں دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے: ایک، یہ کہ تمھاری فطرت کو جیسا وہ جانتا ہے، نہ کوئی دوسرا جان سکتا ہے، نہ تم خود جان سکتے ہو۔ لہٰذا اس کی رہنمائی پر اعتماد کیے بغیر تمھارے لیے کوئی چارہ نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ جس نے تمھارے اِستِقرارِ حمل سے لے کر بعد کے مراحل تک ہر موقع پر تمھاری چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں تک کو پورا کرنے کا اہتمام کیا، کس طرح ممکن تھا کہ وہ دُنیا کی زندگی میں تمھاری ہدایت و رہنمائی کا انتظام نہ کرتا، حالانکہ تم سب سے بڑھ کر اگر کسی چیز کے محتاج ہو، تو وہ یہی ہے۔

مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ

اِس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بُنیاد ہیں[5] اور دوسری متشابہات۔[6]

۵- مُحکَم پکّی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں۔ ''آیاتِ مُحکَمات'' سے مراد وہ آیات ہیں، جن کی زبان بالکل صاف ہے، جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجایش نہیں ہے، جن کے الفاظ معنٰی و مدّعا پر صاف اور صریح دلالت کرتے ہیں، جنھیں تاویلات کا تختۂ مشق بنانے کا موقع مشکل ہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔ یہ آیات ''کتاب کی اصل بنیاد ہیں''، یعنی قرآن جس غرض کے لیے نازل ہوا ہے، اُس غرض کو یہی آیتیں پورا کرتی ہیں۔ اُنھی میں اسلام کی طرف دُنیا کو دعوت دی گئی ہے، اُنھی میں عبرت اور نصیحت کی باتیں فرمائی گئی ہیں، اُنھی میں گمراہیوں کی تردید اور راہِ راست کی توضیح کی گئی ہے۔ اُنھی میں دین کے بنیادی اُصول بیان کیے گئے ہیں، اُنھی میں عقائد، عبادات، اَخلاق، فرائض اور امر و نہی کے احکام ارشاد ہوئے ہیں۔ پس جو شخص طالبِ حق ہو اور یہ جاننے کے لیے قرآن کی طرف رُجوع کرنا چاہتا ہو کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ پر نہ چلے، اس کی پیاس بُجھانے کے لیے آیاتِ مُحکَمات ہی اصل مَرجَع ہیں، اور فطرتاً اُنھی پر اس کی توجہ مرکوز ہوگی اور وہ زیادہ تر اُنھی سے فائدہ اُٹھانے میں مشغول رہے گا۔

۶ - متشابہات، یعنی وہ آیات جن کے مفہُوم میں اشتباہ کی گنجایش ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کے لیے زندگی کا کوئی راستہ تجویز نہیں کیا جا سکتا، جب تک کائنات کی حقیقت، اور اس کے آغاز و انجام، اور اس میں انسان کی حیثیت، اور ایسے ہی دُوسرے بنیادی اُمور کے متعلق کم سے کم ضروری معلومات انسان کو نہ دی جائیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو چیزیں انسان کے حواس سے ماورا ہیں، جو انسانی علم کی گرفت میں نہ کبھی آئی ہیں، نہ آ سکتی ہیں، جن کو اس نے نہ کبھی دیکھا، نہ چُھوا، نہ چکھا، اُن کے لیے انسانی زبان میں نہ ایسے الفاظ مل سکتے ہیں جو اُنھی کے لیے وضع کیے گئے ہوں اور نہ ایسے معروف اسالیبِ بیان مل سکتے ہیں، جن سے ہر سامع کے ذہن میں ان کی صحیح تصویر کھنچ جائے۔ لامحالہ یہ ناگزیر ہے کہ اس نوعیت کے مضامین کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اور اسالیبِ بیان وہ استعمال کیے جائیں، جو اصل حقیقت سے قریب تر مُشابہَت رکھنے والی محسوس چیزوں کے لیے انسانی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مابعد الطبیعی مسائل کے بیان میں قرآن کے اندر ایسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے، اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں، جن میں یہ زبان استعمال ہوئی ہے۔

لیکن اِس زبان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ آدمی کو حقیقت کے قریب تک پہنچا دے، یا اس کا ایک دُھندلا سا تصوّر پیدا کر دے۔ ایسی آیات کے مفہُوم کو متعین کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جائے گی، اتنے ہی زیادہ اشتباہات و احتمالات سے سابقہ پیش آئے گا، حتّٰی کہ انسان حقیقت سے قریب تر ہونے کے بجائے اور زیادہ دُور ہوتا چلا جائے گا۔ پس جو لوگ طالبِ حق ہیں اور ذوقِ فضول نہیں رکھتے، وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اُس

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ
ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ ۚ وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا
اللّٰهُ ۘؔ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ
عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۷﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغۡ
قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدَیۡتَنَا وَهَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَةً ۚ
اِنَّکَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ﴿۸﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوۡمٍ

(حاشیہ: وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم — وقف منزل — وقف لازم)

جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اُن کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اِس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ”ہمارا اُن پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں۷۔“ اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانش مند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اللہ سے دُعا کرتے رہتے ہیں کہ ”پروردگار! جب تُو ہمیں سیدھے رستے پر لگا چکا ہے، تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مُبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاضِ حقیقی ہے۔ پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے، جس کے

دُھندلے تصوّر پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کے لیے کافی ہے اور اپنی تمام تر توجہ مُحکمات پر صَرف کرتے ہیں، مگر جو لوگ بُوالفضول یا فتنہ جُو ہوتے ہیں، اُن کا تمام تر مشغلہ متشابہات ہی کی بحث و تنقیب ہوتا ہے۔

۷ – یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب وہ لوگ متشابہات کا صحیح مفہُوم جانتے ہی نہیں، تو ان پر ایمان کیسے لے آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معقول آدمی کو قرآن کے کلام اللہ ہونے کا یقین محکمات کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے، نہ کہ متشابہات کی تاویلوں سے۔ اور جب آیاتِ محکمات میں غور و فکر کرنے سے اس کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب واقعی اللہ ہی کی کتاب ہے، تو پھر متشابہات اس کے دل میں کوئی خَلجان پیدا نہیں کرتے۔ جہاں تک ان کا سیدھا سادھا مفہُوم اس کی سمجھ میں آجاتا ہے، اس کو وہ لے لیتا ہے، اور جہاں پیچیدگی رونما ہوتی ہے، وہاں کھوج لگانے اور مُوشگافیاں کرنے کے بجائے وہ اللہ کے کلام پر مُجمل ایمان لا کر اپنی توجہ کام کی باتوں کی طرف پھیر دیتا ہے۔

ع

لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ ۹ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔا ۭ
وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ ۱۰ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ۱۱ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ
اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ ۱۲ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ
الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَھُمْ

آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ تُو ہرگز اپنے وعدے سے ٹلنے والا نہیں ہے۔“ ع

جن لوگوں نے کفر کا رویّہ اختیار کیا ہے[8]، انھیں اللہ کے مقابلے میں نہ اُن کا مال کچھ کام دے گا، نہ اولاد۔ وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ اُن کا انجام ویسا ہی ہوگا، جیسا فرعون کے ساتھیوں اور اُن سے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ اُنھوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ پس اے محمدؐ! جن لوگوں نے تمھاری دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، اُن سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت، جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور جہنم بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ تمھارے لیے اُن دو گروہوں میں ایک نشانِ عبرت تھا، جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دُوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشمِ سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ

۸- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورہ بقرہ، حاشیہ ۱۶۱۔

مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾ زُيِّنَ لِلنَّاسِ
حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ
الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ

مومن گروہ سے دو چند ہے[9]۔ مگر (نتیجے نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے، مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے[10]۔

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس ـــــ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے،

۹- اگرچہ حقیقی فرق سہ چند تھا، لیکن سرسری نگاہ سے دیکھنے والا بھی یہ محسوس کیے بغیر تو نہیں رہ سکتا تھا کہ کفار کا لشکر مسلمانوں سے دوگُنا ہے۔

۱۰- جنگِ بَدر کا واقعہ اُس وقت قریبی زمانے ہی میں پیش آچکا تھا، اس لیے اس کے مُشاہدات و نتائج کی طرف اشارہ کر کے لوگوں کو عبرت دلائی گئی ہے۔ اس جنگ میں تین باتیں نہایت سبق آموز تھیں:

ایک یہ کہ مسلمان اور کفار جس شان سے ایک دوسرے کے بالمقابل آئے تھے، اس سے دونوں کا اَخلاقی فرق صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک طرف کافروں کے لشکر میں شرابوں کے دَور چل رہے تھے، ناچنے اور گانے والی لونڈیاں ساتھ آئی تھیں اور خوب دادِ عیش دی جا رہی تھی۔ دُوسری طرف مسلمانوں کے لشکر میں پرہیز گاری تھی، خدا ترسی تھی، انتہا درجے کا اخلاقی اِنْضِباط تھا، نمازیں تھیں اور روزے تھے، بات بات پر خدا کا نام تھا اور خدا ہی کے آگے دعائیں اور التجائیں کی جا رہی تھیں۔ دونوں لشکروں کو دیکھ کر ہر شخص بآسانی معلوم کر سکتا تھا کہ دونوں میں سے کون اللہ کی راہ میں لڑ رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ مسلمان اپنی قلّتِ تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود کفار کی کثیر التعداد اور بہتر اسلحہ رکھنے والی فوج کے مقابلے میں جس طرح کامیاب ہوئے، اس سے صاف معلوم ہو گیا تھا کہ ان کو اللہ کی تائید حاصل تھی۔

تیسرے یہ کہ اللہ کی غالب طاقت سے غافل ہو کر جو لوگ اپنے سروسامان اور اپنے حامیوں کی کثرت پر پُھولے ہوئے تھے، ان کے لیے یہ واقعہ ایک تازیانہ تھا کہ اللہ کس طرح چند مفلس و قلّاش غریب الوطن مہاجروں اور مدینے کے کاشتکاروں کی ایک مُٹھی بھر جماعت کے ذریعے سے قریش جیسے قبیلے کو شکست دلوا سکتا ہے، جو تمام عرب کا سرتاج تھا۔

وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ
عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ
لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ
اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ ۚ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ
اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ ۚ اَلصّٰبِرِيْنَ

مویشی اور زرعی زمینیں ـــــ بڑی خوش آیند بنا دی گئی ہیں، مگر یہ سب دُنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے، وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمھیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں، اُن کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انھیں ہیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں[۱۱] گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رَوِیّے پر گہری نظر رکھتا ہے[۱۲]۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ''مالک! ہم ایمان لائے، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتشِ دوزخ سے بچالے۔'' یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں[۱۳]،

۱۱ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بَقرہ، حاشیہ ۲۷۔

۱۲ – یعنی اللہ غلط بخش نہیں ہے اور نہ سرسری اور سطحی طور پر فیصلہ کرنے والا ہے۔ وہ بندوں کے اعمال و افعال اور ان کی نیتوں اور ارادوں کو خوب جانتا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ بندوں میں سے کون اُس کے انعام کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے۔

۱۳ – یعنی راہِ حق میں پوری استقامت دکھانے والے ہیں۔ کسی نقصان یا مصیبت سے ہمت نہیں ہارتے، کسی ناکامی سے دل شکستہ نہیں ہوتے، کسی لالچ سے پھسل نہیں جاتے، اور ایسی حالت میں بھی حق کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے رہتے ہیں، جبکہ بظاہر اُس کی کامیابی کا کوئی امکان نظر نہ آتا ہو۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۶۰)

وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ
بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۸﴾ النصف
اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۫ قف وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ

راست باز ہیں، فرماں بردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے[۱۴]، اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہلِ علم نے بھی دی ہے[۱۵]۔ وہ انصاف پہ قائم ہے۔ اُس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام[۱۶] ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے اُن لوگوں نے اختیار کیے، جنھیں کتاب

۱۴ - یعنی اللہ جو کائنات کی تمام حقیقتوں کا براہِ راست علم رکھتا ہے، جو تمام موجودات کو بے حجاب دیکھ رہا ہے، جس کی نگاہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، یہ اُس کی شہادت ہے ــــــ اور اس سے بڑھ کر معتبر عینی شہادت اور کس کی ہوگی ــــــ کہ پورے عالَم وجود میں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے، جو خدائی کی صفات سے متّصِف ہو، خدائی کے اقتدار کی مالک ہو، اور خدائی کے حُقوق کی مستحق ہو۔

۱۵ - اللہ کے بعد سب سے زیادہ معتبر شہادت فرشتوں کی ہے، کیونکہ وہ سلطنتِ کائنات کے انتظامی اہلِ کار ہیں اور وہ براہِ راست اپنے ذاتی علم کی بنا پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سلطنت میں اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا اور اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے، جس کی طرف زمین و آسمان کے انتظامی معاملات میں وہ رُجوع کرتے ہوں۔ اس کے بعد مخلوقات میں سے جن لوگوں کو بھی حقائق کا تھوڑا یا بہت علم حاصل ہوا ہے، ان سب کی ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ مُتّفقہ شہادت رہی ہے کہ ایک ہی خدا اس پوری کائنات کا مالک و مُدبّر ہے۔

۱۶ - یعنی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظامِ زندگی اور ایک ہی طریقۂ حیات صحیح و دُرست ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کو اپنا مالک و معبُود تسلیم کرے اور اس کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو بالکل سُپرد کر دے اور اس کی بندگی بجالانے کا طریقہ خود نہ ایجاد کرے، بلکہ اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے جو ہدایت

أُوتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ
وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ
حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ
لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا

دی گئی تھی، اُن کے اِس طرزِ عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے علم آ جانے کے بعد آپس میں ایک دُوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا[17] اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے، اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں، تو ان سے کہو: ”میں نے اور میرے پیرووں نے تو اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔“ پھر اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب دونوں سے پوچھو: ”کیا تم نے بھی اس کی اطاعت و بندگی قبول کی؟“[18] اگر کی

بھیجی ہے، ہر کمی و بیشی کے بغیر صرف اسی کی پیروی کرے۔ اسی طرزِ فکر و عمل کا نام ”اسلام“ ہے، اور یہ بات سراسر بجا ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اپنی مخلوق اور رعیّت کے لیے اِس اسلام کے سوا کسی دُوسرے طرزِ عمل کو جائز تسلیم نہ کرے۔ آدمی اپنی حماقت سے اپنے آپ کو دہریّت سے لے کر شرک و بُت پرستی تک ہر نظریے اور ہر مسلک کی پیروی کا جائز حق دار سمجھ سکتا ہے، مگر فرماں روائے کائنات کی نگاہ میں تو یہ نری بغاوت ہے۔

۱۷ – مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو پیغمبر بھی دُنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانے میں آیا ہے، اس کا دین اسلام ہی تھا، اور جو کتاب بھی دُنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی ہے، اس نے اسلام ہی کی تعلیم دی ہے۔ اس اصل دین کو مسخ کر کے اور اس میں کمی و بیشی کر کے جو بہت سے مذاہب نوعِ انسانی میں رائج کیے گئے، ان کی پیدائش کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں نے اپنی جائز حد سے بڑھ کر حُقوق، فائدے اور امتیازات حاصل کرنے چاہے اور اپنی خواہشات کے مطابق اصل دین کے عقائد، اُصول اور احکام میں ردّو بدل کر ڈالا۔

۱۸ – دُوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ ”مَیں اور میرے پَیرو تو اس ٹھیٹ اسلام کے قائل ہو چکے ہیں جو خدا کا اصل دین ہے۔ اب تم بتاؤ کہ کیا تم اپنے اور اپنے اسلاف کے بڑھائے ہوئے حاشیوں کو چھوڑ کر اس اصلی و حقیقی دین کی طرف آتے ہو۔“

فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰ ع اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۲۱ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ
نّٰصِرِيْنَ ۝۲۲ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ

تو وہ راہِ راست پا گئے، اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمّہ داری تھی۔ آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔ ع

جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں، جو خلقِ خدا میں سے عدل و راستی کا حکم دینے کے لیے اُٹھیں، ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سُنا دو۔[19] یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دُنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو گئے،[20] اور ان کا مددگار کوئی نہیں ہے۔[21]

تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصّہ ملا ہے، اُن کا حال کیا ہے؟

---

۱۹ – یہ طنزیہ اندازِ بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جن کرتوتوں پر وہ آج بہت خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت خوب کام کر رہے ہیں، انھیں بتا دو کہ تمھارے ان اعمال کا انجام یہ ہے۔

۲۰ – یعنی انھوں نے اپنی قوتیں اور کوششیں ایسی راہ میں صَرف کی ہیں جس کا نتیجہ دُنیا میں بھی خراب ہے اور آخرت میں بھی خراب۔

۲۱ – یعنی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو ان کی اس غلط سعی و عمل کو پُھل بنا سکے، یا کم از کم بدانجامی ہی سے بچا سکے۔ جن جن قوتوں پر وہ بھروسا رکھتے ہیں کہ وہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ ان کے کام آئیں گی، ان میں سے

يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا
النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا
يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ
وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾

اُنھیں جب کتابِ الٰہی کی طرف بُلایا جاتا ہے تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے[۲۲]، تو ان میں سے ایک فریق اس سے پہلو تہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے منہ پھیر جاتا ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں: "آتشِ دوزخ تو ہمیں مَس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز[۲۳]" اُن کے خود ساختہ عقیدوں نے اُن کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔ مگر کیا بنے گی اُن پر جب ہم انھیں اُس روز جمع کریں گے جس کا آنا یقینی ہے؟ اس روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دے دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔

فی الواقع کوئی بھی ان کی مددگار ثابت نہ ہوگی۔

۲۲ – یعنی ان سے کہا جاتا ہے کہ خدائی کتاب کو آخری سند مان لو، اس کے فیصلے کے آگے سر جھکا دو، اور جو کچھ اس کی رُو سے حق ثابت ہو، اسے حق، اور جو اس کی رُو سے باطل ثابت ہو، اسے باطل تسلیم کر لو۔ واضح رہے کہ اس مقام پر خدا کی کتاب سے مراد تورات و انجیل ہے اور "کتاب کے علم میں سے کچھ حصّہ پانے والوں" سے مراد یہود و نصاریٰ کے علما ہیں۔

۲۳ – یعنی یہ لوگ اپنے آپ کو خدا کا چہیتا سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ ہم خواہ کچھ کریں، بہرحال جنت ہماری ہے۔ ہم اہلِ ایمان ہیں، ہم فُلاں کی اولاد اور فلاں کی اُمت اور فلاں کے مرید اور فلاں کے دامن گرفتہ ہیں، بھلا دوزخ کی کیا مجال کہ ہمیں چھو جائے۔ اور بالفرض اگر ہم دوزخ میں ڈالے بھی گئے تو بس چند روز وہاں رکھے جائیں گے تاکہ گناہوں کی جو آلایش لگ گئی ہے وہ صاف ہو جائے، پھر سیدھے جنّت میں پہنچا دیے جائیں گے۔ اسی

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ
مِمَّنْ تَشَآءُ٘ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُؕ بِیَدِكَ
الْخَیْرُؕ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ
وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ٘ وَ تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ
الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ٘ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾ لَا
یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ

کہو! خدایا! مُلک کے مالک! تُو جسے چاہے، حکومت دے اور جس سے چاہے، چھین لے۔ جسے چاہے، عزّت بخشے اور جس کو چاہے، ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔ جان دار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جان دار کو۔ اور جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے۔[۲۴]

مومنین اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔

قِسم کے خیالات نے ان کو اتنا جَری و بے باک بنا دیا ہے کہ وہ سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کر جاتے ہیں، بدترین گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، کُھلّم کُھلّا حق سے انحراف کرتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف ان کے دل میں نہیں آتا۔

۲۴ – جب انسان ایک طرف کافروں اور نافرمانوں کے کرتُوت دیکھتا ہے اور پھر یہ دیکھتا ہے کہ وہ دنیا میں کس طرح پَھل پُھول رہے ہیں، دوسری طرف اہلِ ایمان کی اطاعت شعاریاں دیکھتا ہے اور پھر ان کو اُس فقر و فاقہ اور اُن مصائب و آلام کا شکار دیکھتا ہے، جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابۂ کِرامؓ ۳ھ اور اس کے لگ بھگ زمانے میں مُبتلا تھے، تو قدرتی طور پر اس کے دل میں ایک عجیب حسرت آمیز اِستِفہام گردش کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اسی اِستِفہام کا جواب دیا ہے اور ایسے لطیف پیرایے میں دیا ہے کہ اس سے زیادہ لطافت کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَلَيۡسَ مِنَ اللّٰهِ فِىۡ شَىۡءٍ اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا
مِنۡهُمۡ تُقٰٮةً ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفۡسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ
الۡمَصِيۡرُ ﴿۲۸﴾ قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِىۡ صُدُوۡرِكُمۡ اَوۡ تُبۡدُوۡهُ يَعۡلَمۡهُ
اللّٰهُ ؕ وَيَعۡلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۹﴾ يَوۡمَ تَجِدُ كُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ مِنۡ خَيۡرٍ

جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ۔[25] مگر اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمھیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔[26] اے نبیؐ! لوگوں کو خبردار کر دو کہ تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے، اُسے خواہ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ بہرحال اسے جانتا ہے، زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اُس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ دن آنے والا ہے، جب ہر نفس اپنے کیے کا پھل حاضر

۲۵ – یعنی اگر کوئی مومن کسی دشمنِ اسلام جماعت کے چنگل میں پھنس گیا ہو اور اسے ان کے ظلم و ستم کا خوف ہو، تو اس کو اجازت ہے کہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے کہ گویا انھی میں کا ایک آدمی ہے۔ یا اگر اس کا مسلمان ہونا ظاہر ہو گیا ہو تو اپنی جان بچانے کے لیے وہ کفار کے ساتھ دوستانہ رَوِیّے کا اظہار کر سکتا ہے، حتّٰی کہ شدید خوف کی حالت میں جو شخص برداشت کی طاقت نہ رکھتا ہو، اس کو کلمۂ کفر تک کہہ جانے کی رخصت ہے۔

۲۶ – یعنی کہیں انسانوں کا خوف تم پر اتنا نہ چھا جائے کہ خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔ انسان حد سے حد تمھاری دُنیا بگاڑ سکتے ہیں، مگر خدا تمھیں ہمیشگی کا عذاب دے سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے بچاؤ کے لیے اگر بدرجۂ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تَقِیَّہ کرنا پڑے، تو وہ بس اس حد تک ہونا چاہیے کہ اسلام کے مشن اور اسلامی جماعت کے مفاد اور کسی مسلمان کی جان و مال کو نقصان پہنچائے بغیر تم اپنی جان و مال کا تحفظ کر لو۔ لیکن خبردار! کفر اور کفار کی کوئی ایسی خدمت تمھارے ہاتھوں انجام نہ ہونے پائے جس سے اسلام کے مقابلے میں کفر کو فروغ حاصل ہونے اور مسلمانوں پر کفار کے غالب آ جانے کا امکان ہو۔ خوب سمجھ لو کہ اگر اپنے آپ کو بچانے کے لیے تم نے اللہ کے دین کو، یا اہلِ ایمان کی جماعت کو، یا کسی ایک فردِ مومن کو بھی نقصان پہنچایا، یا خدا کے باغیوں کی کوئی حقیقی خدمت انجام دی، تو اللہ کے محاسبے سے ہرگز نہ بچ سکو گے۔ جانا تم کو بہرحال اسی کے پاس ہے۔

مُّحْضَرًا ۚۛ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَ بَیْنَهٗۤ معانقة
اَمَدًۢا بَعِیْدًا ؕ وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ
بِالْعِبَادِ ۠﴿۳۰﴾ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ
وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِیْعُوا
اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

پائے گا خواہ اُس نے بھلائی کی ہو یا بُرائی۔ اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے بہت دُور ہوتا! اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور وہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے۔[۲۷] ع

اے نبیؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ ”اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبّت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔“ اُن سے کہو کہ ”اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرلو“ پھر اگر وہ تمھاری یہ دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبّت کرے، جو اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔[۲۸]

۲۷ – یعنی یہ اس کی انتہائی خیر خواہی ہے کہ وہ تمھیں قبل از وقت ایسے اعمال پر مُتنبّہ کر رہا ہے جو تمھارے انجام کی خرابی کے موجب ہو سکتے ہیں۔

۲۸ – یہاں پہلی تقریر ختم ہوتی ہے۔ اس کے مضمون، خُصوصاً جنگِ بَدر کی طرف جو اشارہ اس میں کیا گیا ہے، اس کے انداز پر غور کرنے سے غالب قیاس یہی ہوتا ہے کہ اس تقریر کے نُزول کا زمانہ جنگِ بَدر کے بعد اور جنگِ اُحُد سے پہلے کا ہے، یعنی ۳ ہجری۔ محمد بن اسحاق کی رِوایت سے عُموماً لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اس سورت کی ابتدائی ۸۰ آیتیں وفدِ نَجران کی آمد کے موقع پر ۹ ہجری میں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن اوّل تو اس تمہیدی تقریر کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ اس سے بہت پہلے نازل ہوئی ہوگی، دُوسرے مُقاتل بن سلیمان کی روایت میں تصریح ہے کہ وفدِ نَجران کی آمد پر صرف وہ آیات نازل ہوئی ہیں جو حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہما السّلام کے بیان پر مشتمل ہیں اور جن کی

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا

اللہ[۲۹] نے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران[۳۰] کو تمام دُنیا والوں پر ترجیح دے کر (اپنی رسالت کے لیے) منتخب کیا تھا۔ یہ ایک سلسلے کے لوگ تھے، جو ایک دُوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[۳۱]۔ (وہ اُس وقت سُن رہا تھا) جب عمران کی عورت[۳۲] کہہ رہی تھی کہ "میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر

تعداد ۳۰ یا اس سے کچھ زائد ہے۔

۲۹ – یہاں سے دوسرا خطبہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے نزول کا زمانہ ۹ ہجری ہے، جب کہ نَجْران کی عیسائی جُمہوریت کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نَجران کا علاقہ حجاز اور یمن کے درمیان ہے۔ اُس وقت اس علاقے میں ۷۳ بستیاں شامل تھیں، اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار قابلِ جنگ مرد اس میں سے نکل سکتے تھے۔ آبادی تمام تر عیسائی تھی اور تین سرداروں کے زیرِ حکم تھی۔ ایک عاقب کہلاتا تھا، جس کی حیثیت امیرِ قوم کی تھی۔ دوسرا سیّد کہلاتا تھا، جو ان کے تمدّنی و سیاسی اُمور کی نگرانی کرتا تھا۔ اور تیسرا اُسْقُف (بِشَپ) تھا، جس سے مذہبی پیشوائی متعلق تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ فتح کیا اور تمام اہلِ عرب کو یقین ہو گیا کہ ملک کا مستقبل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے، تو عرب کے مختلف گوشوں سے آپؐ کے پاس وفد آنے شروع ہو گئے۔ اِسی سلسلے میں نَجران کے تینوں سردار بھی ۶۰ آدمیوں کا ایک وفد لے کر مدینہ پہنچے۔ جنگ کے لیے بہرحال وہ تیار نہ تھے۔ اب سوال صرف یہ تھا کہ آیا وہ اسلام قبول کرتے ہیں یا ذِمّی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خطبہ نازل کیا، تاکہ اس کے ذریعے سے وفدِ نَجران کو اسلام کی طرف دعوت دی جائے۔

۳۰ – عمران حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کے والد کا نام تھا، جسے بائبل میں "عَمرام" لکھا ہے۔

۳۱ – مسیحیوں کی گمراہی کا تمام تر سبب یہ ہے کہ وہ مسیحؑ کو بندہ اور رسول ماننے کے بجائے اللہ کا بیٹا اور اُلوہیّت میں اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اگر ان کی یہ بنیادی غَلَطی رفع ہو جائے، تو اسلامِ صحیح وخالص کی طرف ان کا پلٹنا بہت آسان ہو جائے۔ اسی لیے اس خطبے کی تمہید یوں اُٹھائی گئی ہے کہ آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کے سب پیغمبر انسان تھے، ایک کی نسل سے دُوسرا پیدا ہوتا چلا آیا، ان میں سے کوئی بھی خدا نہ تھا، ان کی خُصوصیت

فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾
فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ
وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا
رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ؕ

کرتی ہوں، وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا۔ میری اس پیش کش کو قبول فرما۔ تو سُننے اور جاننے والا ہے۔"[۳۳] پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا: "مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے ــــ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا، اللہ کو اس کی خبر تھی ــــ اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔[۳۴] خیر، میں نے اس کا نام مریمؑ رکھ دیا ہے اور میں اسے اور اس کی آیندہ نسل کو شیطانِ مردُود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔" آخرکار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول فرمالیا، اُسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اُٹھایا۔ اور زکریّا کو اس کا سرپرست بنا دیا۔

بس یہ تھی کہ خدا نے اپنے دین کی تبلیغ اور دُنیا کی اصلاح کے لیے ان کو منتخب فرمایا تھا۔

۳۲ - اگر عمران کی عورت سے مراد "عمران کی بیوی" لی جائے، تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ یہ وہ عمران نہیں ہیں جن کا ذکر اُوپر ہوا ہے، بلکہ یہ حضرت مریمؑ کے والد تھے، جن کا نام شاید عمران ہوگا۔ (مسیحی رِوایات میں حضرت مریمؑ کے والد کا نام یوآخیم Ioachim لکھا ہے) اور اگر عمران کی عورت سے مراد آلِ عمران کی عورت لی جائے، تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ اس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعۂ معلومات نہیں ہے جس سے ہم قطعی طور پر ان دونوں معنوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکیں، کیونکہ تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد کون تھے اور ان کی والدہ کس قبیلے کی تھیں۔ البتہ اگر یہ رِوایت صحیح مانی جائے کہ حضرت یحیٰیؑ کی والدہ اور حضرت مریمؑ کی والدہ آپس میں رشتے کی بہنیں تھیں تو پھر "عمران کی عورت" کے معنی قبیلۂ عمران کی عورت ہی دُرست ہوں گے، کیونکہ انجیلِ لُوقا میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے کہ حضرت یحیٰیؑ کی والدہ حضرت ہارُونؑ کی اولاد سے تھیں۔ (لوقا ۱:۵)

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ
يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ
مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ
رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

زکریّا[۳۵] جب کبھی اس کے پاس محراب[۳۶] میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پُوچھتا: مریمؑ! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی: اللہ کے پاس سے آیا ہے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔ یہ حال دیکھ کر زکریّا نے اپنے رب کو پکارا: ''پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر۔ تُو ہی دُعا سننے والا ہے[۳۷]۔

۳۳– یعنی تُو اپنے بندوں کی دُعائیں سنتا ہے اور ان کی نیتوں کے حال سے واقف ہے۔

۳۴– یعنی لڑکا اُن بہت سی فطری کمزوریوں اور تمدّنی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے، جو لڑکی کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں، لہٰذا اگر لڑکا ہوتا تو وہ مقصد زیادہ اچھی طرح حاصل ہو سکتا تھا جس کے لیے میں اپنے بچے کو تیری راہ میں نذر کرنا چاہتی تھی۔

۳۵– اب اس وقت کا ذکر شروع ہوتا ہے جب حضرت مریمؑ سِنِّ رُشد کو پہنچ گئیں اور بیت المقدس کی عبادت گاہ (ہیکل) میں داخل کر دی گئیں اور ذکرِ الٰہی میں شب و روز مشغول رہنے لگیں۔ حضرت زَکَریّاؑ، جن کی تَربیَت میں وہ دی گئی تھیں، غالبًا رشتے میں ان کے خالو تھے اور ہیکل کے مجاوروں میں سے تھے۔ یہ وہ زکریاہ نبی نہیں ہیں جن کے قتل کا ذکر بائبل کے پُرانے عہد نامے میں آیا ہے۔

۳۶– لفظِ محراب سے لوگوں کا ذہن بالعُموم اس محراب کی طرف چلا جاتا ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں محراب سے یہ چیز مراد نہیں ہے۔ صوامع اور کنیسوں میں اصل عبادت گاہ کی عمارت سے متّصل سطحِ زمین سے کافی بلندی پر جو کمرے بنائے جاتے ہیں، جن میں عبادت گاہ کے خدّام اور معتکف لوگ رہا کرتے ہیں، انھیں محراب کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کے کمروں میں سے ایک میں حضرت مریمؑ معتکف رہتی تھیں۔

۳۷– حضرت زَکَریّاؑ اس وقت تک بے اولاد تھے۔ اس نوجوان صالحہ لڑکی کو دیکھ کر فطرتًا ان کے دل میں یہ تمنّا پیدا ہوئی کہ کاش! اللہ انھیں بھی ایسی ہی نیک اولاد عطا کرے، اور یہ دیکھ کر کہ اللہ کس طرح اپنی قدرت

فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ وَهُوَ قَآٮِٕمٌ يُّصَلِّىۡ فِى الۡمِحۡرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ
يُبَشِّرُكَ بِيَحۡيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوۡرًا
وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ غُلٰمٌ وَّقَدۡ
بَلَغَنِىَ الۡكِبَرُ وَامۡرَاَتِىۡ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفۡعَلُ مَا
يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّىۡۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ

جواب میں[۳۸] فرشتوں نے آواز دی، جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ "اللہ تجھے یحییٰؑ کی خوش خبری دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان[۳۹] کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہو گی۔ کمال درجے کا ضابط ہو گا۔ نبوّت سے سرفراز ہو گا اور صالحین میں شمار کیا جائے گا۔ زکریّاؑ نے کہا: "پروردگار! بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہو گا، میں تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔" جواب ملا: "ایسا ہی[۴۰] ہو گا، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" عرض کیا: "مالک! پھر کوئی نشانی میرے لیے مقرر فرما دے[۴۱]۔" کہا: "نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارے

اس گوشہ نشین لڑکی کو رزق پہنچا رہا ہے، انھیں یہ اُمّید ہوئی کہ اللہ چاہے تو اس بڑھاپے میں بھی ان کو اولاد دے سکتا ہے۔

۳۸– بائبل میں ان کا نام "یُوحنّا بپتسمہ دینے والا" (John the Baptist) لکھا ہے۔ ان کے حالات کے لیے مُلاحَظہ ہو: متّی باب ۳ و ۱۱ و ۱۴۔ مَرقُس باب ۱ و ۶۔ لُوقا باب ۱ و ۳۔

۳۹– اللہ کے "فرمان" سے مراد حضرت عیسٰی علیہ السلام ہیں۔ چونکہ ان کی پیدایش اللہ تعالیٰ کے ایک غیر معمولی فرمان سے خرقِ عادت کے طور پر ہوئی تھی، اس لیے ان کو قرآنِ مجید میں "کَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ" کہا گیا ہے۔

۴۰– یعنی تیرے بڑھاپے اور تیری بیوی کے بانجھ پن کے باوجود اللہ تجھے بیٹا دے گا۔

۴۱– یعنی ایسی علامت بتا دے کہ جب ایک پیرِ فرتوت اور ایک بوڑھی بانجھ کے ہاں لڑکے کی ولادت جیسا عجیب غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہو تو اس کی اِطّلاع مجھے پہلے سے ہو جائے۔

ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ
بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۟ع ﴿۴۱﴾ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ
اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ
اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ
اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

ع ۱۱ / ۱۲

کے سوا کوئی بات چیت نہ کرو گے (یا نہ کر سکو گے)۔ اِس دَوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہنا۔[۴۲]" ع

پھر وہ وقت آیا جب مریمؑ سے فرشتوں نے آکر کہا: "اے مریمؑ! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دُنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چُن لیا۔ اے مریمؑ! اپنے رب کی تابعِ فرمان بن کر رہ، اس کے آگے سربسجود ہو، اور جو بندے اس کے حُضور جھکنے والے ہیں، ان کے ساتھ تو بھی جُھک جا۔"

اے محمدؐ! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعے سے بتا رہے ہیں، ورنہ تم اُس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریمؑ کا سرپرست کون ہو اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے،[۴۳] اور نہ تم اُس وقت حاضر تھے

۴۲- اس تقریر کا اصل مقصد عیسائیوں پر ان کے اِس عقیدے کی غَلَطی واضح کرنا ہے کہ وہ مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور الٰہ سمجھتے ہیں۔ تمہید میں حضرت یحییٰ علیہ السّلام کا ذکر اس وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح مسیح علیہ السّلام کی ولادت معجزانہ طریقے سے ہوئی تھی، اُسی طرح اُن سے چھ ہی مہینے پہلے اُسی خاندان میں حضرت یحییٰؑ کی پیدایش بھی ایک دُوسری طرح کے معجزے سے ہو چکی تھی۔ اِس سے اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اگر یحییٰؑ کو ان کی اعجازی ولادت نے الٰہ نہیں بنایا تو مسیحؑ محض اپنی غیر معمولی پیدایش کے بل پر الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٤٤﴾ إِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ
بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي
الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّٰلِحِينَ ﴿٤٦﴾ قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ
لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ

جب اُن کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔

اور جب فرشتوں نے کہا: ”اے مریمؑ! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوش خبری دیتا ہے۔ اُس کا نام مسیح عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ ہوگا، دُنیا اور آخرت میں معزّز ہوگا، اللہ کے مقرّب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مردِ صالح ہوگا۔“ یہ سُن کر مریم بولی: ”پروردگار! میرے ہاں بچّہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔“ جواب ملا: ”ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے

---

۴۳ – یعنی قُرعہ اندازی کر رہے تھے۔ اس قرعہ اندازی کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے ان کو خدا کے کام کے لیے ہیکل کی نذر کر دیا تھا۔ اور وہ چونکہ لڑکی تھیں اس لیے یہ ایک نازک مسئلہ بن گیا تھا کہ ہیکل کے مجاوروں میں سے کس کی سرپرستی میں وہ رہیں۔

۴۴ – یعنی باوجود اس کے کہ کسی مرد نے تجھے ہاتھ نہیں لگایا، تیرے ہاں بچّہ پیدا ہوگا۔ یہی لفظ کَذٰلِکَ (ایسا ہی ہوگا) حضرت زکریّاؑ کے جواب میں بھی کہا گیا تھا۔ اس کا جو مفہوم وہاں ہے، وہی یہاں بھی ہونا چاہیے۔ نیز بعد کا فقرہ بلکہ پچھلا اور اگلا سارا بیان اِسی معنیٰ کی تائید کرتا ہے کہ حضرت مریمؑ کو صِنفی مُواصلت کے بغیر بچّہ پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی اور فی الواقع اِسی صورت سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش ہوئی۔ ورنہ اگر بات یہی تھی کہ حضرت مریمؑ کے ہاں اُسی معروف فطری طریقے سے بچّہ پیدا ہونے والا تھا جس طرح دنیا میں عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے، اور اگر حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش فی الواقع اُسی طرح ہوئی ہوتی، تو یہ سارا بیان قطعی مُہمل ٹھیرتا ہے جو چوتھے رُکوع سے چھٹے رکوع تک چلا جا رہا ہے، اور وہ تمام بیانات بھی بے معنیٰ قرار پاتے ہیں جو ولادتِ مسیحؑ کے باب میں قرآن کے دُوسرے مقامات پر ہمیں ملتے ہیں۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اِلٰہ اور ابن اللہ اسی وجہ سے سمجھا تھا کہ ان کی پیدایش غیر فطری طور پر

مَا يَشَآءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝٤٧
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝٤٨ۚ
وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ
رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔــةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ
فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ

پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرماتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔'' (فرشتوں نے پھر اپنے سلسلۂ کلام میں کہا) ''اور اللہ اُسے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا، تورات اور انجیل کا علم سکھائے گا اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرّر کرے گا۔''

(اور جب وہ بحیثیتِ رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا:) ''میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمھارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسّمہ بناتا ہوں اور اس میں پھُونک مارتا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھّا کرتا ہوں

بغیر باپ کے ہوئی تھی، اور یہودیوں نے حضرت مریمؑ پر الزام بھی اسی وجہ سے لگایا کہ سب کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ ایک لڑکی غیر شادی شدہ تھی اور اس کے ہاں بچّہ پیدا ہوا۔ اگر یہ سرے سے واقعہ ہی نہ تھا تب ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید میں بس اتنا کہہ دینا بالکل کافی تھا کہ تم لوگ غلط کہتے ہو، وہ لڑکی شادی شدہ تھی، فُلاں شخص اس کا شوہر تھا، اور اسی کے نُطفے سے عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔ یہ مختصر سی دوٹوک بات کہنے کے بجائے آخر اتنی لمبی تمہیدیں اُٹھانے اور پیچ در پیچ باتیں کرنے اور صاف صاف مسیح بن فُلاں کہنے کے بجائے مسیح بن مریم کہنے کی آخر کیا ضرورت تھی، جس سے بات سُلجھنے کے بجائے اور اُلجھ جائے۔ پس جو لوگ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت حسبِ معمول باپ اور ماں کے اِتّصال سے ہوئی تھی، وہ دراصل ثابت یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اظہارِ مافی الضمیر اور بیانِ مدّعا کی اُتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَمَا
تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ
مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿ۚ۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ

اور مُردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمھارے لیے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔[۴۵] اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانے میں موجود ہے۔[۴۶]

---

۴۵ – یعنی یہ علامات تم کو اس امر کا اطمینان دلانے کے لیے کافی ہیں کہ میں اس خدا کا بھیجا ہوا ہوں جو کائنات کا خالق اور حاکم ذی اقتدار ہے۔ بشرطیکہ تم حق کو ماننے کے لیے تیار ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔

۴۶ – یعنی یہ میرے فرستادۂ خدا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ اگر میں اُس کی طرف سے بھیجا ہوا نہ ہوتا بلکہ جھوٹا مدّعی ہوتا تو خود ایک مستقل مذہب کی بِنا ڈالتا اور اپنے اِن کمالات کے زور پر تمھیں سابق دین سے ہٹا کر اپنے ایجاد کردہ دین کی طرف لانے کی کوشش کرتا۔ لیکن میں تو اُسی اصل دین کو مانتا ہوں اور اسی تعلیم کو صحیح قرار دے رہا ہوں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر مجھ سے پہلے لائے تھے۔

یہ بات کہ مسیح علیہ السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو موسیٰ علیہ السلام اور دُوسرے انبیاؑ نے پیش کیا تھا، رائج الوقت اَناجیل میں بھی واضح طور پر ہمیں ملتی ہے۔ مثلاً مَتّی کی رِوایَت کے مطابق پہاڑی کے وعظ میں مسیح علیہ السلام صاف فرماتے ہیں:

’’یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔‘‘ (۵:۱۷)

ایک یہودی عالم نے حضرت مسیحؑ سے پوچھا کہ احکامِ دین میں اوّلین حکم کون سا ہے؟ جواب میں آپؑ نے فرمایا:

’’خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے مَحبّت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کے مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر مَحبّت رکھ۔ انھی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاؑ کے صحیفوں کا مدار ہے۔‘‘ (مَتّی ۲۲:۳۷-۴۰)

پھر حضرت مسیحؑ اپنے شاگردوں سے فرماتے ہیں:

’’فقیہ اور فریسی موسیٰؑ کی گدّی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمھیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو، لیکن ان کے سے کام نہ کرو، کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔‘‘ (مَتّی ۲۳:۲-۳)

وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۵۱﴾

اور اس لیے آیا ہوں کہ تمھارے لیے بعض اُن چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں[۴۷]۔ دیکھو، میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی، لہٰذا تم اُسی کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے[۴۸]۔"

۴۷ – یعنی تمھارے جُہلا کے توہّمات، تمھارے فقیہوں کی قانونی مُوشگافیوں، تمھارے رہبانیت پسند لوگوں کے تشدّدات، اور غیر مسلم قوموں کے غلبہ و تسلّط کی بدولت تمھارے ہاں اصل شریعتِ الٰہی پر جن قُیود کا اضافہ ہو گیا ہے، مَیں ان کو منسوخ کروں گا اور تمھارے لیے وہی چیزیں حلال اور وہی حرام قرار دوں گا جنھیں اللہ نے حلال یا حرام کیا ہے۔

۴۸ – اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیا علیہم السلام کی طرح حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی دعوت کے بھی بنیادی نِکات یہی تین تھے:

ایک یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ، جس کے مقابلے میں بندگی کا رَوِیّہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کی اطاعت پر اَخلاق و تمدُّن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اُس مُقتَدِرِ اعلیٰ کے نمایندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حِلّت و حُرمت اور جواز و عَدَمِ جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو، دُوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں۔

پس درحقیقت حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت موسٰی علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دُوسرے انبیاؑ کے مِشَن میں یک سَرِ مُو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیے ہیں اور ان کے درمیان مقصد و نوعیّت کے اعتبار سے فرق کیا ہے اُنھوں نے سخت غَلَطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اُس کی رعیّت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا، اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے، اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دُوسروں کو مالک الملک کے ساتھ

شریک ٹھیرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے، اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔

افسوس ہے کہ موجودہ اناجیل میں مسیح علیہ السلام کے مشن کو اس وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا جس طرح اُوپر قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم منتشر طور پر اشارات کی شکل میں وہ تینوں بنیادی نکات ہمیں ان کے اندر ملتے ہیں جو اُوپر بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ مسیحؑ صرف اللہ کی بندگی کے قائل تھے، ان کے اِس ارشاد سے صاف ظاہر ہوتی ہے:

''تُو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اُسی کی عبادت کر۔'' (متّی ۴:۱۰)

اور صرف یہی نہیں کہ وہ اس کے قائل تھے بلکہ ان کی ساری کوششوں کا مقصود یہ تھا کہ زمین پر خدا کے امرِ شرعی کی اُسی طرح اطاعت ہو جس طرح آسمان پر اس کے امرِ تکوینی کی اطاعت ہو رہی ہے:

''تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے، زمین پر بھی ہو۔'' (متّی ۶:۱۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو نبی اور آسمانی بادشاہت کے نمایندے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، اور اسی حیثیت سے لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیتے تھے، ان کے متعدد اقوال سے معلوم ہوتی ہے۔ اُنھوں نے جب اپنے وطن ناصرہ سے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کے اپنے ہی بھائی بند اور اہلِ شہر ان کی مخالَفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس پر مَتّی، مَرقُس اور لُوقا تینوں کی مُتّفَقہ روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''نبی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا۔'' اور جب یروشلم میں ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں تو انھوں نے جواب دیا: ''ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو۔'' (لُوقا ۱۳:۳۳) آخری مرتبہ جب وہ یروشلم میں داخل ہو رہے تھے تو ان کے شاگردوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا: ''مبارک ہے وہ بادشاہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔'' اس پر یہودی علما ناراض ہوئے اور انھوں نے حضرت مسیحؑ سے کہا کہ آپ اپنے شاگردوں کو چُپ کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا: ''اگر یہ چُپ رہیں گے تو پتھر چِلّا اُٹھیں گے۔'' (لُوقا ۱۹:۳۸-۴۰) ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

''اے محنت اُٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تم کو آرام دوں گا۔

میرا جُوا اپنے اوپر اُٹھا لو...... میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔'' (مَتّی ۱۱:۲۸-۳۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام انسانی ساخت کے قوانین کے بجائے خدائی قانون کی اطاعت کرانا چاہتے تھے، مَتّی اور مَرقُس کی اُس روایت سے صاف طور پر مُترشّح ہوتی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی علما نے اعتراض کیا کہ آپ کے شاگرد بزرگوں کی روایات کے خلاف ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کیوں کھا لیتے ہیں؟ اس پر حضرت مسیحؑ نے فرمایا: تم ریاکاروں کی حالت وہی ہے جس پر یَسعیاہ نبیؑ کی زبان سے یہ طعنہ دیا گیا ہے کہ ''یہ اُمّت زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کے دل مجھ سے دُور ہیں...... کیونکہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں۔'' تم لوگ خدا کے حکم کو تو باطل کرتے ہو اور اپنے گھڑے ہوئے قوانین کو برقرار رکھتے ہو۔ خدا نے تورات میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزّت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو برا کہے، وہ جان سے مارا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کہ میری جو خدمات تمھارے

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ
قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ
بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ

جب عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا: ”کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟“ حواریوں[۴۹] نے جواب دیا: ”ہم اللہ کے مددگار ہیں[۵۰]، ہم اللہ پر ایمان لائے، گواہ رہو کہ ہم مسلم (اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے والے) ہیں۔ مالک! جو فرمان تو نے نازل کیا ہے ہم نے اسے مان لیا اور رسول کی پیروی قبول کی،

کام آسکتی تھیں، انھیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں، اس کے لیے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں یا باپ کی کوئی خدمت نہ کرے۔ (متّی ۱۵: ۳-۹۔ مَرقس ۷: ۵-۱۳)

۴۹ – ”حواری“ کا لفظ قریب قریب وہی معنیٰ رکھتا ہے جو ہمارے ہاں ”انصار“ کا مفہوم ہے۔ بائبل میں بالعُموم حواریوں کے بجائے ”شاگردوں“ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعض مَقامات پر انھیں رسول بھی کہا گیا ہے۔ مگر رسول اِس معنیٰ میں کہ مسیح علیہ السّلام ان کو تبلیغ کے لیے بھیجتے تھے، نہ اِس معنیٰ میں کہ خدا نے ان کو رسُول مقرر کیا تھا۔

۵۰ – دینِ اسلام کی اقامت میں حصہ لینے کو قرآنِ مجید میں اکثر مَقامات پر ”اللہ کی مدد کرنے“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک تشریح طلب مضمون ہے۔ زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی عطا کی ہے، اس میں وہ انسان کو کفر یا ایمان، بغاوت یا اطاعت میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے پر اپنی خدائی طاقت سے مجبور نہیں کرتا۔ اس کے بجائے وہ دلیل اور نصیحت سے انسان کو اس بات کا قائل کرنا چاہتا ہے کہ انکار و نافرمانی اور بغاوت کی آزادی رکھنے کے باوجود اُس کے لیے حق یہی ہے اور اس کی فلاح و نجات کا راستہ بھی یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ اس طرح فہمایش اور نصیحت سے بندوں کو راہِ راست پر لانے کی تدبیر کرنا، یہ دراصل اللہ کا کام ہے۔ اور جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں، اُن کو اللہ اپنا رفیق و مددگار قرار دیتا ہے۔ اور یہ وہ بلند سے بلند مَقام ہے جس پر کسی بندے کی پہنچ ہو سکتی ہے۔ نماز، روزہ اور تمام اقسام کی عبادات میں تو انسان محض بندہ و غلام ہوتا ہے۔ مگر تبلیغِ دین اور اقامتِ دین کی جِدّوجُہد میں بندے کو خدا کی رفاقت و مددگاری کا شَرَف حاصل ہوتا ہے، جو اس دنیا میں رُوحانی ارتقا کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ
خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ع اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ

ع ۱۳/۱۳ النصف

ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔"

پھر بنی اسرائیل (مسیح کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنے لگے۔ جواب میں اللہ نے بھی اپنی خُفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ ع (وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی) جب اُس نے کہا کہ "اے عیسیٰؑ! اب میں تجھے واپس لے لوں[۵۱] گا اور

۵۱ – اصل میں لفظ "مُتَوَفِّيْكَ" استعمال ہُوا ہے۔ تَوَفّی کے اصل معنیٰ لینے اور وُصول کرنے کے ہیں۔ "رُوح قبض کرنا" اس لفظ کا مجازی استعمال ہے، نہ کہ اصل لُغوی معنیٰ۔ یہاں یہ لفظ انگریزی لفظ (to recall) کے معنیٰ میں مستعمل ہوا ہے، یعنی کسی عہدہ دار کو اس کے منصب سے واپس بُلا لینا۔ چونکہ بنی اسرائیل صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تنبیہوں اور فہمایشوں کے باوجود ان کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی، پے در پے کئی انبیاؑ کو قتل کر چکے تھے اور ہر اس بندۂ صالح کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے جو نیکی اور راستی کی طرف انھیں دعوت دیتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر حجّت تمام کرنے اور انھیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰ علیہما السّلام جیسے دو جلیل القدر پیغمبروں کو بیک وقت مبعوث کیا، جن کے ساتھ مامور منَ اللہ ہونے کی ایسی کُھلی کُھلی نشانیاں تھیں کہ ان سے انکار صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو حق و صداقت سے انتہا درجے کا عِناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلے میں جن کی جسارت و بے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر بنی اسرائیل نے اس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا، اور صرف اتنا ہی نہ کیا کہ ان دونوں پیغمبروں کی دعوت رَدّ کر دی، بلکہ ان کے ایک رئیس نے علی الاعلان حضرت یحییٰؑ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک رقّاصہ کی فرمایش پر قلم کرا دیا، اور ان کے علما و فقہا نے سازش کر کے حضرت عیسیٰؑ کو رُومی سلطنت سے سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی فہمایش پر مزید وقت اور قوت صرف کرنا بالکل فضول تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بُلا لیا اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل پر ذلّت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کی یہ پوری تقریر دراصل عیسائیوں کے عقیدۂ اُلُوہیّتِ مسیح کی تردید و اصلاح کے لیے ہے۔ اور عیسائیوں میں اس عقیدہ کے پیدا ہونے کے اہم ترین اسباب تین تھے:

(۱) حضرت مسیحؑ کی اعجازی ولادت

(۲) ان کے صریح محسوس ہونے والے معجزات۔

رَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ

تجھ کو اپنی طرف اُٹھا لوں گا اور جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے اُن سے (یعنی اُن کی معیّت سے اور اُن کے گندے ماحول میں اُن کے ساتھ رہنے سے) تجھے پاک کر دُوں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے۔[52]

(۳) اُن کا آسمان کی طرف اُٹھایا جانا، جس کا ذکر صاف الفاظ میں ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

قرآن نے پہلی بات کی تصدیق کی اور فرمایا کہ مسیحؑ کا بے باپ پیدا ہونا محض اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا۔ اللہ جس کو جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی طریقِ پیدائش ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مسیح خدا تھ خدائی میں کچھ بھی حصّہ رکھتا تھا۔

دوسری بات کی بھی قرآن نے تصدیق کی اور خود مسیحؑ کے معجزات ایک ایک کر کے گنائے، مگر بتا دیا کہ سارے کام اُس نے اللہ کے اِذن سے کیے تھے، باختیارِ خود کچھ بھی نہیں کیا، اس لیے ان میں سے بھی کوئی بات ا نہیں ہے جس سے تم یہ نتیجہ نکالنے میں کچھ بھی حق بجانب ہو کہ مسیحؑ کا خدائی میں کوئی حصہ تھا۔

اب تیسری بات کے متعلق اگر عیسائیوں کی رِوایت سرے سے بالکل ہی غلط ہوتی، تب تو ان کے عقی اُلوہیّتِ مسیح کی تردید کے لیے ضروری تھا کہ صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ جسے تم الٰہ اور ابن اللہ بنا رہے ہو، وہ مر کر میں مل چکا ہے، مزید اطمینان چاہتے ہو تو فُلاں مَقام پر جا کر اس کی قبر دیکھ لو۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی موت کی تصریح نہیں کرتا، اور صرف یہی نہیں کہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو زندہ اُٹھائے جا کے مفہُوم کا کم از کم احتمال تو رکھتے ہی ہیں، بلکہ عیسائیوں کو اُلٹا یہ اور بتا دیتا ہے کہ مسیحؑ سرے سے صلیب پر چڑھائے نہیں گئے، یعنی وہ جس نے آخری وقت میں "ایلی ایلی لما شبقتنی" کہا تھا، اور وہ جس کی صلیب پر چڑھی ہ حالت کی تصویر تم لیے پھرتے ہو، وہ مسیحؑ نہ تھا، مسیحؑ کو تو اس سے پہلے ہی خدا نے اُٹھالیا تھا۔

اس کے بعد جو لوگ قرآن کی آیات سے مسیحؑ کی وفات کا مفہُوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ دراصل یہ ثابت کر ہیں کہ اللہ میاں کو صاف سُلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

۵۲ – انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں، جن کو حضرت عیسٰی علیہ السلام نے ایمان لانے کی دعوت اور انھوں نے اُسے رد کر دیا۔ بخلاف اس کے پیروی کرنے والوں سے مراد اگر صحیح پیروی کرنے والے ہوں تو وہ ص مسلمان ہیں، اور اگر اس سے مراد فی الجملہ آنجناب کے ماننے والے ہوں تو ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں

ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ فِیۡمَا کُنۡتُمۡ فِیۡهِ
تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَاُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا
شَدِیۡدًا فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ ۫ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۵۶﴾
وَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ ؕ
وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتۡلُوۡهُ عَلَیۡكَ مِنَ
الۡاٰیٰتِ وَالذِّکۡرِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰهِ
کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۵۹﴾

پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے، اُس وقت میں اُن باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تمھارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی ہے انھیں دنیا اور آخرت دونوں میں سخت سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے، اور جنھوں نے ایمان اور نیک عملی کا رَوِیّہ اختیار کیا ہے انھیں اُن کے اجر پورے پورے دے دیے جائیں گے۔ اور خوب جان لے کہ ظالموں سے اللہ ہرگز محبّت نہیں کرتا۔''

یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمھیں سُنا رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک عیسٰیؑ کی مثال آدمؑ کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔[۵۳]

---

۵۳ – یعنی اگر محض اعجازی پیدائش ہی کسی کو خدا یا خدا کا بیٹا بنانے کے لیے کافی دلیل ہو، تب تو پھر تمھیں آدمؑ کے متعلق بدرجۂ اولیٰ ایسا عقیدہ تجویز کرنا چاہیے تھا، کیونکہ مسیحؑ تو صرف بے باپ ہی کے پیدا ہوئے تھے، مگر آدمؑ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝٦٠ فَمَنْ
حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا
نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا
وَاَنْفُسَكُمْ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝٦١

یہ اصل حقیقت ہے جو تمھارے رب کی طرف سے بتائی جا رہی ہے اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں۔[۵۴]

یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملے میں تم سے جھگڑا کرے تو اے محمدؐ! اس سے کہو کہ "آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دُعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اُس پر خدا کی لعنت ہو۔"[۵۵]

---

۵۴ – یہاں تک کی تقریر میں جو بُنیادی نِکات عیسائیوں کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، اُن کا خلاصہ علی الترتیب حسبِ ذیل ہے:

پہلا امر جو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ ہے کہ مسیحؑ کی اُلُوہیّت کا اعتقاد تمھارے اندر جن وُجوہ سے پیدا ہوا ہے، ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسے اعتقاد کے لیے صحیح نہیں ہے۔ ایک انسان تھا جس کو اللہ نے اپنی مَصلحتوں کے تحت مناسب سمجھا کہ غیر معمولی صورت سے پیدا کرے اور اسے ایسے معجزے عطا کرے جو نبوت کی صریح علامت ہوں، اور منکرینِ حق کو اسے صلیب پر نہ چڑھانے دے بلکہ اس کو اپنے پاس اُٹھا لے۔ مالک کو اختیار ہے، اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محض اس غیر معمولی برتاؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ خود مالک تھا، یا مالک کا بیٹا تھا، یا مِلکیّت میں اس کا شریک تھا۔

دُوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ مسیحؑ جس چیز کی طرف دعوت دینے آئے تھے، وہ وہی چیز ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں۔ دونوں کے مشن میں یک سرِ مُو فرق نہیں ہے۔

تیسرا بنیادی نکتہ اس تقریر کا یہ ہے کہ مسیحؑ کے بعد ان کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام تھا جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس تعلیم پر قائم رہی جو مسیح علیہ السلام نے دی تھی اور نہ اُس مذہب کی پیروی رہی جس کا اتباع مسیحؑ کے حواری کرتے تھے۔

۵۵ – فیصلے کی یہ صُورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وفدِ نجران جان بُوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے۔ اُوپر کی تقریر میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا جواب بھی اُن لوگوں کے پاس نہ تھا۔ مسیحیت کے

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ
اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶۲ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ
بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝۶۳ ع قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ

ع ۲ / ۱۴

یہ بالکل صحیح واقعات ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خداوند نہیں ہے، اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا اور جس کی حکمت نظامِ عالَم میں کارفرما ہے۔ پس اگر یہ لوگ (اِس شرط پر مقابلے میں آنے سے) منہ موڑیں تو (اُن کا مفسد ہونا صاف کُھل جائے گا) اور اللہ تو مفسدوں کے حال سے واقف ہی ہے۔ ع

کہو:[۵۶] ”اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان

مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کُتُبِ مقدّسہ کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امرِ واقعہ کے عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپؐ کی تعلیم اور آپؐ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہلِ وفد اپنے دلوں میں آپؐ کی نبوّت کے قائل بھی ہو گئے تھے، یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب اُن سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمھیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلے میں دعا کرو کہ جو جھوٹا ہو اُس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی اس مقابلے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس طرح یہ بات تمام عرب کے سامنے کُھل گئی کہ نَجرانی مسیحیّت کے پیشوا اور پادری، جن کے تَقدُّس کا سکّہ دُور دُور تک رواں ہے، دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود انھیں کامل اعتماد نہیں ہے۔

۵۶ – یہاں سے ایک تیسری تقریر شروع ہوتی ہے جس کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگِ بَدر اور جنگِ اُحُد کے درمیانی دَور کی ہے۔ لیکن ان تینوں تقریروں کے درمیان مطالب کی ایسی قریبی مناسبت پائی جاتی ہے کہ شروع سُورت سے لے کر یہاں تک کسی جگہ ربطِ کلام ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ اسی بنا پر بعض مفسّرین کو شبہ ہوا ہے کہ یہ بعد کی آیات بھی وفدِ نَجران والی تقریر ہی کے سلسلے کی ہیں۔ مگر یہاں سے جو تقریر شروع ہو رہی ہے، اس کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ اس کے مُخاطَب یہُودی ہیں۔

بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡـــًٔا وَّلَا
يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا
فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ۝٦٤ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ
تُحَآجُّوۡنَ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰٮةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ
بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝٦٥ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَۤاءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ
عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَـيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ

یکساں ہے۔[۵۷] یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے"۔۔۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں۔

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیمؑ کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں۔ پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے[۵۸] ۔۔۔ تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے ہو اُن میں تو خوب بحثیں کر چکے، اب ان معاملات میں کیوں بحث کرنے چلے ہو جن کا تمھارے پاس کچھ بھی علم نہیں۔ اللہ جانتا ہے،

---

۵۷ - یعنی ایک ایسے عقیدے پر ہم سے اتفاق کرلو جس پر ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جس کے صحیح ہونے سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تمھارے اپنے انبیاؑ سے یہی عقیدہ منقول ہے۔ تمھاری اپنی کُتُبِ مقدسہ میں اس کی تعلیم موجود ہے۔

۵۸ - یعنی تمھاری یہ یہودیت اور یہ نصرانیت بہرحال تورات اور انجیل کے نُزُول کے بعد پیدا ہوئی ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کے نزول سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔ اب ایک معمولی عقل کا آدمی بھی بات بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس مذہب پر تھے، وہ بہرحال یہودیت یا نصرانیت تو نہ تھا۔ پھر اگر حضرت

وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا
وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ
اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾ وَدَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَھْلِ
الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾
يٰٓاَھْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

تم نہیں جانتے۔ ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مسلمِ[۵۹] یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔'' ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو اُن لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبیؐ اور اس کے ماننے والے اِس نسبت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اللہ صرف اُنھی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔

(اے ایمان لانے والو!) اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمھیں راہِ راست سے ہٹا دے، حالانکہ درحقیقت وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے ہیں مگر انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔ اے اہلِ کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے[۶۰] ہو؟

ابراہیمؑ راہِ راست پر تھے اور نجات یافتہ تھے، تو لامحالہ اس سے لازم آتا ہے کہ آدمی کا راہِ راست پر ہونا اور نجات پانا یہودیت و نصرانیت کی پیروی پر موقوف نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۳۵ و ۱۴۱)

۵۹ – اصل میں لفظ حَنِیف استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ایسا شخص ہے جو ہر طرف سے رُخ پھیر کر ایک خاص راستے پر چلے۔ اسی مفہوم کو ہم نے ''مسلمِ یک سُو'' سے ادا کیا ہے۔

۶۰ – دوسرا ترجمہ اس فقرے کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''تم خود گواہی دیتے ہو۔'' دونوں صُورتوں میں نفسِ معنٰی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی، اور صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں پر آپؐ کی تعلیم وتربیت کے حیرت انگیز

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ
وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۧ ﴿۷۱﴾ وَ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ ع ۷/۱۵
اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ
وَ اكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ لَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ
تَبِعَ دِیْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ یُّؤْتٰۤى اَحَدٌ
مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ

اے اہلِ کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مُشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بُوجھتے حق کو چُھپاتے ہو؟ ع

اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبیؐ کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو، شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔[61] نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔ اے نبیؐ! ان سے کہہ دو کہ ''اصل میں ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اور یہ اُسی کی دین ہے کہ کسی کو وہی کچھ دے دیا جائے جو کبھی تم کو دیا گیا تھا، یا یہ کہ دُوسروں کو تمھارے رب کے حُضور پیش کرنے کے لیے تمھارے خلاف قوی حجّت مِل جائے۔'' اے نبیؐ! ان سے کہو کہ

اثرات، اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہو رہے تھے، یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو شخص انبیاؑ کے احوال اور کُتبِ آسمانی کے طرز سے واقف ہو، اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرتؐ کی نبوت میں شک کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بہت سے اہلِ کتاب (خصوصاً ان کے اہلِ علم) یہ جان چکے تھے کہ حضورؐ وہی نبی ہیں جن کی آمد کا وعدہ انبیائے سابقین نے کیا تھا، حتّٰی کہ کبھی کبھی حق کی زبردست طاقت سے مجبور ہو کر ان کی زبانیں آپؐ کی صداقت اور آپؐ کی پیش کردہ تعلیم کے برحق ہونے کا اعتراف تک کر گزرتی تھیں۔ اسی وجہ سے قرآن بار بار ان کو الزام دیتا ہے کہ اللہ کی جن آیات کو تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، جن کی حقانیت پر تم خود گواہی دیتے ہو، ان کو تم قصداً اپنے نفس کی شرارت سے جھٹلا رہے ہو۔

الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾
يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾
وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ
وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا
دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي

"فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے، جسے چاہے عطا فرمائے۔ وہ وسیع النظر[۶۲] ہے اور سب کچھ جانتا ہے،[۶۳] اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے۔"

اہلِ کتاب میں کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمھارا مال تمھیں ادا کر دے گا، اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں بھی اس پر بھروسا کرو تو وہ ادا نہ کرے گا اِلّا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "اُمّیوں (غیر یہودی لوگوں) کے معاملے میں

۶۱ – یہ اُن چالوں میں سے ایک چال تھی جو اطرافِ مدینہ کے رہنے والے یہودیوں کے لیڈر اور مذہبی پیشوا اسلام کی دعوت کو کمزور کرنے کے لیے چلتے رہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو بددل کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عامّۂ خلائق کو بدگمان کرنے کے لیے خفیہ طور پر آدمیوں کو تیار کر کے بھیجنا شروع کیا، تاکہ پہلے علانیہ اسلام قبول کریں، پھر مرتد ہو جائیں، پھر جگہ جگہ لوگوں میں یہ مشہور کرتے پھریں کہ ہم نے اسلام میں اور مسلمانوں میں اور ان کے پیغمبر میں یہ اور یہ خرابیاں دیکھی ہیں، تب ہی تو ہم ان سے الگ ہو گئے۔

۶۲ – اصل میں لفظ "وَاسِعٌ" استعمال ہوا ہے، جو بالعموم قرآن میں تین مواقع پر آیا کرتا ہے۔ ایک وہ موقع جہاں انسانوں کے کسی گروہ کی تنگ خیالی و تنگ نظری کا ذکر آتا ہے اور اُسے اس حقیقت پر مُتنبّہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اللہ تمھاری طرح تنگ نظر نہیں ہے۔ دُوسرا وہ موقع جہاں کسی کے بُخل اور تنگ دلی اور کم حوصلگی پر ملامت کرتے ہوئے یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ فراخ دست ہے، تمھاری طرح بخیل نہیں ہے۔ تیسرا وہ موقع جہاں لوگ اپنے تخیّل کی تنگی کے سبب سے اللہ کی طرف کسی قسم کی محدودیّت منسوب کرتے ہیں اور انھیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ غیر محدود ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۱۶)

الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ
يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٥﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِيْنَ ﴿٧٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ
ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا
يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠

ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔[۶۴]" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے۔ آخر کیوں اُن سے باز پُرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پُورا کرے گا اور بُرائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا، کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں، اللہ قیامت کے روز نہ اُن سے بات کرے گا نہ اُن کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا،[۶۵]

۶۳ — یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ کون فضل و شرف کا مستحق ہے۔

۶۴ — یہ محض یہودی عوام ہی کا جاہلانہ خیال نہ تھا، بلکہ اُن کے ہاں کی مذہبی تعلیم بھی یہی کچھ تھی، اور ان کے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کے فقہی احکام ایسے ہی تھے۔ بائبل قرض اور سُود کے احکام میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان صاف تفریق کرتی ہے۔ (اِستِثنا ۱۵: ۱-۳، ۲۳: ۲۰) تَلمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کردے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کرے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز ملے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گردوپیش آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے، غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیے۔ رِبّی اسْماعیل کہتا ہے کہ اگر اُمّی اور اسرائیلی کا مقدّمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جتوا سکتا ہو تو اُس کے مطابق جتوائے اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے۔ اور اگر اُمّیوں کے قانون کے تحت جتوا سکتا ہو تو اس کے تحت جتوائے اور کہے کہ یہ تمھارا قانون ہے۔ اور اگر دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو، کرے۔ رِبّی شمواِیل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ (تالمودِک مِسّلینی، پال آئزک ہرشوں، لندن ۱۸۸۰ء، صفحات ۳۷-۲۱۰-۲۲۱)

۶۵ — سبب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے ایسے سخت اَخلاقی جرائم کرنے کے بعد بھی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٧﴾ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ
بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٨﴾ مَا كَانَ
لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ
لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا

بلکہ اُن کے لیے تو سخت درد ناک سزا ہے۔

اُن میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا اُلٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں[٦٦] ہوتی، وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا، وہ جان بُوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچّے

کے روز بس یہی اللہ کے مقرّب بندے ہوں گے، انھی کی طرف نظرِ عنایت ہوگی، اور جو تھوڑا بہت گناہوں کا مَیل دنیا میں ان کو لگ گیا ہے، وہ بھی بزرگوں کے صدقے میں ان پر سے دھو ڈالا جائے گا، حالانکہ دراصل وہاں ان کے ساتھ بالکل برعکس معاملہ ہوگا۔

٦٦ – اس کا مطلب اگرچہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کتابِ الٰہی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں، یا الفاظ کا اُلٹ پھیر کر کے کچھ سے کچھ مطلب نکالتے ہیں، لیکن اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو، جو اُن کے مفاد یا اُن کے خود ساختہ عقائد و نظریّات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس کی نظیریں قرآن کو ماننے والے اہلِ کتاب میں بھی مفقود نہیں ہیں۔ مثلاً بعض لوگ جو نبیؐ کی بَشریّت کے منکر ہیں، آیت قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ میں اِنَّمَآ کو اِنَّ مَا پڑھتے ہیں اور اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ ”اے نبیؐ! کہہ دو کہ تحقیق نہیں ہوں میں بشر تم جیسا۔“

رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ
تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ
وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ ع ۸ ۱۲
مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا

ربّانی[67] بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمھیں کفر کا حکم دے جب کہ تم مسلم ہو؟[68] ع

یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ ''آج ہم نے تمھیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمھارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہُوا آئے جو

---

۶۷ – یہودیوں کے ہاں جو علما مذہبی عہدہ دار ہوتے تھے اور جن کا کام مذہبی اُمور میں لوگوں کی رہنمائی کرنا اور عبادات کے قیام اور احکامِ دین کا اجرا کرنا ہوتا تھا، ان کے لیے لفظ رَبّانی استعمال کیا جاتا تھا، جیسا کہ خود قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ (ان کے ربّانی اور ان کے علما ان کو گناہ کی باتیں کرنے اور حرام کے مال کھانے سے کیوں نہ روکتے تھے)۔ اسی طرح عیسائیوں کے ہاں لفظ (divine) بھی ''رَبّانی'' کا ہی ہم معنیٰ ہے۔

۶۸ – یہ اُن تمام غلط باتوں کی ایک جامع تردید ہے جو دُنیا کی مختلف قوموں نے خدا کی طرف سے آئے ہوئے پیغمبروں کی طرف منسوب کر کے اپنی مذہبی کتابوں میں شامل کر دی ہیں اور جن کی رُو سے کوئی پیغمبر یا فرشتہ کسی نہ کسی طرح خدا اور معبُود قرار پاتا ہے۔ ان آیات میں یہ قاعدۂ کُلِیّہ بتایا گیا ہے کہ ایسی کوئی تعلیم جو اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی و پرستش سکھاتی ہو اور کسی بندے کو بندگی کی حد سے بڑھا کر خدائی کے مقام تک لے جاتی ہو، ہرگز کسی پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم نہیں ہوسکتی۔ جہاں کسی مذہبی کتاب میں یہ چیز نظر آئے، سمجھ لو کہ یہ گمراہ کُن لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ ہے۔

مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ
وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ
فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ

پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے، تو تم کو اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنی ہو گی۔[69]“
یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پُوچھا: ”کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمّہ داری اُٹھاتے ہو؟“ اُنھوں نے کہا: ”ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔“ اللہ نے فرمایا: ”اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں، اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔[70]“

اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دینُ اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟

---

۶۹ – مطلب یہ ہے کہ ہر پیغمبر سے اس امر کا عہد لیا جاتا رہا ہے ـــــ اور جو عہد پیغمبر سے لیا گیا ہو، وہ لامحالہ اس کے پیرووں پر بھی آپ سے آپ عائد ہو جاتا ہے ـــــ کہ جو نبی ہماری طرف سے اُس دین کی تبلیغ و اقامت کے لیے بھیجا جائے جس کی تبلیغ و اقامت پر تم مامور ہوئے ہو، اس کا تمھیں ساتھ دینا ہو گا۔ اُس کے ساتھ تعصّب نہ برتنا، اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ سمجھنا، حق کی مُخالفت نہ کرنا، بلکہ جہاں جو شخص بھی ہماری طرف سے حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے اُٹھایا جائے، اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی اُمّت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتا نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا عہد لیا گیا ہو، یا آپؐ نے اپنی اُمّت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔

۷۰ – اس ارشاد سے مقصود اہلِ کتاب کو مُتنبّہ کرنا ہے کہ تم اللہ کے عہد کو توڑ رہے ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور ان کی مخالفت کر کے اُس میثاق کی خلاف ورزی کر رہے ہو جو تمھارے انبیاؑ سے لیا گیا تھا، لہٰذا اب تم فاسق ہو چکے ہو، یعنی اللہ کی اطاعت سے نکل گئے ہو۔

وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّاِلَيۡهِ
يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾ قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰٓى
اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِىَ
مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَالنَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ
مِّنۡهُمۡ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ
دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾

حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابعِ فرمان (مُسلِم) ہیں[71] اور اُسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے؟ اے نبیؐ! کہو کہ ”ہم اللہ کو مانتے ہیں، اُس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے، اُن تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ پر نازل ہوئی تھیں، اور اُن ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دُوسرے پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے[72] اور ہم اللہ کے تابعِ فرمان (مُسلِم) ہیں۔“ اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

---

۷۱ – یعنی تمام کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا دین تو یہی اسلام، یعنی اللہ کی اطاعت و بندگی ہے، اب تم اس کائنات کے اندر رہتے ہوئے اسلام کو چھوڑ کر اور کون سا طریقۂ زندگی تلاش کر رہے ہو؟

۷۲ – یعنی ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے کہ کسی نبی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں، کسی کو جھُوٹا کہیں اور کسی کو سچّا۔ ہم تعصُّب اور حمیّتِ جاہلیّہ سے پاک ہیں۔ دُنیا میں جہاں، جو اللہ کا بندہ بھی اللہ کی طرف سے حق لے کر آیا ہے، ہم اس کے برحق ہونے پر شہادت دیتے ہیں۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ
الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ
وَالْمَلٰۗئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ
عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ

کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ اُن لوگوں کو ہدایت بخشے جنھوں نے نعمتِ ایمان پا لینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا حالانکہ وہ خود اس بات پر گواہی دے چکے ہیں کہ یہ رسُول حق پر ہے اور ان کے پاس روشن نشانیاں بھی آ چکی ہیں[۷۳]۔ اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے، اِسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا میں تخفیف ہو گی اور نہ انھیں مُہلت دی جائے گی۔ البتہ وہ لوگ بچ جائیں گے جو اِس کے بعد توبہ کر کے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے[۷۴] ان کی توبہ بھی

۷۳ — یہاں پھر اُسی بات کا اعادہ کیا گیا ہے جو اس سے قبل بارہا بیان کی جا چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب کے یہودی علما جان چکے تھے اور ان کی زبانوں تک سے اس امر کی شہادت ادا ہو چکی تھی کہ آپؐ نبیِ برحق ہیں، اور جو تعلیم آپؐ لائے ہیں، وہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاؑ لاتے رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا، وہ محض تعصُّب، ضد اور دُشمنیِ حق کی اُس پُرانی عادت کا نتیجہ تھا جس کے وہ صدیوں سے مجرم چلے آ رہے تھے۔

۷۴ — یعنی صرف انکار ہی پر بس نہ کی، بلکہ عملاً مخالفت و مزاحمت بھی کی، لوگوں کو خدا کے راستے سے روکنے کی کوشش

تَوۡبَتُهُمۡ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوۡنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا
وَهُمۡ كُفَّارٌ فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِهِمۡ مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ ذَهَبًا وَّلَوِ
افۡتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ وَّمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۹۱﴾ ع

الجزء ۴

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ ۵

قبول نہ ہوگی، ایسے لوگ تو پکّے گمراہ ہیں۔ یقین رکھو، جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں جان دی اُن میں سے کوئی اگر اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لیے رُوئے زمین بھر کر بھی سونا فدیے میں دے تو اُسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا تیار ہے اور وہ اپنا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔ ع

تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنھیں تم عزیز رکھتے ہو،۷۵

میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگایا، شبہات پیدا کیے، بدگمانیاں پھیلائیں، دلوں میں وسوسے ڈالے، اور بدترین سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں، تاکہ نبی کا مشن کسی طرح کامیاب نہ ہونے پائے۔

۷۵ – اس سے مقصود اُن کی اس غلط فہمی کو دُور کرنا ہے جو وہ "نیکی" کے بارے میں رکھتے تھے۔ ان کے دماغوں میں نیکی کا بلند سے بلند تصوّر بس یہ تھا کہ صدیوں کے توارُث سے "تشرّع" کی جو ایک خاص ظاہری شکل ان کے ہاں بن گئی تھی، اس کا پورا چربہ آدمی اپنی زندگی میں اُتار لے، اور ان کے علما کی قانونی مُوشگافیوں سے جو ایک لمبا چوڑا فقہی نظام بن گیا تھا، اس کے مطابق رات دن زندگی کے چھوٹے چھوٹے ضمنی وفُروعی معاملات کی ناپ تول کرتا رہے۔ اس تشرّع کی اُوپری سطح کے نیچے بالعموم یہودیوں کے بڑے بڑے "دین دار" لوگ تنگ دلی، حرص، بُخل، حق پوشی اور حق فروشی کے عُیُوب چُھپائے ہوئے تھے اور رائے عام ان کو نیک سمجھتی تھی۔ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے انھیں بتایا جا رہا ہے کہ "نیک انسان" ہونے کا مَقام اُن چیزوں سے بالاتر ہے جن کو تم نے مدارِ خیر وصلاح سمجھ رکھا ہے۔ نیکی کی اصل رُوح خدا کی محبّت ہے، ایسی محبّت کہ رضائے الٰہی کے مقابلے میں دنیا کی کوئی چیز عزیز تر نہ ہو۔ جس چیز کی محبّت بھی آدمی کے دل پر اتنی غالب آ جائے کہ وہ اسے خدا کی محبّت پر قربان نہ کر سکتا ہو، بس وہی بُت ہے، اور جب تک اُس بُت کو آدمی توڑ نہ دے، نیکی کے دروازے اس پر بند ہیں۔ اس رُوح سے خالی ہونے کے بعد ظاہری تشرّع کی حیثیت محض اُس چمک دار روغن کی سی ہے جو گُھن کھائی ہوئی لکڑی پر پھیر دیا گیا ہو۔ انسان ایسے روغنوں سے دھوکا کھا سکتے ہیں، مگر خدا نہیں کھا سکتا۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٩٢﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ
حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ
مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْھَآ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٩٣﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ
بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٩٤﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ قف

وقف جبرئیل علیہ السلام

اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔

کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعت محمدیؐ میں حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں[76]، البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنھیں تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اسرائیل[77] نے خود اپنے اُوپر حرام کرلیا تھا۔ ان سے کہو: اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچے ہو تو لاؤ تورات اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت ــــ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے رہیں وہی درحقیقت ظالم ہیں۔ کہو: اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے،

---

۷۶ – قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر جب علمائے یہود کوئی اُصولی اعتراض نہ کر سکے (کیونکہ اساسِ دین جن اُمور پر ہے، اُن میں انبیائے سابقین کی تعلیمات اور نبیِ عَرَبیؐ کی تعلیم میں یک سرِمُو فرق نہ تھا) تو انھوں نے فقہی اعتراضات شروع کیے۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ آپؐ نے کھانے پینے کی بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو پچھلے انبیاؑ کے زمانے سے حرام چلی آ رہی ہیں۔ اسی اعتراض کا یہاں جواب دیا جا رہا ہے۔

۷۷ – ''اسرائیل'' سے مراد اگر بنی اسرائیل لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ نُزولِ تورات سے قبل بعض چیزیں بنی اسرائیل نے محض رسماً حرام قرار دے لی تھیں۔ اور اگر اس سے مراد حضرت یعقوبؑ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنجناب نے بعض چیزوں سے طبعی کراہت کی بنا پر یا کسی مرض کی بنا پر احتراز فرمایا تھا اور ان کی اولاد نے بعد میں انھیں ممنوع سمجھ لیا۔ یہی مؤخر الذکر روایت زیادہ مشہور ہے۔ اور بعد والی آیت سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ اُونٹ اور خرگوش وغیرہ کی حُرمت کا جو حکم بائبل میں لکھا ہے، وہ اصل تورات کا حکم نہیں ہے بلکہ یہودی علما نے بعد میں اسے داخلِ کتاب کر دیا ہے۔ (مفصل بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ انعام، حاشیہ ۱۲۲)

فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾
اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ ۚ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ۵ وَمَنْ

تم کو یکسُو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرنی چاہیے، اور ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ ۷۸

بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکّہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔ ۷۹ اس میں کھُلی ہُوئی نشانیاں ہیں، ۸۰ ابراہیمؑ کا مقامِ عبادت ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ جو

۷۸ – مطلب یہ ہے کہ اِن فقہی جزئیات میں کہاں جا پھنسے ہو۔ دین کی جڑ تو اللہ واحد کی بندگی ہے جسے تم نے چھوڑ دیا اور شرک کی آلایشوں میں مُبتلا ہو گئے۔ اب بحث کرتے ہو فقہی مسائل میں، حالانکہ یہ وہ مسائل ہیں جو اصل ملّتِ ابراہیمی سے ہٹ جانے کے بعد انحطاط کی طویل صدیوں میں تمھارے علما کی مُوشگافیوں سے پیدا ہوئے ہیں۔

۷۹ – یہودیوں کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تم نے بیت المَقدِس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا، حالانکہ پچھلے انبیاؑ کا قبلہ بیت المَقدِس ہی تھا۔ اس کا جواب سورۂ بَقَرہ میں دیا جا چکا ہے۔ لیکن یہودی اس کے بعد بھی اپنے اعتراض پر مُصِر رہے۔ لہٰذا یہاں پھر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ بیت المَقدِس کے متعلق خود بائبل ہی کی شہادت موجود ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمانؑ نے اس کو تعمیر کیا۔ (۱-سلاطین، باب ۶، آیت ۱) اور حضرت سلیمانؑ ہی کے زمانے میں وہ قبلۂ اہلِ توحید قرار دیا گیا۔ (کتابِ مذکور، باب ۸، آیت ۲۹-۳۰) برعکس اس کے یہ تمام عرب کی متواتر اور مُتَّفَق عَلَیہ روایات سے ثابت ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا، اور وہ حضرت موسیٰؑ سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے ہیں۔ لہٰذا کعبہ کی اوّلیت ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کلام کی گنجایش نہیں۔

۸۰ – یعنی اس گھر میں ایسی صریح علامات پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جناب میں مقبول ہوا ہے اور اسے اللہ نے اپنے گھر کی حیثیت سے پسند فرما لیا ہے۔ لَق و دَق بیابان میں بنایا گیا اور پھر اللہ نے اس کے جوار میں رہنے والوں کی رزق رسانی کا بہتر سے بہتر انتظام کر دیا۔ ڈھائی ہزار برس تک جاہلیّت کے سبب سے سارا ملکِ عرب انتہائی بدامنی کی حالت میں مبتلا رہا، مگر اس فساد بھری سرزمین میں کعبہ اور اطرافِ کعبہ ہی کا ایک خِطّہ ایسا تھا جس میں امن قائم رہا۔ بلکہ اسی کعبہ کی یہ برکت تھی کہ سال بھر میں چار مہینے کے لیے پورے ملک کو اس کی بدولت امن میسّر آجاتا تھا۔ پھر ابھی نصف صدی پہلے ہی

دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ
اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖۗ
وَ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ
لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا
وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

اِس میں داخل ہوا مامون ہو گیا[۸۱]۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

کہو: اے اہلِ کتاب! تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کہو: اے اہلِ کتاب! یہ تمھاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اُسے بھی تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے، حالانکہ تم خود (اس کے راہِ راست ہونے پر) گواہ ہو۔ تمھاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔

سب دیکھ چکے تھے کہ اَبْرَہَہ نے جب کعبہ کی تخریب کے لیے مکّہ پر حملہ کیا تو اس کی فوج کس طرح قہرِ الٰہی کی شکار ہوئی۔ اس واقعے سے اُس وقت عرب کا بچّہ بچّہ واقف تھا اور اس کے چشم دید شاہد اِن آیات کے نُزول کے وقت موجود تھے۔

۸۱ – جاہلیّت کے تاریک دَور میں بھی اس گھر کا یہ احترام تھا کہ خون کے پیاسے دُشمن ایک دوسرے کو وہاں دیکھتے تھے اور ایک کو دوسرے پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿١٠٠﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ
وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ط وَمَنْ يَّعْتَصِمْ
بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٠١﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ ع ۱۰
اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم نے اِن اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمھیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمھارے لیے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقع باقی ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سُنائی جا رہی ہیں اور تمھارے درمیان اس کا رسولؐ موجود ہے؟ جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہِ راست پالے گا۔ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔[۸۲] سب مِل کر اللہ کی رسّی[۸۳] کو مضبوط پکڑلو اور تفرقے میں نہ پڑو۔

---

۸۲ – یعنی مرتے دَم تک اللہ کی فرماں برداری اور وفاداری پر قائم رہو۔

۸۳ – اللہ کی رسّی سے مراد اس کا دین ہے، اور اس کو رسّی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہلِ ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے، اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ اس رسّی کو ''مضبوط پکڑنے'' کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیّت ''دین'' کی ہو، اسی سے ان کو دلچسپی ہو، اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں اور اسی کی خدمت کے لیے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجّہات اور دلچسپیاں جُزئیات وفُروع کی طرف منعطف ہوئیں، پھر ان میں لازماً وہی تفرِقہ و اختلاف رُونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیا علیہم السّلام کی اُمتوں کو ان کے

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ
قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَكُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ
النَّارِ فَاَنۡقَذَكُمۡ مِّنۡهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ
تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ

اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دُوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمھارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔[۸۴] اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمھارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ اِن علامتوں سے تمھیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آ جائے۔[۸۵]

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بُلائیں، بھلائی کا

اصل مقصدِ حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے۔

۸۴ – یہ اشارہ ہے اُس حالت کی طرف جس میں اسلام سے پہلے اہلِ عرب مبتلا تھے۔ قبائل کی باہمی عداوتیں، بات بات پر ان کی لڑائیاں، اور شب و روز کے کُشت و خون، جن کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جاتی۔ اس آگ میں جل مرنے سے اگر کسی چیز نے انھیں بچایا تو وہ یہی نعمتِ اسلام تھی۔ یہ آیات جس وقت نازل ہوئی ہیں، اس سے تین چار سال پہلے ہی مدینے کے لوگ مسلمان ہوئے تھے، اور اسلام کی یہ جیتی جاگتی نعمت سب دیکھ رہے تھے کہ اَوس اور خَزرَج کے وہ قبیلے، جو سالہا سال سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، باہم مل کر شیر و شکر ہو چکے تھے، اور یہ دونوں قبیلے مکے سے آنے والے مہاجرین کے ساتھ ایسے بے نظیر ایثار و محبّت کا برتاؤ کر رہے تھے جو ایک خاندان کے لوگ بھی آپس میں نہیں کرتے۔

۸۵ – یعنی اگر تم آنکھیں رکھتے ہو تو ان علامتوں کو دیکھ کر خود اندازہ کر سکتے ہو کہ آیا تمھاری فلاح اِس دین کو مضبوط تھامنے میں ہے، یا اسے چھوڑ کر پھر اُسی حالت کی طرف پلٹ جانے میں جس کے اندر تم پہلے مبتلا تھے؟ آیا تمھارا اصلی خیر خواہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہے، یا وہ یہودی اور مشرک اور منافق لوگ جو تم کو حالتِ سابقہ کی طرف پلٹا لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں؟

بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾
وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ
تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ
اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ اَمَّا
الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ

حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ کہیں تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کُھلی کُھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے[۸۶]۔ جنھوں نے یہ روش اختیار کی وہ اُس روز سخت سزا پائیں گے جب کہ کچھ لوگ سُرخ رُو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہو گا، جن کا منہ کالا ہو گا (ان سے کہا جائے گا کہ) نعمتِ ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کافرانہ رَوِیّہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اِس کفرانِ نعمت کے صلے میں عذاب کا مزا چکھو۔ رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامنِ رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ وہ اسی حالت میں رہیں گے۔ یہ اللہ کے ارشادات ہیں جو ہم تمھیں ٹھیک ٹھیک سُنا رہے ہیں

۸۶ – یہ اشارہ اُن اُمّتوں کی طرف ہے جنھوں نے خدا کے پیغمبروں سے دینِ حق کی صاف اور سیدھی تعلیمات پائیں مگر کچھ مدّت گزر جانے کے بعد اساسِ دین کو چھوڑ دیا اور غیر متعلق ضمنی و فُروعی مسائل کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنانے شروع کر دیے، پھر فضول و لایعنی باتوں پر جھگڑنے میں ایسے مشغول ہوئے کہ نہ انھیں اُس کام کا ہوش رہا جو اللہ نے ان کے سُپرد کیا تھا، اور نہ عقیدہ و اَخلاق کے اُن بنیادی اُصولوں سے کوئی دلچسپی رہی جن پر درحقیقت انسان کی فلاح وسعادت کا مدار ہے۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى
الۡاَرۡضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۱۰۹﴾ ع كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ
اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ
وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوۡ اٰمَنَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ ؕ مِنۡهُمُ

ع ۱۱ ۲

کیونکہ اللہ دنیا والوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔[۸۷] زمین و آسمان کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ ع

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔[۸۸] تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہلِ کتاب[۸۹] ایمان لاتے تو انھی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ

---

۸۷ – یعنی چونکہ اللہ دُنیا والوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا، اس لیے وہ ان کو سیدھا راستہ بھی بتا رہا ہے اور اِس بات سے بھی انھیں قبل از وقت آگاہ کیے دیتا ہے کہ آخرکار وہ کن اُمور پر اُن سے باز پرس کرنے والا ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ کج روی اختیار کریں اور اپنے غلط طرزِ عمل سے باز نہ آئیں، وہ اپنے اُوپر آپ ظلم کریں گے۔

۸۸ – یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ بَقَرہ کے سترھویں رُکوع میں بیان ہو چکا ہے۔ نبیِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے بنی اسرائیل اپنی نااہلی کے باعث معزول کیے جا چکے ہیں، اس پر اب تم مامور کیے گئے ہو۔ اس لیے کہ اَخلاق و اعمال کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ بن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہوگئی ہیں جو امامتِ عادلہ کے لیے ضروری ہیں، یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ وعمل اور اللہ وحدہٗ لاشریک کو اعتقاداً وعملاً اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرنا۔ لہٰذا اب یہ کام تمھارے سُپرد کیا گیا ہے اور تمھیں لازم ہے کہ اپنی ذمّہ داریوں کو سمجھو اور اُن غَلَطیوں سے بچو جو تمھارے پیش رَو کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۲۳ و ۱۴۴)

۸۹ – یہاں اہلِ کتاب سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔

الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ
وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ قف ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ
وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا
يَعْتَدُوْنَ ۟ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ

ایمان دار بھی پائے جاتے ہیں، مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔ یہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلے میں پیٹھ دکھائیں گے، پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلّت کی مار ہی پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اَور بات ہے۔[90] یہ اللہ کے غضب میں گھِر چکے ہیں، ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے، اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔

مگر سارے اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہِ راست پر قائم ہیں،

۹۰ – یعنی دنیا میں اگر کہیں ان کو تھوڑا بہت امن چین نصیب بھی ہوا ہے تو وہ ان کے اپنے بل بُوتے پر قائم کیا ہوا امن و چین نہیں ہے، بلکہ دوسروں کی حمایت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ کہیں کسی مسلم حکومت نے ان کو خدا کے نام پر امان دے دی، اور کہیں کسی غیر مسلم حکومت نے اپنے طور پر انھیں اپنی حمایت میں لے لیا۔ اسی طرح بسا اوقات انھیں دُنیا میں کہیں زور پکڑنے کا موقع بھی مل گیا ہے، لیکن وہ بھی اپنے زورِ بازو سے نہیں بلکہ محض ”بپائے مردی ہمسایہ“۔

يَّتۡلُوۡنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيۡلِ وَهُمۡ يَسۡجُدُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ
وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ
وَيُسَارِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرٰتِؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا
يَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلَنۡ يُّكۡفَرُوۡهُؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ
الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ
شَيۡـئًاؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا
يُنۡفِقُوۡنَ فِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَثَلِ رِيۡحٍ فِيۡهَا صِرٌّ اَصَابَتۡ
حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَاَهۡلَكَتۡهُؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ

راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، بُرائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی، اللہ پرہیزگار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کا رویّہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلے میں ان کو نہ ان کا مال کچھ کام دے گا نہ اولاد، وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں اور آگ ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی اس دُنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں اُس کی مثال اُس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے۔[91] اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا،

۹۱ – اس مثال میں کھیتی سے مراد یہ کِشتِ حیات ہے جس کی فصل آدمی کو آخرت میں کاٹنی ہے۔ ہَوا سے مراد وہ اُوپری جذبۂ خیر ہے جس کی بنا پر کفار رفاہِ عام کے کاموں اور خیرات وغیرہ میں دولت صَرف کرتے ہیں۔ اور پالے سے مراد صحیح ایمان اور ضابطۂ خداوندی کی پیروی کا فُقدان ہے، جس کی وجہ سے ان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ

وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا
تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا

درحقیقت یہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دُوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔ وہ تمھاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اُٹھانے میں نہیں چُوکتے[۹۲]۔ تمھیں جس چیز سے

اس تمثیل سے یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس طرح ہَوا کھیتیوں کی پرورش کے لیے مفید ہے لیکن اگر اسی ہَوا میں پالا ہو تو وہ کھیتی کو پرورش کرنے کے بجائے اسے تباہ کر ڈالتی ہے، اسی طرح خیرات بھی اگرچہ انسان کے مَزرَعۂ آخرت کو پرورش کرنے والی چیز ہے، مگر جب اس کے اندر کفر کا زہر ملا ہوا ہو تو یہی خیرات مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مہلک بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا مالک اللہ ہے، اور اُس مال کا مالک بھی اللہ ہی ہے جس میں انسان تصرُّف کر رہا ہے، اور یہ مملکت بھی اللہ ہی کی ہے جس کے اندر رہ کر انسان کام کر رہا ہے۔ اب اگر اللہ کا یہ غلام اپنے مالک کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتا، یا اس کی بندگی کے ساتھ کسی اور کی ناجائز بندگی بھی شریک کرتا ہے، اور اللہ کے مال اور اس کی مملکت میں تصرُّف کرتے ہوئے اس کے قانون وضابطہ کی اطاعت نہیں کرتا، تو اس کے یہ تمام تصرُّفات از سرتاپا جُرم بن جاتے ہیں۔ اجر ملنا کیسا، وہ تو اس کا مستحق ہے کہ اِن تمام حرکات کے لیے اس پر فوجداری کا مقدّمہ قائم کیا جائے۔ اُس کی خیرات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نوکر اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اس کا خزانہ کھولے اور جہاں جہاں اپنی دانست میں مناسب سمجھے، خرچ کر ڈالے۔

۹۲ – مدینے کے اطراف میں جو یہودی آباد تھے، ان کے ساتھ اَوس اور خَزرَج کے لوگوں کی قدیم زمانے سے دوستی چلی آتی تھی۔ انفرادی طور پر بھی اِن قبیلوں کے افراد اُن کے افراد سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے۔ جب اَوس اور خَزرَج کے قبیلے مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ وہی پُرانے تعلقات نباہتے رہے اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی محبّت وخلوص کے ساتھ ملتے رہے۔ لیکن یہودیوں کو نبیِ عَرَبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے مشن سے جو عداوت ہو گئی تھی، اس کی بنا پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ محبّت رکھنے کے لیے تیار نہ تھے جو اس نئی تحریک میں شامل ہو گیا ہو۔ انھوں نے انصار کے ساتھ ظاہر میں تو وہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آتے تھے، مگر دل میں وہ اب ان کے سخت دشمن ہو چکے تھے، اور اس ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ وفساد برپا کر دیں، اور ان کے جماعتی راز معلوم کر کے ان کے دشمنوں تک

مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِیْ
صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ
وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ ؕ قُلْ
مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ
تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا
بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْـًٔا ؕ

نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمھیں صاف صاف ہدایات دے دی ہیں، اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان سے تعلّق رکھنے میں احتیاط برتو گے)۔ تم ان سے محبّت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبّت نہیں رکھتے، حالانکہ تم تمام کُتبِ آسمانی کو مانتے ہو۔[۹۳] جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی (تمھارے رسول اور تمھاری کتاب کو) مان لیا ہے، مگر جب جُدا ہوتے ہیں تو تمھارے خلاف ان کے غیظ وغضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں ـــــ ان سے کہہ دو کہ اپنے غصے میں آپ جل مرو، اللہ دلوں کے چُھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ـــــ تمھارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے، اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہوسکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔

پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ یہاں ان کی اسی منافقانہ رَوش سے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔

۹۳۔ یعنی یہ عجیب ماجرا ہے کہ شکایت بجائے اِس کے کہ تمھیں اُن سے ہوتی، اُن کو تم سے ہے۔ تم تو

ع ۱۲

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ط

جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس پر حاوی ہے۔ ع

(اے ۹۴ پیغمبرؐ! مسلمانوں کے سامنے اُس موقع کا ذکر کرو) جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور (اُحُد کے میدان میں) مسلمانوں کو جنگ کے لیے جا بجا مامور کر رہے تھے۔

قرآن کے ساتھ تورات کو بھی مانتے ہو، اس لیے اُن کو تم سے شکایت ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ البتہ شکایت اگر ہو سکتی تھی تو تمھیں اُن سے ہو سکتی تھی کیونکہ وہ قرآن کو نہیں مانتے۔

۹۴ – یہاں سے چوتھا خطبہ شروع ہوتا ہے۔ یہ جنگِ اُحُد کے بعد نازل ہوا ہے اور اس میں جنگِ اُحُد پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اُوپر کے خطبے کو ختم کرتے ہوئے آخر میں ارشاد ہوا تھا کہ ”ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی، بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔“ اب چونکہ اُحُد کے میدان میں مسلمانوں کی شکست کا سبب ہی یہ ہوا کہ ان کے اندر صبر کی بھی کمی تھی اور ان کے افراد سے بعض ایسی غلطیاں بھی سرزد ہوئی تھیں جو خدا ترسی کے خلاف تھیں، اس لیے یہ خطبہ جس میں اُنھیں ان کمزوریوں پر مُتنبّہ کیا گیا ہے، مندرجہ بالا فقرے کے بعد ہی متصلاً درج کیا گیا۔

اس خطبے کا اندازِ بیان یہ ہے کہ جنگِ اُحُد کے سلسلے میں جتنے اہم واقعات پیش آئے تھے، ان میں سے ایک ایک کو لے کر اس پر چند جچے تُلے فقروں میں نہایت سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس کے واقعاتی پَس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

شوّال ۳ ھ کی ابتدا میں کفارِ قریش تقریباً ۳ ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر حملہ آور ہوئے۔ تعداد کی کثرت کے علاوہ ان کے پاس ساز و سامان بھی مسلمانوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا، اور پھر وہ جنگِ بَدر کے انتقام کا شدید جوش بھی رکھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تجربہ کار صحابہؓ کی رائے یہ تھی کہ مدینے میں محصور ہو کر مُدافعت کی جائے۔ مگر چند نوجوانوں نے، جو شہادت کے شوق سے بے تاب تھے اور جنھیں بَدر کی جنگ میں شریک ہونے کا موقع نہ ملا تھا، باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ آخر کار اُن کے اصرار سے مجبُور ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر نکلنے ہی کا فیصلہ فرما لیا۔ ایک ہزار آدمی آپؐ کے ساتھ نکلے، مگر مقامِ شَوط پر پہنچ کر عبداللہ ابنِ اُبَیّ اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ عین وقت پر اس کی اس حرکت سے مسلمانوں کے لشکر میں اچھا خاصا اضطراب پھیل گیا، حتّٰی کہ بنو سَلَمہ اور بنو حارِثہ کے لوگ تو ایسے دل شکستہ ہوئے کہ انھوں نے بھی پلٹ جانے کا ارادہ کر لیا تھا، مگر پھر اُولُوا العزم صحابہؓ کی کوششوں سے یہ اضطراب رفع ہو گیا۔ اِن باقی ماندہ سات سو آدمیوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور اُحُد کی پہاڑی کے دامن میں (مدینہ سے تقریباً چار میل کے

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٢١﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا

اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور وہ نہایت باخبر ہے۔
یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بُزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے[95] تھے، حالانکہ

فاصلے پر) اپنی فوج کو اس طرح صف آرا کیا کہ پہاڑ پشت پر تھا اور قریش کا لشکر سامنے۔ پہلو میں صرف ایک دَرّہ ایسا تھا جس سے اچانک حملے کا خطرہ ہوسکتا تھا۔ وہاں آپؐ نے عبداللہؓ بن جُبَیر کے زیرِ قیادت پچاس تیر انداز بٹھا دیے اور ان کو تاکید کر دی کہ ''کسی کو ہمارے قریب نہ پھٹکنے دینا، کسی حال میں یہاں سے نہ ہٹنا، اگر تم دیکھو کہ ہماری بوٹیاں پرندے نوچے لیے جاتے ہیں تب بھی تم اس جگہ سے نہ ٹلنا۔'' اس کے بعد جنگ شروع ہوئی۔ ابتداءً مسلمانوں کا پلّا بھاری رہا، یہاں تک کہ مقابل کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ لیکن اس ابتدائی کامیابی کو کامل فتح کی حد تک پہنچانے کے بجائے مسلمان مالِ غنیمت کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور انھوں نے دشمن کے لشکر کو لُوٹنا شروع کر دیا۔ اُدھر جن تیر اندازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا، انھوں نے جو دیکھا کہ دشمن بھاگ نکلا ہے اور غنیمت لُٹ رہی ہے، تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر غنیمت کی طرف لپکے۔ حضرت عبداللہؓ بن جُبَیر نے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تاکیدی حکم یاد دلا کر بہتیرا روکا، مگر چند آدمیوں کے سوا کوئی نہ ٹھیرا۔ اس موقع سے خالد بن ولید نے، جو اس وقت لشکرِ کفار کے رسالے کی کمان کر رہے تھے، بروقت فائدہ اُٹھایا اور پہاڑی کا چکر کاٹ کر پہلو کے دَرّے سے حملہ کر دیا۔ عبداللہؓ بن جُبَیر نے، جن کے ساتھ صرف چند ہی آدمی رہ گئے تھے، اس حملے کو روکنا چاہا مگر مُدافعت نہ کر سکے اور یہ سیلاب یکایک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ دُوسری طرف جو دشمن بھاگ گئے تھے، وہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہو گئے۔ اس طرح لڑائی کا پانسا ایک دم پلٹ گیا اور مسلمان اس غیر متوقع صورتِ حال سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ ان کا ایک بڑا حصّہ پراگندہ ہو کر بھاگ نکلا۔ تاہم چند بہادر سپاہی ابھی تک میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اتنے میں کہیں سے یہ افواہ اُڑ گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اس خبر نے صحابہؓ کے رہے سہے ہوش وحواس بھی گم کر دیے اور باقی ماندہ لوگ بھی ہمّت ہار کر بیٹھ گئے۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد وپیش صرف دس بارہ جاں نثار رہ گئے تھے اور آپؐ خود زخمی ہو چکے تھے۔ شکست کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔ لیکن عین وقت پر صحابہؓ کو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں، چنانچہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر پھر آپؐ کے گرد جمع ہو گئے اور آپؐ کو بسلامت پہاڑی کی طرف لے گئے۔ اس موقع پر یہ ایک مُعَمّا ہے جو حل نہیں ہو سکا کہ وہ کیا چیز تھی جس نے کفارِ مکہ کو خود بخود واپس پھیر دیا۔ مسلمان اس قدر پراگندہ ہو چکے تھے کہ ان کا پھر مجتمع ہو کر باقاعدہ جنگ کرنا مشکل تھا۔ اگر کفار اپنی فتح کو کمال تک پہنچانے پر اصرار کرتے تو ان کی کامیابی بعید نہ تھی۔ مگر نہ معلوم کس طرح وہ آپ ہی آپ میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ
نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ
رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ
تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ
بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا
بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۗ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ آخر اس سے پہلے جنگِ بدر میں اللہ تمھاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، اُمید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔

یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے: ”کیا تمھارے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اُتار کر تمھاری مدد کرے؟“ ــــ بے شک[۹۶]، اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمھارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اُسی آن تمھارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحبِ نشان فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمھیں اس لیے بتا دی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمھارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے

۹۵ – یہ اشارہ ہے بنوسَلِمہ اور بنوحارثہ کی طرف، جن کی ہمتیں عبداللہ بن اُبَیّ اور اس کے ساتھیوں کی واپسی کے بعد پست ہوگئی تھیں۔

۹۶ – مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ایک طرف دشمن تین ہزار ہیں اور ہمارے ایک ہزار میں سے بھی تین سو الگ ہوگئے ہیں، تو ان کے دل ٹوٹنے لگے۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ الفاظ کہے تھے۔

الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿١٢٦﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ
يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿١٢٧﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ
شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿١٢٨﴾ وَ
لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ
يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢٩﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ

جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے۔ (اور یہ مدد وہ تمھیں اس لیے دے گا) تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے، یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔

(اے پیغمبرؐ!) فیصلے کے اختیارات میں تمھارا کوئی حصّہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انھیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے، جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے، وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔[97] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ بڑھتا اور چڑھتا سُود کھانا چھوڑ دو[98] اور اللہ سے ڈرو،

۹۷- نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب زخمی ہوئے تو آپؐ کے منہ سے کفار کے حق میں بدُعا نکل گئی اور آپؐ نے فرمایا کہ ”وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کو زخمی کرے۔“ یہ آیات اسی کے جواب میں ارشاد ہوئی ہیں۔

۹۸- اُحُد کی شکست کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین کامیابی کے موقع پر مال کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور اپنے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے بجائے غنیمت لُوٹنے میں لگ گئے۔ اس لیے حکیمِ مُطلَق نے اس حالت کی اصلاح کے لیے زر پرستی کے سرچشمے پر بند باندھنا ضروری سمجھا اور حکم دیا کہ سُودخواری سے باز آؤ، جس میں آدمی رات دن اپنے نفع کے بڑھنے اور چڑھنے کا حساب لگاتا رہتا ہے، اور جس کی وجہ سے آدمی کے اندر روپے کی حرص بے حد بڑھتی

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾
وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَ سَارِعُوْٓا
اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ
وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي
السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ
النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا

اُمید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اُس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے مہیّا کی گئی ہے اور اللہ اور رسُول کا حکم مان لو، توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ دَوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اُس جنّت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اور وہ اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیّا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصّے کو پی جاتے ہیں اور دُوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں — ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں[99] — اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فُحش کام

چلی جاتی ہے۔

۹۹ – سُود خواری جس سوسائٹی میں موجود ہوتی ہے، اس کے اندر سُود خواری کی وجہ سے دو قسم کے اَخلاقی امراض پیدا ہوتے ہیں: سُود لینے والوں میں حرص و طمع، بُخل اور خود غرضی۔ اور سُود دینے والوں میں نفرت، غصّہ اور بُغض و حسد۔ اُحُد کی شکست میں ان دونوں قسم کی بیماریوں کا کچھ نہ کچھ حصّہ شامل تھا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ سُود خواری سے فریقین میں جو اَخلاقی اوصاف پیدا ہوتے ہیں، ان کے بالکل برعکس اِنفاق فی سبیل اللہ سے یہ دُوسری قسم کے اوصاف پیدا ہوا کرتے ہیں، اور اللہ کی بخشش اور اس کی جنت اسی دُوسری قسم کے اوصاف سے حاصل ہو سکتی ہے، نہ کہ پہلی قسم کے اوصاف سے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۳۲۰)

فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا
لِذُنُوْبِهِمْ ۖ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۖ قف وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا
فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٥﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ
الْعٰمِلِيْنَ ﴿١٣٦﴾ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي
الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٣٧﴾ هٰذَا بَيَانٌ
لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٨﴾ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا
تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾ اِنْ

ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اُوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں ـــــ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو ـــــ اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انھیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔ تم سے پہلے بہت سے دَور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ اُن لوگوں کا کیا انجام ہوا جنھوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات) کو جُھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لیے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں اُن کے لیے ہدایت اور نصیحت۔

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اِس وقت اگر

يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَ تِلْكَ
الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۴۰﴾
وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ
اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ
يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ

تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمھارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔[۱۰۰] یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا تھا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں[۱۰۱] ــــــ کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں ــــــ اور وہ اِس آزمایش کے ذریعے سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یُونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم تو موت کی تمنّائیں کر رہے تھے! مگر یہ اُس وقت کی بات تھی جب

۱۰۰ – اشارہ ہے جنگِ بَدر کی طرف۔ اور کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب اُس چوٹ کو کھا کر کافر پست ہمّت نہ ہوئے تو اس چوٹ پر تم کیوں ہمّت ہارو۔

۱۰۱ – اصل الفاظ ہیں: وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ – اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم میں سے کچھ شہید لینا چاہتا تھا، یعنی کچھ لوگوں کو شہادت کی عزّت بخشنا چاہتا تھا۔ اور دُوسرا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اور منافقین کے اُس مخلوط گروہ میں سے، جس پر تم اِس وقت مشتمل ہو، اُن لوگوں کو الگ چھانٹ لینا چاہتا تھا جو حقیقت میں شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ہیں، یعنی اُس منصبِ جلیل کے اہل ہیں جس پر ہم نے اُمّتِ مسلمہ کو سرفراز کیا ہے۔

ع ۱۴

اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ ع وَمَا مُحَمَّدٌ
اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ
قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ
فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا
كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ

موت سامنے نہ آئی تھی، لو اب وہ تمھارے سامنے آ گئی اور تم نے اُسے آنکھوں دیکھ لیا۔[102] ع

محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسُول ہیں، اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟[103] یاد رکھو! جو اُلٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دے گا۔

کوئی ذی رُوح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔[104]

---

۱۰۲ – اشارہ ہے شہادت کے اُن تمنائیوں کی طرف جن کے اصرار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔

۱۰۳ – جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو اکثر صحابہؓ کی ہمتیں چھوٹ گئیں۔ اس حالت میں منافقین نے (جو مسلمانوں کے ساتھ ہی لگے ہوئے تھے) کہنا شروع کیا کہ چلو عبداللہ بن اُبَیّ کے پاس چلیں، تاکہ وہ ہمارے لیے ابوسُفیان سے امان لے دے۔ اور بعض نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر محمدؐ خدا کے رسول ہوتے تو قتل کیسے ہوتے، چلو اب دینِ آبائی کی طرف لوٹ چلیں۔ انھی باتوں کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر تمھاری ''حق پرستی'' محض محمدؐ کی شخصیت سے وابستہ ہے اور تمھارا اسلام ایسا سُست بنیاد ہے کہ محمدؐ کے دُنیا سے رخصت ہوتے ہی تم اسی کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے جس سے نکل کر آئے تھے، تو اللہ کے دین کو تمھاری ضرورت نہیں ہے۔

۱۰۴ – اس سے یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ موت کے خوف سے تمھارا بھاگنا فضول ہے۔ کوئی شخص نہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوئے وقت سے پہلے مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے۔

وَمَنۡ يُّرِدۡ ثَوَابَ الدُّنۡيَا نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ ثَوَابَ
الۡاٰخِرَةِ نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا ؕ وَسَنَجۡزِى الشّٰكِرِيۡنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ
نَّبِىٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَهُمۡ فِىۡ

جو شخص ثوابِ دُنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے، اور جو ثوابِ آخرت[۱۰۵] کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے[۱۰۶] والوں کو ہم اُن کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اِس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مِل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں ان سے وہ

لہٰذا تم کو فکر موت سے بچنے کی نہیں بلکہ اس بات کی ہونی چاہیے کہ زندگی کی جو مُہلت بھی تمھیں حاصل ہے، اس میں تمھاری سعی و جُہد کا مقصود کیا ہے، دنیا یا آخرت؟

۱۰۵- ثواب کے معنٰی ہیں نتیجۂ عمل۔ ثوابِ دُنیا سے مراد وہ فوائد و مَنافع ہیں جو انسان کو اُس کی سعی و عمل کے نتیجے میں اِسی دُنیا کی زندگی میں حاصل ہوں۔ اور ثوابِ آخرت سے مراد وہ فوائد و مَنافع ہیں جو اسی سعی و عمل کے نتیجے میں آخرت کی پائدار زندگی میں حاصل ہوں گے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے انسانی اَخلاق کے معاملے میں فیصلہ کُن سوال یہی ہے کہ کارزارِ حیات میں آدمی جو دَوڑ دھوپ کر رہا ہے، اس میں آیا وہ دُنیوی نتائج پر نگاہ رکھتا ہے یا اُخروی نتائج پر۔

۱۰۶- ”شکر کرنے والوں“ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی اِس نعمت کے قدر شناس ہوں کہ اُس نے دین کی صحیح تعلیم دے کر انھیں دُنیا اور اس کی محدود زندگی سے بہت زیادہ وسیع، ایک ناپیدا کنار عالَم کی خبر دی، اور انھیں اس حقیقت سے آگاہی بخشی کہ انسانی سعی و عمل کے نتائج صرف اس دنیا کی چند سالہ زندگی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ اس زندگی کے بعد ایک دُوسرے عالَم تک ان کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔ یہ وسعتِ نظر اور یہ دُور بینی و عاقبت اندیشی حاصل ہو جانے کے بعد جو شخص اپنی کوششوں اور محنتوں کو اِس دُنیوی زندگی کے ابتدائی مرحلے میں بار آور ہوتے نہ دیکھے، یا ان کا برعکس نتیجہ نکلتا دیکھے، اور اس کے باوجود اللہ کے بھروسے پر وہ کام کرتا چلا جائے جس کے متعلق اللہ نے اسے یقین دلایا ہے کہ بہر حال آخرت میں اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلے گا، وہ شکر گزار بندہ ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اس کے بعد بھی دنیا پرستی کی تنگ نظری میں مُبتلا رہیں، جن کا حال یہ ہو کہ دنیا میں جن غلط کوششوں کے بظاہر اچھے نتائج نکلتے نظر آئیں، ان کی طرف وہ آخرت کے بُرے نتائج کی پروا کیے بغیر جھک پڑیں، اور جن صحیح کوششوں کے یہاں بار آور ہونے کی اُمید نہ ہو، یا جن سے یہاں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو، اُن میں آخرت کے نتائج خیر کی اُمید پر اپنا وقت، اپنے مال اور اپنی قوتیں

سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَکَانُوۡا ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾
وَ مَا کَانَ قَوۡلَہُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا
وَ اِسۡرَافَنَا فِیۡۤ اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ
الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىہُمُ اللّٰہُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَۃِ ؕ
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۴۸﴾ ع یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِیۡعُوا
الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَرُدُّوۡکُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِیۡنَ ﴿۱۴۹﴾

ع ۱۵ / ۶

دل شکستہ نہیں ہوئے ، انھوں نے کمزوری نہیں دکھائی ، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے۔[107] ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ان کی دُعا بس یہ تھی کہ ”اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔“ آخرکار اللہ نے ان کو دُنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثوابِ آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اُن لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو اُلٹا پھیر لے جائیں[108] گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔

صَرف کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، وہ ناشکرے ہیں اور اُس علم کے ناقدر شناس ہیں جو اللہ نے انھیں بخشا ہے۔

۱۰۷ – یعنی اپنی قلّتِ تعداد اور بے سروسامانی ، اور کفار کی کثرت اور زور آوری دیکھ کر انھوں نے باطل پرستوں کے آگے سِپَر نہیں ڈالی۔

۱۰۸ – یعنی جس کفر کی حالت سے تم نکل کر آئے ہو، اُسی میں یہ تمھیں پھر واپس لے جائیں گے۔ منافقین اور یہودی اُحُد کی شکست کے بعد مسلمانوں میں یہ خیال پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ محمدؐ اگر واقعی نبی ہوتے تو شکست کیوں کھاتے۔ یہ تو ایک معمولی آدمی ہیں۔ ان کا معاملہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح ہے۔ آج فتح ہے تو کل

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ
سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾
وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى
اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ
اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ
يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا

(اُن کی باتیں غلط ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمھارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرینِ حق کے دلوں میں رُعب بٹھا دیں گے، اس لیے کہ اُنھوں نے اللہ کے ساتھ اُن کو خدائی میں شریک ٹھیرایا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ اُن کا آخری ٹھکانا جہنّم ہے اور بہت ہی بُری ہے وہ قیام گاہ جو اُن ظالموں کو نصیب ہو گی۔

اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اُس کے حکم سے تم ہی اُن کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی محبّت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے ـــــ اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے ـــــ تب اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تا کہ تمھاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی

شکست۔ خدا کی جس حمایت و نصرت کا انھوں نے تم کو یقین دلا رکھا ہے، وہ محض ایک ڈھونگ ہے۔

عَنۡكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا
تَلۡوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡۤ اُخۡرٰٮكُمۡ فَاَثَابَكُمۡ غَمًّۢا
بِغَمٍّ لِّـكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ
بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَةً

تمھیں معاف ہی کر دیا[۱۰۹] کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرِ عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمھیں نہ تھا، اور رسولؐ تمھارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔[۱۱۰] اُس وقت تمھاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمھیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیے[۱۱۱] تاکہ آیندہ کے لیے تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمھارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کردی

۱۰۹ – یعنی تم نے غَلَطی تو ایسی کی تھی کہ اگر اللہ تمھیں معاف نہ کر دیتا تو اس وقت تمھارا اِستیصال ہو جاتا۔ یہ اللہ کا فضل تھا اور اس کی تائید وحمایت تھی جس کی بدولت تمھارے دشمن تم پر قابو پا لینے کے بعد ہوش گم کر بیٹھے اور بلا وجہ خود پسپا ہو کر چلے گئے۔

۱۱۰ – جب مسلمانوں پر اچانک دو طرف سے بیک وقت حملہ ہوا اور ان کی صفوں میں ابتری پھیل گئی، تو کچھ لوگ مدینے کی طرف بھاگ نکلے اور کچھ اُحُد پر چڑھ گئے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک انچ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ دُشمنوں کا چاروں طرف ہجوم تھا، دس بارہ آدمیوں کی مٹھی بھر جماعت پاس رہ گئی تھی، مگر اللہ کا رسُول اس نازک موقع پر بھی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جما ہوا تھا اور بھاگنے والوں کو پکار رہا تھا: اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ، اللہ کے بندو! میری طرف آؤ، اللہ کے بندو! میری طرف آؤ۔

۱۱۱ – رنج ہزیمت کا، رنج اس خبر کا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، رنج اپنے کثیر التعداد مقتولوں اور مجروحوں کا، رنج اس بات کا کہ اب گھروں کی بھی خیر نہیں، تین ہزار دشمن، جن کی تعداد مدینے کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ

نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ
يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا
مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ
شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ
كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ

کہ وہ اُونگھنے لگے۔[112] مگر ایک دوسرا گروہ، جس کے لیے ساری اہمیّت بس اپنے مفاد ہی کی تھی، اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ ”اِس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصّہ ہے“؟ ان سے کہو: ”(کسی کا کوئی حصّہ نہیں) اِس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔“ دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھُپائے ہوئے ہیں اُسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ ”اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصّہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔“ ان سے کہہ دو کہ ”اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہُوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نِکل آتے۔“ اور یہ معاملہ جو پیش آیا، یہ تو اس لیے تھا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ

ہے، شکست خوردہ فوج کو روندتے ہوئے قصبے میں آ گھُسیں گے اور سب کو تباہ کر دیں گے۔

۱۱۲ – یہ ایک عجیب تجربہ تھا جو اس وقت لشکرِ اسلام کے بعض لوگوں کو پیش آیا۔ حضرت ابوطلحہؓ جو اس جنگ میں شریک تھے، خود بیان کرتے ہیں کہ اس حالت میں ہم پر اُونگھ کا ایسا غلبہ ہو رہا تھا کہ تلواریں ہاتھ سے چھُوٹی پڑتی تھیں۔

صُدُوۡرِكُمۡ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوۡرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡكُمۡ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ ۙ
اِنَّمَا اسۡتَزَلَّهُمُ الشَّيۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا كَسَبُوۡا ‌ۚ وَلَقَدۡ عَفَا اللّٰهُ
عَنۡهُمۡ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۱۵۵﴾ؑ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا
تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَقَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ اِذَا ضَرَبُوۡا فِى
الۡاَرۡضِ اَوۡ كَانُوۡا غُزًّى لَّوۡ كَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَمَا
قُتِلُوۡا ‌ۚ لِيَجۡعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسۡرَةً فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ يُحۡىٖ وَ

اُسے آزمالے اور جو کھوٹ تمھارے دلوں میں ہے اُسے چھانٹ دے، اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلے کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے اُن کی اِس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے اُن کے قدم ڈگمگا دیے تھے۔ اللہ نے انھیں معاف کر دیا، اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔ؑ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثے سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے[۱۱۳]، ورنہ دراصل مارنے اور جِلانے والا تو

۱۱۳ – یعنی یہ باتیں حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قضائے الٰہی کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی۔ مگر جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور سب کچھ اپنی تدبیروں ہی پر موقوف سمجھتے ہیں، ان کے لیے اس قسم کے قیاسات بس داغِ حسرت بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں کہ کاش! یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا۔

يُمِيتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَىِٕنْ قُتِلْتُمْ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ
مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَىِٕنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ
فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ
وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِنْ
يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ

اللہ ہی ہے اور تمھاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمھارے حصے میں آئے گی وہ اُن ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنھیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔

(اے پیغمبرؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خُو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ اِن کے قُصور معاف کر دو، اِن کے حق میں دُعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو، پھر جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔ اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، اور وہ تمھیں چھوڑ دے تو اس کے بعد

فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَمَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ ؕ وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ
بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ
لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ

کون ہے جو تمھاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچّے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔

کسی نبی کا یہ کام نہیں ہوسکتا کہ وہ خیانت کر جائے[۱۱۴] ــــــ اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا، پھر ہر متنفّس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مِل جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہو گا ــــــ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو وہ اُس شخص کے سے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گِھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانا جہنّم ہو جو بدترین ٹھکانا ہے؟ اللہ کے نزدیک

۱۱۴ – جن تیر اندازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عَقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا، انھوں نے جب دیکھا کہ دُشمن کا لشکر لُوٹا جا رہا ہے تو ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ساری غنیمت انھی لوگوں کو نہ مل جائے جو اسے لُوٹ رہے ہیں اور ہم تقسیم کے موقع پر محروم رہ جائیں۔ اسی بنا پر انھوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو آپؐ نے اُن لوگوں کو بُلا کر اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے جواب میں کچھ عُذرات پیش کیے جو نہایت کمزور تھے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: بل ظننتم انا نغل ولا نقسم لکم۔ "اصل بات یہ ہے کہ تم کو ہم پر اطمینان نہ تھا، تم نے یہ گمان کیا کہ ہم تمھارے ساتھ خیانت کریں گے اور تم کو حصّہ نہیں دیں گے۔" اس آیت کا اشارہ اسی معاملے کی طرف ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب تمھاری فوج کا کمانڈر خود اللہ کا نبی تھا اور سارے معاملات اس کے ہاتھوں میں تھے، تو تمھارے دل میں یہ اندیشہ پیدا کیسے ہوا کہ نبی کے ہاتھ میں تمھارا مفاد محفوظ نہ ہوگا۔ کیا خدا کے پیغمبر سے یہ توقع رکھتے ہو کہ جو مال اس کی نگرانی میں ہو، وہ دیانت، امانت اور انصاف کے سوا

عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ
النصف وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ اَوَلَمَّآ
اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ

دونوں قسم کے آدمیوں میں بدرجہا فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔

درحقیقت اہلِ ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انھی میں سے ایک ایسا پیغمبر اُٹھایا جو اس کی آیات انھیں سُناتا ہے، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور اُن کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

اور یہ تمھارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے: یہ کہاں سے آئی؟[115] حالانکہ (جنگِ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمھارے ہاتھوں (فریقِ مخالف پر) پڑ چکی ہے۔[116]

کسی اور طریقے سے بھی تقسیم ہو سکتا ہے؟

۱۱۵ – اکابر صحابہؓ تو خیر حقیقت شناس تھے اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو سکتے تھے، مگر عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ جب اللہ کا رسولؐ ہمارے درمیان موجود ہے اور اللہ کی تائید و نصرت ہمارے ساتھ ہے، تو کسی حال میں کفار ہم پر فتح پا ہی نہیں سکتے۔ اس لیے جب اُحُد میں ان کو شکست ہوئی تو ان کی توقعات کو سخت صدمہ پہنچا اور انھوں نے حیران ہو کر پوچھنا شروع کیا کہ یہ کیا ہوا؟ ہم اللہ کے دین کی خاطر لڑنے گئے، اس کا وعدۂ نصرت ہمارے ساتھ تھا، اُس کا رسول خود میدانِ جنگ میں موجود تھا، اور پھر بھی ہم شکست کھا گئے؟ اور شکست بھی اُن سے جو اللہ کے دین کو مٹانے آئے تھے؟ یہ آیات اِسی حیرانی کو دُور کرنے کے لیے ارشاد ہوئی ہیں۔

۱۱۶ – جنگِ اُحُد میں مسلمانوں کے ۷۰ آدمی شہید ہوئے۔ بخلاف اس کے جنگِ بدر میں کفار کے ۷۰ آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور ۷۰ آدمی گرفتار ہو کر آئے تھے۔

قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۶۵﴾
وَمَاۤ اَصَابَكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِیَعْلَمَ
الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ نَافَقُوْا ۖۚ وَقِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا
لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ یَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِیْمَانِ ۚ
یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

اے نبیؐ! اِن سے کہو: یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے[117]، اللہ ہر چیز پر قادر ہے[118]۔ جو نقصان لڑائی کے دن تمھیں پہنچا وہ اللہ کے اِذن سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون۔ وہ منافق کہ جب اُن سے کہا گیا، آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو، تو کہنے لگے: اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے[119]۔ یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اُس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے

۱۱۷ – یعنی یہ تمھاری اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ تم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا، بعض کام تقویٰ کے خلاف کیے، حکم کی خلاف ورزی کی، مال کی طمع میں مبتلا ہوئے، آپس میں نزاع و اختلاف کیا، پھر کیوں پُوچھتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی؟

۱۱۸ – یعنی اللہ اگر تمھیں فتح دینے کی قدرت رکھتا ہے تو شکست دلوانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

۱۱۹ – عبداللہ بن اُبَیّ جب تین سو منافقوں کو اپنے ساتھ لے کر راستے سے پلٹنے لگا تو بعض مسلمانوں نے جا کر اُسے سمجھانے کی کوشش کی اور ساتھ چلنے کے لیے راضی کرنا چاہا۔ مگر اس نے جواب دیا کہ ہمیں یقین ہے کہ آج جنگ نہیں ہوگی، اس لیے ہم جا رہے ہیں، ورنہ اگر ہمیں توقع ہوتی کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔

بِمَا یَكْتُمُوْنَ ۝١٦٧ ج اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ
اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝١٦٨ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ
سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ۝١٦٩ ۙ
فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ
بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ
وقف لازم عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝١٧٠ ۘ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ
ع ۷ ۱۷ ۸ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝١٧١ ج ع

خُوب جانتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور ان کے جو بھائی بند لڑنے گئے اور مارے گئے ان کے متعلق انھوں نے کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔ ان سے کہو: اگر تم اپنے اس قول میں سچّے ہو تو خود تمھاری موت جب آئے اُسے ٹال کر دکھا دینا۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہُوئے ہیں انھیں مُردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں،[۱۲۰] اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اُس پر خوش و خُرّم ہیں،[۱۲۱] اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ ع

۱۲۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۵۵۔

۱۲۱ – مُسندِ احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مروی ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ جو شخص نیک عمل لے کر

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ
الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ مع
اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ
فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ
وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ

جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسُول کی پُکار پر لبّیک کہا[۱۲۲] اُن میں جواشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں اُن کے لیے بڑا اجر ہے۔ اور وہ جن[۱۲۳] سے لوگوں نے کہا کہ ”تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، اُن سے ڈرو“، تو یہ سُن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ آخرکار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، ان کو کسی قسم کا

دُنیا سے جاتا ہے، اُسے اللہ کے ہاں اس قدر پُرلُطف اور پُرکیف زندگی میسّر آتی ہے جس کے بعد وہ کبھی دنیا میں واپس آنے کی تمنّا نہیں کرتا۔ مگر شہید اس سے مُستثنیٰ ہے۔ وہ تمنّا کرتا ہے کہ پھر دنیا میں بھیجا جائے اور پھر اُس لذت، اُس سُرور اور اُس نشے سے لُطف اندوز ہو جو راہِ خدا میں جان دیتے وقت حاصل ہوتا ہے۔

۱۲۲– جنگِ اُحُد سے پلٹ کر جب مشرکین کئی منزل دُور چلے گئے تو انھیں ہوش آیا اور انھوں نے آپس میں کہا: یہ ہم نے کیا حرکت کی کہ محمدؐ کی طاقت کو توڑ دینے کا جو بیش قیمت موقع ملا تھا، اُسے کھو کر چلے آئے۔ چنانچہ ایک جگہ ٹھیر کر انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مدینے پر فوراً ہی دوسرا حملہ کر دیا جائے۔ لیکن پھر ہمّت نہ پڑی اور مکہ واپس چلے گئے۔ ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں پھر نہ پلٹ آئیں۔ اس لیے جنگِ اُحُد کے دوسرے ہی دن آپؐ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کفار کے تعاقب میں چلنا چاہیے۔ یہ اگرچہ نہایت نازک موقع تھا، مگر پھر بھی جو سچے مومن تھے، وہ جان نثار کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حَمراء الاسد تک گئے، جو مدینے سے ۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس آیت کا اشارہ انھی فدا کاروں کی طرف ہے۔

۱۲۳– یہ چند آیات جنگِ اُحُد کے ایک سال بعد نازل ہوئی تھیں، مگر چونکہ ان کا تعلق اُحُد ہی کے سلسلہ

لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ
عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ
وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ
يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ

ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شَرَف بھی انھیں حاصل ہو گیا، اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ اب تمھیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔ لہٰذا آیندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحبِ ایمان ہو۔[۱۲۴]

(اے پیغمبرؐ!) جو لوگ آج کفر کی راہ میں بڑی دَوڑ دُھوپ کر رہے ہیں، ان کی سرگرمیاں تمھیں آزردہ نہ کریں، یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ

واقعات سے تھا، اس لیے ان کو بھی اس خطبے میں شامل کر دیا گیا۔

۱۲۴ – اُحُد سے پلٹتے ہوئے ابوسُفیان مسلمانوں کو چیلنج دے گیا تھا کہ آیندہ سال بَدر میں ہمارا تمھارا پھر مقابلہ ہوگا۔ مگر جب وعدے کا وقت قریب آیا تو اس کی ہمّت نے جواب دے دیا، کیونکہ اُس سال مکّے میں قحط تھا۔ لہٰذا اس نے پہلو بچانے کے لیے یہ تدبیر کی کہ خفیہ طور پر ایک شخص کو بھیجا جس نے مدینہ پہنچ کر مسلمانوں میں یہ خبریں مشہور کرنی شروع کیں کہ اب کے سال قریش نے بڑی زبردست تیاری کی ہے اور ایسا بھاری لشکر جمع کر رہے ہیں جس کا مقابلہ تمام عرب میں کوئی نہ کر سکے گا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلمان خوف زدہ ہو کر اپنی جگہ رہ جائیں اور مقابلے پر نہ آنے کی ذمہ داری انھی پر رہے۔ ابوسفیان کی اس چال کا یہ اثر ہوا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بَدر کی طرف چلنے کے لیے مسلمانوں سے اپیل کی تو اس کا کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔ آخرکار اللہ کے رسولؐ نے بھرے مجمع میں اعلان کر دیا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں اکیلا جاؤں گا۔ اس پر ۱۵ سو فداکار آپؐ کے ساتھ چلنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور آپؐ انھی کو لے کر بدر تشریف لے گئے۔ اُدھر سے ابوسفیان دو ہزار کی جمعیّت لے کر چلا مگر دو روز کی مَسافت تک جا کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سال لڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، آیندہ سال آئیں گے۔ چنانچہ وہ اور اس کے ساتھی واپس ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ روز تک بدر کے مقام پر اس کے انتظار میں مقیم رہے اور اس دَوران میں آپؐ کے ساتھیوں نے

اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٦﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٧٧﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا
نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٧٨﴾ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ
عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا
كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ

اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہ رکھے، اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔ جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں، وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں، اُن کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔ یہ ڈھیل جو ہم انھیں دیے جاتے ہیں، اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں، ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارِ گناہ سمیٹ لیں، پھر اُن کے لیے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔

اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو۔ ۱۲۵ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مُطّلع کر دے۔ ۱۲۶ غیب کی باتیں بتانے کے لیے تو وہ اپنے رسُولوں میں سے جس کو چاہتا ہے

ایک تجارتی قافلے سے کاروبار کر کے خوب مالی فائدہ اُٹھایا۔ پھر جب یہ خبر معلوم ہوگئی کہ کفار واپس چلے گئے تو آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

۱۲۵ – یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی جماعت کو اس حال میں دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ ان کے درمیان سچّے اہلِ ایمان اور منافق، سب خلط ملط رہیں۔

۱۲۶ – یعنی مومن و منافق کی تمیز نُمایاں کرنے کے لیے اللہ یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کرتا کہ غیب سے مسلمانوں کو

رُسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَ
تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ
بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ
سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع لَقَدْ ع ۱۸
سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ وقف لازم

منتخب کر لیتا ہے۔ لہٰذا (اُمورِ غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں، وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے۔نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بُری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں، وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے[۱۲۷] اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔ع

اللہ نے اُن لوگوں کا قول سُنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔[۱۲۸] ان کی

دلوں کا حال بتا دے کہ فُلاں مومن ہے اور فُلاں منافق، بلکہ اس کے حکم سے ایسے امتحان کے مواقع پیش آئیں گے جن میں تجربے سے مومن اور منافق کا حال کُھل جائے گا۔

۱۲۷ – یعنی زمین و آسمان کی جو چیز بھی کوئی مخلوق استعمال کر رہی ہے، وہ دراصل اللہ کی مِلک ہے اور اس پر مخلوق کا قبضہ وتصرُّف عارضی ہے۔ ہر ایک کو اپنے مقبوضات سے بہرحال بے دخل ہونا ہے اور آخرِ کار سب کچھ اللہ ہی کے پاس رہ جانے والا ہے۔ لہٰذا عقل مند ہے وہ جو اس عارضی قبضے کے دَوران میں اللہ کے مال کو اللہ کی راہ میں دل کھول کر صَرف کرتا ہے۔ اور سخت بے وقوف ہے وہ جو اسے بچا بچا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

سَنَكۡتُبُ مَا قَالُوۡا وَقَتۡلَهُمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوۡلُ
ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ ۝١٨١ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَاَنَّ
اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ۝١٨٢ ۚ اَلَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ
عَهِدَ اِلَيۡنَاۤ اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰى يَاۡتِيَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡكُلُهُ
النَّارُ ؕ قُلۡ قَدۡ جَآءَكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِىۡ بِالۡبَيِّنٰتِ
وَبِالَّذِىۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡهُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝١٨٣

یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے، اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے۔ (جب فیصلے کا وقت آئے گا اُس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو، اب عذابِ جہنّم کا مزا چکھو، یہ تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، اللہ اپنے بندوں کے لیے ظالم نہیں ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں: ”اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی کو رسُول تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آ کر) آگ کھالے“، اُن سے کہو: ”تمھارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آ چکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو، پھر اگر (ایمان لانے کے لیے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو اُن رسُولوں کو تم نے کیوں قتل کیا؟“ [129]

---

۱۲۸ – یہ یہودیوں کا قول تھا۔ قرآنِ مجید میں جب یہ آیت آئی کہ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا، ”کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے“، تو اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے یہودیوں نے کہنا شروع کیا کہ جی ہاں، اللہ میاں مفلس ہو گئے ہیں، اب وہ بندوں سے قرض مانگ رہے ہیں۔

۱۲۹ – بائبل میں متعدد مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ خدا کے ہاں کسی قربانی کے مقبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ غیب سے ایک آگ نمودار ہو کر اسے بھسم کر دیتی تھی۔ (قُضاۃ ۶: ۲۰-۲۱ و ۱۳: ۱۹-۲۰) نیز یہ ذکر بھی بائبل میں آتا ہے

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ
وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا
تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ
الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾
لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۗ قف وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ

اب اے محمدؐ! اگر یہ لوگ تمھیں جُھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جا چکے ہیں جو کُھلی کُھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔ آخرکار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پُورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتشِ دوزخ سے بچ جائے اور جنّت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دُنیا، تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔[۱۳۰]

مسلمانو! تمھیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی، اور تم اہلِ کتاب

کہ بعض مواقع پر کوئی نبی سوختنی قربانی کرتا تھا اور ایک غیبی آگ آکر اُسے کھا لیتی تھی۔ (اَحبار ۹: ۲۴۔ ۲۔ تواریخ ۷: ۱-۲) لیکن یہ کسی جگہ بھی نہیں لکھا کہ اس طرح کی قربانی نبوّت کی کوئی ضروری علامت ہے، یا یہ کہ جس شخص کو یہ معجزہ نہ دیا گیا ہو، وہ ہرگز نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ محض ایک من گھڑت بہانہ تھا جو یہودیوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کے لیے تصنیف کر لیا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر ان کی حق دشمنی کا ثبوت یہ تھا کہ خود انبیائے بنی اسرائیل میں سے بعض نبی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے آتشیں قربانی کا یہ معجزہ پیش کیا اور پھر بھی یہ جرائم پیشہ لوگ ان کے قتل سے باز نہ رہے۔ مثال کے طور پر بائبل میں حضرت الیاسؑ (اِیلیّاہ تِشبی) کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے بَعل کے پُجاریوں کو چیلنج دیا کہ مجمع عام میں ایک بیل کی قربانی تم کرو اور ایک کی قربانی میں کرتا ہوں۔ جس کی قربانی کو غیبی آگ کھا لے وہی حق پر ہے۔ چنانچہ ایک خلقِ کثیر کے سامنے یہ مقابلہ ہوا اور غیبی آگ نے حضرت الیاسؑ کی قربانی کھائی۔ لیکن اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ اسرائیل کے بادشاہ کی بَعل پرست مَلِکہ حضرت الیاسؑ کی دشمن ہو گئی، اور وہ زن پرست بادشاہ اپنی ملکہ کی خاطر اُن کے قتل کے درپے ہوا اور ان کو مجبوراً مُلک سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ (۱-سلاطین، باب ۱۸ و ۱۹)

اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ
وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ وَاِذْ
اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ
وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ

اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سُنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو[۱۳۱] یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔ اِن اہلِ کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمھیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہو گا، انھیں پوشیدہ رکھنا نہیں[۱۳۲] ہو گا۔ مگر انھوں نے کتاب کو پسِ پُشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر

اسی بنا پر ارشاد ہُوا ہے کہ حق کے دشمنو! تم کس مُنہ سے آتشیں قربانی کا معجزہ مانگتے ہو؟ جن پیغمبروں نے یہ معجزہ دکھایا تھا، انھی کے قتل سے تم کب باز رہے۔

۱۳۰ – یعنی اس دنیا کی زندگی میں جو نتائج رونما ہوتے ہیں، انھی کو اگر کوئی شخص اصلی اور آخری نتائج سمجھ بیٹھے اور اُنھی پر حق و باطل اور فلاح و خُسران کے فیصلے کا مدار رکھے تو درحقیقت وہ سخت دھوکے میں مُبتلا ہو جائے گا۔ یہاں کسی پر نعمتوں کی بارش ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہی حق پر بھی ہے اور اسی کو اللہ کی بارگاہ میں قُبولیّت بھی حاصل ہے۔ اور اسی طرح یہاں کسی کا مصائب و مشکلات میں مبتلا ہونا بھی لازمی طور پر یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ وہ باطل پر ہے اور مردود بارگاہِ الٰہی ہے۔ اکثر اوقات اس ابتدائی مرحلے کے نتائج اُن آخری نتائج کے برعکس ہوتے ہیں جو حیاتِ اَبدی کے مرحلے میں پیش آنے والے ہیں۔ اور اصل اعتبار اُنھی نتائج کا ہے۔

۱۳۱ – یعنی اُن کے طعن و تشنیع، اُن کے الزامات، اُن کے بے ہُودہ طرزِ کلام اور اُن کی جھوٹی نشر و اشاعت کے مقابلے میں بے صبر ہو کر تم ایسی باتوں پر نہ اُتر آؤ جو صداقت و انصاف، وقار و تہذیب اور اَخلاقِ فاضلہ کے خلاف ہوں۔

۱۳۲ – یعنی انھیں یہ تو یاد رہ گیا کہ بعض پیغمبروں کو آگ میں جلنے والی قربانی بطور نشان کے دی گئی تھی، مگر یہ یاد نہ رہا کہ اللہ نے اپنی کتاب ان کے سُپرد کرتے وقت ان سے کیا عہد لیا تھا اور کس خدمتِ عُظمیٰ کی ذمہ داری ان پر ڈالی تھی۔

یہاں جس عہد کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ذکر جگہ جگہ بائبل میں آتا ہے۔ خُصوصاً کتابِ اِستثنا میں حضرت موسیٰؑ کی جو آخری تقریر نقل کی گئی ہے، اس میں تو وہ بار بار بنی اسرائیل سے عہد لیتے ہیں کہ جو احکام میں نے تم کو پہنچائے ہیں، اُنھیں

ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ
يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا
تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَ
لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾ ع ۱۹ ۱۰
اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

اُسے بیچ ڈالا۔ کتنا بُرا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ تم اُن لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسے کاموں کی تعریف اُنھیں حاصل ہو جو فی الواقع انھوں نے نہیں کیے ہیں[۱۳۳]۔ حقیقت میں ان کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ زمین اور آسمان کا مالک اللہ ہے اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے۔ ع

زمین[۱۳۴] اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں

اپنے دل پر نقش کرنا، اپنی آیندہ نسلوں کو سکھانا، گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اُٹھتے، ہر وقت ان کا چرچا کرنا، اپنے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر ان کو لکھ دینا۔ (۶: ۴-۹) پھر اپنی آخری وصیّت میں انھوں نے تاکید کی کہ فلسطین کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرنا کہ کوہِ عیبال پر بڑے بڑے پتھر نصب کر کے تورات کے احکام ان پر کندہ کر دینا۔ (۲۷: ۲-۴) نیز بنی لاوی کو تورات کا ایک نسخہ دے کر ہدایت فرمائی کہ ہر ساتویں برس عیدِ خیام کے موقع پر قوم کے مَردوں، عورتوں، بچّوں سب کو جگہ جگہ جمع کر کے یہ پُوری کتاب لفظ بلفظ ان کو سناتے رہنا۔ لیکن اس پر بھی کتاب اللہ سے بنی اسرائیل کی غفلت رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھی کہ حضرت موسیٰؑ کے سات سو برس بعد ہیکلِ سلیمانی کے سجادہ نشین، اور یروشلم کے یہودی فرماں روا تک کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں تورات نامی بھی کوئی کتاب موجود ہے۔ (۲-سلاطین ۲۲: ۸-۱۳)

۱۳۳ – مثلاً وہ اپنی تعریف میں یہ سُننا چاہتے ہیں کہ حضرت بڑے متقی ہیں، دین دار اور پارسا ہیں، خادمِ دین ہیں، حامیِ شرعِ متین ہیں، مُصلح و مُزکّی ہیں، حالانکہ حضرت کچھ بھی نہیں۔ یا اپنے حق میں یہ ڈھنڈورا پِٹوانا چاہتے ہیں کہ فُلاں صاحب بڑے ایثار پیشہ اور مخلص اور دیانت دار رہنما ہیں اور انھوں نے ملّت کی بڑی خدمت کی ہے، حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔

۱۳۴ – یہ خاتمۂ کلام ہے۔ اس کا ربط اُوپر کی قریبی آیات میں نہیں بلکہ پوری سورت میں تلاش کرنا چاہیے۔

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا
وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾
رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ
مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ
اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ

اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں[۱۳۵]۔ (وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں:) ”پروردگار! یہ سب کچھ تُو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تُو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے[۱۳۶]۔ پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے، تُو نے جسے دوزخ میں ڈالا، اسے درحقیقت بڑی ذلّت و رُسوائی میں ڈال دیا، اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ مالک! ہم نے ایک پُکارنے والے کو سُنا جو ایمان کی طرف بُلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی[۱۳۷]، پس اے ہمارے آقا! جو قُصُور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو بُرائیاں

اس کو سمجھنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ سُورت کی تمہید کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

۱۳۵ – یعنی ان نشانیوں سے ہر شخص بآسانی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ خدا سے غافل نہ ہو، اور آثارِ کائنات کو جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ غور و فکر کے ساتھ مشاہدہ کرے۔

۱۳۶ – جب وہ نظامِ کائنات کا بغور مُشاہدہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت ان پر کُھل جاتی ہے کہ یہ سراسر ایک حکیمانہ نظام ہے۔ اور یہ بات سراسر حِکمت کے خلاف ہے کہ جس مخلوق میں اللہ نے اخلاقی حِس پیدا کی ہو، جسے تصرُّف کے اختیارات دیے ہوں، جسے عقل و تمیز عطا کی ہو، اُس سے اُس کی حیاتِ دنیا کے اعمال پر بازپُرس نہ ہو، اور اسے نیکی

عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝١٩٣ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى
رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝١٩٤
فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ

ہم میں ہیں انھیں دُور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا! جو وعدے تُو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کیے ہیں، اُن کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رُسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔[۱۳۸]"

جواب میں ان کے رب نے فرمایا: "میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دُوسرے کے ہم جنس ہو۔[۱۳۹] لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لیے لڑے اور مارے گئے، اُن کے سب قصور میں

پر جزا اور بدی پر سزا نہ دی جائے۔ اس طرح نظامِ کائنات پر غور و فکر کرنے سے اُنھیں آخرت کا یقین حاصل ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی سزا سے پناہ مانگنے لگتے ہیں۔

۱۳۷ – اِسی طرح یہی مشاہدہ اُن کو اس بات پر بھی مطمئن کر دیتا ہے کہ پیغمبر اس کائنات اور اس کے آغاز و انجام کے متعلق جو نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور زندگی کا جو راستہ بتاتے ہیں، وہ سراسر حق ہے۔

۱۳۸ – یعنی انھیں اس امر میں تو شک نہیں ہے کہ اللہ اپنے وعدوں کو پورا کرے گا یا نہیں۔ البتہ تردُّد اس امر میں ہے کہ آیا ان وعدوں کے مصداق ہم بھی قرار پاتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے وہ اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ ان وعدوں کا مصداق ہمیں بنا دے اور ہمارے ساتھ انھیں پورا کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا میں تو ہم پیغمبروں پر ایمان لا کر کُفّار کی تضحیک اور طعن و تشنیع کے ہدف بنے ہی ہیں، قیامت میں بھی اِن کافروں کے سامنے ہماری رسوائی ہو اور وہ ہم پر پھبتی کسیں کہ ایمان لا کر بھی اِن کا بھلا نہ ہوا۔

عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ
الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي
الْبِلَادِ ؕ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۫ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ
الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ
اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾ وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الثلثة
الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ

معاف کر دُوں گا اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ اُن کی جزا ہے اللہ کے ہاں، اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے[۱۴۰]۔''

اے نبیؐ! دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمھیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لُطف ہے، پھر یہ سب جہنّم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ کی طرف سے یہ سامانِ ضیافت ہے ان کے لیے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہی سب سے بہتر ہے۔ اہلِ کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں، اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمھاری طرف بھیجی گئی ہے اور

۱۳۹ – یعنی تم سب انسان ہو اور میری نگاہ میں یکساں ہو۔ میرے ہاں یہ دستور نہیں ہے کہ عورت اور مرد، آقا اور غلام، کالے اور گورے، اُونچ اور نیچ کے لیے انصاف کے اُصول اور فیصلے کے معیار الگ الگ ہوں۔

۱۴۰ – روایت ہے کہ بعض غیر مسلم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ موسیٰؑ عصا اور ید بیضا لائے

اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا
قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا
وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ ع ۲۰

اُس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی، اللہ کے آگے جُھکے ہوئے ہیں، اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چُکانے میں دیر نہیں لگاتا۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ،[۱۴۱] حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اُمید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ ع

تھے۔ عیسیٰؑ اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے۔ دوسرے پیغمبر بھی کچھ نہ کچھ معجزے لائے تھے۔ آپؐ فرمائیں کہ آپؐ کیا لائے ہیں؟ اس پر آپؐ نے اس رُکوع کے آغاز سے یہاں تک کی آیات تلاوت فرمائیں اور ان سے کہا: میں تو یہ لایا ہوں۔

۱۴۱ – اصل عربی متن میں صَابِرُوْا کا لفظ آیا ہے۔ اس کے دو معنٰی ہیں: ایک، یہ کہ کفار اپنے کفر پر جو مضبوطی دکھا رہے ہیں اور اس کو سربلند رکھنے کے لیے جو زحمتیں اُٹھا رہے ہیں، تم ان کے مقابلے میں ان سے بڑھ کر پامردی دکھاؤ۔ دُوسرے، یہ کہ ان کے مقابلے میں ایک دُوسرے سے بڑھ کر پامردی دکھاؤ۔

تفہیم القرآن

النسآء

(۴)

النِّسَآء

زمانۂ نُزُول اور اجزائے مضمون یہ سُورہ متعدّد خُطبوں پر مشتمل ہے جو غالبًا ۳ ہجری کے اواخر سے لے کر ۴ ہجری کے اواخر یا ۵ ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ تعیُّن کرنا مشکل ہے کہ کس مَقام سے کس مَقام تک کی آیات ایک سلسلۂ تقریر میں نازل ہوئی تھیں اور ان کا ٹھیک زمانۂ نزول کیا ہے، لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہو جاتی ہیں، اس لیے ان کی مدد سے ہم ان مختلف تقریروں کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں جن میں یہ احکام اور یہ اشارے واقع ہوئے ہیں۔

مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ وراثت کی تقسیم اور یتیموں کے حُقوق کے متعلق ہدایات جنگِ اُحُد کے بعد نازل ہوئی تھیں جب کہ مسلمانوں کے ستّر آدمی شہید ہو گئے تھے اور مدینے کی چھوٹی سی بستی میں اس حادثے کی وجہ سے بہت سے گھروں میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شُہدا کی میراث کس طرح تقسیم کی جائے اور جو یتیم بچے انھوں نے چھوڑے ہیں، اُن کے مفاد کا تحفُّظ کیسے ہو۔ اس بنا پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ابتدائی چار رکوع اور پانچویں رکوع کی پہلی تین آیتیں اسی زمانے میں نازل ہوئی ہوں گی۔

روایات میں صلوٰۃِ خوف (عین حالتِ جنگ میں نماز پڑھنے) کا ذکر ہمیں غزوۂ ذات الرّقاع میں ملتا ہے جو ۴ ہجری میں ہوا۔ اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسی کے لگ بھگ زمانے میں وہ خطبہ نازل ہوا ہوگا جس میں اس نماز کی ترکیب بیان کی گئی ہے۔ (رکوع ۱۵)

مدینہ سے بنی نَضیر کا اخراج رَبیع الاوّل ۴ ہجری میں ہوا، اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ وہ خطبہ اس سے پہلے قریبی زمانے ہی میں نازل ہوا ہوگا جس میں یہودیوں کو آخری تنبیہ کی گئی ہے کہ ''ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں۔''

پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمّم کی اجازت غزوۂ بنی المُصطَلِق کے موقع پر دی گئی تھی جو ۵ ہجری میں ہوا۔ اس لیے وہ خطبہ جس میں تیمّم کا ذکر ہے اسی سے متّصل عہد کا سمجھنا چاہیے۔ (رکوع ۷)

شانِ نُزُول اور مَباحِث اِس طرح بحیثیتِ مجموعی سورت کا زمانۂ نزول معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں اس زمانے کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے، تاکہ سُورہ کے مضامین سمجھنے میں اس سے مدد

لی جا سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُس وقت جو کام تھا، اُسے تین بڑے بڑے شعبوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے: ایک اُس نئی مُنظّم اسلامی سوسائٹی کا نشوونما جس کی بِنا ہجرت کے ساتھ ہی مدینۂ طیّبہ اور اس کے اطراف و جوانب میں پڑ چکی تھی اور جس میں جاہلیت کے پرانے طریقوں کو مٹا کر اَخلاق، تمدّن، معاشرت، معیشت اور تدبیرِ مملکت کے نئے اُصول رائج کیے جا رہے تھے۔ دوسرے، اُس کش مکش کا مقابلہ جو مشرکینِ عرب، یہودی قبائل اور منافقین کی مخالفِ اصلاح طاقتوں کے ساتھ پوری شدّت سے جاری تھی۔ تیسرے، اسلام کی دعوت کو اِن مزاحم طاقتوں کے علَی الرّغم پھیلانا اور مزید دلوں اور دماغوں کو مسخّر کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس موقع پر جتنے خطبے نازل کیے گئے وہ سب انھی تین شعبوں سے متعلّق ہیں۔

اسلامی سوسائٹی کی تنظیم کے لیے سورۂ بقرہ میں جو ہدایات دی گئی تھیں، اب یہ سوسائٹی ان سے زائد ہدایات کی طالب تھی، اس لیے سورۂ نساء کے اِن خُطبوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ مسلمان اپنی اجتماعی زندگی کو اسلام کے طریق پر کس طرح دُرست کریں۔ خاندان کی تنظیم کے اُصول بتائے گئے۔ نکاح پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلّقات کی حد بندی کی گئی۔ یتیموں کے حُقوق معیّن کیے گئے۔ وراثت کی تقسیم کا ضابطہ مقرر کیا گیا۔ معاشی معاملات کی دُرستی کے متعلّق ہدایات دی گئیں۔ خانگی جھگڑوں کی اصلاح کا طریقہ سکھایا گیا۔ تعزیری قانون کی بِنا ڈالی گئی۔ شراب نوشی پر پابندی عائد کی گئی۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام دیے گئے۔ مسلمانوں کو بتایا گیا کہ ایک صالح انسان کا طرزِ عمل خدا اور بندوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر جماعتی نظم وضبط (ڈسپلن) قائم کرنے کے متعلّق ہدایات دی گئیں۔ اہلِ کتاب کے اَخلاقی و مذہبی رَوِیّے پر تبصرہ کر کے مسلمانوں کو مُتنبّہ کیا گیا کہ اپنی اِن پیش رَو اُمّتوں کے نقشِ قدم پر چلنے سے پرہیز کریں۔ منافقین کے طرزِ عمل پر تنقید کر کے سچّی ایمان داری کے مقتضیات واضح کیے گئے، اور ایمان و نِفاق کے امتیازی اوصاف کو بالکل نمایاں کر کے رکھ دیا گیا۔

مخالفِ اصلاح طاقتوں سے جو کش مکش برپا تھی اُس نے جنگِ اُحُد کے بعد زیادہ نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ اُحُد کی شکست نے اطراف ونواح کے مشرک قبائل، یہودی ہمسایوں اور گھر کے منافقوں کی ہمّتیں بہت بڑھا دی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف پُرجوش خطبوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے اُبھارا، اور دوسری طرف جنگی حالات میں کام کرنے کے لیے انھیں مختلف ضروری ہدایات دیں۔ مدینے میں منافق اور ضعیف الایمان لوگ ہر قسم کی خوفناک خبریں اُڑا کر بدحواسی پھیلانے کی کوشش کر رہے

تھے۔ حکم دیا گیا کہ ہر ایسی خبر ذمہ دار لوگوں تک پہنچائی جائے، اور جب تک وہ کسی خبر کی تحقیق نہ کرلیں، اس کی اشاعت کو روکا جائے۔ مسلمانوں کو بار بار غزوات اور سَرِیّوں میں جانا پڑتا تھا اور اکثر ایسے راستوں سے گزرنا ہوتا تھا جہاں پانی فراہم نہ ہوسکتا تھا۔ اجازت دی گئی کہ پانی نہ ملے تو غسل اور وضو، دونوں کے بجائے تیمم کرلیا جائے۔ نیز ایسے حالات میں نماز مختصر کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی اور جہاں خطرہ سر پر ہو، وہاں صلوٰۃِ خوف ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا۔ عرب کے مختلف علاقوں میں جو مسلمان کافر قبیلوں کے درمیان منتشر تھے اور بسا اوقات جنگ کی لپیٹ میں بھی آجاتے تھے، ان کا معاملہ مسلمانوں کے لیے سخت پریشان کُن تھا۔ اِس مسئلے میں ایک طرف اسلامی جماعت کو تفصیلی ہدایات دی گئیں اور دوسری طرف اُن مسلمانوں کو بھی ہجرت پر اُبھارا گیا، تاکہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر دار الاسلام میں آجائیں۔

یہودیوں میں سے بنی نَضیر کا رَوِیّہٗ خُصُوصیّت کے ساتھ نہایت مُعانِدانہ ہوگیا تھا اور وہ مُعاہدات کی صریح خلاف ورزی کر کے کُھلّم کُھلّا دشمنانِ اسلام کا ساتھ دے رہے تھے اور خود مدینے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی جماعت کے خلاف سازشوں کے جال بچھا رہے تھے۔ ان کی اس رَوِش پر سخت گرفت کی گئی اور انھیں صاف الفاظ میں آخری تنبیہ کردی گئی۔ اس کے بعد ہی مدینے سے اُن کا اخراج عمل میں آیا۔

منافقین کے مختلف گروہ مختلف طرزِ عمل رکھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس قسم کے منافقوں سے کیا معاملہ کریں۔ ان سب کو الگ الگ طبقوں میں تقسیم کر کے ہر طبقے کے منافقوں کے متعلّق بتا دیا گیا کہ ان کے ساتھ یہ برتاؤ ہونا چاہیے۔

غیر جانب دار معاہد قبائل کے ساتھ جو رَوِیّہ مسلمانوں کا ہونا چاہیے تھا، اس کو بھی واضح کیا گیا۔

سب سے زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ مسلمان کا اپنا کریکٹر بے داغ ہو، کیونکہ اس کش مکش میں یہ مٹھی بھر جماعت اگر جیت سکتی تھی تو اپنے اخلاقِ فاضلہ ہی کے زور سے جیت سکتی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو بلند ترین اخلاقیات کی تعلیم دی گئی اور جو کمزوری بھی ان کی جماعت میں ظاہر ہوئی اس پر سخت گرفت کی گئی۔

دعوت و تبلیغ کا پہلو بھی اس سُورہ میں چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ جاہلیّت کے مقابلے میں اسلام جس اَخلاقی و تمدّنی اصلاح کی طرف دنیا کو بُلا رہا تھا، اس کی توضیح کرنے کے علاوہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین، تینوں گروہوں کے غلط مذہبی تصوّرات اور غلط اخلاق و اعمال پر اس سُورہ میں تنقید کر کے ان کو دینِ حق کی طرف دعوت دی گئی ہے۔

---

۱۷۶ آیاتہا — سُوْرَۃُ النِّسَآءِ مَدَنِیَّۃٌ — ۲۴ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ
وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ
رَقِيْبًا ﴿۱﴾ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۖ

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دُنیا میں پھیلا دیے[۱]۔ اُس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دُوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو، اور رشتہ و قرابت کے تعلّقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔
یتیموں کے مال اُن کو واپس دو[۲]، اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو[۳]،

۱- چونکہ آگے چل کر انسانوں کے باہمی حُقوق بیان کرنے ہیں اور خُصوصیّت کے ساتھ خاندانی نظام کی بہتری و استواری کے لیے ضروری قوانین ارشاد فرمائے جانے والے ہیں، اس لیے تمہید اس طرح اُٹھائی گئی کہ ایک طرف اللہ سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے کی تاکید کی، اور دُوسری طرف یہ بات ذہن نشین کرائی کہ تمام انسان ایک اصل سے ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشت پوست ہیں۔

"تم کو ایک جان سے پیدا کیا"، یعنی نوعِ انسانی کی تخلیق ابتداءً ایک فرد سے کی۔ دوسری جگہ قرآن خود اس کی تشریح کرتا ہے کہ وہ پہلا انسان آدمؑ تھا جس سے دنیا میں نسلِ انسانی پھیلی۔

"اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا"، اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ عام طور پر جو بات اہلِ تفسیر بیان کرتے ہیں اور جو بائبل میں بھی بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ آدمؑ کی پسلی سے حوّا کو پیدا کیا گیا (تلمُود میں اَور زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت حوّا کو حضرت آدم علیہ السّلام کی دائیں جانب کی تیرھویں پسلی سے پیدا کیا گیا تھا)۔ لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے۔ اور جو حدیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے، اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ بات کو اسی طرح مُجمل رہنے دیا

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ۲
وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ
النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا

اور اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں اُن میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔[۴] لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ اُن کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو

جائے جس طرح اللہ نے اسے مُجمل رکھا ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعیّن کرنے میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔

۲ – یعنی جب تک وہ بچے ہیں، اُن کے مال اُنھی کے مفاد پر خرچ کرو، اور جب بڑے ہو جائیں تو جو اُن کا حق ہے وہ انھیں واپس کر دو۔

۳ – جامع فقرہ ہے، جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ حلال کی کمائی کے بجائے حرام خوری نہ کرنے لگو، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے اچھے مال کو اپنے بُرے مال سے نہ بدل لو۔

۴ – اس کے تین مفہوم اہلِ تفسیر نے بیان کیے ہیں:

(۱) حضرت عائشہؓ اس کی تفسیر میں فرماتی ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں، اُن کے مال اور اُن کے حسن و جمال کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر دھرا تو ہے نہیں، جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے، وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر اُن پر ظلم کیا کرتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو دوسری عورتیں دُنیا میں موجود ہیں، ان میں سے جو تمھیں پسند آئیں، اُن کے ساتھ نکاح کر لو۔ اسی سورت میں انیسویں رکوع کی پہلی آیت اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

(۲) ابنِ عباسؓ اور ان کے شاگرد عِکرِمہؒ اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک ایک شخص دس دس بیویاں کر لیتا تھا۔ اور جب اس کثرتِ اِزدِواج سے مَصارف بڑھ جاتے تھے تو مجبُور ہو کر اپنے یتیم بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حُقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نکاح کے لیے چار کی حد مقرر کر دی اور فرمایا کہ ظلم و بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے لے کر چار تک اتنی بیویاں کرو جن کے ساتھ تم عدل پر قائم رہ سکو۔

(۳) سعید بن جُبَیر اور قَتادَہ اور بعض دوسرے مفسّرین کہتے ہیں کہ جہاں تک یتیموں کا معاملہ ہے، اہلِ جاہلیّت بھی ان کے ساتھ بے انصافی کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن عورتوں کے معاملے میں اُن کے ذہن عدل و انصاف کے

فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ؕ ذٰلِكَ اَدۡنٰۤى اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ ﴿۳﴾

پھر ایک ہی بیوی کرو،[5] یا اُن عورتوں کو زوجیّت میں لاؤ جو تمھارے قبضے میں آئی ہیں،[6] بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔

تصوّر سے خالی تھے۔ جتنی چاہتے تھے شادیاں کر لیتے تھے اور پھر اُن کے ساتھ ظلم و جَور سے پیش آتے تھے۔ اِس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو عورتوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے سے ڈرو۔ اوّل تو چار سے زیادہ نکاح ہی نہ کرو، اور اس چار کی حد میں بھی بس اتنی بیویاں رکھو جن کے ساتھ انصاف کر سکو۔

آیت کے الفاظ ان تینوں تفسیروں کے مُتحمّل ہیں اور عجب نہیں کہ تینوں مفہوم مراد ہوں۔ نیز اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو اُن عورتوں سے نکاح کر لو جن کے ساتھ یتیم بچے ہیں۔

۵ – اس بات پر فقہائے اُمّت کا اجماع ہے کہ اس آیت کی رُو سے تعدّدِ ازواج کو محدود کیا گیا ہے اور بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔ روایات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ طائف کا رئیس غَیلان جب اسلام لایا تو اس کی نو۹ بیویاں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حکم دیا کہ چار بیویاں رکھ لے اور باقی کو چھوڑ دے۔ اسی طرح ایک دوسرے شخص (نَوفَل بن معاویہ) کی پانچ بیویاں تھیں۔ آپؐ نے حکم دیا کہ ان میں سے ایک کو چھوڑ دے۔

نیز یہ آیت تعدّدِ ازواج کے جواز کو عدل کی شرط سے مشروط کرتی ہے۔ جو شخص عدل کی شرط پُوری نہیں کرتا مگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کے جواز سے فائدہ اٹھاتا ہے، وہ اللہ کے ساتھ دغا بازی کرتا ہے۔ حکومتِ اسلامی کی عدالتوں کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو اُن کی داد رسی کریں۔

بعض لوگ اہلِ مغرب کی مسیحیّت زدہ رائے سے مغلوب و مَرعُوب ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کا اصل مقصد تعدّدِ ازواج کے طریقے کو (جو مغربی نقطۂ نظر سے فی الاصل بُرا طریقہ ہے) مٹا دینا تھا، مگر چونکہ یہ طریقہ بہت زیادہ رواج پا چکا تھا اس لیے اس پر صرف پابندیاں عائد کر کے چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس قسم کی باتیں دراصل محض ذہنی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ تعدّدِ ازواج کا فی نفسہٖ ایک برائی ہونا بجائے خود ناقابلِ تسلیم ہے، کیونکہ بعض حالات میں یہ چیز ایک تمدّنی اور اَخلاقی ضرورت بن جاتی ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پھر وہ لوگ جو ایک عورت پر قانع نہیں ہو سکتے، حِصارِ نکاح سے باہر صنفی بدامنی پھیلانے لگتے ہیں، جس کے نقصانات تمدّن و اخلاق کے لیے اس سے بہت زیادہ ہیں جو تعدّدِ ازواج سے پہنچ سکتے ہیں۔ اِسی لیے قرآن نے اُن لوگوں کو اس کی اجازت دی ہے جو اس کی ضرورت محسوس کریں۔ تاہم جن لوگوں کے نزدیک تعدّدِ ازواج فی نفسہٖ ایک برائی ہے، اُن کو یہ اختیار تو ضرور حاصل ہے کہ چاہیں تو قرآن کے برخلاف اس کی مَذمّت کریں اور اسے موقوف کر دینے کا مشورہ دیں۔ لیکن یہ حق انھیں نہیں پہنچتا کہ اپنی رائے کو خواہ مخواہ قرآن

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا
فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــٴًـا مَّرِیْٓــٴًـا ۝۴ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ
لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵

اور عورتوں کے مَہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو، البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مَہر کا کوئی حصّہ تمھیں معاف کر دیں تو اُسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔[7]

اور اپنے وہ مال جنھیں اللہ نے تمھارے لیے قیامِ زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو، البتہ انھیں کھانے اور پہننے کے لیے دو اور انھیں نیک ہدایت کرو۔[8]

کی طرف منسوب کریں۔ کیونکہ قرآن نے صریح الفاظ میں اس کو جائز ٹھیرایا ہے اور اشارتاً و کنایتاً بھی اس کی مذمّت میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ فی الواقع وہ اسے مسدود کرنا چاہتا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو میری کتاب ’’سُنّت کی آئینی حیثیت‘‘، ص ۳۰۷ تا ۳۱۶)

۶ – لونڈیاں مراد ہیں، یعنی وہ عورتیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں اور حکومت کی طرف سے لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آزاد خاندانی بیوی کا بار بھی برداشت نہ کر سکو تو پھر لونڈی سے نکاح کر لو، جیسا کہ رکوع ۴ میں آگے آتا ہے۔ یا یہ کہ اگر ایک سے زیادہ عورتوں کی تمھیں ضرورت ہو اور آزاد خاندانی بیویوں کے درمیان عدل رکھنا تمھارے لیے مشکل ہو تو لونڈیوں کی طرف رُجوع کرو، کیونکہ ان کی وجہ سے تم پر ذمہ داریوں کا بار نسبتاً کم پڑے گا۔ (آگے حاشیہ ۴۴ میں لونڈیوں کے متعلق احکام کی مزید تفصیل ملے گی)۔

۷ – حضرت عمرؓ اور قاضی شُریح کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو پُورا مَہر یا اس کا کوئی حصّہ معاف کر دیا ہو اور بعد میں وہ اس کا پھر مطالبہ کرے تو شوہر اس کے ادا کرنے پر مجبُور کیا جائے گا، کیونکہ اس کا مطالبہ کرنا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے مَہر یا اس کا کوئی حصّہ چھوڑنا نہیں چاہتی۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: ’’حُقوق الزّوجین‘‘ عنوان ’’مہر‘‘)

۸ – یہ آیت وسیع معنٰی کی حامل ہے۔ اس میں اُمّت کو یہ جامع ہدایت فرمائی گئی ہے کہ مال جو ذریعۂ قیامِ زندگی ہے، بہرحال ایسے نادان لوگوں کے اختیار و تصرّف میں نہ رہنا چاہیے جو اسے غلط طریقے سے استعمال کر کے نظامِ تمدّن و معیشت اور بالآخر نظامِ اخلاق کو خراب کر دیں۔ حُقوقِ مِلکیّت جو کسی شخص کو اپنے املاک پر حاصل ہیں، اس قدر غیر محدود نہیں ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو اور ان کے استعمال سے اجتماعی فساد برپا کر دے تب بھی اس کے وہ حقوق سلب نہ کیے جا سکیں۔ جہاں تک آدمی کی ضروریاتِ زندگی کا تعلّق ہے، وہ تو ضرور پوری ہونی چاہییں، لیکن جہاں تک حقوقِ مالکانہ کے آزادانہ استعمال کا تعلّق ہے، اس پر یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ یہ

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ
رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا
وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ

اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو، یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں[9]۔ پھر اگر تم اُن کے اندر اہلیّت پاؤ تو اُن کے مال اُن کے حوالے کر دو[10]۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حدِّ انصاف سے تجاوُز کر کے اِس خوف سے اُن کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سر پرست مال دار ہو، وہ پرہیزگاری سے کام لے

استعمال اخلاق وتمدّن اور اجتماعی معیشت کے لیے صریحاً مُضر نہ ہو۔ اس ہدایت کے مطابق چھوٹے پیمانے پر ہر صاحبِ مال کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنا مال جس کے حوالے کر رہا ہے، وہ اس کے استعمال کی صلاحیّت رکھتا ہے یا نہیں۔ اور بڑے پیمانے پر حکومتِ اسلامی کو اس امر کا انتظام کرنا چاہیے کہ جو لوگ اپنے اموال پر خود مالکانہ تصرُّف کے اہل نہ ہوں، یا جو لوگ اپنی دولت کو بُرے طریقوں سے استعمال کر رہے ہوں، ان کی املاک کو وہ اپنے انتظام میں لے لے اور ان کی ضروریاتِ زندگی کا بندوبست کر دے۔

۹ – یعنی جب وہ سِنِّ بُلوغ کے قریب پہنچ رہے ہوں تو دیکھتے رہو کہ ان کا عقلی نشوونما کیسا ہے اور ان میں اپنے معاملات کو خود اپنی ذمّہ داری پر چلانے کی صلاحیت کس حد تک پیدا ہو رہی ہے۔

۱۰ – مال ان کے حوالے کرنے کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں: ایک بلوغ، دوسرے رُشد، یعنی مال کے صحیح استعمال کی اہلیّت۔ پہلی شرط کے متعلق تو فقہائے اُمّت میں اتفاق ہے۔ دوسری شرط کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر سِنِّ بُلوغ کو پہنچنے پر یتیم میں رُشد نہ پایا جائے تو ولیِ یتیم کو زیادہ سے زیادہ سات سال اور انتظار کرنا چاہیے۔ پھر خواہ رُشد پایا جائے یا نہ پایا جائے، اس کا مال اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ اور امام ابویُوسُف، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ مال حوالے کیے جانے کے لیے بہرحال رُشد کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ غالباً مؤخّر الذکر حضرات کی رائے کے مطابق یہ بات زیادہ قرینِ صواب ہوگی کہ اس معاملے میں قاضیِ شرع کی طرف رُجوع کیا جائے اور اگر قاضی پر ثابت ہو جائے کہ اس میں رُشد نہیں پایا جاتا تو وہ اس کے معاملات کی نگرانی کے لیے خود کوئی مناسب انتظام کر دے۔

وَ مَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ
اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۶﴾
لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ
لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ
مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۷﴾ وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ
اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ

اور جو غریب ہو، وہ معروف طریقے سے کھائے[11]۔ پھر جب اُن کے مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنا لو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔

مَردوں کے لیے اُس مال میں حصّہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اُس مال میں حصّہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت[12]، اور یہ حصّہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

اور جب تقسیم کے موقع پر کنبے کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو

---

۱۱ – یعنی اپنا حق الخدمت اس حد تک لے کہ ہر غیر جانب دار معقول آدمی اس کو مناسب تسلیم کرے۔ نیز یہ کہ جو کچھ بھی حق الخدمت وہ لے، چوری چھپے نہ لے، بلکہ علانیہ متعیّن کر کے لے اور اس کا حساب رکھے۔

۱۲ – اس آیت میں واضح طور پر پانچ قانونی حکم دیے گئے ہیں: ایک، یہ کہ میراث صرف مَردوں ہی کا حصّہ نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اس کی حق دار ہیں۔ دوسرے، یہ کہ میراث بہرحال تقسیم ہونی چاہیے، خواہ وہ کتنی ہی کم ہو، حتّٰی کہ اگر مرنے والے نے ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں تو اسے بھی دس حصّوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ یہ اَور بات ہے کہ ایک وارث دوسرے وارثوں سے ان کا حصّہ خرید لے۔ تیسرے، اس آیت سے یہ بات بھی مُترشّح ہوتی ہے کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال و املاک پر جاری ہوگا۔ خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، زرعی ہوں یا صنعتی، یا کسی اور صنفِ مال میں شمار ہوتے ہوں۔ چوتھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میراث کا حق اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب مورث کوئی مال چھوڑ مرا ہو۔ پانچویں، اِس سے یہ قاعدہ بھی نکلتا ہے کہ قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر رشتہ دار میراث نہ پائے گا۔

وَقُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ﴿۸﴾ وَلۡيَخۡشَ الَّذِيۡنَ لَوۡ تَرَكُوۡا مِنۡ
خَلۡفِهِمۡ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوۡا عَلَيۡهِمۡ فَلۡيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلۡيَقُوۡلُوۡا
قَوۡلًا سَدِيۡدًا ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡيَتٰمٰى ظُلۡمًا
اِنَّمَا يَاۡكُلُوۡنَ فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ؕ وَسَيَصۡلَوۡنَ سَعِيۡرًا ﴿۱۰﴾ ع
يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِىۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ

ع ۱۲

اور اُن کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو[۱۳]۔

لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انھیں اپنے بچّوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں، درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنّم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں[۱۴] گے۔ ع

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ:

مرد کا حصّہ دو عورتوں کے برابر ہے[۱۵]۔

---

۱۳ – خطاب میّت کے وارثوں سے ہے اور انھیں ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ میراث کی تقسیم کے موقع پر جو دور و نزدیک کے رشتہ دار اور کنبے کے غریب و مسکین لوگ اور یتیم بچے آ جائیں، ان کے ساتھ تنگ دلی نہ برتو۔ میراث میں ازرُوئے شرع اُن کا حصّہ نہیں ہے تو نہ سہی، وُسعتِ قلب سے کام لے کر ترکے میں سے اُن کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو، اور ان کے ساتھ وہ دل شکن باتیں نہ کرو جو ایسے مواقع پر بالعُموم چھوٹے دل کے کم ظرف لوگ کیا کرتے ہیں۔

۱۴ – حدیث میں آیا ہے کہ جنگِ اُحُد کے بعد حضرت سعدؓ بن ربیع کی بیوی اپنی دو بچّیوں کو لیے ہوئے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انھوں نے عرض کیا کہ "یا رسولؐ اللہ! یہ سعد کی بچّیاں ہیں جو آپؐ کے ساتھ اُحُد میں شہید ہوئے ہیں۔ ان کے چچا نے پوری جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لیے ایک حبّہ تک نہیں چھوڑا ہے۔

فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانَتْ
وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۗ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ
مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ وَلَدٌ وَّوَرِثَهُ
أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ

اگر (میّت کی وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔[۱۶]

اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔

اگر میت صاحبِ اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصّہ ملنا چاہیے۔[۱۷]

اور اگر وہ صاحبِ اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصّہ دیا جائے۔[۱۸]

اور اگر میّت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصّے کی حق دار ہوگی۔[۱۹]

اب بھلا ان بچّیوں سے کون نکاح کرے گا۔" اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

۱۵– میراث کے معاملے میں یہ اوّلین اُصولی ہدایت ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دوگُنا ہے۔ چونکہ شریعت نے خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ مَعاشی ذمّہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور عورت کو بہت سی مَعاشی ذمہ داریوں کے بار سے سُبکدوش رکھا ہے، لہٰذا انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ میراث میں عورت کا حصّہ مرد کی بہ نسبت کم رکھا جاتا۔

۱۶– یہی حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اس کی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں، تو خواہ دو لڑکیاں ہوں یا دو سے زائد، بہرحال اس کے کُل ترکے کا ۲/۳ حصہ ان لڑکیوں میں تقسیم ہوگا، اور باقی ۱/۳ دوسرے وارثوں میں۔ لیکن اگر میّت کا صرف ایک لڑکا ہو تو اس پر اجماع ہے کہ دوسرے وارثوں کی غیر موجودگی میں وہ کُل مال کا وارث ہوگا، اور دوسرے وارث موجود ہوں تو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی سب مال اُسے ملے گا۔

۱۷– یعنی میّت کے صاحبِ اولاد ہونے کی صُورت میں بہرحال میّت کے والدین میں سے ہر ایک ۱/۶ کا

مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ‌ ؕ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ
اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَـكُمۡ نَفۡعًا‌ ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا

یہ سب حصّے اُس وقت نکالے جائیں گے جب کہ وصیّت جو میّت نے کی ہو پُوری کر دی جائے اور قرض جو اُس پر ہو ادا کر دیا جائے۔[20]
تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بلحاظِ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصّے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں، اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف

حق دار ہوگا۔ خواہ میّت کی وارث صرف بیٹیاں ہوں، یا صرف بیٹے ہوں، یا بیٹے اور بیٹیاں ہوں، یا ایک بیٹا ہو، یا ایک بیٹی۔ رہے باقی $\frac{2}{3}$، تو ان میں دُوسرے وارث شریک ہوں گے۔

۱۸ – ماں باپ کے سوا کوئی اور وارث نہ ہو تو باقی $\frac{2}{3}$ باپ کو ملے گا۔ ورنہ $\frac{2}{3}$ میں باپ اور دُوسرے وارث شریک ہوں گے۔

۱۹ – بھائی بہن ہونے کی صورت میں ماں کا حصہ $\frac{1}{3}$ کے بجائے $\frac{1}{6}$ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ماں کے حصّے میں سے جو $\frac{1}{6}$ لیا گیا ہے، وہ باپ کے حصّے میں ڈالا جائے گا، کیونکہ اس صُورت میں باپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ میّت کے والدین اگر زندہ ہوں تو اس کے بہن بھائیوں کو حصّہ نہیں پہنچتا۔

۲۰ – وصیّت کا ذکر قرض پر مقدّم اس لیے کیا گیا ہے کہ قرض کا ہونا ہر مرنے والے کے حق میں ضروری نہیں ہے، اور وصیّت کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ لیکن حکم کے اعتبار سے اُمّت کا اس پر اجماع ہے کہ قرض وصیّت پر مقدّم ہے۔ یعنی اگر میّت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے میّت کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا، پھر وصیّت پوری کی جائے گی، اور اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔ وصیّت کے متعلق سُورۂ بقرہ حاشیہ نمبر ۱۸۲ میں ہم بتا چکے ہیں کہ آدمی کو اپنے کُل مال کے $\frac{1}{3}$ حصّے کی حد تک وصیّت کرنے کا اختیار ہے، اور یہ وصیّت کا قاعدہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ قانونِ وراثت کی رو سے جن عزیزوں کو میراث میں سے حصّہ نہیں پہنچتا، ان میں سے جس کو یا جس جس کو آدمی مدد کا مستحق پاتا ہو، اس کے لیے اپنے اختیارِ تمیزی سے حصّہ مقرر کر دے۔ مثلاً کوئی یتیم پوتا یا پوتی موجود ہے، یا کسی بیٹے کی بیوہ مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے، یا کوئی بھائی یا بہن یا بھاوج یا بھتیجا یا بھانجا یا اور کوئی عزیز ایسا ہے جو سہارے کا محتاج نظر آتا ہے، تو اس کے حق میں وصیّت کے ذریعے سے حصّہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں ہے تو دوسرے مستحقین کے لیے یا کسی رفاہِ عام کے کام میں صَرف کرنے کے لیے وصیّت کی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی کُل ملکیّت میں سے $\frac{2}{3}$ یا اس سے کچھ زائد کے متعلق شریعت نے میراث کا ضابطہ بنا دیا ہے، جس میں سے شریعت کے

حَكِيمًا ﴿١١﴾ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ
لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ
بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا
تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ
الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ

اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔[۲۱]

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصّہ تمھیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صُورت میں ترکے کا ایک چوتھائی حصّہ تمھارا ہے جب کہ وصیّت جو انھوں نے کی ہو پوری کردی جائے، اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کردیا جائے۔ اور وہ تمھارے ترکے میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحبِ اولاد ہونے کی صُورت میں اُن کا حصّہ آٹھواں[۲۲] ہوگا، بعد اس کے کہ جو وصیّت تم نے کی ہو وہ پُوری کردی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کردیا جائے۔

نامزد کردہ وارثوں کو مقرّرہ حصّہ ملے گا۔ اور ۱/۳ یا اس سے کچھ کم کو خود اس کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے مخصوص خاندانی حالات کے لحاظ سے (جو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کے معاملے میں مختلف ہوں گے) جس طرح مناسب سمجھے، تقسیم کرنے کی وصیّت کردے۔ پھر اگر کوئی شخص اپنی وصیّت میں ظلم کرے، یا بالفاظِ دیگر، اپنے اختیارِ تمیزی کو غلط طور پر اس طرح استعمال کرے جس سے کسی کے جائز حُقوق متأثّر ہوتے ہوں تو اس کے لیے یہ چارہ کار رکھ دیا گیا ہے کہ خاندان کے لوگ باہمی رضا مندی سے اس کی اصلاح کرلیں، یا قاضیِ شرعی سے مداخلت کی درخواست کی جائے اور وہ وصیّت کو دُرست کردے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو میرا رسالہ ''یتیم پوتے کی وراثت'')

۲۱ – یہ جواب ہے اُن سب نادانوں کو جو میراث کے اس خدائی قانون کو نہیں سمجھتے اور اپنی ناقص عقل سے اس کسر کو پورا کرنا چاہتے ہیں جو اُن کے نزدیک اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں رہ گئی ہے۔

۲۲ – یعنی خواہ ایک بیوی ہو یا کئی بیویاں ہوں، اولاد ہونے کی صورت میں وہ ۱/۸ کی، اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں ۱/۴ کی حصّہ دار ہوں گی، اور یہ ۱/۴ یا ۱/۸ سب بیویوں میں برابری کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا۔

وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ
اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ
مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى
بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو، تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصّہ ملے گا، اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کُل ترکے کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے[۲۳]، جب کہ وصیّت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو میّت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے، بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو[۲۴]۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا

۲۳ – باقی ۵/۶ یا ۲/۳ جو بچتے ہیں، ان میں اگر کوئی اور وارث موجود ہو تو اس کو حصّہ ملے گا، ورنہ اس پُوری باقی ماندہ ملکیّت کے متعلّق اس شخص کو وصیّت کرنے کا حق ہوگا۔

اس آیت کے متعلّق مفسرین کا اجماع ہے کہ اس میں بھائی اور بہنوں سے مُراد اَخیافی بھائی اور بہن ہیں، یعنی جو میّت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں اور باپ ان کا دوسرا ہو۔ رہے سگے بھائی بہن، اور وہ سوتیلے بھائی بہن جو باپ کی طرف سے میت کے ساتھ رشتہ رکھتے ہوں، تو ان کا حکم اِسی سورہ کے آخر میں ارشاد ہُوا ہے۔

۲۴ – وصیّت میں ضرر رسانی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حُقوق تلف ہوتے ہوں۔ اور قرض میں ضرر رسانی یہ ہے کہ محض حق داروں کو محروم کرنے کے لیے آدمی خواہ مخواہ اپنے اُوپر ایسے قرض کا اقرار کرے جو اس نے فی الواقع نہ لیا ہو، یا اور کوئی ایسی چال چلے جس سے مقصود یہ ہو کہ حق دار میراث سے محروم ہو جائیں۔ اس قسم کے ضِرار کو گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ وصیت میں نقصان رسانی بڑے گناہوں میں سے ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی تمام عمر اہلِ جنّت کے سے کام کرتا رہتا ہے، مگر مرتے وقت وصیّت میں ضرر رسانی کر کے اپنی کتابِ زندگی کو ایسے عمل پر ختم کر جاتا ہے جو اُسے دوزخ کا مستحق بنا دیتا ہے۔ یہ ضِرار اور حق تلفی اگرچہ ہر حال میں گناہ ہے، مگر خاص طور پر کَلالہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ جس شخص کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں، اس میں عُموماً یہ میلان پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی جائداد کو کسی نہ کسی طرح تلف کر جائے اور

حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ
حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾ ع

اور نرم خُو ہے۔[۲۵]

یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا، اُسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اُس کے رُسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا، اُسے اللہ آگ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رُسوا کُن سزا ہے۔[۲۵ الف] ع

نسبتاً دُور کے رشتہ داروں کو حصّہ پانے سے محروم کر دے۔

۲۵ – یہاں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا اظہار دو وجوہ سے کیا گیا ہے: ایک، یہ کہ اگر اس قانون کی خلاف ورزی کی گئی تو اللہ کی گرفت سے آدمی نہ بچ سکے گا۔ دوسرے، یہ کہ اللہ نے جو حصّے جس طرح مقرر کیے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں، کیونکہ بندوں کی مَصلحت جس چیز میں ہے، اللہ اس کو خود بندوں سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اور اللہ کی صفتِ حلم یعنی اس کی نرم خوئی کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اللہ نے یہ قوانین مقرر کرنے میں سختی نہیں کی ہے، بلکہ ایسے قاعدے مقرر کیے ہیں جن میں بندوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولت ہے، تاکہ وہ مَشقّت اور تنگی میں مبتلا نہ ہوں۔

۲۵، الف – یہ ایک بڑی خوف ناک آیت ہے جس میں اُن لوگوں کو ہمیشگی کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانونِ وراثت کو تبدیل کریں، یا اُن دُوسری قانونی حدوں کو توڑیں جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدوں کو توڑا۔ اس قانونِ وراثت کے معاملے میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں، وہ خدا کے خلاف کُھلی بغاوت کی حد تک پہنچتی ہیں۔ کہیں عورتوں کو میراث سے مستقل طور پر محروم کیا گیا۔ کہیں

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ
اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ
حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾
وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا
فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں، اُن پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت آ جائے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں، اُن دونوں کو تکلیف دو، پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انھیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے[۲۶]۔

صرف بڑے بیٹے کو میراث کا مستحق ٹھیرایا گیا۔ کہیں سرے سے تقسیمِ میراث ہی کے طریقے کو چھوڑ کر ”مشترک خاندانی جائداد“ کا طریقہ اختیار کر لیا گیا۔ کہیں عورتوں اور مَردوں کا حصّہ برابر کر دیا گیا۔ اور اب ان پُرانی بغاوتوں کے ساتھ تازہ ترین بغاوت یہ ہے کہ بعض مسلمان ریاستیں اہلِ مغرب کی تقلید میں ”وفات ٹیکس“ (death duty) اپنے ہاں رائج کر رہی ہیں، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ میّت کے وارثوں میں ایک وارث حکومت بھی ہے جس کا حصّہ رکھنا اللہ میاں بھول گئے تھے! حالانکہ اسلامی اُصول پر اگر میّت کا ترکہ کسی صورت میں حکومت کو پہنچتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی مرنے والے کا کوئی قریب و بعید رشتہ دار موجود نہ ہو اور اس کا چھوڑا ہوا مال تمام اشیائے متروکہ (unclaimed properties) کی طرح داخلِ بیت المال ہو جائے۔ یا پھر حکومت اس صورت میں کوئی حصّہ پا سکتی ہے جب کہ مرنے والا اپنی وصیّت میں اس کے لیے کوئی حصہ مقرر کر جائے۔

۲۶ – ان دونوں آیتوں میں زِنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورتوں کے متعلّق ہے اور ان کی سزا یہ ارشاد ہوئی ہے کہ انھیں تاحکمِ ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے بارے میں ہے کہ دونوں کو اذیّت دی جائے، یعنی مارا پیٹا جائے، سخت سُست کہا جائے اور ان کی تذلیل کی جائے۔ زنا کے

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ
يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ
السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ

ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قُبولیّت کا حق انھی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی بُرا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظرِ عنایت سے پھر متوجّہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ مگر توبہ اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بُرے کام کیے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے، اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی۔

متعلّق یہ ابتدائی حکم تھا۔ بعد میں سُورۂ نور کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک ہی حکم دیا گیا کہ انھیں سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ اہلِ عرب چونکہ اس وقت تک کسی باقاعدہ حکومت کے ماتحت رہنے اور عدالت و قانون کے نظام کی اطاعت کرنے کے عادی نہ تھے، اس لیے یہ بات حکمت کے خلاف ہوتی اگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی ایک قانونِ تعزیرات بنا کر دفعتًا ان پر نافذ کر دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو رفتہ رفتہ تعزیری قوانین کا خُوگر بنانے کے لیے پہلے زِنا کے متعلق یہ سزائیں تجویز فرمائیں، پھر بتدریج زِنا، قَذف اور سَرِقہ کی حدیں مقرر کیں، اور بالآخر اسی بنا پر تعزیرات کا وہ مفصّل قانون بنا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں نافذ تھا۔

مفسر سُدّی کو ان دونوں آیتوں کے ظاہری فرق سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ پہلی آیت منکوحہ عورتوں کے لیے ہے اور دوسری آیت غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے۔ لیکن یہ ایک کمزور تفسیر ہے جس کی تائید میں کوئی وزنی دلیل نہیں۔ اور اس سے زیادہ کمزور بات وہ ہے جو ابو مسلم اصفہانی نے لکھی ہے کہ پہلی آیت عورت اور عورت کے ناجائز تعلق کے بارے میں ہے اور دوسری آیت مرد اور مرد کے ناجائز تعلّق کے بارے میں۔ تعجب ہے ابو مسلم جیسے ذی علم شخص کی نظر اس حقیقت کی طرف کیوں نہ گئی کہ قرآن انسانی زندگی کے لیے قانون و اَخلاق کی شاہراہ بناتا ہے اور انھی مسائل سے بحث کرتا ہے جو شاہراہ پر پیش آتے ہیں۔ رہیں گلیاں اور پگڈنڈیاں، تو ان کی طرف توجہ کرنا اور ان پر پیش آنے والے ضمنی مسائل سے بحث کرنا کلامِ شاہانہ کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہے۔ ایسی چیزوں کو اس نے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا ۝۱۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَاۗءَ
كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

اور اسی طرح توبہ اُن کے لیے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے[۲۷]۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو[۲۸]۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ انھیں تنگ کر کے اُس مہر کا کچھ حصّہ اُڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انھیں دے چکے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ عہدِ نبوّت کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد اور مرد کے ناجائز تعلّق پر کیا سزا دی جائے تو صحابۂ کرامؓ میں سے کسی نے بھی یہ نہ سمجھا کہ سُورۂ نساء کی اس آیت میں اس کا حکم موجود ہے۔

۲۷– توبہ کے معنیٰ پلٹنے اور رُجوع کرنے کے ہیں۔ گناہ کے بعد بندے کا خدا سے توبہ کرنا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ ایک غلام، جو اپنے آقا کا نافرمان بن کر اس سے منہ پھیر گیا تھا، اب اپنے کیے پر پشیمان ہے اور اطاعت و فرماں برداری کی طرف پلٹ آیا ہے۔ اور خدا کی طرف سے بندے پر توبہ یہ معنیٰ رکھتی ہے کہ غلام کی طرف سے مالک کی نظرِ عنایت جو پھر گئی تھی، وہ ازسرِنَو اس کی طرف مُنعطف ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ میرے ہاں معافی صرف اُن بندوں کے لیے ہے جو قصداً نہیں بلکہ نادانی کی بنا پر قصور کرتے ہیں، اور جب آنکھوں پر سے جہالت کا پردہ ہٹتا ہے تو شرمندہ ہو کر اپنے قصور کی معافی مانگ لیتے ہیں۔ ایسے بندے جب بھی اپنی غلطی پر نادم ہو کر اپنے آقا کی طرف پلٹیں گے، اس کا دروازہ کُھلا پائیں گے کہ ؎

این درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

مگر توبہ اُن کے لیے نہیں ہے جو اپنے خدا سے بے خوف اور بے پروا ہو کر تمام عمر گناہ پر گناہ کیے چلے جائیں اور پھر عین اُس وقت جب کہ موت کا فرشتہ سامنے کھڑا ہو، معافی مانگنے لگیں۔ اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ان اللہ یقبل توبۃ العبد ما لم یُغرغِر۔ ”اللہ بندے کی توبہ بس اُسی وقت تک قُبول کرتا ہے جب تک کہ آثارِ موت شروع نہ ہوں۔“ کیونکہ امتحان کی مہلت جب پُوری ہوگئی اور کتابِ زندگی ختم ہو چکی تو اب پلٹنے کا کون سا موقع ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کفر کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جائے اور دُوسری زندگی کی

إِلَّآ أَنْ يَّأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ
فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ
فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿١٩﴾ وَإِنْ أَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ

ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں (تو ضرور تمھیں تنگ کرنے کا حق ہے[۲۹])۔ ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اُسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو[۳۰]۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دُوسری بیوی لے آنے کا ارادہ

سرحد میں داخل ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ معاملہ اُس کے برعکس ہے جو وہ دنیا میں سمجھتا رہا تو اس وقت معافی مانگنے کا کوئی موقع نہیں۔

۲۸ – اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد اس کے خاندان والے اس کی بیوہ کو میّت کی میراث سمجھ کر اس کے ولی وارث نہ بن بیٹھیں۔ عورت کا شوہر جب مر گیا تو وہ آزاد ہے۔ عدّت گزار کر جہاں چاہے جائے اور جس سے چاہے نکاح کر لے۔

۲۹ – مال اڑانے کے لیے نہیں بلکہ بدچلنی کی سزا دینے کے لیے۔

۳۰ – یعنی اگر عورت خوبصورت نہ ہو، یا اس میں کوئی اور ایسا نَقص ہو جس کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہ آئے، تو یہ مناسب نہیں ہے کہ شوہر فوراً دل برداشتہ ہو کر اسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے۔ حتّی الامکان اسے صبر و تحمُّل سے کام لینا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت خوب صورت نہیں ہوتی مگر اس میں بعض دوسری خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو اِزدِواجی زندگی میں حُسنِ صورت سے زیادہ اہمیّت رکھتی ہیں۔ اگر اُسے اپنی اُن خوبیوں کے اظہار کا موقع ملے تو وہی شوہر جو ابتداءً محض اس کی صورت کی خرابی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا، اس کے حسنِ سیرت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات اِزدِواجی زندگی کی ابتدا میں عورت کی بعض باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں اور وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ صبر سے کام لے اور عورت کے تمام امکانات کو بروئے کار آنے کا موقع دے، تو اس پر خود ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی بُرائیوں سے بڑھ کر خوبیاں رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی اِزدِواجی تعلّق کو منقطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے۔ طلاق بالکل آخری چارۂ کار ہے جس کو ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابغض الحلال الی اللّٰہ الطلاق، یعنی طلاق اگرچہ جائز ہے، مگر تمام جائز کاموں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند اگر کوئی چیز ہے تو وہ طلاق ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ

زَوۡجٍ ۙ وَّاٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰىهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَیۡـًٔا ؕ
اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۲۰﴾ وَكَیۡفَ تَاۡخُذُوۡنَهٗ وَقَدۡ
اَفۡضٰى بَعۡضُكُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ وَّاَخَذۡنَ مِنۡكُمۡ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا ﴿۲۱﴾
وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ

ہی کرلو تو خواہ تم نے اُسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اُسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اُسے کس طرح لے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لُطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں[۳۱]؟

اور جن عورتوں سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں اُن سے ہرگز نکاح نہ کرو، مگر جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا[۳۲]۔

آپؐ نے فرمایا: تزوجوا ولا تطلقوا فان اللّٰہ لا یحب الذواقین والذواقات، یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ اللہ ایسے مَردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو بھونرے کی طرح پھول پھول کا مزا چکھتے پھریں۔

۳۱– پختہ عہد سے مراد نکاح ہے، کیونکہ وہ حقیقت میں ایک مضبوط پیمانِ وفا ہے، جس کے استحکام پر بھروسا کر کے ہی ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالے کرتی ہے۔ اب اگر مرد اپنی خواہش سے اس کو توڑتا ہے تو اسے وہ معاوضہ واپس لینے کا حق نہیں ہے جو اس نے معاہدہ کرتے وقت پیش کیا تھا۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بَقَرہ، حاشیہ ۲۵۱)

۳۲– تمدّنی اور معاشرتی مسائل میں جاہلیّت کے غلط طریقوں کو حرام قرار دیتے ہوئے بالعُموم قرآنِ مجید میں یہ بات ضرور فرمائی جاتی ہے کہ ”جو ہو چکا سو ہو چکا“۔ اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ بے علمی اور نادانی کے زمانے میں جو غَلَطیاں تم لوگ کرتے رہے ہو، ان پر گرفت نہیں کی جائے گی، بشرطیکہ اب حکم آجانے کے بعد اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلو اور جو غلط کام ہیں انھیں چھوڑ دو۔ دوسرے، یہ کہ زمانۂ سابق کے کسی طریقے کو اب اگر حرام ٹھیرایا گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ پچھلے قانون یا رسم و رواج کے مطابق جو کام پہلے کیے جا چکے ہیں ان کو کَالعَدم، اور ان سے پیدا شدہ نتائج کو ناجائز، اور عائد شدہ ذمہ داریوں کو لازماً ساقط بھی کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اگر سوتیلی ماں سے نکاح کو آج حرام کیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب تک جتنے لوگوں نے ایسے نکاح کیے تھے، ان کی اولاد حرامی قرار دی جا رہی ہے اور اپنے باپوں کے مال میں ان کا حقِ وراثت ساقط کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح اگر لین دین کے کسی طریقے کو

ع ۴ ۱۳

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۟ؑ ۲۲ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ

درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے، ناپسندیدہ ہے اور بُرا چلن ہے۔[۳۳] ع

تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں[۳۴]، بیٹیاں[۳۵]، بہنیں[۳۶]، پھوپھیاں، خالائیں،

حرام کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے جتنے معاملات اس طریقے پر ہوئے ہیں، انھیں بھی کالعدم ٹھیرا دیا گیا ہے اور اب وہ سب دولت جو اس طریقے سے کسی نے کمائی ہو اس سے واپس لی جائے گی یا مالِ حرام ٹھیرائی جائے گی۔

۳۳ – اسلامی قانون میں یہ فعل فوجداری جُرم ہے اور قابلِ دست اندازیِ پولیس ہے۔ ابوداؤد، نَسائی اور مُسندِ احمد میں یہ روایات ملتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو موت اور ضبطیِ جائداد کی سزا دی ہے۔ اور ابنِ ماجہ نے ابنِ عباسؓ سے جو روایت نقل ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے یہ قاعدۂ کُلّیہ ارشاد فرمایا تھا کہ من وقع علی ذات محرم فاقتلوہ۔ ’’جو شخص مُحرّمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کرے اُسے قتل کر دو۔‘‘ فقہا کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام احمدؒ تو اسی بات کے قائل ہیں کہ ایسے شخص کو قتل کیا جائے اور اس کا مال ضبط کر لیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر اس نے مُحرّمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کیا ہو تو اس پر حدِّ زنا جاری ہوگی، اور اگر نکاح کیا ہو تو اسے سخت عبرتناک سزا دی جائے گی۔

۳۴ – ماں کا اطلاق سگی اور سوتیلی، دونوں قسم کی ماؤں پر ہوتا ہے اس لیے دونوں حرام ہیں۔ نیز اسی حکم میں باپ کی ماں اور ماں کی ماں بھی شامل ہے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے باپ کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو، وہ بھی بیٹے پر حرام ہے یا نہیں۔ سَلَف میں سے بعض اس کی حُرمت کے قائل نہیں ہیں، اور بعض اسے بھی حرام قرار دیتے ہیں، بلکہ ان کے نزدیک جس عورت کو باپ نے شَہْوَت سے ہاتھ لگایا ہو، وہ بھی بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح سَلَف میں اس امر پر بھی اختلاف رہا ہے کہ جس عورت سے بیٹے کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو، وہ باپ پر حرام ہے یا نہیں۔ اور جس مرد سے ماں یا بیٹی کا ناجائز تعلق رہا ہو یا بعد میں ہو جائے، اس سے نکاح ماں اور بیٹی دونوں کے لیے حرام ہے یا نہیں۔ اس باب میں فقیہانہ بحثیں بہت طویل ہیں، مگر یہ بات بادنیٰ تأمّل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ کسی شخص کے نکاح میں ایسی عورت کا ہونا جس پر اس کا باپ یا اس کا بیٹا بھی نظر رکھتا ہو، یا جس کی ماں یا بیٹی پر بھی اس کی نگاہ ہو، ایک صالح معاشرت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا۔ شریعتِ الٰہی کا مزاج اس معاملے میں اُن قانونی مُوشگافیوں کو قبول نہیں کرتا جن کی بنا پر نکاح اور غیرِ نکاح اور قبلِ نکاح اور بعدِ نکاح اور لمس اور نظر وغیرہ میں فرق کیا جاتا ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ خاندانی

وَبَنٰتُ الۡاَخِ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ
وَاَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمۡ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیۡ

بھتیجیاں، بھانجیاں[۳۷]، اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دُودھ پلایا ہو، اور تمھاری دُودھ شریک بہنیں[۳۸]، اور تمھاری بیویوں کی مائیں[۳۹]، اور تمھاری بیویوں کی لڑکیاں جنھوں نے

زندگی میں ایک ہی عورت کے ساتھ باپ اور بیٹے کے، یا ایک ہی مرد کے ساتھ ماں اور بیٹی کے شہوانی جذبات کا وابستہ ہونا سخت مفاسد کا موجب ہے اور شریعت اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ من نظر الی فرج امرأۃ حرمت علیه امّها و ابنتها۔ ’’جس شخص نے کسی عورت کے اعضائے صنفی پر نظر ڈالی ہو، اُس کی ماں اور بیٹی دونوں اُس پر حرام ہیں۔‘‘ اور لا ینظر اللّٰہ الی رجل نظر الی فرج امرأۃ وابنتها۔ ’’خدا اس شخص کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا جو بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کے اعضائے صنفی پر نظر ڈالے۔‘‘ ان روایات سے شریعت کا منشا صاف واضح ہو جاتا ہے۔

۳۵ – بیٹی کے حکم میں پوتی اور نواسی بھی شامل ہیں۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ناجائز تعلّقات کے نتیجے میں جو لڑکی ہوئی ہو وہ بھی حرام ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ، مالک اور احمد بن حَنبل رحمہم اللہ کے نزدیک وہ بھی جائز بیٹی کی طرح مُحرَّمات میں سے ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک وہ محرّمات میں سے نہیں ہے۔ مگر درحقیقت یہ تصوّر بھی ذوقِ سلیم پر بار ہے کہ جس لڑکی کے متعلّق آدمی یہ جانتا ہو کہ وہ اسی کے نطفے سے پیدا ہوئی ہے، اس کے ساتھ نکاح کرنا اس کے لیے جائز ہو۔

۳۶ – سگی بہن اور ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن، تینوں اس حکم میں یکساں ہیں۔

۳۷ – اِن سب رشتوں میں بھی سگے اور سوتیلے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ باپ اور ماں کی بہن، خواہ سگی ہو خواہ سوتیلی، یا باپ شریک، بہرحال وہ بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح بھائی اور بہن، خواہ سگے ہوں یا سوتیلے یا باپ شریک، ان کی بیٹیاں ایک شخص کے لیے اپنی بیٹی کی طرح حرام ہیں۔

۳۸ – اس امر پر اُمّت میں اتفاق ہے کہ ایک لڑکے یا لڑکی نے جس عورت کا دُودھ پیا ہو، اس کے لیے وہ عورت ماں کے حکم میں اور اس کا شوہر باپ کے حکم میں ہے، اور تمام وہ رشتے جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں، رضاعی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ اس حکم کا ماخَذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ حُرمتِ رضاعت کس قدر دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جتنی مقدار سے روزہ دار کا روزہ ٹوٹ سکتا ہے

فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ

تمھاری گودوں میں پرورش پائی ہے[۳۸]___ اُن بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمھارا تعلّقِ زن وشو ہو چکا ہو۔ ورنہ اگر (صرف نکاح ہُوا ہو اور) تعلّقِ زن وشو نہ ہُوا ہو تو (انھیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے ___ اور تمھارے اُن بیٹوں کی بیویاں

اتنی ہی مقدار میں اگر بچّہ کسی کا دودھ پی لے تو حُرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ مگر امام احمدؒ کے نزدیک تین مرتبہ پینے سے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک پانچ دفعہ پینے سے یہ حُرمت ثابت ہوتی ہے۔ نیز اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کس عمر میں پینے سے یہ رشتے حرام ہوتے ہیں۔ اس باب میں فقہا کے اقوال حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اعتبار صرف اُس زمانے میں دودھ پینے کا ہے جب کہ بچے کا دودھ چُھڑایا نہ جا چکا ہو اور شیر خواری ہی پر اس کے تغذیے کا انحصار ہو۔ ورنہ دودھ چھُٹائی کے بعد اگر کسی بچّے نے کسی عورت کا دودھ پی لیا ہو تو اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے اُس نے پانی پی لیا۔ یہ رائے اُمِّ سَلَمہؓ اور ابنِ عباسؓ کی ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی ایک روایت اس معنیٰ میں آئی ہے۔ زُہری، حَسَن بصری، قَتَادَہ، عِکرِمہ اور اَوزاعی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔

(۲) دو سال کی عمر کے اندر اندر جو دُودھ پیا گیا ہو، صرف اسی سے حُرمتِ رضاعت ثابت ہوگی۔ یہ حضرت عمرؓ، ابنِ مسعودؓ، ابو ہریرہؓ اور ابنِ عمرؓ کا قول ہے اور فقہا میں سے امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف، امام محمد، اور سُفیان ثَوری رحمہم اللہ نے اسے قبول کیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ سے بھی ایک قول اسی کی تائید میں منقول ہے۔ امام مالکؒ بھی اسی حد کے قائل ہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ دو سال سے اگر مہینا دو مہینا زائد عمر بھی ہو تو اس میں دُودھ پینے کا وہی حکم ہے۔

(۳) امام ابو حنیفہؒ اور امام زُفَرؒ کا مشہور قول یہ ہے کہ زمانۂ رضاعت ڈھائی سال ہے اور اس کے اندر پینے سے حُرمتِ رضاعت ثابت ہوتی ہے۔

(۴) خواہ کسی عمر میں دُودھ پیے، حُرمت ثابت ہو جائے گی۔ یعنی اس معاملے میں اصل اعتبار دُودھ کا ہے نہ کہ عمر کا۔ پینے والا اگر بوڑھا بھی ہو تو اس کا وہی حکم ہے جو شِیر خوار بچے کا ہے۔ یہی رائے ہے حضرت عائشہؓ کی۔ اور حضرت علیؓ سے بھی صحیح تر روایت اسی کی تائید میں منقول ہے۔ اور فقہا میں سے عُروہ بن زُبیر، عطا، لَیث بن سعد اور ابنِ حزم رحمہم اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

۳۹- اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے محض نکاح ہُوا ہو، اس کی ماں حرام ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ، مالک، احمد اور شافعی رحمہم اللہ اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ

الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۙ﴿۲۳﴾

الجزء ۵

وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ

عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا

جو تمھاری صُلب سے ہوں[۴۱]۔ اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو،[۴۲] مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے[۴۳]۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دُوسرے کے نکاح میں ہوں (مُحْصَنات)۔ البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو (جنگ میں) تمھارے ہاتھ آئیں[۴۴]۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے۔ اِن کے ماسوا جتنی عورتیں ہیں انھیں اپنے اموال کے ذریعے سے حاصل کرنا تمھارے لیے

جب تک کسی عورت سے خَلْوت نہ ہوئی ہو، اس کی ماں حرام نہیں ہوتی۔

۴۰ – ایسی لڑکی کا حرام ہونا اس شرط پر موقوف نہیں ہے کہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو۔ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے محض اس رشتے کی نزاکت ظاہر کرنے کے لیے استعمال فرمائے ہیں۔ فقہائے اُمّت کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ سوتیلی بیٹی آدمی پر بہر حال حرام ہے، خواہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو یا نہ پائی ہو۔

۴۱ – یہ قید اس غَرَض کے لیے بڑھائی گئی ہے کہ جسے آدمی نے بیٹا بنا لیا ہو، اس کی بیوہ یا مُطَلَّقہ آدمی پر حرام نہیں ہے۔ حرام صرف اُس بیٹے کی بیوی ہے جو آدمی کی اپنی صُلب سے ہو۔ اور بیٹے ہی کی طرح پوتے اور نواسے کی بیوی بھی دادا اور نانا پر حرام ہے۔

۴۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ خالہ اور بھانجی اور پھوپھی اور بھتیجی کو بھی ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ اس معاملے میں یہ اُصُول سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی دو عورتوں کو جمع کرنا بہر حال حرام ہے جن میں سے کوئی ایک اگر مرد ہوتی تو اس کا نکاح دوسری سے حرام ہوتا۔

۴۳ – یعنی جاہلیت کے زمانے میں جو ظلم تم لوگ کرتے رہے ہو کہ دو دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کر لیتے تھے، اس پر باز پُرس نہ ہوگی، بشرطیکہ اب اس سے باز رہو۔ (مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۳۲) اسی بنا پر یہ حکم ہے کہ جس شخص نے حالتِ کفر میں دو بہنوں کو نکاح میں جمع کر رکھا ہو، اُسے اسلام لانے کے بعد ایک کو رکھنا اور ایک کو چھوڑنا ہوگا۔

۴۴ – یعنی جو عورتیں جنگ میں پکڑی ہوئی آئیں اور ان کے کافر شوہر دار الحرب میں موجود ہوں، وہ حرام نہیں ہیں، کیونکہ دار الحرب سے دار الاسلام میں آنے کے بعد ان کے نکاح ٹوٹ گئے۔ ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کیا جا سکتا ہے اور جس کی مِلکِ یمین میں وہ ہوں وہ ان سے تمتُّع بھی کر سکتا ہے۔ البتہ فقہا کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اگر میاں اور بیوی دونوں ایک ساتھ گرفتار ہوں تو ان کا کیا حکم ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ ان کا نکاح باقی رہے گا، اور امام مالکؒ و شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ ان کا نکاح بھی باقی نہ رہے گا۔

لونڈیوں سے تَمَتُّع کے معاملے میں بہت سی غلط فہمیاں لوگوں کے ذہن میں ہیں، لہٰذا حسبِ ذیل مسائل کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے:

(۱) جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں، ان کو پکڑتے ہی ہر سپاہی ان کے ساتھ مباشرت کر لینے کا مجاز نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی قانون یہ ہے کہ ایسی عورتیں حکومت کے حوالے کر دی جائیں گی۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے، چاہے ان سے فِدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ اُن مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں، اور چاہے تو انھیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ ایک سپاہی صرف اُس عورت ہی سے تمتُّع کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے باقاعدہ اس کی مِلک میں دی گئی ہو۔

(۲) جو عورت اس طرح کسی کی مِلک میں دی جائے، اس کے ساتھ بھی اس وقت تک مباشرت نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اسے ایک مرتبہ ایّامِ ماہواری نہ آ جائیں اور یہ اطمینان نہ ہو لے کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے مباشرت کرنا حرام ہے۔ اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضعِ حمل سے پہلے بھی مباشرت ناجائز ہے۔

(۳) جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتُّع کے معاملے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہلِ کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو، بہرحال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصّے میں وہ آئیں، وہ ان سے تَمَتُّع کر سکتے ہیں۔

(۴) جو عورت جس شخص کے حصّے میں دی گئی ہو صرف وہی اس کے ساتھ تمتُّع کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو اسے ہاتھ لگانے کا حق نہیں ہے۔ اس عورت سے جو اولاد ہو گی وہ اسی شخص کی جائز اولاد سمجھی جائے گی جس کی مِلک میں وہ عورت ہے۔ اُس اولاد کے قانونی حُقوق وہی ہوں گے جو شریعت میں صُلبی اولاد کے لیے مقرر ہیں۔ صاحبِ اولاد ہو جانے کے بعد وہ عورت فروخت نہ کی جا سکے گی اور مالک کے مرتے ہی وہ آپ سے آپ آزاد ہو جائے گی۔

(۵) جو عورت اس طرح کسی شخص کی مِلک میں آئی ہو، اسے اگر اس کا مالک کسی دوسرے شخص کے نکاح میں دے دے تو پھر مالک کو اس سے دوسری تمام خدمات لینے کا حق تو رہتا ہے لیکن شہوانی تعلق کا حق باقی نہیں رہتا۔

(۶) جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے، اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔ لیکن اس معاملے میں کوئی حد مقرر نہ کرنے سے شریعت کا منشا یہ نہیں تھا کہ مال دار لوگ بے شمار لونڈیاں خرید خرید کر جمع کر لیں اور اپنے گھر کو عیاشی کا گھر بنا لیں۔ بلکہ درحقیقت اس معاملے میں عدمِ تعیُّن کی وجہ جنگی حالات کا عَدَمِ تعیُّن ہے۔

(۷) مِلکیّت کے تمام دوسرے حقوق کی طرح وہ مالکانہ حقوق بھی قابلِ انتقال ہیں جو کسی شخص کو ازرُوئے قانون

بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ
مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا
حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ
الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ
الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ

حلال کر دیا گیا ہے، بشرطیکہ حصارِ نکاح میں اُن کو محفوظ کرو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔ پھر جو ازدواجی زندگی کا لُطف تم ان سے اُٹھاؤ، اس کے بدلے اُن کے مَہر بطور فرض کے ادا کرو، البتہ مَہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمھارے درمیان اگر کوئی سمجھوتا ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اللہ علیم اور دانا ہے۔ اور جو شخص تم میں سے اتنی مَقدِرَت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (مُحْصَنات) سے نکاح کر سکے، اسے چاہیے کہ تمھاری اُن لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمھارے قبضے میں ہوں اور مومنہ ہوں۔ اللہ تمھارے ایمانوں کا حال خُوب جانتا ہے، تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ[۴۵] ہو،

کسی اسیرِ جنگ پر حکومت نے عطا کیے ہوں۔

(۸) حکومت کی طرف سے حقوقِ ملکیّت کا باقاعدہ عطا کیا جانا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک قانونی فعل ہے۔ لہٰذا کوئی معقول وجہ نہیں کہ جو شخص نکاح میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتا، وہ خواہ مخواہ لونڈی سے تمتُّع میں کراہت محسوس کرے۔

(۹) اسیرانِ جنگ میں سے کسی عورت کو کسی شخص کی ملکیّت میں دے دینے کے بعد پھر حکومت اسے واپس لینے کی مجاز نہیں رہتی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی عورت کا ولی اس کو کسی کے نکاح میں دے چکنے کے بعد پھر واپس لینے کا حق دار نہیں رہتا۔

(۱۰) اگر کوئی فوجی کمانڈر محض وقتی اور عارضی طور پر اپنے سپاہیوں کو قیدی عورتوں سے شہوانی پیاس بجھا لینے کی اجازت دے دے اور محض کچھ وقت کے لیے انھیں فوج میں تقسیم کرے تو یہ اسلامی قانون کی رُو سے قطعاً ایک ناجائز فعل ہے۔ اس میں اور زِنا میں کوئی فرق نہیں ہے، اور زِنا اسلامی قانون میں جُرم ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو ہماری کتاب ''تفہیمات'' حصّۂ دوم، اور ''رسائل و مسائل'' حصّۂ اوّل)

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ
فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ
مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ

لٰہذا اُن کے سرپرستوں کی اجازت سے اُن کے ساتھ نکاح کرلو اور معروف طریقے سے اُن کے مہر ادا کردو، تاکہ وہ حصارِ نکاح میں محفوظ (مُحْصَنات) ہو کر رہیں، آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں۔ پھر جب وہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اُس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو خاندانی عورتوں (مُحْصَنات) کے لیے مقرر[۴۶] ہے۔ یہ سہولت[۴۷] تم میں سے اُن لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بندِ تقویٰ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر

۴۵ – یعنی معاشرت میں لوگوں کے درمیان جو فرقِ مَراتب ہے وہ محض ایک اعتباری چیز ہے، ورنہ دراصل سب مسلمان یکساں ہیں، اور اگر کوئی حقیقی وجہِ امتیاز ان کے درمیان ہے تو وہ ایمان ہے جو محض اُونچے گھرانوں ہی کا حصّہ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک لونڈی ایمان و اَخلاق میں ایک خاندانی عورت سے بہتر ہو۔

۴۶ – سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوتی ہے جس سے خوارج اور اُن دُوسرے لوگوں نے فائدہ اُٹھایا ہے جو رَجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ”اگر آزاد شادی شدہ عورت کے لیے شریعتِ اسلام میں زنا کی سزا رَجم ہے تو اس کی نصف سزا کیا ہو سکتی ہے جو لونڈی کو دی جائے؟ لٰہذا یہ آیت اس بات پر دلیلِ قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا ہے ہی نہیں۔“ لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ مُحْصَنٰت (محفوظ عورتیں) دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ”شادی شدہ عورتیں“ جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو۔ دوسرے ”خاندانی عورتیں“ جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو، اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیتِ زیرِ بحث میں مُحْصَنٰت کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لیے دوسرے معنٰی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ پہلے معنٰی میں، جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے۔ بخلاف اس کے لونڈیوں کے لیے مُحْصَنٰت کا لفظ پہلے معنٰی میں استعمال ہوا ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ جب انھیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (فَاِذَآ اُحْصِنَّ) تب ان کے لیے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے جو

ع۴

تَصۡبِرُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۵﴾ ع یُرِیۡدُ اللّٰہُ
لِیُبَیِّنَ لَکُمۡ وَ یَہۡدِیَکُمۡ سُنَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ
وَ یَتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۶﴾ وَ اللّٰہُ یُرِیۡدُ اَنۡ

تم صبر کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اُن طریقوں کو واضح کرے اور اُنھی طریقوں پر تمھیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحا کرتے تھے۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمھاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے، اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔[۴۸] ہاں، اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ

مذکور ہوئی۔ اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں: ایک، خاندان کی حفاظت، جس کی بنا پر وہ شادی کے بغیر بھی مُحْصَنہ ہوتی ہے۔ دوسری، شوہر کی حفاظت، جس کی وجہ سے اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی جب تک لونڈی ہے، مُحْصَنہ نہیں ہے، کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے۔ البتہ نکاح ہونے پر اس کو صرف شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی اَدھوری، کیونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی مِلک میں وہ تھی، اور نہ اُسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہُوا کرتا ہے۔ لہٰذا اسے جو سزا دی جائے گی، وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی، نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ سورۂ نور کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے، وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لیے ہے، جن کے مقابلے میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ رہیں شادی شدہ خاندانی عورتیں، تو وہ غیر شادی شدہ مُحْصَنات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں، کیونکہ وہ دُہری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ قرآن ان کے لیے سزائے رجم کی تصریح نہیں کرتا، لیکن نہایت لطیف طریقے سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو بلید الذہن لوگوں سے مخفی رہ جائے تو رہ جائے، نبی کے ذہنِ رسا سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔

۴۷ – یعنی خاندانی عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو تو کسی لونڈی سے اس کے مالکوں کی اجازت لے کر نکاح کر لینے کی سہولت۔

۴۸ – سورہ کے آغاز سے یہاں تک جو ہدایات دی گئی ہیں، اور اس سورۃ کے نُزول سے پہلے سورۂ بَقَرہ میں مسائلِ تمدّن و معاشرت کے متعلق جو ہدایات دی جا چکی تھیں، ان سب کی طرف بحیثیتِ مجموعی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

يَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۚ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا
عَظِيمًا ﴿٢٧﴾ يُرِيدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾

توجّہ کرنا چاہتا ہے، مگر جو لوگ خود اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کر رہے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ راست سے ہٹ کر دُور نکل[49] جاؤ۔ اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے، کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

جا رہا ہے کہ یہ معاشرت، اخلاق اور تمدّن کے وہ قوانین ہیں جن پر قدیم ترین زمانے سے ہر دَور کے انبیاؑ اور اُن کے صالح پیرو عمل کرتے چلے آئے ہیں، اور یہ اللہ کی عنایت و مہربانی ہے کہ وہ تم کو جاہلیّت کی حالت سے نکال کر صالحین کے طریقۂ زندگی کی طرف تمھاری رہنمائی کر رہا ہے۔

۴۹ – یہ اشارہ ہے منافقین اور قدامت پرست جُہلا اور نواحِ مدینہ کے یہودیوں کی طرف۔ منافقین اور قدامت پرستوں کو تو وہ اصلاحات سخت ناگوار تھیں جو تمدّن و معاشرت میں صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصّبات اور رسم و رواج کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ میراث میں لڑکیوں کا حصّہ۔ بیوہ عورت کا سُسرال کی بندشوں سے رہائی پانا اور عدّت کے بعد اس کا ہر شخص سے نکاح کے لیے آزاد ہو جانا۔ سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہونا۔ دو بہنوں کے ایک ساتھ نکاح میں جمع کیے جانے کو ناجائز قرار دینا۔ مُتبنّٰی کو وراثت سے محروم کرنا اور منہ بولے باپ کے لیے مُتبنّٰی کی بیوہ اور مُطلّقہ کا حلال ہونا۔ یہ اور اس طرح کی دوسری اصلاحات میں سے ایک ایک چیز ایسی تھی جس پر بڑے بوڑھے اور آبائی رُسُوم کے پرستار چیخ چیخ اُٹھتے تھے۔ مدّتوں اِن احکام پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شرارت پسند لوگ ان باتوں کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوتِ اصلاح کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے پھرتے تھے۔ مثلاً جو شخص کسی ایسے نکاح سے پیدا ہوا تھا جسے اب اسلامی شریعت حرام قرار دے رہی تھی، اس کو یہ کہہ کہہ کر اشتعال دلایا جاتا تھا کہ لیجیے، آج جو نئے احکام وہاں آئے ہیں اُن کی رُو سے آپ کی ماں اور آپ کے باپ کا تعلق ناجائز ٹھیرا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نادان لوگ اُس اصلاح کے کام میں رکاوٹیں ڈال رہے تھے جو اُس وقت احکامِ الٰہی کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔

دوسری طرف یہودی تھے جنھوں نے صدیوں کی مُوشگافیوں سے اصل خدائی شریعت پر اپنے خود ساختہ احکام و قوانین کا ایک بھاری خول چڑھا رکھا تھا۔ بے شمار پابندیاں اور باریکیاں اور سختیاں تھیں جو انھوں نے شریعت میں بڑھا لی تھیں۔ بکثرت حلال چیزیں ایسی تھیں جنھیں وہ حرام کر بیٹھے تھے۔ بہت سے اَوہام تھے جن کو انھوں نے قانونِ خداوندی میں داخل کر لیا تھا۔ اب یہ بات ان کے علما اور عوام، دونوں کی ذہنیت اور مذاق کے بالکل خلاف تھی کہ وہ اس سیدھی سادھی شریعت کی قدر پہچان سکتے جو قرآن پیش کر رہا تھا۔ وہ قرآن کے احکام کو سُن کر بے تاب ہو ہو جاتے تھے۔ ایک

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ
اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۫ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دُوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے[50]۔ اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو[51]۔

ایک چیز پر سو سو اعتراضات کرتے تھے۔ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یا تو قرآن ان کے فقہا کے تمام اجتہادات اور ان کے اسلاف کے سارے اَوہام وخُرافات کو شریعتِ الٰہی قرار دے، ورنہ یہ ہرگز کتابِ الٰہی نہیں ہے۔مثال کے طور پر یہودیوں کے ہاں دستور تھا کہ ایّامِ ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا۔ نہ اس کا پکایا ہُوا کھانا کھاتے، نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے، نہ اس کے ساتھ فرش پر بیٹھتے۔ بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چُھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ان چند دنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی تھی۔ یہی رواج یہودیوں کے اثر سے مدینے کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپؐ سے اس کے متعلّق سوال کیا گیا۔ جواب میں وہ آیت آئی جو سورۂ بَقَرہ، رکوع ۲۸ کے آغاز میں درج ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی رُو سے حکم دیا کہ ایّامِ ماہواری میں صرف مباشرت ناجائز ہے۔ باقی تمام تعلّقات عورتوں کے ساتھ اسی طرح رکھے جائیں جس طرح دوسرے دنوں میں ہوتے ہیں۔اس پر یہودیوں میں شور مچ گیا۔وہ کہنے لگے کہ یہ شخص تو قسم کھا کر بیٹھا ہے کہ جو جو کچھ ہمارے ہاں حرام ہے، اسے حلال کر کے رہے گا اور جس جس چیز کو ہم ناپاک کہتے ہیں، اسے پاک قرار دے گا۔

۵۰ – ”باطل طریقوں“ سے مراد وہ تمام طریقے ہیں جو خلافِ حق ہوں اور شرعاً و اَخلاقاً ناجائز ہوں۔ ”لین دین“ سے مراد یہ ہے کہ آپس میں مفاد ومنافع کا تبادلہ ہونا چاہیے، جس طرح تجارت اور صنعت وحرفت وغیرہ میں ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی ضروریات فراہم کرنے کے لیے محنت کرتا ہے اور وہ اس کا معاوضہ دیتا ہے۔”آپس کی رضامندی“ سے مراد یہ ہے کہ لین دین نہ تو کسی ناجائز دباؤ سے ہو اور نہ فریب و دغا سے۔رشوت اور سُود میں بظاہر رضامندی ہوتی ہے، مگر فی الواقع وہ رضامندی مجبورانہ ہوتی ہے اور دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جُوے میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے، مگر درحقیقت جُوے میں حصّہ لینے والا ہر شخص اس غلط اُمید پر رضامند ہوتا ہے کہ جیت اس کی ہوگی۔ ہارنے کے ارادے سے کوئی بھی راضی نہیں ہوتا۔ جَعْل اور فریب کے کاروبار میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے، مگر اس غلط فہمی کی بنا پر ہوتی ہے کہ اندر جَعْل وفریب نہیں ہے۔ اگر فریقِ ثانی کو معلوم ہو کہ تم اس سے جَعْل یا فریب کر رہے ہو تو وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہو۔

۵۱ – یہ فقرہ پچھلے فقرے کا تتمّہ بھی ہوسکتا ہے اور خود ایک مستقل فقرہ بھی۔ اگر پچھلے فقرے کا تتمّہ سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھانا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ دنیا میں اس سے نظامِ تمدن

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا
فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا
كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ

یقین مانو کہ اللہ تمھارے اُوپر مہربان[۵۲] ہے۔ جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا، اُس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگر تم اُن بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمھیں منع کیا جا رہا ہے، تو تمھاری چھوٹی موٹی بُرائیوں کو ہم تمھارے حساب سے ساقط کر دیں[۵۳] گے اور تم کو عزّت

خراب ہوتا ہے اور اس کے بُرے نتائج سے حرام خور آدمی خود بھی نہیں بچ سکتا۔ اور آخرت میں اس کی بدولت آدمی سخت سزا کا مُستوجِب بن جاتا ہے۔ اور اگر اسے مستقل فقرہ سمجھا جائے تو اس کے دو معنٰی ہیں: ایک، یہ کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ دوسرے، یہ کہ خودکُشی نہ کرو۔ اللہ تعالٰی نے الفاظ ایسے جامع استعمال کیے ہیں اور ترتیبِ کلام ایسی رکھی ہے کہ اس سے یہ تینوں مفہوم نکلتے ہیں اور تینوں حق ہیں۔

۵۲ – یعنی اللہ تعالٰی تمھارا خیر خواہ ہے، تمھاری بھلائی چاہتا ہے، اور یہ اس کی مہربانی ہی ہے کہ وہ تم کو ایسے کاموں سے منع کر رہا ہے جن میں تمھاری اپنی بربادی ہے۔

۵۳ – یعنی ہم تنگ دل اور تنگ نظر نہیں ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پکڑ کر اپنے بندوں کو سزا دیں۔ اگر تمھارا نامۂ اعمال بڑے جرائم سے خالی ہو تو چھوٹی خطاؤں کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور تم پر فردِ جرم لگائی ہی نہ جائے گی۔ البتہ اگر بڑے جرائم کا ارتکاب کر کے آؤ گے تو پھر جو مُقدّمہ تم پر قائم کیا جائے گا، اس میں چھوٹی خطائیں بھی گرفت میں آ جائیں گی۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بڑے گناہ اور چھوٹے گناہ میں اُصولی فرق کیا ہے۔ جہاں تک میں نے قرآن اور سنّت میں غور کیا ہے، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم بالصّواب) کہ تین چیزیں ہیں جو کسی فعل کو بڑا گناہ بناتی ہیں:

(۱) کسی کی حق تلفی، خواہ وہ خدا ہو جس کا حق تلف کیا گیا ہے، یا والدین ہوں، یا دوسرے انسان، یا خود اپنا نفس۔ پھر جس کا حق جتنا زیادہ ہے اسی قدر اس کے حق کو تلف کرنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اسی بنا پر گناہ کو ”ظلم“ بھی کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر شرک کو قرآن میں ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔

(۲) اللہ سے بے خوفی اور اس کے مقابلے میں اِستکبار، جس کی بنا پر آدمی اللہ کے امر و نہی کی پروا نہ کرے اور نافرمانی کے ارادے سے قصداً وہ کام کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے، اور عمداً اُن کاموں کو نہ کرے جن کا اُس نے حکم دیا ہے۔ یہ

مُّدۡخَلًا كَرِيمًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى
بَعۡضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا اكۡتَسَبُوۡا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا اكۡتَسَبۡنَ ؕ
وَسۡـَٔلُوا اللّٰهَ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ﴿۳۲﴾

کی جگہ داخل کریں گے۔

اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دُوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنّا نہ کرو۔ جو کچھ مَردوں نے کمایا ہے اُس کے مطابق ان کا حِصّہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق اُن کا حصّہ۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دُعا مانگتے رہو، یقیناً اللہ ہر چیز کا عِلم رکھتا ہے۔[۵۴]

نافرمانی جس قدر زیادہ ڈِھٹائی اور جسارت اور ناخدا ترسی کی کیفیّت اپنے اندر لیے ہوئے ہوگی، اسی قدر گناہ بھی شدید ہوگا۔ اسی معنٰی کے لحاظ سے گناہ کے لیے ''فِسق'' اور ''معصیت'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

(۳) اُن روابط کو توڑنا اور اُن تعلقات کو بگاڑنا جن کے وصل و استحکام اور دُرستی پر انسانی زندگی کا امن منحصر ہے، خواہ یہ روابط بندے اور خدا کے درمیان ہوں، یا بندے اور بندے کے درمیان۔ پھر جو رابطہ جتنا زیادہ اہم ہے اور جس کے کٹنے سے امن کو جتنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے اور جس کے معاملے میں مامونیت کی جتنی زیادہ توقع کی جاتی ہے، اسی قدر اس کو توڑنے اور کاٹنے اور خراب کرنے کا گناہ زیادہ بڑا ہے۔ مثلاً زِنا اور اس کے مختلف مدارج پر غور کیجیے۔ یہ فعل فی نفسہٖ نظامِ تمدّن کو خراب کرنے والا ہے، اس لیے بجائے خود ایک بڑا گناہ ہے، مگر اس کی مختلف صورتیں ایک دوسرے سے گناہ میں شدید تر ہیں۔ شادی شدہ آدمی کا زنا کرنا بن بیاہے کی بہ نسبت زیادہ سخت گناہ ہے۔ منکوحہ عورت سے زنا کرنا غیر منکوحہ سے کرنے کی بہ نسبت قبیح تر ہے۔ ہمسایہ کے گھر والوں سے زنا کرنا غیر ہمسایہ سے کرنے کی بہ نسبت زیادہ بُرا ہے۔ مُحرّمات مثلاً بہن یا بیٹی یا ماں سے زنا کرنا غیر عورت سے کرنے کی بہ نسبت اَشنَع ہے۔ مسجد میں زنا کرنا کسی اور جگہ کرنے سے اَشدّ ہے۔ ان مثالوں میں ایک ہی فعل کی مختلف صُورتوں کے درمیان گناہ ہونے کی حیثیت سے مدارج کا فرق انھی وُجوہ سے ہے جو اُوپر بیان ہوئے ہیں۔ جہاں مامونیت کی توقع جس قدر زیادہ ہے، جہاں انسانی رابطہ جتنا زیادہ مستحقِ احترام ہے، اور جہاں اس رابطے کو قطع کرنا جس قدر زیادہ موجبِ فساد ہے، وہاں زنا کا ارتکاب اسی قدر زیادہ شدید گناہ ہے۔ اسی معنٰی کے لحاظ سے گناہ کے لیے ''فُجور'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

۵۴ – اس آیت میں ایک بڑی اہم اَخلاقی ہدایت دی گئی ہے، جسے اگر ملحوظ رکھا جائے تو اجتماعی زندگی میں

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ
اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۳۳ ع

اور ہم نے ہر اُس ترکے کے حق دار مقرر کر دیے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمھارے عہد و پیمان ہوں، تو ان کا حصّہ انھیں دو، یقیناً اللہ ہر چیز پر نگراں[55] ہے۔ ع

انسان کو بڑا امن نصیب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں نہیں بنایا ہے بلکہ ان کے درمیان بے شمار حیثیتوں سے فرق رکھے ہیں۔ کوئی خوب صورت ہے اور کوئی بدصُورت۔ کوئی خوش آواز ہے اور کوئی بد آواز۔ کوئی طاقت ور ہے اور کوئی کمزور۔ کوئی سلیم الاعضا ہے اور کوئی پیدایشی طور پر جسمانی نَقص لے کر آیا ہے۔ کسی کو جسمانی اور ذہنی قوتوں میں سے کوئی قوت زیادہ دی ہے اور کسی کو کوئی دوسری قوت۔ کسی کو بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں۔ کسی کو زیادہ ذرائع دیے ہیں اور کسی کو کم۔ اسی فرق و امتیاز پر انسانی تمدّن کی ساری گونا گونی قائم ہے اور یہ عین مُقتضائے حکمت ہے۔ جہاں اس فرق کو اس کے فطری حُدود سے بڑھا کر انسان اپنے مصنوعی امتیازات کا اس پر اضافہ کرتا ہے وہاں ایک نوعیّت کا فساد رُونما ہوتا ہے، اور جہاں سرے سے اس فرق ہی کو مٹا دینے کے لیے فطرت سے جنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہاں ایک دوسری نوعیّت کا فساد برپا ہوتا ہے۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جسے کسی حیثیت سے اپنے مقابلے میں بڑھا ہوا دیکھے، بے چین ہو جائے، یہی اجتماعی زندگی میں رشک، حسد، رقابت، عداوت، مزاحمت اور کشاکش کی جڑ ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فضل اُسے جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا، اسے پھر وہ ناجائز تدبیروں سے حاصل کرنے پر اُتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔ اس کے ارشاد کا مدّعا یہ ہے کہ جو فضل اس نے دوسروں کو دیا ہو اس کی تمنّا نہ کرو، البتہ اللہ سے فضل کی دُعا کرو، وہ جس فضل کو اپنے علم و حکمت سے تمھارے لیے مناسب سمجھے گا، عطا فرما دے گا۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”مَردوں نے جو کچھ کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصّہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصّہ“، اس کا مطلب جہاں تک مَیں سمجھ سکا ہوں، یہ ہے کہ مَردوں اور عورتوں میں سے جس کو جو کچھ اللہ نے دیا ہے، اس کو استعمال کر کے جو جتنی اور جیسی بُرائی یا بھلائی کمائے گا، اسی کے مطابق، یا بالفاظِ دیگر، اسی کی جنس سے اللہ کے ہاں حصہ پائے گا۔

۵۵ - اہلِ عرب میں قاعدہ تھا کہ جن لوگوں کے درمیان دوستی اور بھائی چارہ کے عہد و پیمان ہو جاتے تھے، وہ ایک دوسرے کی میراث کے حق دار بن جاتے تھے۔ اسی طرح جسے بیٹا بنا لیا جاتا تھا، وہ بھی منہ بولے باپ کا وارث قرار پاتا تھا۔ اس آیت میں جاہلیّت کے اس طریقے کو منسوخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وراثت تو اُسی قاعدے کے مطابق

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعۡضَهُمۡ
عَلٰى بَعۡضٍ وَّبِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ‌ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ
حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَيۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ‌ؕ وَالّٰتِىۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ
فَعِظُوۡهُنَّ وَاهۡجُرُوۡهُنَّ فِى الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ‌ ۚ

مرد عورتوں پر قوّام[56] ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت[57] دی ہے، اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شِعار ہوتی ہیں اور مَردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں اُن کے حُقوق کی حفاظت کرتی ہیں[58]۔ اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو انھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں اُن سے علیحدہ رہو اور[59] مارو،

رشتہ داروں میں تقسیم ہونی چاہیے جو ہم نے مقرر کر دیا ہے، البتہ جن لوگوں سے تمھارے عہد و پیمان ہوں، اُن کو اپنی زندگی میں تم جو چاہو دے سکتے ہو۔

۵۶ – قوّام یا قیّم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد، یا ادارے، یا نظام کے معاملات کو دُرست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیّا کرنے کا ذمّہ دار ہو۔

۵۷ – یہاں فضیلت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے، جیسا کہ ایک عام اُردو خواں آدمی اس لفظ کا مطلب لے گا، بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنیٰ میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعاً بعض ایسی خُصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں۔ اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوّام ہونے کی اہلیّت رکھتا ہے، اور عورت فطرتاً ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت و خبر گیری کے تحت رہنا چاہیے۔

۵۸ – حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اُسے دیکھو تو تمھارا جی خوش ہو جائے، جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمھاری اطاعت کرے، اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمھارے پیچھے تمھارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔“ یہ حدیث اس آیت کی بہترین تفسیر کرتی ہے۔ مگر یہاں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عورت پر اپنے شوہر کی اطاعت سے اہم اور اَقْدَم اپنے خالق کی اطاعت ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شوہر خدا کی مَعصیت کا حکم دے، یا خدا کے عائد کیے ہوئے کسی فرض سے باز رکھنے کی کوشش کرے، تو اس کی اطاعت سے انکار کر دینا عورت کا فرض ہے۔ اس صورت میں اگر وہ اس کی اطاعت کرے گی تو گناہ گار ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر شوہر اپنی بیوی کو نفل نماز یا نفل روزہ ترک کرنے کے لیے کہے تو لازم ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔ اس صُورت میں اگر وہ نوافل ادا کرے گی تو مقبول نہ ہوں گے۔

فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلِيًّا كَبِيۡرًا ۝۳۴ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا
حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا
يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا خَبِيۡرًا ۝۳۵

پھر اگر وہ تمھاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو، یقین رکھو کہ اُوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔ اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلّقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو، وہ دونوں[۶۰] اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ اُن کے درمیان مُوافقت کی صورت نکال دے گا، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔[۶۱]

۵۹ – یہ مطلب نہیں ہے کہ تینوں کام بیک وقت کر ڈالے جائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نُشوز کی حالت میں ان تینوں تدبیروں کی اجازت ہے۔ اب رہا ان پر عمل درآمد، تو بہرحال اس میں قصور اور سزا کے درمیان تناسُب ہونا چاہیے، اور جہاں ہلکی تدبیر سے اصلاح ہو سکتی ہو، وہاں سخت تدبیر سے کام نہ لینا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کے مارنے کی جب کبھی اجازت دی ہے، بادلِ ناخواستہ دی ہے، اور پھر بھی اسے ناپسند ہی فرمایا ہے۔ تاہم بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو پٹے بغیر دُرست ہی نہیں ہوتیں۔ ایسی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ منہ پر نہ مارا جائے، بے رحمی سے نہ مارا جائے اور ایسی چیز سے نہ مارا جائے جو جسم پر نشان چھوڑ جائے۔

۶۰ – دونوں سے مراد ثالث بھی ہیں اور زوجین بھی۔ ہر جھگڑے میں صلح ہونے کا امکان ہے، بشرطیکہ فریقین بھی صلح پسند ہوں اور بیچ والے بھی چاہتے ہوں کہ فریقین میں کسی طرح صفائی ہو جائے۔

۶۱ – اس آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جہاں میاں اور بیوی میں ناموافقت ہو جائے، وہاں نزاع سے انقطاع تک نوبت پہنچنے یا عدالت میں معاملہ جانے سے پہلے گھر کے گھر ہی میں اصلاح کی کوشش کر لینی چاہیے، اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک آدمی اس غرض کے لیے مقرر کیا جائے کہ دونوں مل کر اسبابِ اختلاف کی تحقیق کریں اور پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیے کی کوئی صورت نکالیں۔ یہ پنچ یا ثالث مقرر کرنے والا کون ہو؟ اس سوال کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے، تاکہ اگر زوجین خود چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا

اورتم سب اللہ کی بندگی کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایے سے، پہلو کے ساتھی[۶۲] اور مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو

ایک ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کرلیں، ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بوڑھے مداخلت کر کے پنچ مقرر کریں، اور اگر مُقدّمہ عدالت میں پہنچ ہی جائے تو عدالت خود کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خاندانی پنچ مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کرے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ ثالثوں کے اختیارات کیا ہیں۔ فقہا میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ ثالث فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، البتہ تصفیے کی جو صورت ان کے نزدیک مناسب ہو، اس کے لیے سفارش کر سکتے ہیں، ماننا یا نہ ماننا زوجین کے اختیار میں ہے۔ ہاں اگر زوجین نے ان کو طلاق یا خُلع یا کسی اور امر کا فیصلہ کر دینے کے لیے اپنا وکیل بنایا ہو تو البتہ ان کا فیصلہ تسلیم کرنا زوجین کے لیے واجب ہوگا۔ یہ حَنَفی اور شافعی علما کا مسلک ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک دونوں پنچوں کو مُوافقت کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے، مگر علیحدگی کا فیصلہ وہ نہیں کر سکتے۔ یہ حَسَن بصریؒ اور قَتادہؒ اور بعض دوسرے فقہا کا قول ہے۔ ایک اور گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ان پنچوں کو ملانے اور جدا کر دینے کے پورے اختیارات ہیں۔ ابنِ عباسؓ، سعید بن جُبَیر، ابراہیم نَخَعیؒ، شَعْبیؒ، محمد بن سیرینؒ، اور بعض دوسرے حضرات نے یہی رائے اختیار کی ہے۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے فیصلوں کی جو نظیریں ہم تک پہنچی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات پنچ مقرر کرتے ہوئے عدالت کی طرف سے ان کو حاکمانہ اختیارات دے دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عَقیلؓ بن ابی طالب اور ان کی بیوی فاطمہ بنتِ عُتبہ بن ربیعہ کا مقدّمہ جب حضرت عثمانؓ کی عدالت میں پیش ہوا تو انھوں نے شوہر کے خاندان میں سے حضرت ابنِ عباسؓ کو، اور بیوی کے خاندان میں سے حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کو پنچ مقرر کیا اور ان سے کہا کہ اگر آپ دونوں کی رائے میں ان کے درمیان تفریق کر دینا ہی مناسب ہو تو تفریق کر دیں۔ اسی طرح ایک مقدّمے میں حضرت علیؓ نے حَکَم مقرر کیے اور ان کو اختیار دیا کہ چاہیں ملا دیں اور چاہیں جُدا کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پنچ بطورِ خود تو عدالتی اختیارات نہیں رکھتے۔ البتہ اگر عدالت ان کو مقرر کرتے وقت انھیں اختیارات دے دے تو پھر ان کا فیصلہ ایک عدالتی فیصلے کی طرح نافذ ہوگا۔

مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا
فَخُوْرَا ۙ ﴿۳۶﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ
وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ ﴿۳۷﴾ وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ

تمھارے قبضے میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو، یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پِندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں اور دُوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اُسے چھُپاتے ہیں[۶۳]۔ ایسے کافرِ نعمت لوگوں کے لیے ہم نے رُسوا کُن عذاب مہیّا کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے

---

۶۲ – متن میں ''اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ'' فرمایا گیا ہے، جس سے مراد ہم نشین دوست بھی ہے اور ایسا شخص بھی جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے۔ مثلاً آپ بازار میں جا رہے ہوں اور کوئی شخص آپ کے ساتھ راستہ چل رہا ہو، یا کسی دکان پر آپ سودا خرید رہے ہوں اور کوئی دوسرا خریدار بھی آپ کے پاس بیٹھا ہو، یا سفر کے دَوران میں کوئی شخص آپ کا ہم سفر ہو۔ یہ عارضی ہمسایگی بھی ہر مہذّب اور شریف انسان پر ایک حق عائد کرتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حتیٰ الامکان اس کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اور اسے تکلیف دینے سے مجتنب رہے۔

۶۳ – اللہ کے فضل کو چھُپانا یہ ہے کہ آدمی اس طرح رہے گویا کہ اللہ نے اس پر فضل نہیں کیا ہے۔ مثلاً کسی کو اللہ نے دولت دی ہو اور وہ اپنی حیثیت سے گر کر رہے۔ نہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے، نہ بندگانِ خدا کی مدد کرے، نہ نیک کاموں میں حصّہ لے۔ لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ بیچارہ بڑا ہی خستہ حال ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی سخت ناشکری ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انّ اللّٰہ اذا انعم نعمۃ علیٰ عبد احبّ ان یظھر اثرھا علیہ، اللہ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر بندے پر ظاہر ہو۔ یعنی اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس اور مسکن، اور اس کی داد و دِہش، ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کا اظہار ہوتا رہے۔

النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ
الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ
عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً
يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا
مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ ۘ يَوْمَئِذٍ
يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

خرچ کرتے ہیں اور درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخر پر۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہُوا اُسے بہت ہی بُری رفاقت میسّر آئی۔ آخر اِن لوگوں پر کیا آفت آجاتی اگر یہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے۔ اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی کا حال چھُپا نہ رہ جاتا۔ اللہ کسی پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اُسے دوچند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ پھر سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور اِن لوگوں پر تمھیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔[۶۴] اُس وقت وہ سب لوگ جنھوں نے رسُولؐ کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے، تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔

۶۴ – یعنی ہر دَور کا پیغمبر اپنے دَور کے لوگوں پر اللہ کی عدالت میں گواہی دے گا کہ زندگی کا وہ سیدھا راستہ اور فکر و عمل کا وہ صحیح طریق، جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی، اُسے میں نے اِن لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ پھر یہی شہادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دَور کے لوگوں پر دیں گے، اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا دور آپؐ کی بِعثت کے وقت سے قیامت تک ہے۔ (آلِ عمران، حاشیہ ۶۹)

ع ۶
وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ
وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ

وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب [۶۵] نہ جاؤ۔ نماز اُس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے [۶۶] ہو۔ اور اسی طرح جنابت [۶۷] کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ غسل نہ کرلو، اِلّا یہ کہ راستے سے گزرتے [۶۸] ہو۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم

۶۵ – یہ شراب کے متعلق دوسرا حکم ہے۔ پہلا حکم وہ تھا جو سورۂ بقرہ (آیت ۲۱۹) میں گزرا۔ اُس میں صرف یہ ظاہر کر کے چھوڑ دیا گیا تھا کہ شراب بُری چیز ہے، اللہ کو پسند نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ اس کے بعد ہی شراب سے پرہیز کرنے لگا تھا۔ مگر بہت سے لوگ اسے بدستور استعمال کرتے رہے تھے، حتّٰی کہ بسا اوقات نشے کی حالت ہی میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے تھے اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتے تھے۔ غالباً ۴ ہجری کی ابتدا میں یہ دُوسرا حکم آیا اور نشے میں نماز پڑھنے کی مُمانعت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے شراب پینے کے اوقات بدل دیے اور ایسے اوقات میں شراب پینی چھوڑ دی جن میں یہ اندیشہ ہوتا کہ کہیں نشہ ہی کی حالت میں نماز کا وقت نہ آ جائے۔ اس کے کچھ مدّت بعد شراب کی قطعی حرمت کا وہ حکم آیا جو سورۂ مائدہ، آیت ۹۰، ۹۱ میں ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آیت میں سُکر یعنی نشہ کا لفظ ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف شراب کے لیے خاص نہ تھا بلکہ ہر نشہ آور چیز کے لیے عام تھا۔ اور اب بھی اس کا حکم باقی ہے۔ اگرچہ نشہ آور اشیا کا استعمال بجائے خود حرام ہے، لیکن نشے کی حالت میں نماز پڑھنا دُہرا اور عظیم تر گناہ ہے۔

۶۶ – اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ جب کسی شخص پر نیند کا غلبہ ہو رہا ہو اور وہ نماز پڑھنے میں بار بار اُونگھ جاتا ہو تو اُسے نماز چھوڑ کر سو جانا چاہیے۔ بعض لوگ اس آیت سے یہ اِستدلال کرتے ہیں کہ جو شخص نماز کی عَرَبی عبارات کا مطلب نہیں سمجھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ لیکن علاوہ اس کے کہ یہ ایک بے جا تشدُّد ہے، خود قرآن کے الفاظ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ قرآن میں حتّٰی تفقھوا یا حتّٰی تفھموا ما تقولون نہیں فرمایا ہے بلکہ حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ فرمایا ہے۔ یعنی نماز میں آدمی کو اتنا ہوش رہنا چاہیے کہ وہ یہ جانے کہ وہ کیا چیز اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کھڑا تو ہو نماز پڑھنے، اور شروع کر دے کوئی غزل۔

مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ
النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا
بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

بیمار ہو، یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص رفعِ حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں سے لَمس کیا ہو[۶۹]، اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرلو[۷۰]، بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔

۶۷ – جَنابَت کے اصل معنیٰ دُوری اور بے گانگی کے ہیں۔ اسی سے لفظ اجنبی نکلا ہے۔ اصطلاحِ شرع میں جَنابَت سے مراد وہ نجاست ہے جو قضائے شہوت سے یا خواب میں مادّہ خارج ہونے سے لاحق ہوتی ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی طہارت سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔

۶۸ – فقہا اور مفسّرین میں سے ایک گروہ نے اس آیت کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں نہ جانا چاہیے، اِلّا یہ کہ کسی کام کے لیے مسجد میں سے گزرنا ہو۔ اسی رائے کو عبداللہؓ بن مسعود، اَنَسؓ بن مالک، حَسَن بصریؒ اور ابراہیم نَخَعیؒ وغیرہ حضرات نے اختیار کیا ہے۔ دوسرا گروہ اس سے سفر مراد لیتا ہے۔ یعنی اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے تو تیمّم کیا جاسکتا ہے۔ رہا مسجد کا معاملہ، تو اِس گروہ کی رائے میں جُنُبی کے لیے وضو کر کے مسجد میں بیٹھنا جائز ہے۔ یہ رائے حضرت علیؓ، ابنِ عباسؓ، سعید بن جُبَیر اور بعض دوسرے حضرات نے اختیار فرمائی ہے۔ اگرچہ اس امر میں قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے اور نہانا ممکن نہ ہو تو تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن پہلا گروہ اِس مسئلے کو حدیث سے اخذ کرتا ہے اور دوسرا گروہ اس رِوایَت کی بنیاد قرآن کی مندرجہ بالا آیت پر رکھتا ہے۔

۶۹ – اس امر میں اختلاف ہے کہ لَمس یعنی چُھونے سے کیا مراد ہے۔ حضرات علیؓ، ابنِ عباسؓ، ابوموسیٰ اَشْعَریؓ، اُبَیؓ ابنِ کعب، سعید بن جُبَیرؒ، حسن بصریؒ اور متعدّد ائمہ کی رائے ہے کہ اس سے مراد مباشرت ہے، اور اسی رائے کو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام سُفیان ثَورِیؒ نے اختیار کیا ہے۔ بخلاف اس کے حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور عبداللہ ابنِ عمرؓ کی رائے ہے اور بعض رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ ابنِ خطّاب کی بھی یہی رائے ہے کہ اس سے مراد چھونا یا ہاتھ لگانا ہے، اور اسی رائے کو امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے۔ بعض ائمہ نے بیچ کا مسلک بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً امام مالکؒ کی رائے ہے کہ اگر عورت یا مرد ایک دوسرے کو جذباتِ شہوانی کے ساتھ ہاتھ لگائیں تو ان کا وضو ساقط ہو جائے گا اور نماز کے لیے انھیں نیا وضو کرنا ہوگا، لیکن اگر جذباتِ شہوانی کے بغیر ایک کا جسم دوسرے سے مَس ہو جائے تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ
وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جنھیں کتاب کے علم کا کچھ حصّہ دیا گیا ہے؟[۷۱] وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کر دو۔ اللہ تمھارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے

۷۰ – حکم کی تفصیلی صورت یہ ہے کہ اگر آدمی بے وضو ہے یا اُسے غسل کی حاجت ہے اور پانی نہیں ملتا تو تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر مریض ہے اور غسل یا وضو کرنے سے اس کو نقصان کا اندیشہ ہے، تو پانی موجود ہونے کے باوجود تیمُّم کی اجازت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

تیمُّم کے معنٰی قصد کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب پانی نہ ملے، یا پانی ہو اور اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

تیمّم کے طریقے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دفعہ مٹی پر ہاتھ مار کر منہ پر پھیر لیا جائے، پھر دوسری دفعہ ہاتھ مار کر کہنیوں تک ہاتھوں پر پھیر لیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور اکثر فقہا کا یہی مذہب ہے، اور صحابہؓ و تابعینؒ میں سے حضرت علیؓ، عبداللہ بن عمرؓ، حَسن بصریؒ، شَعبیؒ اور سالم بن عبداللہؒ وغیرہم اس کے قائل تھے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک صرف ایک دفعہ ہی ہاتھ مارنا کافی ہے۔ وہی ہاتھ منہ پر بھی پھیر لیا جائے اور اسی کو کلائی تک ہاتھوں پر بھی پھیر لیا جائے۔ کہنیوں تک مسح کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ عطاءؒ اور مَکحُول اور اَوزاعی اور احمد ابنِ حنبل رحمہم اللہ کا مذہب ہے، اور عُموماً حضرات اہلِ حدیث اسی کے قائل ہیں۔

تیمّم کے لیے ضروری نہیں کہ زمین ہی پر ہاتھ مارا جائے۔ اس غرض کے لیے ہر گرد آلود چیز اور ہر وہ چیز جو خشک اجزائے ارضی پر مشتمل ہو، کافی ہے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس طرح مٹی پر ہاتھ مار کر مُنہ اور ہاتھوں پر پھیر لینے سے آخر طہارت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ آدمی میں طہارت کی حس اور نماز کا احترام قائم رکھنے کے لیے ایک اہم نفسیاتی تدبیر ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنی ہی مدّت تک پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو، بہرحال اس کے اندر طہارت کا احساس برقرار رہے گا، پاکیزگی کے جو قوانین شریعت میں مقرر کر دیے گئے ہیں ان کی پابندی وہ برابر کرتا رہے گا، اور اس کے ذہن سے قابلِ نماز ہونے کی حالت اور قابلِ نماز نہ ہونے کی حالت کا فرق و امتیاز کبھی محو نہ ہو سکے گا۔

۷۱ – علمائے اہلِ کتاب کے متعلق قرآن نے اکثر یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ "انھیں کتاب کے علم کا کچھ حصّہ دیا گیا ہے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو انھوں نے کتاب الٰہی کا ایک حصّہ گم کر دیا تھا۔ پھر جو کچھ کتابِ الٰہی میں سے اُن کے پاس موجود

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ
هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ
عَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي
الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا

اور تمھاری حمایت و مددگاری کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ جو لوگ یہودی بن گئے ہیں[۷۲] اُن میں کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو اُن کے محل سے پھیر دیتے ہیں[۷۳]، اور دینِ حق کے خلاف نیش زنی کرنے کے لیے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں: سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا[۷۴] اور اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ[۷۵] اور رَاعِنَا[۷۶]۔ حالانکہ اگر وہ کہتے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، اور اِسْمَعْ اور اُنْظُرْنَا تو یہ

تھا، اس کی رُوح اور اس کے مقصد و مدّعا سے بھی وہ بیگانہ ہو چکے تھے۔ ان کی تمام دلچسپیاں لفظی بحثوں اور احکام کے جُزئیات اور عقائد کی فلسفیانہ پیچیدگیوں تک محدود تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دین کی حقیقت سے ناآشنا اور دین داری کے جوہر سے خالی تھے، اگرچہ علمائے دین اور پیشوایانِ مِلّت کہے جاتے تھے۔

۷۲ – یہ نہیں فرمایا کہ ''یہودی ہیں'' بلکہ یہ فرمایا کہ ''یہودی بن گئے ہیں''، کیونکہ ابتداءً تو وہ بھی مسلمان ہی تھے، جس طرح ہر نبی کی اُمت اصل میں مسلمان ہوتی ہے، مگر بعد میں وہ صرف یہودی بن کر رہ گئے۔

۷۳ – اس کے تین مطلب ہیں: ایک، یہ کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں ردّوبدل کرتے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ اپنی تاویلات سے آیاتِ کتاب کے معنیٰ کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ تیسرے، یہ کہ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیروؤں کی صحبت میں آ کر ان کی باتیں سُنتے ہیں اور واپس جا کر لوگوں کے سامنے غلط طریقے سے روایت کرتے ہیں۔ بات کچھ کہی جاتی ہے اور وہ اسے اپنی شرارت سے کچھ کا کچھ بنا کر لوگوں میں مشہور کرتے ہیں، تاکہ انھیں بدنام کیا جائے اور ان کے متعلّق غلط فہمیاں پھیلا کر لوگوں کو اسلامی جماعت کی طرف آنے سے روکا جائے۔

۷۴ – یعنی جب انھیں خدا کے احکام سُنائے جاتے ہیں تو زور سے کہتے ہیں: سَمِعْنَا (ہم نے سُن لیا) اور آہستہ کہتے ہیں: عَصَيْنَا (ہم نے قبول نہیں کیا)۔ یا اَطَعْنَا (ہم نے قبول کیا) کا تلفّظ اس انداز سے زبان کو لچکا دے کر کرتے ہیں کہ عَصَيْنَا بن جاتا ہے۔

۷۵ – یعنی دَورانِ گفتگو میں جب وہ کوئی بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: اِسْمَعْ (سُنیے)

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ ۙ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا
نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا
فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ
وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ
يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ

انھی کے لیے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا۔ مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے، اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔

اے وہ لوگو جنھیں کتاب دی گئی تھی! مان لو اُس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اُس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمھارے پاس پہلے سے موجود تھی[۷۷]۔ اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں، یا ان کو اسی طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا[۷۸]، اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے۔ اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا[۷۹]، اس کے ماسوا دُوسرے جس قدر گناہ ہیں، وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے[۸۰]۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھیرایا، اُس نے تو

اور پھر ساتھ ہی غَیْرَ مُسْمَعٍ بھی کہتے ہیں جو ذُو معنیٰ ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ ایسے محترم ہیں کہ آپ کو کوئی بات خلافِ مرضی نہیں سنائی جا سکتی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمھیں کوئی کچھ سُنائے۔ ایک اور مطلب یہ ہے کہ خدا کرے تم بہرے ہو جاؤ۔

۷۶ — اس کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۰۸۔

۷۷ — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: آلِ عمران، حاشیہ ۲۔

۷۸ — ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۸۲ و ۸۳۔

افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ
بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ
يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ ع اَلَمْ تَرَ
اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ

بہت ہی بڑا جھُوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جو بہت اپنی پاکیزگیِ نفس کا دم بھرتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور (انھیں جو پاکیزگی نہیں ملتی تو درحقیقت) ان پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جاتا۔ دیکھو تو سہی، یہ اللہ پر بھی جھُوٹے افترا گھڑنے سے نہیں چُوکتے اور ان کے صریحاً گناہ گار ہونے کے لیے یہی ایک گناہ کافی ہے ؏

کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصّہ دیا گیا ہے؟ اور اُن کا حال یہ ہے کہ جِبْت[81]

---

۷۹ – یہ اس لیے فرمایا کہ اہلِ کتاب اگرچہ انبیا اور کُتُبِ آسمانی کی پیروی کے مدّعی تھے، مگر شرک میں مبتلا ہو گئے تھے۔

۸۰ – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس شرک نہ کرے، باقی دوسرے گناہ دل کھول کر کرتا رہے۔ بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک، جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا تھا، تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے، حتّٰی کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ علمائے یہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے، بلکہ ان کا سارا وقت اُن جُزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا جو ان کے فقیہوں نے استنباط در استنباط کر کے نکالے تھے، مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے، اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں انھیں کوئی مضایقہ نظر آتا تھا۔

۸۱ – جِبْت کے اصل معنٰی بے حقیقت، بے اصل اور بے فائدہ چیز کے ہیں۔ اسلام کی زبان میں جادو، کہانت (جوتش)، فال گیری، ٹونے ٹوٹکے، شگون اور مہُورت اور تمام دوسری وہمی و خیالی باتوں کو "جِبْت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے: النیاقة والطرق والطیر من الجبت۔ یعنی جانوروں کی آوازوں سے فال لینا، زمین پر جانوروں کے

وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ
الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ﴿٥١﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن
يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ
الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾ أَمْ يَحْسُدُونَ
النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ

اور طاغوت[82] کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلّق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں[83]۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے، اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اُس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ کیا حکومت میں اُن کا کوئی حصّہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ دُوسروں کو ایک پھُوٹی کوڑی تک نہ دیتے[84]۔ پھر کیا یہ دُوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انھیں اپنے فضل سے نواز دیا[85]؟ اگر یہ بات ہے تو انھیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیمؑ

نشاناتِ قدم سے شگون نکالنا اور فال گیری کے دوسرے طریقے سب ”جِبت“ کے قبیل سے ہیں۔ پس ”جِبت“ کا مفہوم وہی ہے جسے ہم اُردو زبان میں اوہام کہتے ہیں اور جس کے لیے انگریزی میں superstitions کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

۸۲ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۸۶ و ۲۸۸۔

۸۳ – علمائے یہود کی ہٹ دھرمی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، ان کو وہ مشرکینِ عرب کی بہ نسبت زیادہ گمراہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو یہ مشرکین ہی زیادہ راہِ راست پر ہیں، حالانکہ وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف خالص توحید ہے جس میں شرک کا شائبہ تک نہیں، اور دوسری طرف صریح بُت پرستی ہے جس کی مذمّت سے ساری بائبل بھری پڑی ہے۔

۸۴ – یعنی کیا خدا کی حکومت کا کوئی حصّہ ان کے قبضے میں ہے کہ یہ فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کون برسرِ ہدایت ہے اور کون نہیں ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو ان کے ہاتھوں دوسروں کو ایک پھُوٹی کوڑی بھی نصیب نہ ہوتی، کیونکہ ان کے دل تو اتنے چھوٹے ہیں کہ ان سے حق کا اعتراف تک نہیں ہوسکتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کیا ان کے پاس کسی ملک کی حکومت ہے کہ اس میں دوسرے لوگ حصّہ بٹانا چاہتے ہیں اور یہ انھیں اس میں سے کچھ نہیں دینا چاہتے؟ یہاں تو محض اعترافِ حق کا سوال درپیش ہے اور اس میں بھی یہ بُخل سے کام لے رہے ہیں۔

اِبۡرٰهِيۡمَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا ﴿۵۴﴾
فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ صَدَّ عَنۡهُ ؕ وَكَفٰى
بِجَهَنَّمَ سَعِيۡرًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِيۡهِمۡ
نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُهُمۡ بَدَّلۡنٰهُمۡ جُلُوۡدًا غَيۡرَهَا
لِيَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۵۶﴾ ربع
وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ

کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور مُلکِ عظیم بخش دیا،[۸۶] مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا،[۸۷] اور منہ موڑنے والوں کے لیے تو بس جہنّم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ خوب عذاب کا مزا چکھیں، اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور نیک عمل کیے اُن کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے

۸۵ – یعنی یہ اپنی نا اہلی کے باوجود اللہ کے جس فضل اور جس انعام کی آس خود لگائے بیٹھے تھے، اس سے جب دوسرے لوگ سرفراز کر دیے گئے اور عرب کے اُمّیوں میں ایک عظیم الشان نبیؐ کے ظہور سے وہ روحانی و اخلاقی اور ذہنی و عملی زندگی پیدا ہو گئی جس کا لازمی نتیجہ عروج و سربلندی ہے، تو اب یہ اس پر حسد کر رہے ہیں اور یہ باتیں اسی حسد کی بنا پر ان کے منہ سے نکل رہی ہیں۔

۸۶ – ’’مُلکِ عظیم‘‘ سے مراد دنیا کی امامت و رہنمائی اور اقوامِ عالَم پر قائدانہ اقتدار ہے جو کتاب اللہ کا علم پانے اور اس علم و حکمت کے مطابق عمل کرنے سے لازماً حاصل ہوتا ہے۔

۸۷ – یاد رہے کہ یہاں جواب بنی اسرائیل کی حاسدانہ باتوں کا دیا جا رہا ہے۔ اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ آخر جلتے کس بات پر ہو؟ تم بھی ابراہیمؑ کی اولاد ہو اور یہ بنی اسماعیل بھی ابراہیمؑ ہی کی اولاد ہیں۔ ابراہیمؑ سے دُنیا

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ
لَهُمۡ فِیۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّ نُدۡخِلُهُمۡ ظِلًّا ظَلِیۡلًا ﴿۵۷﴾
اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهۡلِهَا ۙ وَ اِذَا
حَكَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
نِعِمَّا یَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۵۸﴾

جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور اُن کو پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور انھیں ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔

مسلمانو! اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سُپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔[۸۸] اللہ تم کو نہایت عُمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سُنتا اور دیکھتا ہے۔

کی امامت کا جو وعدہ ہم نے کیا تھا، وہ آلِ ابراہیم میں سے صرف اُن لوگوں کے لیے تھا جو ہماری بھیجی ہوئی کتاب اور حکمت کی پیروی کریں۔ یہ کتاب اور حکمت پہلے ہم نے تمھارے پاس بھیجی تھی، مگر تمھاری اپنی نالائقی تھی کہ تم اس سے منہ موڑ گئے۔ اب وہی چیز ہم نے بنی اسماعیل کو دی ہے اور یہ اُن کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں۔

۸۸ – یعنی تم اُن بُرائیوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انھوں نے اپنے انحطاط کے زمانے میں امانتیں، یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے (positions of trust) ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نااہل، کم ظرف، بد اخلاق، بددیانت اور بدکار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بُرے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا، بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سُپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں، یعنی جن میں بارِ امانت اُٹھانے کی صلاحیت ہو۔ بنی اسرائیل کی دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انصاف کی رُوح سے خالی ہو گئے تھے۔ وہ شخصی اور قومی اغراض کے لیے بے تکلّف ایمان نگل جاتے تھے۔ صریح ہٹ دھرمی برت جاتے تھے۔ انصاف کے گلے پر چُھری پھیرنے میں انھیں ذرا تامّل نہ ہوتا تھا۔ ان کی بے انصافی کا تلخ ترین تجربہ اُس زمانے میں خود مسلمانوں کو ہو رہا تھا۔ ایک طرف ان کے سامنے محمد رسول اللہ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسُولؐ کی طرف[۸۹] پھیر دو

صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگیاں تھیں۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بُتوں کو پُوج رہے تھے، بیٹیوں کو زندہ گاڑتے تھے، سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے اور کعبے کے گرد مادرزاد ننگے ہو کر طواف کرتے تھے۔ یہ نام نہاد اہلِ کتاب ان میں سے دوسرے گروہ کو پہلے گروہ پر ترجیح دیتے تھے اور ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہ آتی تھی کہ پہلے گروہ کے مقابلے میں یہ دوسرا گروہ زیادہ صحیح راستے پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس بے انصافی پر تنبیہ کرنے کے بعد اب مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کہیں ایسے بے انصاف نہ بن جانا۔ خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہر حال بات جب کہو، انصاف کی کہو اور فیصلہ جب کرو، عدل کے ساتھ کرو۔

۸۹ – یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی، تمدّنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اوّلین دفعہ ہے۔ اس میں حسبِ ذیل اُصول مستقل طور پر قائم کر دیے گئے ہیں:

(۱) اسلامی نظام میں اصل مُطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندۂ خدا ہے، باقی جو کچھ بھی ہے، اس کے بعد ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی، اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام، دونوں کا مرکز و محوَر، خدا کی فرماں برداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اس صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کی مدِّمقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت اور اس کی تابع ہوں۔ ورنہ ہر وہ حلقۂ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت کا حریف ہو۔ یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ ’’خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں ہے۔‘‘

(۲) اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسولؐ کی اطاعت ہے۔ یہ کوئی مستقل بالذّات اطاعت نہیں ہے بلکہ اطاعتِ خدا کی واحد عملی صورت ہے۔ رسول اس لیے مُطاع ہے کہ وہی ایک مستند ذریعہ ہے جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرامین پہنچتے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت صرف اِسی طریقے سے کر سکتے ہیں کہ رسول کی اطاعت کریں۔ کوئی اطاعتِ خدا رسول کی سند کے بغیر معتبر نہیں ہے، اور رسول کی پیروی سے منہ موڑنا خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ اسی مضمون کو یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ من اطاعنی فقد اطاع اللّٰہ ومن عصانی فقد عصَی اللّٰہ ۔ ’’جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔‘‘ اور یہی بات خود قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ آگے آ رہی ہے۔

(۳) مذکورۂ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے، وہ اُن ''اُولی الامر'' کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں۔ ''اُولی الامر'' کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہِ کار ہوں، خواہ وہ ذہنی و فکری رہنمائی کرنے والے علما ہوں، یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر، یا مُلکی انتظام کرنے والے حُکّام، یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج، یا تمدنی و معاشرتی اُمور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلّوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غَرَض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحبِ امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے، اور اس سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا دُرست نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو، اور خدا و رسولؐ کا مطیع ہو۔ یہ دونوں شرطیں اس اطاعت کے لیے لازمی شرطیں ہیں، اور یہ نہ صرف آیتِ مذکورۂ صدر میں صاف طور پر درج ہیں، بلکہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ مثلاً حسبِ ذیل احادیث مُلاحظہ ہوں:

السمع والطاعة على المرء المسلم في ما احب وكره ما لم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة۔ (بخاری و مسلم)

مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اُولی الامر کی بات سنے اور مانے، خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند، تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے، اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سُننا چاہیے نہ ماننا چاہیے۔

لا طاعة في معصية، انما الطاعة في المعروف۔ (بخاری و مسلم)

خدا اور رسولؐ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے ''معروف'' میں ہے۔

يكون عليكم امراء تعرفون وتنكرون فمن انكر فقد برئ ومن كره فقد سلم ولٰكن من رضي وتابع فقالوا افلا نقاتلهم؟ قال لا ما صلّوا۔ (مسلم)

حضورؐ نے فرمایا: تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو مُنکَر۔ تو جس نے ان کے مُنکَرات پر اظہارِ ناراضی کیا، وہ بَری الذّمہ ہوا۔ اور جس نے ان کو ناپسند کیا، وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا، وہ ماخوذ ہو گا۔ صحابہؓ نے پوچھا: پھر جب ایسے حکّام کا دَور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔

یعنی ترکِ نماز وہ علامت ہو گی جس سے صریح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعتِ خدا و رسول سے باہر ہو گئے ہیں، اور پھر ان کے خلاف جِدّوجُہد کرنا دُرست ہو گا۔

شِرَار ائمّتكم الّذين تبغضونهم ويبغضونكم وتلعنونهم ويلعنونكم قلنا يا رسول اللّٰه افلا ننابذهم عند ذٰلك؟ قال لا ما اقاموا

حضورؐ نے فرمایا: تمھارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمھارے لیے مبغوض ہوں اور تم ان کے لیے مبغوض ہو۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم اُن کے مقابلے پر نہ اٹھیں؟ فرمایا: نہیں، جب تک وہ

فیکم الصّلوٰۃ، لا ما اقاموا فیکم الصّلوٰۃ۔ (مسلم) تمھارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔ نہیں، جب تک وہ تمھارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔

اس حدیث میں اُوپر والی شرط کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ اُوپر کی حدیث سے گمان ہوسکتا تھا کہ اگر وہ اپنی انفرادی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جاسکتی۔ لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے سے مراد دراصل مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں نماز کا نظام قائم کرنا ہے۔ یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود پابندِ نماز ہوں، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظامِ حکومت چل رہا ہو، وہ کم از کم اِقامتِ صلوٰۃ کا انتظام کرے۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اُصولی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے۔ ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور اسے اُلٹ پھینکنے کی سعی مسلمانوں کے لیے جائز ہو جائے گی۔ اسی بات کو ایک اور رِوایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے مِن جملہ اور باتوں کے ایک اس امر کا عہد بھی لیا کہ ان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بواحًا عندکم من اللہ فیہ برھان، یعنی یہ کہ ”ہم اپنے سرداروں اور حُکّام سے نزاع نہ کریں گے، اِلّا یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کُھلا کُھلا کفر دیکھیں جس کی موجودگی میں ان کے خلاف ہمارے پاس خدا کے حُضور پیش کرنے کے لیے دلیل موجود ہو۔“ (بخاری و مسلم)

(۴) چوتھی بات جو آیتِ زیرِ بحث میں ایک مستقل اور قطعی اُصول کے طور پر طے کر دی گئی ہے، یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند (final authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان، یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلے میں بھی نزاع واقع ہوگی، اس میں فیصلے کے لیے قرآن اور سنّت کی طرف رُجوع کیا جائے گا، اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ اس طرح تمام مسائلِ زندگی میں کتاب اللہ و سنّت رسولؐ اللہ کو سند اور مَرجَع اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیّت ہے جو اسے کافرانہ نظامِ زندگی سے مُمیّز کرتی ہے۔ جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے، وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ تمام مسائلِ زندگی کے فیصلے کے لیے کتاب اللہ و سنتِ رسولؐ اللہ کی طرف کیسے رجوع کیا جا سکتا ہے، جبکہ میونسپلٹی اور ریلوے اور ڈاک خانہ کے قواعد و ضوابط اور ایسے ہی بے شمار معاملات کے احکام سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ شبہ اُصولِ دین کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان کو جو چیز کافر سے مُمیّز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ کافر مُطلَق آزادی کا مدّعی ہے، اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اُس دائرے میں آزادی سے متمتّع ہوتا ہے جو اس کے رب نے اسے دی ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اُصول اور قوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خدائی سند کا اپنے آپ کو حاجت مند سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ہر معاملے میں سب سے پہلے خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے، اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف اِسی صورت میں آزادیِ عمل برتتا ہے، اور اُس کی یہ آزادیِ عمل اس حجّت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملے میں شارع کا کوئی حکم نہ دینا اس کی

اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ
وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ؑ ﴿۵۹﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ
اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ
اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا

ع ۸ ۹

اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔[۹۰] ع

اے نبیؐ! تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رُجوع کریں، حالانکہ انھیں طاغوت سے

طرف سے آزادیِ عمل عطا کیے جانے کی دلیل ہے۔

۹۰- قرآنِ مجید چونکہ محض کتابِ آئین ہی نہیں ہے بلکہ کتابِ تعلیم و تلقین اور صحیفۂ وعظ و ارشاد بھی ہے، اس لیے پہلے فقرے میں جو قانونی اُصول بیان کیے گئے تھے، اب اس دوسرے فقرے میں ان کی حکمت و مصلحت سمجھائی جا رہی ہے۔ اس میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک، یہ کہ مذکورۂ بالا چاروں اُصولوں کی پیروی کرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ اور ان اُصولوں سے انحراف، یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ دوسرے، یہ کہ ان اصولوں پر اپنے نظامِ زندگی کو تعمیر کرنے ہی میں مسلمانوں کی بہتری بھی ہے۔ صرف یہی ایک چیز ان کو دنیا میں صراطِ مستقیم پر قائم رکھ سکتی ہے اور اسی سے ان کی عاقبت بھی دُرست ہوسکتی ہے۔ یہ نصیحت ٹھیک اُس تقریر کے خاتمے پر ارشاد ہوئی ہے جس میں یہودیوں کی اخلاقی و دینی حالت پر تبصرہ کیا جا رہا تھا۔ اس طرح ایک نہایت لطیف طریقے سے مسلمانوں کو مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ تمھاری پیش رَو اُمّت دین کے اِن بنیادی اُصولوں سے منحرف ہو کر جس پستی میں گر چکی ہے اس سے عبرت حاصل کرو۔ جب کوئی گروہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی ہدایت کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے، اور ایسے سرداروں اور رہنماؤں کے پیچھے لگ جاتا ہے جو خدا و رسول کے مطیعِ فرمان نہ ہوں، اور اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی حاکموں سے کتاب و سنت کی سند پوچھے بغیر ان کی اطاعت کرنے لگتا ہے، تو وہ اُن خرابیوں میں مبتلا ہونے سے کسی طرح بچ نہیں سکتا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے۔

بِهٖ ؕ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝۶۰ وَ اِذَا قِيْلَ
لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ
يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝۶۱ فَكَيْفَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ
مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖۗ

کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا[91]۔ شیطان انھیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دُور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسُولؐ کی طرف، تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمھاری طرف آنے سے کتراتے ہیں[92]۔ پھر اُس وقت کیا ہوتا ہے جب اِن کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آ پڑتی ہے؟ اُس وقت یہ تمھارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں[93]

۹۱ – یہاں صریح طور پر ''طاغوت'' سے مراد وہ حاکم ہے جو قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو، اور وہ نظامِ عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت ''طاغوت'' کی حیثیت رکھتی ہو، اس کے پاس اپنے معاملات فیصلے کے لیے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رُو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر، دونوں لازم و ملزوم ہیں، اور خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جُھکنا عین منافقت ہے۔

۹۲ – اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین کی عام روش تھی کہ جس مُقدّمے میں انھیں توقع ہوتی تھی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا اس کو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آتے تھے، مگر جس مُقدّمے میں اندیشہ ہوتا تھا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہوگا اس کو آپؐ کے پاس لانے سے انکار کر دیتے تھے۔ یہی حال اب بھی بہت سے منافقوں کا ہے کہ اگر شریعت کا فیصلہ ان کے حق میں ہو تو سر آنکھوں پر، ورنہ ہر اُس قانون، ہر اس رسم و رواج اور ہر اُس عدالت کے دامن میں جا پناہ لیں گے جس سے انھیں اپنے منشا کے مطابق فیصلہ حاصل ہونے کی توقع ہو۔

۹۳ – غالبًا اس سے مراد یہ ہے کہ جب اُن کی اِس منافقانہ حرکت کا مسلمانوں کو علم ہو جاتا ہے اور انھیں خوف ہوتا ہے کہ اب باز پُرس ہوگی اور سزا ملے گی، اُس وقت قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان کا یقین دلانے لگتے ہیں۔

بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّاۤ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿٦٢﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ
فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ﴿٦٣﴾ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا
لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ
فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا
رَّحِيْمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا
شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا

اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیّت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح مُوافقت ہو جائے ــــــ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، ان سے تعرض مت کرو، انھیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اُتر جائے۔ (انھیں بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے[۹۴]۔ اگر انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمھارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے، اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتا، تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔ نہیں، اے محمدؐ! تمھارے رب کی قسم! یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو، اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی

۹۴ – یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انھی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔

قَضَيۡتَ وَيُسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا ۞ ۶۵ وَلَوۡ اَنَّا كَتَبۡنَا عَلَيۡهِمۡ اَنِ اقۡتُلُوۡۤا
اَنۡفُسَكُمۡ اَوِ اخۡرُجُوۡا مِنۡ دِيَارِكُمۡ مَّا فَعَلُوۡهُ اِلَّا قَلِيۡلٌ مِّنۡهُمۡ ؕ
وَلَوۡ اَنَّهُمۡ فَعَلُوۡا مَا يُوۡعَظُوۡنَ بِهٖ لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ وَاَشَدَّ
تَثۡبِيۡتًا ۞ ۶۶ وَّاِذًا لَّاٰتَيۡنٰهُمۡ مِّنۡ لَّدُنَّاۤ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ۞ ۶۷
وَّلَهَدَيۡنٰهُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ۞ ۶۸ وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ

تنگی نہ محسُوس کریں، بلکہ سربتسلیم کرلیں[95]۔ اگر ہم نے انھیں حکم دیا ہوتا کہ اپنے آپ کو ہلاک کردو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر عمل کرتے[96]۔ حالانکہ جو نصیحت انھیں کی جاتی ہے، اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب[97] ہوتا، اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم انھیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور انھیں سیدھا راستہ دکھا دیتے[98]۔ جو اللہ اور رسُولؐ کی اطاعت

---

۹۵ – اس آیت کا حکم صرف حضُورؐ کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے ہے۔ جو کچھ اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور جس طریقے پر اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے تحت آپؐ نے عمل کیا ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کُن سند ہے اور اس سند کو ماننے یا نہ ماننے ہی پر آدمی کے مومن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔ حدیث میں اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ لا یؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس طریقے کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔

۹۶ – یعنی جب ان کا حال یہ ہے کہ شریعت کی پابندی کرنے میں ذرا سا نقصان یا تھوڑی سی تکلیف بھی یہ برداشت نہیں کرسکتے تو ان سے کسی بڑی قربانی کی ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر جان دینے یا گھر بار چھوڑنے کا مطالبہ ان سے کیا جائے تو یہ فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے اور ایمان و اطاعت کے بجائے کفر و نافرمانی کی راہ لیں گے۔

۹۷ – یعنی اگر یہ لوگ شک اور تذبذب اور تردُّد چھوڑ کر یکسوئی کے ساتھ رسول کی اطاعت و پیروی پر قائم ہو جاتے اور ڈانواں ڈول نہ رہتے تو ان کی زندگی تزلزل سے محفوظ ہو جاتی۔ ان کے خیالات، اَخلاق اور معاملات سب کے سب ایک مستقل اور پائدار بنیاد پر قائم ہو جاتے اور یہ اُن برکات سے بہرہ ور ہوتے جو ایک شاہراہِ مستقیم پر ثابت قدمی کے ساتھ چلنے سے ہی حاصل ہُوا کرتی ہیں۔ جو شخص تذبذب اور تردُّد کی حالت میں مبتلا ہو، کبھی اِس راستے پر

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ
رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿٧٠﴾ ع

ع ۹

کرے گا، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاؑ اور صدّیقین اور شہدا اور صالحین[99]۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسّر آئیں[100]۔ یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور حقیقت جاننے کے لیے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے۔ ع

چلے اور کبھی اُس راستے پر، اور اطمینان کسی راستے کے بھی صحیح ہونے پر اسے حاصل نہ ہو، اس کی ساری زندگی نقش برآب کی طرح بسر ہوتی ہے اور سعیِ لاحاصل بن کر رہ جاتی ہے۔

۹۸ — یعنی جب وہ شک چھوڑ کر ایمان ویقین کے ساتھ رسول کی اطاعت کا فیصلہ کر لیتے تو اللہ کے فضل سے ان کے سامنے سعی و عمل کا سیدھا راستہ بالکل روشن ہو جاتا اور انھیں صاف نظر آ جاتا کہ وہ اپنی قوتیں اور محنتیں کس راہ میں صرف کریں جس سے ان کا ہر قدم اپنی حقیقی منزلِ مقصود کی طرف اٹھے۔

۹۹ — صدّیق سے مراد وہ شخص ہے جو نہایت راست باز ہو، جس کے اندر صداقت پسندی اور حق پرستی کمال درجے پر ہو، جو اپنے معاملات اور برتاؤ میں ہمیشہ سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کرے، جب ساتھ دے تو حق اور انصاف ہی کا ساتھ دے اور سچے دل سے دے، اور جس چیز کو حق کے خلاف پائے، اس کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے اور ذرا کمزوری نہ دکھائے۔ جس کی سیرت ایسی سُتھری اور بے لوث ہو کہ اپنے اور غیر، کسی کو بھی اس سے خالص راست روی کے سوا کسی دوسرے طرزِ عمل کا اندیشہ نہ ہو۔

شہید کے اصل معنیٰ گواہ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے ایمان کی صداقت پر اپنی زندگی کے پورے طرزِ عمل سے شہادت دے۔ اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے کو بھی شہید اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ جان دے کر ثابت کر دیتا ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان لایا تھا، اسے واقعی سچے دل سے حق سمجھتا تھا اور اسے اتنا عزیز رکھتا تھا کہ اس کے لیے جان قربان کرنے میں بھی اس نے دریغ نہ کیا۔ ایسے راست باز لوگوں کو بھی شہید کہا جاتا ہے جو اس قدر قابلِ اعتماد ہوں کہ جس چیز پر وہ شہادت دیں، اس کا صحیح و برحق ہونا بلا تأمّل تسلیم کر لیا جائے۔

صالح سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے خیالات اور عقائد میں، اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال و افعال میں راہِ راست پر قائم ہو اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رَوِیّہ رکھتا ہو۔

۱۰۰ — یعنی وہ انسان خوش قسمت ہے جسے ایسے لوگ دنیا میں رفاقت کے لیے میسّر آئیں اور جس کا انجام

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ
انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ
مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾
وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رہو[101]، پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔ ہاں، تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چُراتا ہے[102]، اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے: اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں اِن لوگوں کے ساتھ نہ گیا، اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے ــــــ اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمھارے اور اس کے درمیان محبّت کا

آخرت میں بھی ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہو۔ کسی آدمی کے احساسات مُردہ ہو جائیں تو بات دوسری ہے، ورنہ درحقیقت بدسیرت اور بدکردار لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا دُنیا ہی میں ایک عذابِ الیم ہے، کجا کہ آخرت میں بھی آدمی انھی کے ساتھ اُس انجام سے دوچار ہو جو اُن کے لیے مقدّر ہے۔ اسی لیے اللہ کے نیک بندوں کی ہمیشہ یہی تمنّا رہی ہے کہ ان کو نیک لوگوں کی سوسائٹی نصیب ہو اور مر کر بھی وہ نیک ہی لوگوں کے ساتھ رہیں۔

۱۰۱ – واضح رہے کہ یہ خطبہ اُس زمانے میں نازل ہوا تھا جب اُحُد کی شکست کی وجہ سے اطراف ونواح کے قبائل کی ہمتیں بڑھ گئی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گِھر گئے تھے۔ آئے دن خبریں آتی رہتی تھیں کہ فلاں قبیلے کے تیور بگڑ رہے ہیں، فلاں قبیلہ دشمنی پر آمادہ ہے، فُلاں مقام پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ پے درپے غداریاں کی جارہی تھیں۔ ان کے مبلّغین کو فریب سے دعوت دی جاتی تھی اور قتل کر دیا جاتا تھا۔ مدینے کے حُدود سے باہر ان کے لیے جان ومال کی سلامتی باقی نہ رہی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کی طرف سے ایک زبردست سعی وجُہد اور سخت جاں فشانی کی ضرورت تھی، تاکہ اِن خطرات کے ہجوم سے اسلام کی یہ تحریک مِٹ نہ جائے۔

۱۰۲ – ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ خود تو جی چُراتا ہی ہے، دوسروں کی بھی ہمتیں پست کرتا ہے اور ان کو جہاد سے روکنے کے لیے ایسی باتیں کرتا ہے کہ وہ بھی اُسی کی طرح بیٹھ رہیں۔

وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِیْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾
فَلْيُقَاتِلْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ
نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ
لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ ؕ

تو کوئی تعلّق تھا ہی نہیں ـــــــ کہ کاش! میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔ (ایسے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے اُن لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دُنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں،[۱۰۳] پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا، اُسے ضرور ہم اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مَردوں، عورتوں اور بچّوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔[۱۰۴]

۱۰۳- یعنی اللہ کی راہ میں لڑنا دُنیا طلب لوگوں کا کام ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایسے لوگوں کا کام ہے جن کے پیشِ نظر صرف اللہ کی خوشنودی ہو، جو اللہ اور آخرت پر کامل اعتماد رکھتے ہوں، اور دنیا میں اپنی کامیابی وخوش حالی کے سارے امکانات اور اپنے ہر قسم کے دُنیوی مفاد اس اُمید پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کہ ان کا رب ان سے راضی ہوگا اور اس دنیا میں نہیں تو آخرت میں بہرحال ان کی قربانیاں ضائع نہ ہوں گی۔ رہے وہ لوگ جن کی نگاہ میں اصل اہمیت اپنے دُنیوی مفاد ہی کی ہو، تو درحقیقت یہ راستہ ان کے لیے نہیں ہے۔

۱۰۴- اشارہ ہے اُن مظلوم بچّوں، عورتوں اور مَردوں کی طرف جو مکّے میں اور عرب کے دوسرے قبائل میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر نہ ہجرت پر قادر تھے اور نہ اپنے آپ کو ظلم سے بچا سکتے تھے۔ یہ غریب طرح طرح سے

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا
یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ
اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾ ۧ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ
لَهُمْ كُفُّوْۤا اَیْدِیَكُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا
كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ
كَخَشْیَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ

جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں[۱۰۵]۔ پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں[۱۰۶]۔ ع

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انھیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے یا کچھ اس سے بھی[۱۰۷] بڑھ کر۔ کہتے ہیں: خدایا! یہ ہم پر لڑائی

تختۂ مشقِ ستم بنائے جا رہے تھے اور دُعائیں مانگتے تھے کہ کوئی انھیں اس ظلم سے بچائے۔

۱۰۵ — یہ اللہ کا دو ٹوک فیصلہ ہے۔ اللہ کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ زمین پر اللہ کا دین قائم ہو، یہ اہلِ ایمان کا کام ہے، اور جو واقعی مومن ہے، وہ اس کام سے کبھی باز نہ رہے گا۔ اور طاغوت کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ خدا کی زمین پر خدا کے باغیوں کا راج ہو، یہ کافروں کا کام ہے اور کوئی ایمان رکھنے والا آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔

۱۰۶ — یعنی بظاہر شیطان اور اس کے ساتھی بڑی تیاریوں سے اُٹھتے ہیں اور بڑی زبردست چالیں چلتے ہیں، لیکن اہلِ ایمان کو نہ اُن کی تیاریوں سے خوف زدہ ہونا چاہیے اور نہ ان کی چالوں سے۔ آخرکار ان کا انجام ناکامی ہے۔

۱۰۷ — اس آیت کے تین مفہوم ہیں اور تینوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

عَلَيۡنَا الۡقِتَالَ ۚ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ ؕ قُلۡ مَتَاعُ
الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ ۚ وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۟ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ
فَتِيۡلًا ﴿۷۷﴾ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يُدۡرِكْكُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ كُنۡتُمۡ
فِىۡ بُرُوۡجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ
مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ

کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مُہلت دی؟ ان سے کہو: دنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے، اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے، اور تم پر ظلم ایک شمّہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔[108] رہی موت، تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمھیں آ کر رہے گی، خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔

اگر انھیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ

ایک مفہوم یہ ہے کہ پہلے یہ لوگ خود جنگ کے لیے بے تاب تھے۔ بار بار کہتے تھے کہ صاحب! ہم پر ظلم کیا جا رہا ہے، ہمیں ستایا جاتا ہے، مارا جاتا ہے، گالیاں دی جاتی ہیں، آخر ہم کب تک صبر کریں، ہمیں مقابلے کی اجازت دی جائے۔ اُس وقت ان سے کہا جاتا تھا کہ صبر کرو اور نماز و زکوٰۃ سے ابھی اپنے نفس کی اصلاح کرتے رہو، تو یہ صبر و برداشت کا حکم ان پر شاق گزرتا تھا۔ مگر اب جو لڑائی کا حکم دے دیا گیا تو انھی تقاضا کرنے والوں میں سے ایک گروہ دشمنوں کا ہجوم اور جنگ کے خطرات دیکھ دیکھ کر سہا جا رہا ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب تک مطالبہ نماز اور زکوٰۃ اور ایسے ہی بے خطر کاموں کا تھا اور جانیں لڑانے کا کوئی سوال درمیان میں نہ آیا تھا، یہ لوگ پکّے دین دار تھے۔ مگر اب جو حق کی خاطر جان جوکھوں کا کام شروع ہوا تو ان پر لرزہ طاری ہونے لگا۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ پہلے تو لُوٹ کھسوٹ اور نفسانی لڑائیوں کے لیے ان کی تلوار ہر وقت نیام سے نکلی پڑتی تھی اور رات دن کا مشغلہ ہی جنگ و پیکار تھا۔ اُس وقت انھیں خوں ریزی سے ہاتھ روکنے اور نماز و زکوٰۃ سے نفس کی اصلاح کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اب جو خدا کے لیے تلوار اُٹھانے کا حکم دیا گیا تو وہ لوگ جو نفس کی خاطر لڑنے میں شیر دل تھے،

مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا
يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ
اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ
لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ
فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ ؕ

تمھاری بدولت ہے[۱۰۹]۔ کہو: سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اے انسان! تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے، اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب وعمل کی بدولت ہے۔

اے محمدؐ! ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسُول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔ اور جو منہ موڑ گیا، تو بہرحال ہم نے تمھیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے[۱۱۰]۔

خدا کی خاطر لڑنے میں بُزدل بن جاتے ہیں۔ وہ دستِ شمشیر زن جو نفس اور شیطان کی راہ میں بڑی تیزی دکھاتا تھا، اب خدا کی راہ میں شل ہوا جاتا ہے۔

یہ تینوں مفہوم مختلف قسم کے لوگوں پر چسپاں ہوتے ہیں اور آیت کے الفاظ ایسے جامع ہیں کہ تینوں پر یکساں دلالت کرتے ہیں۔

۱۰۸ – یعنی اگر تم خدا کے دین کی خدمت بجا لاؤ اور اس کی راہ میں جانفشانی دکھاؤ تو یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے ہاں تمھارا اجر ضائع ہو جائے۔

۱۰۹ – یعنی جب فتح وظفر اور کامیابی وسُرخروئی نصیب ہوتی ہے تو اسے اللہ کا فضل قرار دیتے ہیں اور بُھول جاتے ہیں کہ اللہ نے ان پر یہ فضل نبیؐ ہی کے ذریعے سے فرمایا ہے۔ مگر جب خود اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کے سبب سے کہیں شکست ہوتی ہے اور بڑھتے ہوئے قدم پیچھے پڑنے لگتے ہیں، تو سارا الزام نبی کے سر تھوپتے ہیں اور خود بری الذّمہ

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ؗ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ
غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ
وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ
الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا
كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ
وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ

وہ مُنہ پر کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں۔ مگر جب تمھارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمھاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے۔ اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے۔ تم ان کی پروا نہ کرو اور اللہ پر بھروسا رکھو، وہی بھروسے کے لیے کافی ہے۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اَور کی طرف سے ہوتا تو اِس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔[111]

یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوف ناک خبر سُن پاتے ہیں اُسے لے کر پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر یہ اُسے رسُولؐ اور اپنی جماعت کے ذمّہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو

ہونا چاہتے ہیں۔

۱۱۰ – یعنی اپنے عمل کے یہ خود ذمّہ دار ہیں۔ ان کے اعمال کی باز پُرس تم سے نہ ہوگی۔ تمھارے سُپرد جو کام کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ اللہ کے احکام و ہدایات ان تک پہنچا دو۔ یہ کام تم نے بخوبی انجام دے دیا۔ اب یہ تمھارا کام نہیں ہے کہ ہاتھ پکڑ کر انھیں زبردستی راہِ راست پر چلاؤ۔ اگر یہ اُس ہدایت کی پیروی نہ کریں جو تمھارے ذریعے سے پہنچ رہی ہے، تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ کیوں نافرمانی کرتے تھے۔

۱۱۱ – منافق اور ضعیف الایمان لوگوں کی جس روش پر اُوپر کی آیتوں میں تنبیہ کی گئی ہے اس کی بڑی اور اصلی وجہ یہ تھی کہ انھیں قرآن کے منجانبِ اللہ ہونے میں شک تھا۔ انھیں یقین نہ آتا تھا کہ رسولؐ پر واقعی وحی اُترتی ہے اور

يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ
لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا
تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ
بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾
مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ

اِن کے درمیان اس بات کی صلاحیّت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں[۱۱۲]۔ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمھاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔

پس اے نبیؐ! تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اَور کے لیے ذمّہ دار نہیں ہو۔ البتہ اہلِ ایمان کو لڑنے کے لیے اکساؤ، بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے، اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔ جو بھلائی کی سِفارش کرے گا وہ اس میں سے حصّہ

یہ جو کچھ ہدایات آ رہی ہیں، براہِ راست خدا ہی کے پاس سے آ رہی ہیں۔ اسی لیے ان کی منافقانہ روش پر ملامت کرنے کے بعد اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ قرآن پر غور ہی نہیں کرتے ورنہ یہ کلام تو خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کا کلام ہو نہیں سکتا۔ کوئی انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ سالہا سال تک وہ مختلف حالات میں، مختلف مواقع پر، مختلف مضامین پر تقریریں کرتا رہے اور اوّل سے آخر تک اس کی ساری تقریریں ایسا ہموار، یک رنگ، متناسب مجموعہ بن جائیں جس کا کوئی جُز دوسرے جُز سے متصادم نہ ہو، جس میں تبدیلیِ رائے کا کہیں نشان تک نہ ملے، جس میں متکلّم کے نفس کی مختلف کیفیات اپنے مختلف رنگ نہ دکھائیں، اور جس پر کبھی نظرِ ثانی تک کی ضرورت نہ پیش آئے۔

۱۱۲– وہ چونکہ ہنگامے کا موقع تھا، اس لیے ہر طرف افواہیں اُڑ رہی تھیں۔ کبھی خطرے کی بے بنیاد مبالغہ آمیز اطلاعیں آتیں اور ان سے یکایک مدینہ اور اس کے اطراف میں پریشانی پھیل جاتی۔ کبھی کوئی چالاک دشمن کسی واقعی خطرے کو چھپانے کے لیے اطمینان بخش خبریں بھیج دیتا اور لوگ انھیں سُن کر غفلت میں مبتلا ہو جاتے۔ ان افواہوں میں وہ لوگ بڑی دلچسپی لیتے تھے جو محض ہنگامہ پسند تھے، جن کے لیے اسلام اور جاہلیّت کا یہ معرکہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہ تھا، جنھیں کچھ

وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝٨٥ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا
بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
النصف حَسِيْبًا ۝٨٦ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ
ع الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۝٨٧

پائے گا اور جو بُرائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصّہ پائے گا[۱۱۳]، اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔

اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمھیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقے کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اُسی طرح[۱۱۴]، اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہ تم سب کو اُس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، اور اللہ کی بات سے بڑھ کر سچّی بات اور کس کی ہو سکتی ہے[۱۱۵]۔ ع

خبر نہ تھی کہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ افواہیں پھیلانے کے نتائج کس قدر دُور رس ہوتے ہیں۔ ان کے کان میں جہاں کوئی بھنک پڑ جاتی، اسے لے کر جگہ جگہ پھونکتے پھرتے تھے۔ انھی لوگوں کو اس آیت میں سرزنش کی گئی ہے اور انھیں سختی کے ساتھ مُتنبّہ فرمایا گیا ہے کہ افواہیں پھیلانے سے باز رہیں اور ہر خبر جو اُن کو پہنچے، اسے ذمہ دار لوگوں تک پہنچا کر خاموش ہو جائیں۔

۱۱۳ – یعنی یہ اپنی اپنی پسند اور اپنا اپنا نصیب ہے کہ کوئی خدا کی راہ میں کوشش کرنے اور حق کو سربلند کرنے کے لیے لوگوں کو اُبھارے اور اس کا اجر پائے، اور کوئی خدا کے بندوں کو غلط فہمیوں میں ڈالنے اور ان کی ہمتیں پست کرنے اور انھیں اِعلائے کلمۃُ اللہ کی سعی و جُہد سے باز رکھنے میں اپنی قوت صَرف کرے، اور اس کی سزا کا مستحق بنے۔

۱۱۴ – اُس وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے، اور جیسا کہ تعلقات کی کشیدگی میں ہوا کرتا ہے، اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان دوسرے لوگوں کے ساتھ کج خُلقی سے نہ پیش آنے لگیں۔ اس لیے انھیں ہدایت کی گئی کہ جو تمھارے ساتھ احترام کا برتاؤ کرے، اس کے ساتھ تم بھی ویسے ہی بلکہ اس سے زیادہ احترام سے پیش آؤ۔ شائستگی کا جواب شائستگی ہی ہے، بلکہ تمھارا منصب یہ ہے کہ دوسروں سے بڑھ کر شائستہ بنو۔ ایک داعی و مبلغ گروہ کے لیے، جو دنیا کو راہِ راست پر لانے اور مسلکِ حق کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھا ہو، دُرشت مزاجی، تُرش رُوئی اور تلخ کلامی مناسب نہیں ہے۔ اس سے نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے مگر اُس مقصد کو اُلٹا نقصان پہنچتا ہے جس کے لیے وہ اُٹھا ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ

پھر یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمھارے درمیان دو رائیں پائی جاتی ہیں،[۱۱۶] حالانکہ جو بُرائیاں اُنھوں نے کمائی ہیں، اُن کی بدولت اللہ انھیں اُلٹا پھیر چکا ہے۔[۱۱۷]

۱۱۵ – یعنی کافر اور مشرک اور مُلحد اور دہریے جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے خدا کی خدائی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اُس کا خدائے واحد اور خدائے مُطلَق ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی کے بدلے بدل نہیں سکتی۔ پھر ایک دن وہ سب انسانوں کو جمع کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کا نتیجہ دکھا دے گا۔ اس کی قدرت کے احاطے سے بچ کر کوئی بھاگ بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا خدا ہرگز اس بات کا حاجت مند نہیں ہے کہ اس کی طرف سے کوئی اس کے باغیوں پر جلے دل کا بخار نکالتا پھرے اور کج خُلقی و تُرش کلامی کو زخمِ دل کا مرہم بنائے۔

یہ تو اس آیت کا تعلق اُوپر کی آیت سے ہے۔ لیکن یہی آیت اس پورے سلسلۂ کلام کا خاتمہ بھی ہے جو پچھلے دو تین رکوعوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس حیثیت سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی میں جو شخص جس طریقے پر چاہے چلتا رہے اور جس راہ میں اپنی کوششیں اور محنتیں صَرف کرنا چاہتا ہے کیے جائے، آخر کار سب کو ایک دن اس خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پھر ہر ایک اپنی سعی و عمل کے نتائج دیکھ لے گا۔

۱۱۶ – یہاں ان منافق مسلمانوں کے مسئلے سے بحث کی گئی ہے جو مکہ میں اور عرب کے دوسرے حصّوں میں اسلام تو قبول کر چکے تھے، مگر ہجرت کر کے دارالاسلام کی طرف منتقل ہونے کے بجائے بدستور اپنی کافر قوم ہی کے ساتھ رہتے بستے تھے، اور کم و بیش ان تمام کارروائیوں میں عملاً حصّہ لیتے تھے جو ان کی قوم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ سخت پیچیدہ تھا کہ ان کے ساتھ آخر کیا معاملہ کیا جائے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ کچھ بھی ہو، آخر یہ ہیں تو مسلمان ہی۔ کلمہ پڑھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کفار کا سا معاملہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رکوع میں اسی اختلاف کا فیصلہ فرمایا ہے۔

اس موقع پر ایک بات کو واضح طور پر سمجھ لینا ضروری ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ نہ صرف اس مقام کو، بلکہ قرآنِ مجید کے اُن تمام مقامات کو سمجھنے میں آدمی ٹھوکر کھائے گا جہاں ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں کو منافقین میں شمار کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینۂ طیّبہ کی طرف ہجرت فرمائی اور ایک چھوٹا سا خطہ عرب کی سرزمین میں ایسا بہم پہنچ گیا جہاں ایک مومن کے لیے اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن تھا، تو عام حکم دے دیا گیا کہ جہاں جہاں، جس جس علاقے اور جس جس قبیلے میں اہلِ ایمان کفار سے دبے ہوئے ہیں اور اسلامی زندگی بسر کرنے کی آزادی نہیں رکھتے، وہاں سے وہ ہجرت کریں اور مدینہ کے دارالاسلام میں آ جائیں۔ اُس وقت جو لوگ ہجرت کی قدرت رکھتے تھے اور پھر صرف اس لیے اُٹھ کر نہ آئے کہ انھیں اپنے گھر بار، اَعِزّہ و اقربا اور اپنے مفادات اسلام کی بہ نسبت عزیز تر تھے، وہ سب منافق قرار دیے گئے۔ اور

أَتُرِيدُونَ أَن تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ ۖ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَن
تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ﴿٨٨﴾ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ
سَوَاءً ۖ فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ
اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ ۖ
وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿٨٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ

کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے ہدایت نہیں بخشی اُسے تم ہدایت بخش دو؟ حالانکہ جس کو اللہ نے راستے سے ہٹا دیا اُس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ، تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آجائیں، اور اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں پاؤ انھیں پکڑو اور قتل کرو[118] اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے

جو لوگ حقیقت میں بالکل مجبور تھے، ان کو ”مُستَضعَفِین“ میں شمار کیا گیا، جیسا کہ آگے رُکوع ۱۴ میں آ رہا ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ دارالکُفر کے رہنے والے کسی مسلمان کو محض ہجرت نہ کرنے پر منافق صرف اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جب کہ دارالاسلام کی طرف سے ایسے تمام مسلمانوں کو یا تو دعوتِ عام ہو، یا کم از کم اس نے ان کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہوں۔ اس صورت میں بلا شبہ وہ سب مسلمان منافق قرار پائیں گے جو دارالکفر کو دارالاسلام بنانے کی کوئی سعی بھی نہ کر رہے ہوں، اور استطاعت کے باوجود ہجرت بھی نہ کریں۔ لیکن اگر دارالاسلام کی طرف سے نہ تو دعوت ہی ہو اور نہ اس نے اپنے دروازے ہی مہاجرین کے لیے کھلے رکھے ہوں، تو اس صورت میں صرف ہجرت نہ کرنا کسی شخص کو منافق نہ بنا دے گا، بلکہ وہ منافق صرف اُس وقت کہلائے گا جب کہ فی الواقع کوئی منافقانہ کام کرے۔

۱۱۷ – یعنی جس دو رنگی اور مَصلحت پرستی اور ترجیحِ دنیا بر آخرت کا اکتساب انھوں نے کیا ہے، اس کی بدولت اللہ نے انھیں اسی طرف پھیر دیا ہے جس طرف سے یہ آئے تھے۔ انھوں نے کفر سے نکل کر اسلام کی طرف پیش قدمی کی تو ضرور تھی، مگر اس سرحد میں آنے اور ٹھیرنے کے لیے یکسو ہو جانے کی ضرورت تھی، ہر اُس مفاد کو قربان کر دینے کی ضرورت تھی جو اسلام و ایمان کے مفاد سے ٹکراتا ہو، اور آخرت پر ایسے یقین کی ضرورت تھی جس کی بنا پر آدمی اطمینان کے ساتھ اپنی دُنیا کو قربان کر سکتا ہو۔ یہ ان کو گوارا نہ ہُوا،

اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ
صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَ لَوْ
شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ
يُقَاتِلُوْكُمْ وَ اَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ
سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ
وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ
فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ
فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ

جاملیں جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے۔[119] اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمھارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں، نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔ اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلّط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمھاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمھارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ ایک اور قسم کے منافق تمھیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، مگر جب کبھی فتنے کا موقع پائیں گے اس میں کُود پڑیں گے۔ ایسے لوگ اگر تمھارے مقابلے سے باز نہ رہیں اور صلح و سلامتی تمھارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں، تو جہاں وہ ملیں انھیں پکڑو اور مارو، ان پر

اس لیے جدھر سے آئے تھے اُلٹے پاؤں اُدھر ہی واپس چلے گئے۔ اب ان کے معاملے میں اختلاف کا کون سا موقع باقی ہے؟

۱۱۸- یہ حکم اُن منافق مسلمانوں کا ہے جو برسرِ جنگ کافر قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور اسلامی حکومت کے خلاف مُعاندانہ کارروائیوں میں عملاً حصّہ لیں۔

۱۱۹- یہ اِستثنا اِس حکم سے نہیں ہے کہ ”انھیں دوست اور مددگار نہ بنایا جائے“، بلکہ اس حکم سے ہے کہ ”انھیں

ع ۱۳

جَعَلۡنَا لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا ﴿۹۱﴾ ع وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ
يَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنۡ قَتَلَ مُؤۡمِنًا خَطَـًٔا فَتَحۡرِيۡرُ
رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهۡلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ يَّصَّدَّقُوۡا ؕ فَاِنۡ
كَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّكُمۡ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ ؕ

ہاتھ اُٹھانے کے لیے ہم نے تمھیں کُھلی حُجّت دے دی ہے۔ ع

کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دُوسرے مومن کو قتل کرے، اِلّا یہ کہ اُس سے چُوک ہو جائے۔[۱۲۰] اور جو شخص کسی مومن کو غَلَطی سے قتل کر دے تو اس کا کفّارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے[۱۲۱] اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا دے،[۱۲۲] اِلّا یہ کہ وہ خوں بہا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمھاری دشمنی ہو تو اس کا کفّارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔

پکڑا اور مارا جائے"۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ واجب القتل منافق کسی ایسی کافر قوم کے حُدود میں جا پناہ لیں جس کے ساتھ اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو چکا ہو، تو اس کے علاقے میں ان کا تعاقب نہیں کیا جائے گا اور نہ یہی جائز ہوگا کہ دارالاسلام کا کوئی مسلمان غیر جانب دار ملک میں کسی واجب القتل منافق کو پائے اور اسے مار ڈالے۔ احترام دراصل منافق کے خون کا نہیں بلکہ معاہدے کا ہے۔

۱۲۰ – یہاں اُن منافق مسلمانوں کا ذکر نہیں ہے جن کے قتل کی اوپر اجازت دی گئی ہے، بلکہ اُن مسلمانوں کا ذکر ہے جو یا تو دار الاسلام کے باشندے ہوں، یا اگر دار الحرب یا دار الکفر میں بھی ہوں تو دشمنانِ اسلام کی کارروائیوں میں اُن کی شرکت کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ اُس وقت بکثرت لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی حقیقی مجبُوریوں کی بنا پر دشمنِ اسلام قبیلوں کے درمیان ٹھیرے ہوئے تھے۔ اور اکثر ایسے اتفاقات پیش آ جاتے تھے کہ مسلمان کسی دشمن قبیلے پر حملہ کرتے اور وہاں نادانستگی میں کوئی مسلمان ان کے ہاتھ سے مارا جاتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں اس صورت کا حکم بیان فرمایا ہے جب کہ غَلَطی سے کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے۔

۱۲۱ – چونکہ مقتول مومن تھا اس لیے اس کے قتل کا کفارہ ایک مومن غلام کی آزادی قرار دیا گیا۔

۱۲۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خوں بہا کی مقدار سو اُونٹ، یا دو سو گائیں، یا دو ہزار بکریاں مقرر فرمائی ہے۔ اگر دوسری کسی شکل میں کوئی شخص خوں بہا دینا چاہے تو اس کی مقدار انھی چیزوں کی بازاری قیمت کے لحاظ سے معیّن کی جائے گی۔ مثلاً نبیؐ کے زمانے میں نقد خوں بہا دینے والوں کے لیے ۸ سو دینار یا ۸ ہزار درہم مقرر تھے۔ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انھوں نے

وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى
اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ
مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمھارا مُعاہَدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خوں بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔[۱۲۳] پھر جو غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینے کے روزے رکھے۔[۱۲۴] یہ اِس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے[۱۲۵] اور اللہ علیم و دانا ہے۔

فرمایا کہ اُونٹوں کی قیمت اب چڑھ گئی ہے، لہٰذا اب سونے کے سکّے میں ایک ہزار دینار، یا چاندی کے سکّے میں ۱۲ ہزار درہم خوں بہا دلوایا جائے گا۔ مگر واضح رہے کہ خوں بہا کی یہ مقدار جو مقرر کی گئی ہے، قتلِ عَمد کی صورت کے لیے نہیں ہے بلکہ قتلِ خطا کی صورت کے لیے ہے۔

۱۲۳ – اس آیت کے احکام کا خلاصہ یہ ہے:

اگر مقتول دار الاسلام کا باشندہ ہو تو اس کے قاتل کو خوں بہا بھی دینا ہوگا اور خدا سے اپنے قصور کی معافی مانگنے کے لیے ایک غلام بھی آزاد کرنا ہوگا۔

اگر وہ دار الحرب کا باشندہ ہو تو قاتل کو صرف غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اس کا خوں بہا کچھ نہیں ہے۔

اگر وہ کسی ایسے دار الکفر کا باشندہ ہو جس سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے تو قاتل کو ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اور اس کے علاوہ خوں بہا بھی دینا ہوگا، لیکن خوں بہا کی مقدار وہی ہوگی جتنی اُس مُعاہَد قوم کے کسی غیر مسلم فرد کو قتل کر دینے کی صورت میں ازرُوئے مُعاہَدہ دی جانی چاہیے۔

۱۲۴ – یعنی روزے مسلسل رکھے جائیں، بیچ میں ناغہ نہ ہو۔ اگر کوئی شخص عذرِ شرعی کے بغیر ایک روزہ بھی بیچ میں چھوڑ دے تو از سرِ نو روزوں کا سلسلہ شروع کرنا پڑے گا۔

۱۲۵ – یعنی یہ "جُرمانہ" نہیں بلکہ "توبہ" اور "کَفّارہ" ہے۔ جرمانے میں ندامت و شرمساری اور اصلاحِ نفس کی کوئی روح نہیں ہوتی، بلکہ عُموماً وہ سخت ناگواری کے ساتھ مجبُوراً دیا جاتا ہے اور بیزاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ برعکس اس کے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوئی ہے وہ عبادت اور کارِ خیر اور ادائے حُقوق کے ذریعے سے اس کا اثر اپنی روح پر سے دھو دے، اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے، تاکہ نہ صرف یہ گناہ معاف ہو بلکہ آیندہ کے لیے اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادے سے بھی محفوظ رہے۔ کفارہ کے لُغوی معنٰی ہیں: "چھپانے والی چیز"۔ کسی کارِ خیر کو گناہ کا "کَفّارہ" قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ
غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا
لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ

رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بُوجھ کر قتل کرے تو اُس کی جزا جہنّم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اُس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیّا کر رکھا ہے۔

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمھاری طرف سلام سے تقدیم کرے، اُسے فوراً نہ کہہ دو کہ تُو مومن نہیں ہے[۱۲۶]۔ اگر تم دُنیوی فائدہ

نیکی اُس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے، جیسے کسی دیوار پر داغ لگ گیا ہو اور اس پر سفیدی پھیر کر داغ کا اثر مٹا دیا جائے۔

۱۲۶ – ابتدائے اسلام میں ”السّلام علیکم“ کا لفظ مسلمانوں کے لیے شِعار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنیٰ میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمھارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور خیر خواہ ہوں، میرے پاس تمھارے لیے سلامتی و عافیت کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا نہ تم مجھ سے دشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو۔ جس طرح فوج میں ایک لفظ شِعار (password) کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اس غَرَض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ فوجِ مخالف کے آدمیوں سے مُمیَّز ہوں، اسی طرح سلام کا لفظ بھی مسلمانوں میں شِعار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔ خُصوصیّت کے ساتھ اُس زمانے میں اس شعار کی اہمیّت اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ اس وقت عرب کے نومسلموں اور کافروں کے درمیان لباس، زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں امتیاز نہ تھا جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو۔

لیکن لڑائیوں کے موقع پر ایک پیچیدگی یہ پیش آتی تھی کہ مسلمان جب کسی دشمن گروہ پر حملہ کرتے اور وہاں کوئی مسلمان اس لپیٹ میں آ جاتا تو وہ حملہ آور مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ بھی ان کا دینی بھائی ہے ”السّلام علیکم“ یا ”لا الٰہ الا اللہ“ پکارتا تھا، مگر مسلمانوں کو اس پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی کافر ہے جو محض جان بچانے کے لیے حیلہ کر رہا ہے، اس لیے بسا اوقات وہ اسے قتل کر بیٹھتے تھے اور اس کی چیزیں غنیمت کے طور پر لُوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہر موقع پر نہایت سختی کے ساتھ سرزنش فرمائی۔ مگر اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہے۔ آخرِ کار اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اس پیچیدگی کو حل کیا۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اس کے متعلق تمھیں سرسری طور پر یہ فیصلہ کر دینے کا

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ
قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي
الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ
فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ
دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى

چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمھارے لیے بہت سے اموالِ غنیمت ہیں۔ آخر اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا[127]، لہٰذا تحقیق سے کام لو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔

مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اُس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ

حق نہیں ہے کہ وہ محض جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور ہوسکتا ہے کہ جھوٹا ہو۔ حقیقت تو تحقیق ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ تحقیق کے بغیر چھوڑ دینے میں اگر یہ امکان ہے کہ ایک کافر جھوٹ بول کر جان بچالے جائے، تو قتل کر دینے میں اس کا امکان بھی ہے کہ ایک مومن بے گناہ تمھارے ہاتھ سے مارا جائے۔ اور بہرحال تمھارا ایک کافر کو چھوڑ دینے میں غلطی کرنا اس سے بدرجہا زیادہ بہتر ہے کہ تم ایک مومن کو قتل کرنے میں غلطی کرو۔

۱۲۷ – یعنی ایک وقت تم پر بھی ایسا گزر چکا ہے کہ انفرادی طور پر مختلف کافر قبیلوں میں منتشر تھے، اپنے اسلام کو ظلم و ستم کے خوف سے چھپانے پر مجبور تھے، اور تمھارے پاس ایمان کے زبانی اقرار کے سوا اپنے ایمان کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ اب یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تم کو اجتماعی زندگی عطا کی اور تم اس قابل ہوئے کہ کفار کے مقابلے میں اسلام کا جھنڈا

الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَ
كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ

ع ۱۴

بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے[۱۲۸]، اُن کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے[۱۲۹] ان کی رُوحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔

بلند کرنے اُٹھے ہو۔ اس احسان کا یہ کوئی صحیح شکریہ نہیں ہے کہ جو مسلمان ابھی پہلی حالت میں مبتلا ہیں، ان کے ساتھ تم نرمی و رعایت سے کام نہ لو۔

۱۲۸ – یہاں اُن بیٹھنے والوں کا ذکر نہیں ہے، جن کو جہاد پر جانے کا حکم دیا جائے اور وہ بہانے کر کے بیٹھ رہیں، یا نَفیرِ عام ہو اور جہاد فرضِ عین ہو جائے پھر بھی وہ جنگ پر جانے سے جی چُرائیں۔ بلکہ یہاں ذکر اُن بیٹھنے والوں کا ہے جو جہاد کے فرضِ کفایہ ہونے کی صورت میں میدانِ جنگ کی طرف جانے کے بجائے دوسرے کاموں میں لگے رہیں۔ پہلی دو صورتوں میں جہاد کے لیے نہ نکلنے والا صرف منافق ہی ہو سکتا ہے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے کسی بھلائی کا وعدہ نہیں ہے، اِلّا یہ کہ وہ کسی حقیقی معذوری کا شکار ہو۔ بخلاف اس کے یہ آخری صورت ایسی ہے جس میں اسلامی جماعت کو پوری فوجی طاقت مطلوب نہیں ہوتی بلکہ محض اس کا ایک حصہ مطلوب ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر امام کی طرف سے اپیل کی جائے کہ کون سرباز ہیں جو فُلاں مہم کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں، تو جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں وہ افضل ہیں بہ نسبت اُن کے جو دوسرے کاموں میں لگے رہیں، خواہ وہ دوسرے کام بھی بجائے خود مفید ہی ہوں۔

۱۲۹ – مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبوری و معذوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان مقیم تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کرنے پر راضی تھے، درآں حالے کہ ایک دارالاسلام مہیا ہو چکا تھا جس کی طرف ہجرت کر کے اپنے دین و اعتقاد کے مطابق پوری اسلامی زندگی بسر کرنا ان کے لیے ممکن ہو گیا تھا۔ یہی ان کا اپنے نفس پر ظلم تھا، کیونکہ ان کو پوری اسلامی زندگی کے مقابلے میں اس نیم کفر و نیم اسلام پر جس چیز نے قانع و مطمئن کر رکھا تھا، وہ کوئی واقعی مجبوری نہ تھی، بلکہ محض اپنے نفس کے عیش اور اپنے خاندان، اپنی جائداد و املاک اور اپنے دنیوی مفاد کی محبت تھی جسے انھوں نے اپنے دین پر ترجیح دی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۱۱۶)

قَالُوْۤا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ
مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۙ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ
الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّ لَا
يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۙ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ
بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ
فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ ع

فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟[۱۳۰] یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کردے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجایش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسولؐ کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر راستے ہی میں اسے موت آ جائے، اُس کا اجر اللہ کے ذمّے واجب ہو گیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے۔[۱۳۱] ع

۱۳۰ — یعنی جب ایک جگہ خدا کے باغیوں کا غلبہ تھا اور خدا کے قانونِ شرعی پر عمل کرنا ممکن نہ تھا تو وہاں رہنا کیا ضرور تھا؟ کیوں نہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف منتقل ہو گئے جہاں قانونِ الٰہی کی پیروی ممکن ہوتی؟

۱۳۱ — یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو، اس کے لیے نظامِ کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے: ایک، یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظامِ کفر کو نظامِ اسلام میں تبدیل کرنے کی جدّوجُہد کرتا رہے، جس طرح انبیا علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبورانہ قیام رکھتا ہو۔ ان دو صورتوں

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ

اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضایقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کر دو[۱۳۲] (خصوصاً)

کے سوا ہر صورت میں دارالکفر کا قیام ایک مستقل معصیت ہے اور اس معصیت کے لیے یہ عذر کوئی بہت وزنی عذر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں کوئی ایسا دارالاسلام پاتے ہی نہیں ہیں جہاں ہم ہجرت کر کے جا سکیں۔ اگر کوئی دارالاسلام موجود نہیں ہے تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی ایسا نہیں ہے جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزر کر سکتا ہو اور احکامِ کفر کی اطاعت سے بچا رہے؟

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوئی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ لا ھجرۃ بعد الفتح، یعنی فتحِ مکہ کے بعد اب ہجرت نہیں ہے۔ حالانکہ دراصل یہ حدیث کوئی دائمی حکم نہیں ہے بلکہ صرف اس وقت کے حالات میں اہلِ عرب سے ایسا فرمایا گیا تھا۔ جب تک عرب کا بیشتر حصہ دارالکفر و دارالحرب تھا اور صرف مدینہ و اطراف مدینہ میں اسلامی احکام جاری ہو رہے تھے، مسلمانوں کے لیے تاکیدی حکم تھا کہ ہر طرف سے سمٹ کر دارالاسلام میں آ جائیں۔ مگر جب فتحِ مکہ کے بعد عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا اور قریب قریب پورا ملک اسلام کے زیرِ نگیں آ گیا تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہجرت کی حاجت باقی نہیں رہی ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے تمام حالات میں قیامت تک کے لیے ہجرت کی فرضیت منسوخ ہو گئی ہے۔

۱۳۲ – زمانۂ امن کے سفر میں قصر یہ ہے کہ جن اوقات کی نماز میں چار رکعتیں فرض ہیں ان میں دو رکعتیں پڑھی جائیں۔ اور حالتِ جنگ میں قصر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جنگی حالات جس طرح بھی اجازت دیں، نماز پڑھی جائے۔ جماعت کا موقع ہو تو جماعت سے پڑھو، ورنہ فرداً فرداً ہی سہی۔ قبلہ رُخ نہ ہو سکتے ہو تو جدھر بھی رخ ہو۔ سواری پر بیٹھے ہوئے اور چلتے ہوئے بھی پڑھ سکتے ہو۔ رُکوع و سجدہ ممکن نہ ہو تو اشارے ہی سے سہی۔ ضرورت پڑے تو نماز ہی کی حالت میں چل بھی سکتے ہو۔ کپڑوں کو خون لگا ہوا ہو تب بھی مضایقہ نہیں۔ ان سب آسانیوں کے باوجود اگر ایسی پر خطر حالت ہو کہ کسی طرح نماز نہ پڑھی جا سکے تو مجبوراً مؤخر کی جائے جیسے جنگِ خندق کے موقع پر ہوا۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ سفر میں صرف فرض پڑھے جائیں یا سنتیں بھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جو کچھ ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ آپؐ سفر میں فجر کی سنتوں اور عشا کے وتر کا تو التزام فرماتے تھے مگر باقی اوقات میں صرف فرض پڑھتے تھے، سنتیں پڑھنے کا التزام آپؐ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ نفل نمازوں کا جب موقع ملتا تھا پڑھ لیا کرتے تھے، حتّٰی کہ سواری پر بیٹھے ہوئے بھی پڑھتے رہتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے لوگوں کو سفر میں فجر کے سوا دوسرے اوقات کی سنتیں پڑھنے سے منع کیا ہے۔ مگر اکثر علما ترک اور فعل دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں اور اسے بندے کے اختیار پر چھوڑ دیتے ہیں۔ حنفیہ کا مختار مذہب یہ ہے کہ مسافر جب راستہ طے کر رہا ہو تو سنتیں نہ پڑھنا افضل ہے اور جب کسی مقام پر منزل کرے اور اطمینان حاصل ہو تو پڑھنا افضل ہے۔

جس سفر میں قصر کیا جاسکتا ہے اس کے لیے بعض ائمہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ فی سبیل اللہ ہونا چاہیے، جیسے جہاد، حج، عمرہ، طلب علم وغیرہ۔ ابنِ عمرؓ، ابنِ مسعودؓ اور عطاؒ کا یہی فتویٰ ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ سفر کسی ایسے مقصد کے لیے ہونا چاہیے جو شرعاً جائز ہو، حرام و ناجائز اغراض کے لیے جو سفر کیا جائے، اس میں قصر کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ حَنفِیَّہ کہتے ہیں کہ قصر ہر سفر میں کیا جا سکتا ہے، رہی سفر کی نوعیت، تو وہ بجائے خود ثواب یا عتاب کی مستحق ہو سکتی ہے، مگر قصر کی اجازت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بعض ائمہ نے ''مضایقہ نہیں'' (فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ) کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ سفر میں قصر کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ محض اس کی اجازت ہے۔ آدمی چاہے تو اس سے فائدہ اُٹھائے ورنہ پوری نماز پڑھے۔ یہی رائے امام شافعیؒ نے اختیار کی ہے، اگرچہ وہ قصر کرنے کو افضل اور ترکِ قصر کو ترکِ اَولیٰ قرار دیتے ہیں۔ امام احمدؒ کے نزدیک قصر کرنا واجب تو نہیں ہے مگر نہ کرنا مکروہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قصر کرنا واجب ہے اور یہی رائے ایک رِوایت میں امام مالکؒ سے بھی منقول ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سفر میں قصر کیا ہے اور کسی معتبر روایت میں یہ منقول نہیں ہے کہ آپؐ نے کبھی سفر میں چار رکعتیں پڑھی ہوں۔ ابنِ عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ سفروں میں رہا ہوں اور کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے قصر نہ کیا ہو۔ اسی کی تائید میں ابنِ عباسؓ اور دوسرے متعدِد صحابہؓ سے بھی مستند روایات منقول ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے جب حج کے موقع پر مِنیٰ میں چار رکعتیں پڑھائیں تو صحابہؓ نے اس پر اعتراض کیا اور حضرت عثمانؓ نے یہ جواب دے کر لوگوں کو مطمئن کیا کہ میں نے مکّے میں شادی کر لی ہے، اور چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں مُتأَہِّل ہُوا ہو وہ گویا اس شہر کا باشندہ ہے، اس لیے میں نے یہاں قصر نہیں کیا۔ ان کثیر روایات کے خلاف دو روایتیں حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قصر اور اتمام دونوں دُرست ہیں، لیکن یہ روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے علاوہ خود حضرت عائشہؓ ہی کے ثابت شدہ مسلک کے خلاف ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ایک حالت بین السفر و الحضر بھی ہوتی ہے جس میں ایک ہی عارضی فرودگاہ پر حسبِ موقع کبھی قصر اور کبھی اتمام دونوں کیے جاسکتے ہیں، اور غالباً حضرت عائشہؓ نے اسی حالت کے متعلّق فرمایا ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں قصر بھی کیا ہے اور اتمام بھی۔ رہے قرآن کے یہ الفاظ کہ ''مضایقہ نہیں اگر قصر کرو''، تو ان کی نظیر سورۂ بَقَرہ رکوع ۱۹ میں گزر چکی ہے جہاں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے متعلق بھی یہی الفاظ فرمائے گئے ہیں، حالانکہ یہ سعی مناسکِ حج میں سے ہے اور واجب ہے۔ دراصل دونوں جگہ یہ کہنے کا مقصود لوگوں کے اِس اندیشے کو دُور کرنا ہے کہ ایسا کرنے سے کہیں کوئی گناہ تو لازم نہیں آئے گا، یا ثواب میں کمی تو نہ ہوگی۔

مقدارِ سفر جس میں قصر کیا جاسکتا ہے، ظاہریّہ کے نزدیک کچھ نہیں ہے، ہر سفر میں قصر کیا جا سکتا ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ۔ امام مالکؒ کے نزدیک ۴۸ میل یا ایک دن رات سے کم کے سفر میں قصر نہیں ہے۔ یہی رائے امام احمدؒ کی ہے۔ ابنِ عباسؓ کا بھی یہی مسلک ہے اور امام شافعیؒ سے بھی ایک قول اس کی تائید میں مروی ہے۔ حضرت انسؓ ۱۵ میل کے سفر میں قصر کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ امام اَوزاعیؒ اور امام زُہریؒ حضرت عمرؓ کی اس رائے کو لیتے ہیں کہ ایک دن کا سفر قصر کے لیے کافی ہے۔ حَسَن بصری دو دن،

اِنۡ خِفۡتُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنَكُمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ اِنَّ الۡكٰفِرِيۡنَ
كَانُوۡا لَـكُمۡ عَدُوًّا مُّبِيۡنًا ﴿۱۰۱﴾ وَاِذَا كُنۡتَ فِيۡهِمۡ فَاَقَمۡتَ لَهُمُ

جب کہ تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں ستائیں گے،۱۳۳ کیونکہ وہ کُھلّم کُھلّا تمھاری دشمنی پر تُلے ہوئے ہیں۔
اور اے نبیؐ! جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالتِ جنگ میں) انھیں نماز پڑھانے

اور امام ابو یوسفؒ دو دن سے زیادہ کی مسافت میں قصر جائز سمجھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس سفر میں پیدل یا اُونٹ کی سواری سے تین دن صَرف ہوں (یعنی تقریباً ۱۸ فرسنگ یا ۵۴ میل) اس میں قصر کیا جا سکتا ہے۔ یہی رائے ابنِ عمرؓ، ابنِ مسعود اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی ہے۔

اثنائے سفر میں دَورانِ قیام جس میں قصر کیا جا سکتا ہے، مختلف ائمہ کے نزدیک مختلف ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک جہاں آدمی نے چار دن ٹھیرنے کا ارادہ کر لیا ہو، وہاں پوری نماز پڑھنی ہوگی۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جہاں چار دن سے زیادہ قیام کا ارادہ ہو، وہاں قصر جائز نہیں۔ امام اَوزاعیؒ ۱۳ دن اور امام ابوحنیفہؒ ۱۵ دن یا اس سے زیادہ کی نیتِ قیام پر پوری نماز ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کوئی صریح حکم مروی نہیں ہے۔ اور اگر کسی جگہ آدمی مجبوراً اُرکا ہوا ہو اور ہر وقت یہ خیال ہو کہ مجبوری دُور ہوتے ہی وطن واپس ہو جائے گا تو تمام علما کا اتفاق ہے کہ ایسی جگہ بلاتعیُّنِ مدّتِ قصر کیا جاتا رہے گا۔ صحابۂ کرامؓ سے بکثرت مثالیں ایسی منقول ہیں کہ انھوں نے ایسے حالات میں دو دو سال مسلسل قصر کیا ہے۔ امام احمد ابنِ حنبلؒ اسی پر قیاس کر کے قیدی کو بھی اس کے پُورے زمانۂ قید میں قصر کی اجازت دیتے ہیں۔

۱۳۳ — ظاہریّوں اور خارجیوں نے اس فقرے کا یہ مطلب لیا ہے کہ قصر صرف حالتِ جنگ کے لیے ہے اور حالتِ امن کے سفر میں قصر کرنا قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن حدیث میں مستند رِوایت سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب یہی شبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو حضورؐ نے فرمایا: صدقة تصدق الله بها علیکم فاقبلوا صدقته۔ ”یہ قصر کی اجازت ایک انعام ہے جو اللہ نے تمھیں بخشا ہے، لہٰذا اس کے انعام کو قبول کرو۔“ یہ بات قریب قریب تواتُر سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امن اور خوف دونوں حالتوں کے سفر میں قصر فرمایا ہے۔ ابنِ عباسؓ تصریح کرتے ہیں کہ ان النبی صلی الله علیه وسلم خرج من المدینة الٰی مکة لا یخاف الا ربّ العٰلمین فصلی رکعتین۔ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے اور اس وقت ربّ العالمین کے سوا کسی کا خوف نہ تھا، مگر آپؐ نے دو ہی رکعتیں پڑھیں۔“ اسی بنا پر میں نے ترجمے میں خُصوصاً کا لفظ قوسین میں بڑھا دیا ہے۔

الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ قف
فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى
لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ج
وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ

کھڑے[۱۳۴] ہوتو چاہیے کہ ان میں[۱۳۵] سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہواور اسلحہ لیے رہے، پھر جب وہ سجدہ کرلے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے، آکر تمھارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنّا رہے اور اپنے اسلحہ لیے رہے[۱۳۶]، کیوں کہ کفّار اِس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہوتو

---

۱۳۴ – امام ابویوسفؒ اور حسن بن زیادؒ نے ان الفاظ سے یہ گمان کیا ہے کہ صلوٰۃِ خوف صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے لیے مخصوص تھی۔ لیکن قرآن میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے ایک حکم دیا گیا ہے اور وہی حکم آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشینوں کے لیے بھی ہے۔ اس لیے صلوٰۃِ خوف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ پھر بکثرت جلیل القدر صحابہؓ سے ثابت ہے کہ انھوں نے حضورؐ کے بعد بھی صلوٰۃِ خوف پڑھی ہے اور اس باب میں کسی صحابی کا اختلاف مروی نہیں ہے۔

۱۳۵ – صلوٰۃِ خوف کا یہ حکم اس صورت کے لیے ہے جب کہ دشمن کے حملے کا خطرہ تو ہو مگر عملاً معرکۂ قتال گرم نہ ہو۔ رہی یہ صورت کہ عملاً جنگ ہو رہی ہو تو اس صورت میں حَنَفِیَہ کے نزدیک نماز مؤخر کردی جائے گی۔ امام مالکؒ اور امام ثوریؒ کے نزدیک اگر رکوع وسجود ممکن نہ ہو تو اشاروں سے پڑھ لی جائے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نماز ہی کی حالت میں تھوڑی سی زد و خورد بھی کی جاسکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے کہ آپؐ نے غزوۂ خندق کے موقع پر چار نمازیں نہیں پڑھیں اور پھر موقع پاکر علی الترتیب انھیں ادا کیا، حالانکہ غزوۂ خندق سے پہلے صلوٰۃِ خوف کا حکم آچکا تھا۔

۱۳۶ – صلوٰۃِ خوف کی ترکیب کا انحصار بڑی حد تک جنگی حالات پر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے نماز پڑھائی ہے اور امامِ وقت مجاز ہے کہ ان طریقوں میں سے جس طریقے کی اجازت جنگی صورتِ حال دے اسی کو اختیار کرے۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصّہ امام کے ساتھ نماز پڑھے اور دوسرا حصّہ دشمن کے مقابلے پر رہے۔ پھر جب ایک رکعت پوری ہوجائے تو پہلا حصّہ سلام پھیر کر چلا جائے اور دوسرا حصّہ آکر دوسری رکعت امام کے ساتھ پوری کرے۔ اس طرح

فَیَمِیۡلُوۡنَ عَلَیۡکُمۡ مَّیۡلَۃً وَّاحِدَۃً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اِنۡ کَانَ بِکُمۡ اَذًی مِّنۡ مَّطَرٍ اَوۡ کُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤی اَنۡ تَضَعُوۡۤا اَسۡلِحَتَکُمۡ ۚ وَخُذُوۡا حِذۡرَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿۱۰۲﴾ فَاِذَا قَضَیۡتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا

وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں مضایقہ نہیں، مگر پھر بھی چوکنے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کُن عذاب مہیّا کر رکھا ہے۔[۱۳۷] پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے

امام کی دو رکعتیں ہوں گی اور فوج کی ایک ایک رکعت۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک حصّہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر چلا جائے، پھر دُوسرا حصہ آ کر ایک رکعت امام کے پیچھے پڑھے، پھر دونوں حصے باری باری سے آ کر اپنی چھُوٹی ہوئی ایک ایک رکعت بطورِ خود ادا کرلیں۔ اس طرح دونوں حصّوں کی ایک ایک رکعت امام کے پیچھے ادا ہوگی، اور ایک رکعت انفرادی طور پر۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے فوج کا ایک حصہ دو رکعتیں ادا کرے اور تشہُّد کے بعد سلام پھیر کر چلا جائے۔ پھر دوسرا حصّہ تیسری رکعت میں آ کر شریک ہو اور امام کے ساتھ سلام پھیرے۔ اس طرح امام کی چار اور فوج کی دو دو رکعتیں ہوں گی۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور جب امام دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو تو مقتدی بطورِ خود ایک رکعت مع تشہُّد پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ پھر دوسرا حصّہ آ کر اس حال میں امام کے پیچھے کھڑا ہو کہ ابھی امام دوسری ہی رکعت میں ہو اور یہ لوگ بقیہ نماز امام کے ساتھ ادا کرنے کے بعد ایک رکعت خود اُٹھ کر پڑھ لیں۔ اس صورت میں امام کو دوسری رکعت میں طویل قیام کرنا ہوگا۔

پہلی صورت کو ابنِ عباسؓ، جابر بن عبداللہؓ اور مجاہدؒ نے رِوایت کیا ہے۔ دوسرے طریقے کو عبداللہؓ بن مسعود نے روایت کیا ہے اور حَنَفِیَہ اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ تیسرے طریقے کو حسن بصریؒ نے ابوبکرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور چوتھے طریقے کو امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے تھوڑے اختلاف کے ساتھ ترجیح دی ہے اور اس کا ماخذ سہل بن ابی حَثْمہ کی روایت ہے۔

اِن کے علاوہ صلوٰۃ خوف کے اور بھی طریقے ہیں جن کی تفصیل مبسُوطات میں مل سکتی ہے۔

۱۳۷ – یعنی یہ احتیاط جس کا حکم تمھیں دیا جا رہا ہے، محض دُنیوی تدابیر کے لحاظ سے ہے، ورنہ دراصل فتح و شکست کا مدار تمھاری تدابیر پر نہیں بلکہ اللہ کے فیصلے پر ہے۔ اس لیے ان احتیاطی تدبیروں پر عمل کرتے ہوئے تمھیں اس امر کا یقین رکھنا

وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰى جُنُوۡبِكُمۡ‌ ۚ فَاِذَا اطۡمَاۡنَنۡتُمۡ فَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ‌ ۚ اِنَّ
الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَهِنُوۡا فِى
ابۡتِغَآءِ الۡقَوۡمِ‌ ؕ اِنۡ تَكُوۡنُوۡا تَاۡلَمُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ يَاۡلَمُوۡنَ كَمَا
تَاۡلَمُوۡنَ‌ ۚ وَتَرۡجُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرۡجُوۡنَ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا
حَكِيۡمًا ﴿۱۰۴﴾ ع اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ

ع ۱۵

اور بیٹھے اور لیٹے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو۔ اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو۔ نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندیِ وقت کے ساتھ اہلِ ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔

اس گروہ[۱۳۸] کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمھاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ اور تم اللہ سے اُس چیز کے اُمّیدوار ہو جس کے وہ اُمّیدوار نہیں ہیں۔[۱۳۹] اللہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ ع

اے نبیؐ![۱۴۰] ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمھاری طرف نازل کی ہے، تاکہ جو راہِ راست اللہ نے

چاہیے کہ جو لوگ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بُجھانے کی کوشش کر رہے ہیں، اللہ انھیں رسوا کرے گا۔

۱۳۸ – یعنی گروہ کفّار جو اُس وقت اسلام کی دعوت اور نظامِ اسلامی کے قیام کی راہ میں مانع و مزاحم بن کر کھڑا ہوا تھا۔

۱۳۹ – یعنی تعجب کا مقام ہے اگر اہلِ ایمان حق کی خاطر اتنی تکلیفیں بھی برداشت نہ کریں جتنی کفار باطل کی خاطر برداشت کر رہے ہیں، حالانکہ اُن کے سامنے صرف دنیا اور اس کے ناپائیدار فائدے ہیں اور اس کے برعکس اہلِ ایمان ربّ السماوات والارض کی خوشنودی و تقرّب اور اس کے اَبدی انعامات کے امیدوار ہیں۔

۱۴۰ – اس رکوع اور اس کے بعد والے رکوع میں ایک اہم معاملے سے بحث کی گئی ہے جو اُسی زمانے میں پیش آیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ انصار کے قبیلہ بنی ظفر میں ایک شخص طُعمہ یا بشیر بن اُبیرق تھا۔ اس نے ایک انصاری کی زرہ چُرالی۔ اور جب اس کا تجسس شروع ہوا تو مالِ مسروقہ ایک یہودی کے ہاں رکھ دیا۔ زرہ کے مالک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اِستغاثہ کیا اور طُعمہ پر اپنا شبہ ظاہر کیا۔ مگر طُعمہ اور اس کے بھائی بندوں اور بنی ظفر کے بہت سے لوگوں نے آپس میں اتفاق کر کے اُس یہودی پر الزام تھوپ دیا۔ یہودی سے پوچھا گیا تو اس نے اپنی براءت ظاہر کی۔ لیکن یہ لوگ طُعمہ کی حمایت میں زور شور سے وکالت کرتے

بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۙ﴿۱۰۵﴾
وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ﴿۱۰۶﴾ وَ لَا
تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۙۚ﴿۱۰۷﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ

تمھیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو، اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو، وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں[۱۴۱]، تم اُن کی حمایت نہ کرو۔ اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات

رہے اور کہا کہ یہ یہودی خبیث، جو حق کا انکار اور اللہ کے رسولؐ سے کفر کرنے والا ہے، اِس کی بات کا کیا اعتبار، بات ہماری تسلیم کی جانی چاہیے، کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔قریب تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مقدّے کی ظاہری رُوداد سے متأثّر ہوکر اس یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے اور مُستغیث کو بھی بنی اُبیرِق پر الزام عائد کرنے پر تنبیہ فرماتے۔ اتنے میں وحی آئی اور معاملے کی ساری حقیقت کھول دی گئی۔

اگرچہ ایک قاضی کی حیثیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا روداد کے مطابق فیصلہ کر دینا بجائے خود آپؐ کے لیے کوئی گناہ نہ ہوتا۔اور ایسی صورتیں قاضیوں کو پیش آتی ہی ہیں کہ ان کے سامنے غلط رُوداد پیش کر کے حقیقت کے خلاف فیصلے حاصل کر لیے جاتے ہیں۔لیکن اُس وقت، جب کہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک زبردست کش مکش برپا تھی، اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم رُودادِ مقدّمہ کے مطابق یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے، تو اسلام کے مخالفوں کو آپؐ کے خلاف اور پوری اسلامی جماعت اور خود دعوتِ اسلامی کے خلاف ایک زبردست اخلاقی حربہ مل جاتا۔ وہ یہ کہتے پھرتے کہ اجی یہاں حق و انصاف کا کیا سوال ہے، یہاں تو وہی جتھا بندی اور عصبیت کام کر رہی ہے جس کے خلاف تبلیغ کی جاتی ہے۔ اسی خطرے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس مقدّمے میں مداخلت فرمائی۔

اِن رکوعوں میں ایک طرف اُن مسلمانوں کو سختی کے ساتھ ملامت کی گئی ہے جنھوں نے محض خاندان اور قبیلے کی عصبیّت میں مجرموں کی حمایت کی تھی۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ انصاف کے معاملے میں کسی تعصّب کا دخل نہ ہونا چاہیے۔ یہ ہرگز دیانت نہیں ہے کہ اپنے گروہ کا آدمی اگر برسرِ باطل ہو تو اس کی بے جا حمایت کی جائے اور دوسرے گروہ کا آدمی اگر برسرِ حق ہو تو اس کے ساتھ بے انصافی کی جائے۔

۱۴۱ – جو شخص دوسرے کے ساتھ خیانت کرتا ہے، وہ دراصل سب سے پہلے خود اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرتا ہے۔ کیونکہ دل اور دماغ کی جو قوتیں اس کے پاس بطورِ امانت ہیں ان پر بے جا تصرف کر کے وہ انھیں مجبور کرتا ہے کہ خیانت میں اس کا

مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ
مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ
مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫
فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ
وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ
اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا
فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾
وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ

چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ وہ تو اُس وقت بھی اُن کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اُس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ اِن کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے۔ ہاں! تم لوگوں نے اِن مجرموں کی طرف سے دُنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا، مگر قیامت کے روز ان کی طرف سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون اِن کا وکیل ہوگا؟ اگر کوئی شخص بُرا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے، تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔ مگر جو بُرائی کما لے تو اس کی یہ کمائی اُسی کے لیے وبال ہوگی، اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا، اُس نے تو

ساتھ دیں۔ اور اپنے ضمیر کو، جسے اللہ نے اس کے اَخلاق کا محافظ بنایا تھا، اس حد تک دبا دیتا ہے کہ وہ اس خیانت کاری میں سدِّراہ بننے کے قابل نہیں رہتا۔ جب انسان اپنے اندر اس ظالمانہ دست بُرد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیتا ہے، تب کہیں باہر اس سے خیانت و معصیت کے افعال صادر ہوتے ہیں۔

ع ۸ ۱۶ ۱۳

اِحْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ؑ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ
وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا
يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ
اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ
وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ
نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ
بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ
فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ

بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا۔ؑ

اے نبیؐ! اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمھارے شاملِ حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تمھیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا، حالاں کہ در حقیقت وہ خود اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر رہے تھے اور تمھارا کوئی نقصان نہ کر سکتے تھے۔ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے[۱۴۲] اور تم کو وہ کچھ بتایا ہے جو تمھیں معلوم نہ تھا، اور اس کا فضل تم پر بہت ہے۔

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لیے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لیے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے، اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کرے گا، اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔ مگر جو شخص رسولؐ کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور

۱۴۲ – یعنی اگر وہ غلط رُوداد پیش کر کے تمھیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے اور اپنے حق میں انصاف کے خلاف فیصلہ حاصل کر لیتے تو نقصان انھی کا تھا، تمھارا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ کیونکہ خدا کے نزدیک مجرم وہ ہوتے نہ کہ تم۔

مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ
نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ع ۝۱۱۵ اِنَّ اللّٰهَ ع ۱۷ ۱۳
لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ
وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۱۶ اِنْ يَّدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۝۱۱۷

اہلِ ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالے کہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو اُس کو ہم اُسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا[۱۴۳] اور اسے جہنّم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ ع

اللہ کے ہاں[۱۴۴] بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے، اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہوسکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا، وہ تو گمراہی میں بہت دُور نکل گیا۔ وہ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو معبود بناتے ہیں۔ وہ اُس باغی شیطان کو معبود بناتے ہیں[۱۴۵]

جو شخص حاکم کو دھوکا دے کر اپنے حق میں غلط فیصلہ حاصل کرتا ہے، وہ دراصل خود اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ ان تدبیروں سے حق اس کے ساتھ ہوگیا، حالانکہ فی الواقع اللہ کے نزدیک حق جس کا ہے اسی کا رہتا ہے اور فریب خوردہ حاکم کے فیصلے سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۹۷)

۱۴۳ – جب مذکورۂ بالا مقدّمے میں وحیِ الٰہی کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس خائن مسلمان کے خلاف، اور اُس بے گناہ یہودی کے حق میں، فیصلہ صادر فرما دیا تو اس منافق پر جاہلیّت کا اس قدر سخت دورہ پڑا کہ وہ مدینہ سے نکل کر اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے پاس مکہ چلا گیا اور کُھلّم کُھلّا مخالفت پر آمادہ ہوگیا۔ اس آیت میں اس کی اسی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔

۱۴۴ – اس رکوع میں اُوپر کے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اپنی جاہلیت کے طیش میں آکر یہ شخص جس راہ کی طرف گیا ہے وہ کیسی راہ ہے، اور صالحین کے گروہ سے الگ ہوکر جن لوگوں کا ساتھ اس نے اختیار کیا ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔

۱۴۵ – شیطان کو اس معنٰی میں تو کوئی بھی معبود نہیں بناتا کہ اس کے آگے مراسمِ پرستش ادا کرتا ہو اور اس کو

يُجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ
اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ
اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰهِ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ ع ۱۸ ۱۱ ۱۵

اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا۔ اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔ اس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، اُس ابراہیمؑ کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے[150] اور اللہ ہر چیز پر محیط ہے۔[151] ع

لوگ تم سے عورتوں کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔[152] کہو، اللہ تمھیں اُن کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے،

پہنچ جانے کا اطمینان، کسی کو یہ بھروسا کہ نہ خدا ہے نہ آخرت، بس مر کر مٹی ہو جانا ہے، کسی کو یہ تسلّی کہ آخرت ہے بھی تو وہاں کی گرفت سے فلاں کے طفیل اور فلاں کے صدقے میں بچ نکلو گے۔ غرض جو جس وعدے اور جس توقع سے فریب کھا سکتا ہے، اس کے سامنے وہی پیش کرتا ہے اور پھانس لیتا ہے۔

۱۵۰ — یعنی اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا اور خود سری و خود مختاری سے باز آ جانا اس لیے بہترین طریقہ ہے کہ یہ حقیقت کے عین مطابق ہے۔ جب اللہ زمین و آسمان کا اور ان ساری چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں تو انسان کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ اس کی بندگی و اطاعت پر راضی ہو جائے اور سرکشی چھوڑ دے۔

وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ فِىْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِىْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ

اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سُنائے جارہے ہیں[۱۵۳] یعنی وہ احکام جو اُن یتیم لڑکیوں کے متعلّق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے[۱۵۴] اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو (یا لالچ کی بنا پر تم خود ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو)[۱۵۵]، اور وہ احکام جو اُن بچّوں کے متعلّق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے۔[۱۵۶] اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو، اور جو بھلائی تم کرو گے

۱۵۱ – یعنی اگر انسان اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرے اور سرکشی سے باز نہ آئے تو وہ اللہ کی گرفت سے بچ کر کہیں بھاگ نہیں سکتا، اللہ کی قدرت اس کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

۱۵۲ – اس کی تصریح نہیں فرمائی گئی کہ عورتوں کے معاملے میں لوگ کیا پُوچھتے تھے۔ مگر آگے چل کر جو فتویٰ دیا گیا ہے، اس سے سوال کی نوعیت خود واضح ہو جاتی ہے۔

۱۵۳ – یہ اصل اِستِفتا کا جواب نہیں ہے بلکہ لوگوں کے سوال کی طرف توجہ فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اُن احکام کی پابندی پر پھر ایک مرتبہ زور دیا ہے جو اِسی سورت کے آغاز میں یتیم لڑکیوں کے متعلق بالخصوص اور یتیم بچّوں کے متعلق بالعُموم ارشاد فرمائے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں یتیموں کے حقوق کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ ابتدائی دو رکوعوں میں ان کے حقوق کے تحفّظ کی تاکید بڑی شدت کے ساتھ کی جا چکی تھی۔ مگر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ اب جو معاشرتی مسائل کی گفتگو چھڑی تو قبل اس کے کہ لوگوں کے پیش کردہ سوال کا جواب دیا جاتا، یتیموں کے مفاد کا ذکر بطورِ خود چھیڑ دیا گیا۔

۱۵۴ – اشارہ ہے اُس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ”اگر یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں......“ (سورۂ نساء، آیت ۳)

۱۵۵ – تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”تم ان سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو“ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”تم ان سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے“۔ حضرت عائشہؓ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی، وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے۔ اگر لڑکی مال دار ہونے کے ساتھ خوب صورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور مہر و نفقہ ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور اگر وہ بدصُورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے تھے اور نہ کسی دوسرے سے اس کا نکاح ہونے دیتے تھے، تاکہ اس کا کوئی ایسا سر دھرا پیدا نہ ہو جائے جو کل اُس کے حق کا مطالبہ

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا
نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ
وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا

وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔

جب[۱۵۷] کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسُلوکی یا بے رُخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضایقہ نہیں اگر میاں اور بیوی (کچھ حُقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کرلیں۔ صلح بہر حال بہتر ہے[۱۵۸]۔ نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں[۱۵۹]، لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو

کرنے والا ہو۔

۱۵۶ – اشارہ ہے اُن احکام کی طرف جو اِسی سُورہ کے پہلے اور دوسرے رکوع میں یتیموں کے حقوق کے متعلّق ارشاد ہوئے ہیں۔

۱۵۷ – یہاں سے اصل اِستفتا کا جواب شروع ہوتا ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سوال کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص غیر محدود تعداد تک بیویاں کرنے کے لیے آزاد تھا اور ان کثیر التعداد بیویوں کے لیے کچھ بھی حقوق مقرر نہ تھے۔ سورۂ نساء کی ابتدائی آیات جب نازل ہوئیں تو اس آزادی پر دو قسم کی پابندیاں عائد ہوگئیں: ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دی گئی۔ دوسرے یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے عدل (یعنی مُساویانہ برتاؤ) کو شرط قرار دیا گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کسی شخص کی بیوی بانجھ ہے، یا دائم المرض ہے، یا تعلّقِ زن و شو کے قابل نہیں رہی ہے، اور شوہر دوسری بیوی بیاہ لاتا ہے تو کیا وہ مجبُور ہے کہ دونوں کے ساتھ یکساں رغبت رکھے؟ یکساں محبّت رکھے؟ جسمانی تعلّق میں بھی یکسانی برتے؟ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا عدل کی شرط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو چھوڑ دے؟ نیز یہ کہ اگر پہلی بیوی خود جدا نہ ہونا چاہے تو کیا زوجین میں اس قسم کا معاملہ ہو سکتا ہے کہ جو بیوی غیر مرغوب ہو چکی ہے، وہ اپنے بعض حقوق سے خود دست بردار ہو کر شوہر کو طلاق سے باز رہنے پر راضی کرلے؟ کیا ایسا کرنا عدل کی شرط کے خلاف تو نہ ہوگا؟ یہ سوالات ہیں جن کا جواب اِن آیات میں دیا گیا ہے۔

۱۵۸ – یعنی طلاق و جدائی سے بہتر ہے کہ اس طرح باہم مُصالحت کر کے ایک عورت اُسی شوہر کے ساتھ رہے جس کے ساتھ وہ عمر کا ایک حصّہ گزار چکی ہے۔

۱۵۹ – عورت کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر شوہر کے لیے بے رغبتی کے اسباب کو خود محسوس کرتی ہو اور پھر بھی وہ سلوک چاہے جو ایک مرغوب بیوی کے ساتھ ہی برتا جا سکتا ہے۔ مرد کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ

فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا اَنۡ
تَعۡدِلُوۡا بَیۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ
فَتَذَرُوۡہَا کَالۡمُعَلَّقَۃِ ؕ وَاِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ

یقین رکھو کہ اللہ تمھارے اس طرزِ عمل سے بے خبر نہ ہوگا۔[160] بیویوں کے درمیان پُورا پُورا عدل کرنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اِس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا (قانونِ الٰہی کا منشا پُورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اِس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو اَدھر لٹکتا چھوڑ دو۔[161] اگر تم اپنا طرزِ عمل دُرست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ

جو عورت دل سے اُتر جانے پر بھی اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہو، اس کو وہ حد سے زیادہ دبانے کی کوشش کرے اور اس کے حُقوق ناقابلِ برداشت حد تک گھٹا دینا چاہے۔

۱۶۰ – یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے مرد ہی کے جذبۂ فیّاضی سے اپیل کی ہے جس طرح بالعُموم ایسے معاملات میں اس کا قاعدہ ہے۔ اس نے مرد کو ترغیب دی ہے کہ وہ بے رغبتی کے باوجود اس عورت کے ساتھ احسان سے پیش آئے جو برسوں اس کی رفیقِ زندگی رہی ہے، اور اس خدا سے ڈرے جو اگر کسی انسان کی خامیوں کے سبب سے اپنی نظرِ التفات اس سے پھیر لے اور اس کے نصیب میں کمی کرنے پر اُتر آئے تو پھر اس کا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہ رہے۔

۱۶۱ – مطلب یہ ہے کہ آدمی تمام حالات میں تمام حیثیتوں سے دو یا زائد بیویوں کے درمیان مُساوات نہیں برت سکتا۔ ایک خوب صورت ہے اور دوسری بدصورت، ایک جوان ہے اور دُوسری سِنّ رسیدہ، ایک دائم المرض ہے اور دوسری تندرست، ایک بدمزاج ہے اور دوسری خوش مزاج، اور اسی طرح کے دوسرے تفاوُت بھی ممکن ہیں جن کی وجہ سے ایک بیوی کی طرف طبعًا آدمی کی رغبت کم اور دوسری کی طرف زیادہ ہو سکتی ہے۔ ایسی حالتوں میں قانون یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ محبّت و رغبت اور جسمانی تعلّق میں ضرور ہی دونوں کے درمیان مُساوات رکھی جائے۔ بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب تم بے رغبتی کے باوجود ایک عورت کو طلاق نہیں دیتے اور اس کو اپنی خواہش یا خود اُس کی خواہش کی بنا پر بیوی بنائے رکھتے ہو، تو اس سے کم از کم اس حد تک تعلّق ضرور رکھو کہ وہ عملاً بے شوہر ہو کر نہ رہ جائے۔ ایسے حالات میں ایک بیوی کی بہ نسبت دوسری کی طرف میلان زیادہ ہونا تو فطری امر ہے، لیکن ایسا بھی نہ ہونا چاہیے کہ دوسری یوں معلّق ہو جائے گویا کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن ایک طرف عدل کی شرط کے ساتھ تعدُّدِ ازواج کی اجازت دیتا ہے اور دوسری طرف عدل کو ناممکن قرار دے کر اس اجازت کو عملاً منسوخ کر دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نتیجہ نکالنے کے لیے اس آیت میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اگر صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا گیا ہوتا کہ ”تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے“ تو

غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنۡ يَّتَفَرَّقَا يُغۡنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنۡ سَعَتِهٖ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيۡمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى
الۡاَرۡضِ ؕ وَلَقَدۡ وَصَّيۡنَا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَ
اِيَّاكُمۡ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنۡ تَكۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيۡدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ اَيُّهَا
النَّاسُ وَيَاۡتِ بِاٰخَرِيۡنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيۡرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنۡ

چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے[۱۶۲]۔ لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دُوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انھیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو، آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز ہے، ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور کارسازی کے لیے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمھاری جگہ دُوسروں کو لے آئے، اور وہ اِس کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو شخص

یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا، مگر اس کے بعد ہی جو یہ فرمایا گیا کہ "لہٰذا ایک بیوی کی طرف بالکل نہ جھک پڑو"، اس فقرے نے کوئی موقع اُس مطلب کے لیے باقی نہیں چھوڑا جو مسیحی یورپ کی تقلید کرنے والے حضرات اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

۱۶۲ – یعنی اگر حتّی الامکان تم قصداً ظلم نہ کرو اور انصاف ہی سے کام لینے کی کوشش کرتے رہو تو فطری مجبُوریوں کی بنا پر جو تھوڑی بہت کوتاہیاں تم سے انصاف کے معاملے میں صادر ہوں گی، انھیں اللہ معاف فرما دے گا۔

كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا
قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ

ع ۱۹ ۱۲

محض ثوابِ دُنیا کا طالب ہو، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس ثوابِ دُنیا بھی ہے اور ثوابِ آخرت بھی، اور اللہ سمیع و بصیر ہے۔[۱۶۳] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے عَلَم بردار[۱۶۴] اور خدا واسطے کے گواہ بنو،[۱۶۵] اگرچہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری اپنی ذات پر یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں پر

۱۶۳ — بالعُموم قانونی احکام بیان کرنے کے بعد، اور بالخصوص تمدّن و معاشرت کے اُن پہلوؤں کی اصلاح پر زور دینے کے بعد جن میں انسان اکثر ظلم کا ارتکاب کرتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اِس قسم کے چند پُر اثر جملوں میں ایک مختصر وعظ ضرور فرمایا کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نفوس کو اُن احکام کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ اُوپر چونکہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ انصاف اور حُسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے، لہٰذا اس کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ چند باتیں اہلِ ایمان کے ذہن نشین کر دی جائیں:

ایک یہ کہ تم کبھی اِس بُھلاوے میں نہ رہنا کہ کسی کی قسمت کا بنانا اور بگاڑنا تمھارے ہاتھ میں ہے، اگر تم اُس سے ہاتھ کھینچ لوگے تو اس کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ نہیں، تمھاری اور اس کی، سب کی قسمتوں کا مالک اللہ ہے اور اللہ کے پاس اپنے کسی بندے یا بندی کی مدد کا ایک تم ہی واحد ذریعہ نہیں ہو۔ اس مالکِ زمین و آسمان کے ذرائع بے حد وسیع ہیں اور وہ اپنے ذرائع سے کام لینے کی حکمت بھی رکھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمھیں اور تمھاری طرح پچھلے تمام انبیاؑ کی اُمتوں کو ہمیشہ یہی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ خدا ترسی کے ساتھ کام کرو۔ اس ہدایت کی پیروی میں تمھاری اپنی فلاح ہے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم اس کی خلاف ورزی کروگے تو پچھلی تمام اُمتوں نے نافرمانیاں کر کے خدا کا کیا بگاڑ لیا ہے جو تم بگاڑ سکوگے۔ اُس فرمانروائے کائنات کو نہ پہلے کسی کی پروا تھی نہ اب تمھاری پروا ہے۔ اس کے امر سے انحراف کروگے تو وہ تم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو سربلند کر دے گا اور تمھارے ہٹ جانے سے اس کی سلطنت کی رونق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

تیسرے یہ کہ خدا کے پاس دنیا کے فائدے بھی ہیں اور آخرت کے فائدے بھی، عارضی اور وقتی فائدے بھی ہیں، پائدار اور دائمی فائدے بھی۔ اب یہ تمھارے اپنے ظرف اور حوصلے اور ہمت کی بات ہے کہ تم اُس سے کس قسم کے

وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ قف
فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مال دار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے۔ لٰہذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچّائی سے پہلو بچایا، تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو اس کی خبر ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان[۱۶۶] لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل

فائدے چاہتے ہو۔ اگر تم محض دُنیا کے چند روزہ فائدوں ہی پر ریجھتے ہو اور ان کی خاطر اَبدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو، تو خدا یہی کچھ تم کو یہیں اور ابھی دے دے گا، مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمھارا کوئی حصہ نہ رہے گا۔ دریا تو تمھاری کھیتی کو اَبد تک سیراب کرنے کے لیے تیار ہے، مگر یہ تمھارے اپنے ظرف کی تنگی اور حوصلے کی پستی ہے کہ صرف ایک فصل کی سیرابی کو ابدی خشک سالی کی قیمت پر خریدتے ہو۔ کچھ ظرف میں وسعت ہو تو اطاعت و بندگی کا وہ راستہ اختیار کرو جس سے دُنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمھارے حصے میں آئیں۔

آخر میں فرمایا اللہ سمیع و بصیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اندھا اور بہرا نہیں ہے کہ کسی شاہِ بے خبر کی طرح اندھا دُھند کام کرے اور اپنی عطا و بخشش میں بھلے اور بُرے کے درمیان کوئی تمیز نہ کرے۔ وہ پُوری باخبری کے ساتھ اپنی اِس کائنات پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ ہر ایک کے ظرف اور حوصلے پر اس کی نگاہ ہے۔ ہر ایک کے اوصاف کو وہ جانتا ہے۔ اُسے خوب معلوم ہے کہ تم میں سے کون کس راہ میں اپنی محنتیں اور کوششیں صَرف کر رہا ہے۔ تم اس کی نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے ان بخششوں کی اُمید نہیں کر سکتے جو اس نے صرف فرماں برداروں ہی کے لیے مخصوص کی ہیں۔

۱۶۴ – یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے عَلَم بردار بنو۔ تمھارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اُٹھنا ہے۔ تمھیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمھارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔

۱۶۵ – یعنی تمھاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے، کسی کی رُو رعایت اس میں نہ ہو، کوئی ذاتی مفاد یا

وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا
كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ ۭ

کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت سے کفر کیا[۱۶۷] وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دُور نکل گیا۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے[۱۶۸]، تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی اُن کو راہِ راست دکھائے گا۔

خدا کے سوا کسی کی خوشنودی تمھارے مدِّنظر نہ ہو۔

۱۶۶ – ایمان لانے والوں سے کہنا کہ "ایمان لاؤ" بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل یہاں لفظ ایمان دو الگ معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ ایمان لانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آدمی انکار کے بجائے اقرار کی راہ اختیار کرے، نہ ماننے والوں سے الگ ہو کر ماننے والوں میں شامل ہو جائے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو مانے اُسے سچے دل سے مانے۔ پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ مانے۔ اپنی فکر کو، اپنے مذاق کو، اپنی پسند کو، اپنے رَوِیّے اور چلن کو، اپنی دوستی اور دشمنی کو، اپنی سعی و جُہد کے مَصرَف کو بالکل اُس عقیدے کے مطابق بنالے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔ آیت میں خطاب اُن تمام مسلمانوں سے ہے جو پہلے معنیٰ کے لحاظ سے "ماننے والوں" میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان سے مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے سچے مومن بنیں۔

۱۶۷ – کفر کرنے کے بھی دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ آدمی صاف صاف انکار کر دے۔ دوسرے یہ کہ زبان سے تو مانے مگر دل سے نہ مانے، یا اپنے رَوِیّے سے ثابت کر دے کہ وہ جس چیز کو ماننے کا دعویٰ کر رہا ہے، فی الواقع اسے نہیں مانتا۔ یہاں کفر سے یہ دونوں معنیٰ مراد ہیں اور آیت کا مقصود لوگوں کو اس بات پر مُتنبِّہ کرنا ہے کہ اسلام کے اِن اساسی عقیدوں کے ساتھ کفر کی اِن دونوں اقسام میں سے جس قسم کا برتاؤ بھی آدمی اختیار کرے گا، اس کا نتیجہ حق سے دُوری اور باطل کی راہوں میں سرگشتگی و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

۱۶۸ – اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے دین محض ایک غیر سنجیدہ تفریح ہے۔ ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیّلات یا اپنی خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اُٹھی، مسلمان ہو گئے اور

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۳۸ الَّذِيْنَ
يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ
اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝۱۳۹ وَقَدْ
نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا
وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ
حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ

اور جو منافق اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انھیں یہ مُژدہ سُنا دو کہ اُن کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزّت کی طلب میں اُن کے پاس جاتے ہیں[169]؟ حالانکہ عزّت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ اِس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دُوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انھی کی طرح[170] ہو۔ یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور

جب دُوسری لہر اُٹھی، کافر بن گئے۔ یا جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا، مسلمان بن گئے اور جب معبُودِ منفعت نے دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پُوجا کرنے کے لیے بے تکلّف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے“ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص محض کافر بن جانے ہی پر اکتفا نہ کرے، بلکہ اس کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں اور عَلانیہ تدبیریں شروع کر دے، اور اپنی قوت اس سعی و جُہد میں صَرف کرنے لگے کہ کفر کا بول بالا ہو اور اس کے مقابلے میں اللہ کے دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے۔ یہ کفر میں مزید ترقی، اور ایک جرم پر پے درپے جرائم کا اضافہ ہے، جس کا وبال بھی مجرّد کفر سے لازماً زیادہ ہونا چاہیے۔

۱۶۹ – ”عزّت“ کا مفہوم عربی زبان میں اردو کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے۔ اُردو میں عزّت محض احترام اور قدر و منزلت کے معنٰی میں آتا ہے۔ مگر عربی میں عزّت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ عزّت ”ناقابلِ ہتک حرمت“ کا ہم معنٰی ہے۔

وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَاۙ ۝۱۴۰ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ
كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖؗ وَ اِنْ كَانَ
لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لَنْ يَّجْعَلَ
اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝۱۴۱ؑ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ
قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا

ع ۱۷

کافروں کو جہنّم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے۔ یہ منافق تمھارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے)۔ اگر اللہ کی طرف سے فتح تمھاری ہوئی تو آ کر کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلّا بھاری رہا تو اُن سے کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟[۱۷۱] بس اللہ ہی تمھارے اور ان کے معاملے کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور (اس فیصلے میں) اللہ نے کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ ع

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو کَسمَساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اُٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی

۱۷۰ – یعنی اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود کافروں کی ان صحبتوں میں شریک ہوتا ہے جہاں آیاتِ الٰہی کے خلاف کفر بکا جاتا ہے، اور ٹھنڈے دل سے ان لوگوں کو خدا اور رسولؐ کا مذاق اُڑاتے ہوئے سنتا ہے، تو اس میں اور ان کافروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ (جس حکم کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، وہ سورۂ انعام آیت ۶۸ میں بیان ہوا ہے)۔

۱۷۱ – ہر زمانے کے منافقین کی یہی خصوصیت ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں، اُن کو یہ اپنے زبانی اقرار اور دائرۂ اسلام میں برائے نام شمولیت کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں۔ اور جو فائدے کافر

قَلِيۡلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى
هٰٓؤُلَاۤءِ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۳﴾

یاد کرتے ہیں۔[۱۷۲] کفر و ایمان کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں۔ نہ پُورے اِس طرف ہیں نہ پُورے اُس طرف۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو، اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔[۱۷۳]

ہونے کی حیثیت سے حاصل ہونے ممکن ہیں، ان کی خاطر یہ کفّار سے جا کر ملتے ہیں اور ہر طریقے سے ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم کوئی "متعصب مسلمان" نہیں ہیں، نام کا تعلق مسلمانوں سے ضرور ہے مگر ہماری دلچسپیاں اور وفاداریاں تمھارے ساتھ ہیں، فکر و تہذیب اور مذاق کے لحاظ سے ہر طرح کی مُوافقت تمھارے ساتھ ہے، اور کفر و اسلام کی کش مکش میں ہمارا وزن جب پڑے گا تمھارے ہی پلڑے میں پڑے گا۔

۱۷۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی شخص مسلمانوں کی جماعت میں شمار ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ نماز کا پابند نہ ہو۔ جس طرح تمام دنیوی جماعتیں اور مجلسیں اپنے اجتماعات میں کسی ممبر کے بلا عُذر شریک نہ ہونے کو اس کی عَدَم دلچسپی پر محمول کرتی ہیں اور مسلسل چند اجتماعات سے غیر حاضر رہنے پر اسے ممبری سے خارج کر دیتی ہیں، اسی طرح اسلامی جماعت کے کسی رکن کا نمازِ باجماعت سے غیر حاضر رہنا اُس زمانے میں اِس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اور اگر وہ مسلسل چند مرتبہ جماعت سے غیر حاضر رہتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بنا پر سخت سے سخت منافقوں کو بھی اس زمانے میں پانچوں وقت مسجد کی حاضری ضرور دینی پڑتی تھی، کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار کیے ہی نہ جا سکتے تھے۔ البتہ جو چیز ان کو سچّے اہلِ ایمان سے ممیّز کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ سچّے مومن ذوق و شوق سے آتے تھے، وقت سے پہلے مسجدوں میں پہنچ جاتے تھے، نماز سے فارغ ہو کر بھی مسجدوں میں ٹھیرے رہتے تھے، اور ان کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ نماز سے ان کو حقیقی دلچسپی ہے۔ بخلاف اس کے اذان کی آواز سنتے ہی منافق کی جان پر بن جاتی تھی، دل پر جبر کر کے اُٹھتا تھا، اس کے آنے کا انداز صاف غمازی کرتا تھا کہ آنہیں رہا بلکہ اپنے آپ کو کھینچ کر لا رہا ہے، جماعت ختم ہوتے ہی اس طرح بھاگتا تھا گویا کسی قیدی کو رہائی ملی ہے، اور اس کی تمام حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص خدا کے ذکر سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔

۱۷۳ – یعنی جس نے خدا کے کلام اور اس کے رسولؐ کی سیرت سے ہدایت نہ پائی ہو، جس کو سچّائی سے منحرف اور باطل پرستی کی طرف راغب دیکھ کر خدا نے بھی اُسی طرف پھیر دیا ہو جس طرف وہ خود پھرنا چاہتا تھا، اور جس کی ضلالت طلبی کی وجہ سے خدا نے اس پر ہدایت کے دروازے بند اور صرف ضلالت ہی کے راستے کھول دیے ہوں، ایسے شخص کو راہِ راست دکھانا درحقیقت کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس معاملے کو رزق کی مثال سے سمجھیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جس انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے، اللہ ہی کے ہاں سے ملتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا
مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ
وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجّت دے دو؟ یقین جانو کہ منافق جہنّم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو اُن کا مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو اُن میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں

مگر اللہ ہر شخص کو رزق اُس راستے سے دیتا ہے جس راستے سے وہ خود مانگتا ہو۔ اگر کوئی شخص اپنا رزق حلال راستے سے طلب کرے اور اُسی کے لیے کوشش بھی کرے تو اللہ اس کے لیے حلال راستوں کو کھول دیتا ہے اور جتنی اس کی نیت صادق ہوتی ہے، اُسی نسبت سے حرام کے راستے اس کے لیے بند کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص حرام خوری پر تُلا ہُوا ہوتا ہے اور اسی کے لیے سعی کرتا ہے، اس کو خدا کے اِذن سے حرام ہی کی روٹی ملتی ہے، اور پھر یہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس کے نصیب میں رزقِ حلال لکھ دے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کی تمام راہیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ کوئی شخص کسی راہ پر بھی اللہ کے اذن اور اس کی توفیق کے بغیر نہیں چل سکتا۔ رہی یہ بات کہ کس انسان کو کس راہ پر چلنے کا اذن ملتا ہے اور کس راہ کی رہروی کے اسباب اس کے لیے ہموار کیے جاتے ہیں، تو اس کا انحصار سراسر آدمی کی اپنی طلب اور سعی پر ہے۔ اگر وہ خدا سے لگاؤ رکھتا ہے، سچّائی کا طالب ہے اور خالص نیت سے خدا کے راستے پر چلنے کی سعی کرتا ہے، تو اللہ اسی کا اذن اور اسی کی توفیق اسے عطا فرماتا ہے اور اسی راہ پر چلنے کے اسباب اس کے لیے موافق کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور غلط راستوں ہی پر چلنے کی سعی کرتا ہے، اللہ کی طرف سے اس کے لیے ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہی راہیں اس کے لیے کھول دی جاتی ہیں جن کو اس نے آپ اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ ایسے شخص کو غلط سوچنے، غلط کام کرنے اور غلط راہوں میں اپنی قوتیں صَرف کرنے سے بچا لینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنے نصیب کی راہِ راست جس نے خود کھو دی اور جس سے اللہ نے اس کو محروم کر دیا، اس کے لیے یہ گم شدہ نعمت کسی کے ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔

وَاعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰهِ وَاَخۡلَصُوۡا دِيۡنَهُمۡ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ
وَسَوۡفَ يُؤۡتِ اللّٰهُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفۡعَلُ اللّٰهُ
بِعَذَابِكُمۡ اِنۡ شَكَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيۡمًا ﴿۱۴۷﴾

اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں[۱۷۴]، ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمھیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو[۱۷۵] اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے[۱۷۶] اور سب کے حال سے واقف ہے۔

۱۷۴- اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی وفاداریاں اللہ کے سوا کسی اور سے وابستہ نہ ہوں، اپنی ساری دلچسپیوں اور محبّتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر دے، کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا ایسا لگاؤ باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اُسے قربان نہ کیا جا سکتا ہو۔

۱۷۵- شُکر کے اصل معنیٰ اعترافِ نعمت یا احسان مندی کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی کا رَوِیّہ اختیار نہ کرو، بلکہ صحیح طور پر اس کے احسان مند بن کر رہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ تمھیں سزا دے۔

ایک محسن کے مقابلے میں صحیح احسان مندانہ رَوِیّہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسان مندی کا ثبوت دے۔ انھی تین چیزوں کے مجموعے کا نام شُکر ہے۔ اور اس شُکر کا اقتضا یہ ہے کہ اوّلاً آدمی احسان کو اُسی کی طرف منسوب کرے جس نے دراصل احسان کیا ہے، کسی دوسرے کو احسان کے شکریہ اور نعمت کے اعتراف میں اس کا حصّہ دار نہ بنائے۔ ثانیاً، آدمی کا دل اپنے محسن کے لیے محبّت اور وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو اور اُس کے مخالفوں سے محبّت و اخلاص اور وفاداری کا ذرّہ برابر تعلّق بھی نہ رکھے۔ ثالثاً، وہ اپنے محسن کا مطیع و فرماں بردار ہو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے منشا کے خلاف استعمال نہ کرے۔

۱۷۶- اصل میں لفظ ''شَاکِر'' استعمال ہوا ہے، جس کا ترجمہ ہم نے ''قدر دان'' کیا ہے۔ شُکر جب اللہ کی طرف سے بندے کی جانب ہو تو اس کے معنیٰ ''اعترافِ خدمت'' یا قدر دانی کے ہوں گے، اور جب بندے کی طرف سے اللہ کی جانب ہو تو اس کو اعترافِ نعمت یا احسان مندی کے معنیٰ میں لیا جائے گا۔ اللہ کی طرف سے بندوں کا شکریہ ادا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نا قدر شناس نہیں ہے، جتنی اور جیسی خدمات بھی بندے اس کی راہ میں بجا لائیں، اللہ کے ہاں ان کی قدر کی جاتی ہے،

الجزء ۶

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الۡجَہۡرَ بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ ؕ

وَ کَانَ اللّٰہُ سَمِیۡعًا عَلِیۡمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنۡ تُبۡدُوۡا خَیۡرًا اَوۡ تُخۡفُوۡہُ اَوۡ

تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیۡرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ

یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ

اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو، اور اللہ سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ (مظلوم ہونے کی صُورت میں اگرچہ تم کو بدگوئی کا حق ہے) لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاوٴ، یا کم از کم بُرائی سے درگزر کرو، تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے، حالانکہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔[۱۷۷]

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوںؐ سے کفر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسُولوںؐ کے

کسی کی خدمات صِلہ و انعام سے محروم نہیں رہتیں، بلکہ وہ نہایت فیّاضی کے ساتھ ہر شخص کو اس کی خدمت سے زیادہ صلہ دیتا ہے۔ بندوں کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے کیا اس کی قدر کم کرتے ہیں، اور جو کچھ نہ کیا اس پر گرفت کرنے میں بڑی سختی دکھاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا حال یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے نہیں کیا ہے اس پر محاسبہ کرنے میں وہ بہت نرمی اور چشم پوشی سے کام لیتا ہے، اور جو کچھ کیا ہے اس کی قدر اس کے مرتبے سے بڑھ کر کرتا ہے۔

۱۷۷ – اس آیت میں مسلمانوں کو ایک نہایت بلند درجے کی اَخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق اور یہودی اور بُت پرست، سب کے سب اُس وقت ہر ممکن طریقے سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو ستانے اور پریشان کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اِس نئی تحریک کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں کے اندر نفرت اور غصّے کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کے جذبات کا طوفان اُٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا تمہارے خدا کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم مظلوم ہو، اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اُسے حق پہنچتا ہے۔ لیکن پھر بھی اَفضل یہی ہے کہ خفیہ ہو یا عَلانیہ، ہر حال میں بھلائی کیے جاوٴ اور بُرائیوں سے درگزر کرو، کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اَخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جس خدا کا قرب تم چاہتے ہو، اس کی شان یہ ہے کہ نہایت حلیم اور بُردبار ہے، سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے اور بڑے سے بڑے قصوروں پر بھی درگزر کیے چلا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے قریب تر

وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ
اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ
حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ
سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع

درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے، اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ سب پکے کافر ہیں[۱۷۸] اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے وہ سزا مہیّا کر رکھی ہے جو انھیں ذلیل وخوار کر دینے والی ہوگی ـــــ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں، اور اُن کے درمیان تفریق نہ کریں، اُن کو ہم ضرور اُن کے اجر عطا کریں گے،[۱۷۹] اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے[۱۸۰] ع

ہونے کے لیے تم بھی عالی حوصلہ اور وسیع الظرف بنو۔

۱۷۸ – یعنی کافر ہونے میں وہ لوگ جو نہ خدا کو مانتے ہیں نہ اس کے رسولوںؑ کو، اور وہ جو خدا کو مانتے ہیں مگر رسولوںؑ کو نہیں مانتے، اور وہ جو کسی رسول کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے، سب یکساں ہیں۔ ان میں سے کسی کے کافر ہونے میں ذرّہ برابر شک کی گنجایش نہیں۔

۱۷۹ – یعنی جو لوگ خدا کو اپنا واحد معبُود اور مالک تسلیم کرلیں، اور اس کے بھیجے ہوئے تمام رسُولوںؑ کی پیروی قبول کریں، صرف وہی اپنے اعمال پر اجر کے مستحق ہیں، اور وہ جس درجے کا عملِ صالح کریں گے اسی درجے کا اجر پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے خدا کی لاشریک الٰہیّت و رُبوبیّت ہی تسلیم نہ کی، یا جنھوں نے خدا کے نمایندوں میں سے بعض کو قبول اور بعض کو ردّ کرنے کا باغیانہ طرزِ عمل اختیار کیا، تو ان کے لیے کسی عمل پر کسی اجر کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے لوگوں کا کوئی عمل خدا کی نگاہ میں قانونی عمل نہیں ہے۔

۱۸۰ – یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائیں گے، ان کا حساب لینے میں اللہ سخت گیری نہیں برتے گا، بلکہ ان کے ساتھ بہت نرمی اور درگزر سے کام لے گا۔

یَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدۡ
سَاَلُوۡا مُوۡسٰٓى اَكۡبَرَ مِنۡ ذٰلِكَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهۡرَةً
فَاَخَذَتۡهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلۡمِهِمۡ‌ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ
مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَعَفَوۡنَا عَنۡ ذٰلِكَ‌ ۚ وَاٰتَيۡنَا مُوۡسٰى

یہ اہلِ کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر اُن پر نازل کراؤ[۱۸۱] تو اِس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰؑ سے کر چکے ہیں۔ اُس سے تو اِنھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اِسی سرکشی کی وجہ سے یکایک اِن پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔[۱۸۲] پھر انھوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا حالانکہ یہ کُھلی کُھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔[۱۸۳] اس پر بھی ہم نے اِن سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰؑ کو

---

۱۸۱ – مدینے کے یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپؐ کی رسالت اُس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو، یا ہم میں سے ایک ایک شخص کے نام اُوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آ جائے کہ یہ محمدؐ ہمارے رسول ہیں، ان پر ایمان لاؤ۔

۱۸۲ – یہاں کسی واقعے کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے، اِس لیے اُن کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف سرسری اشارات کیے گئے ہیں۔ اس آیت میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ سورۂ بَقَرہ، آیت ۵۵ میں بھی گزر چکا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۷۱)

۱۸۳ – کُھلی کُھلی نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول مقرر ہونے کے بعد سے لے کر فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے تک پے در پے ان لوگوں کے مُشاہَدے میں آ چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ سلطنتِ مصر کی عظیم الشان طاقت کے پنجوں سے جس نے بنی اسرائیل کو چُھڑایا تھا، وہ کوئی گائے کا بچّہ نہ تھا بلکہ اللہ ربّ العالمین تھا۔ مگر یہ اس قوم کی باطل پرستی کا کمال تھا کہ خدا کی قدرت اور اس کے فضل کی روشن ترین نشانیوں کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکنے کے بعد بھی جب جُھکی تو اپنے مُحسن خدا کے آگے نہیں بلکہ ایک بچھڑے کی مصنوعی مُورت ہی کے آگے جُھکی۔

سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا
لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ
وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ
وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ
قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ

صریح فرمان عطا کیا اور اِن لوگوں پر طُور کو اُٹھا کر اِن سے (اُس فرمان کی اطاعت کا) عہد[۱۸۴] لیا۔ ہم نے اِن کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہوں[۱۸۵]۔ ہم نے اِن سے کہا کہ سَبْت کا قانون نہ توڑو اور اس پر اِن سے پختہ عہد لیا[۱۸۶]۔ آخر کار اِن کی عہد شکنی کی وجہ سے، اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جُھٹلایا، اور متعدّد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں[۱۸۷] ــــ[۱۸۸] حالانکہ درحقیقت اِن کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے اِن کے دلوں پر ٹھپّا لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان

---

۱۸۴ – صریح فرمان سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تختیوں پر لکھ کر دیے گئے تھے۔ سورۂ اَعراف، رُکوع ۱۷ میں اس کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ آئے گا۔ اور عہد سے مراد وہ میثاق ہے جو کوہِ طور کے دامن میں بنی اسرائیل کے نمایندوں سے لیا گیا تھا۔ سورۂ بقرہ، آیت ۶۳ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے اور اعراف، آیت ۱۷۱ میں پھر اس کی طرف اشارہ آئے گا۔

۱۸۵ – بَقرہ، آیت ۵۸، ۵۹ و حاشیہ ۷۵۔

۱۸۶ – بَقرہ، آیت ۶۵ و حاشیہ ۸۲ و ۸۳۔

۱۸۷ – یہودیوں کے اس قول کی طرف سورۂ بقرہ آیت ۸۸ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ تمام باطل پرست جُہلا کی طرح اس بات پر فخر کرتے تھے کہ جو خیالات اور تعصّبات اور رسم و رواج ہم نے اپنے باپ دادا سے پائے ہیں، ان پر ہمارا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ کسی طرح ہم اُن سے نہیں ہٹائے جا سکتے۔ جب کبھی خدا کی طرف سے پیغمبروں نے آکر ان کو سمجھانے کی کوشش کی، انھوں نے اُن کو یہی جواب دیا کہ تم خواہ کوئی دلیل اور کوئی آیت لے آؤ، ہم تمھاری کسی

اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٥٥﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿١٥٦﴾

لاتے ہیں ——— پھر[189] اپنے کفر میں اتنے بڑھے کہ مریمؑ پر سخت بہتان لگایا،[190]

بات کا اثر نہ لیں گے، جو کچھ مانتے اور کرتے چلے آئے ہیں، وہی مانتے رہیں گے اور وہی کیے چلے جائیں گے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۹۴)۔

۱۸۸ – یہ جملۂ معترضہ ہے۔

۱۸۹ – یہ فقرہ اصل سلسلۂ تقریر سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۹۰ – حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا معاملہ یہودی قوم میں فی الواقع ذرّہ برابر بھی مُشتبہ نہ تھا، بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے، اُسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیّت کا بچہ ہے جس کی ولادت معجزے کا نتیجہ ہے، نہ کہ کسی اَخلاقی جُرم کا۔ جب بنی اسرائیل کے ایک شریف ترین اور مشہور و نامور مذہبی گھرانے کی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لیے ہوئے آئی، اور قوم کے بڑے اور چھوٹے سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پر ہجوم کر کے آ گئے، تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچّے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمھیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے کہا کہ اس بچے سے ہم کیا پوچھیں جو گھوارے میں لیٹا ہوا ہے۔ مگر یکایک وہ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا۔ ”میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے“ (سورۂ مریم، رکوع ۲)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُس شبہے کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی تھی جو ولادتِ مسیحؑ کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سِنِّ شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریمؑ پر زنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰؑ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا۔ لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر آپ نے نبوت کے کام کی ابتدا فرمائی، اور جب آپ نے یہودیوں کو ان کی بد اعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، اُن کے علما و فقہا کو ان کی ریاکاریوں پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اُس اَخلاقی زوال پر مُتنبّہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے، اور اُس پُرخطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا، تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے۔ اس وقت انھوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ! زانیہ ہیں اور عیسیٰ ابن مریم وَلَدُ الزِّنا۔ حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس درحقیقت ان کا یہ بہتان کسی حقیقی شبہے کا نتیجہ نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا، بلکہ خالص بہتان تھا جو انھوں نے جان بُوجھ کر محض حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے ظلم اور جھوٹ کے بجائے کفر قرار دیا ہے، کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا

وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ۚ
وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ

اور خود کہا کہ ہم نے مسیح، عیسیٰ ابنِ مریمؑ، رسُول اللہ کو قتل کر دیا ہے[191]۔۔۔۔ حالانکہ[192] فی الواقع انھوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کے لیے مُشتَبَہ کر دیا گیا[193]۔ اور جن لوگوں نے

راستہ روکنا تھا، نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔

۱۹۱ – یعنی جُرأتِ مُجرمانہ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے اور پھر اس کے قتل کا اقدام کیا اور فخریہ کہا کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔ اُوپر ہم نے گہوارے کے واقعے کا جو حوالہ دیا ہے، اس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السّلام کی نبوّت میں شک کرنے کی کوئی گنجایش باقی نہ تھی۔ پھر جو روشن نشانیاں انھوں نے حضرتِ موصوف سے مشاہدہ کیں (جن کا ذکر سورۂ آلِ عمران رکوع ۵ میں گزر چکا ہے)، ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مُشتَبَہ ہو چکا تھا کہ آنجناب اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اِس جرم کا ارتکاب اُس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہے۔

بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی قوم کسی شخص کو نبی جانتے اور مانتے ہوئے اُسے قتل کر دے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کے انداز و اطوار ہوتے ہی کچھ عجیب ہیں۔ وہ اپنے درمیان کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں جو اُن کی بُرائیوں پر انھیں ٹوکے اور ناجائز کاموں سے ان کو روکے۔ ایسے لوگ چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہوں ہمیشہ بدکردار قوموں میں قید اور قتل کی سزائیں پاتے ہی رہے ہیں۔ تَلمُود میں لکھا ہے کہ بُخْتِ نَصَّر نے جب بیت المَقدِس فتح کیا تو وہ ہیکلِ سلیمانی میں داخل ہوا اور اس کی سیر کرنے لگا۔ عین قربان گاہ کے سامنے ایک جگہ دیوار پر اسے ایک تیر کا نشان نظر آیا۔ اس نے یہودیوں سے پوچھا: "یہ کیسا نشان ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "یہاں زَکَریاہ نبی کو ہم نے قتل کیا تھا۔ وہ ہماری بُرائیوں پر ہمیں ملامت کرتا تھا۔ آخر جب ہم اس کی ملامتوں سے تنگ آ گئے تو ہم نے اسے مار ڈالا۔" بائبل میں یَرمیاہ نبی کے متعلق لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل کی بداخلاقیاں حد سے گزر گئیں اور حضرت یَرمیاہؑ نے ان کو مُتَنَبِّہ کیا کہ اِن اعمال کی پاداش میں خدا تم کو دوسری قوموں سے پامال کرا دے گا، تو ان پر الزام لگایا گیا کہ یہ شخص کسدیوں (کلدانیوں) سے ملا ہوا ہے اور قوم کا غدار ہے۔ اس الزام میں ان کو جیل بھیج دیا گیا۔ خود حضرت مسیحؑ کے واقعۂ صلیب سے دو ڈھائی سال پہلے ہی حضرت یحییٰؑ کا معاملہ پیش آ چکا تھا۔ یہودی بالعموم ان کو نبی جانتے تھے اور کم از کم یہ تو مانتے ہی تھے کہ وہ ان کی قوم کے صالح ترین لوگوں میں سے ہیں۔ مگر جب انھوں نے ہیرودیس (والیِ ریاستِ یہودیہ) کے دربار کی برائیوں پر تنقید کی تو

اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا
اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ۙ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ

اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں ان کے پاس اس معاملے میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے[۱۹۴]۔ انھوں نے مسیحؑ کو یقین کے ساتھ قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف

اسے برداشت نہ کیا گیا۔ پہلے جیل بھیجے گئے، اور پھر والیِ ریاست کی معشوقہ کے مطالبے پر ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہودیوں کے اس ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے زُعم میں مسیحؑ کو سُولی پر چڑھانے کے بعد سینے پر ہاتھ مار کر کہا ہو: "ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے"۔

۱۹۲ – یہ پھر جملۂ معترضہ ہے۔

۱۹۳ – یہ آیت تصریح کرتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السّلام صلیب پر چڑھائے جانے سے پہلے اُٹھا لیے گئے تھے اور یہ کہ مسیحیوں اور یہودیوں، دونوں کا یہ خیال کہ مسیحؑ نے صلیب پر جان دی، محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ قرآن اور بائبل کے بیانات کا متقابل مطالعہ کرنے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً پیلاطُس کی عدالت میں تو پیشی آپ ہی کی ہوئی تھی، مگر جب وہ سزائے موت کا فیصلہ سُنا چکا اور جب یہودیوں نے مسیحؑ جیسے پاک نفس انسان کے مقابلے میں ایک ڈاکو کی جان کو زیادہ قیمتی ٹھیرا کر اپنی حق دشمنی و باطل پسندی پر آخری مُہر بھی لگا دی، تب اللہ تعالیٰ نے کسی وقت آنجناب کو اُٹھا لیا۔ بعد میں یہودیوں نے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا، وہ آپ کی ذاتِ مقدس نہ تھی بلکہ کوئی اور شخص تھا، جس کو نہ معلوم کس وجہ سے ان لوگوں نے عیسیٰ ابنِ مریمؑ سمجھ لیا۔ تاہم ان کا جُرم اس سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس کو انھوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا، جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلّت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا، اس کو وہ عیسیٰ ابنِ مریمؑ ہی سمجھ رہے تھے۔ اب یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ معاملہ کس طرح ان کے لیے مُشتبہ ہو گیا۔ چونکہ اس باب میں کوئی یقینی ذریعۂ معلومات نہیں ہے، اس لیے مجرّد قیاس و گمان اور افواہوں کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس شبہے کی نوعیّت کیا تھی جس کی بنا پر یہودی یہ سمجھے کہ انھوں نے عیسیٰ ابنِ مریمؑ کو صلیب دی ہے، درآں حالے کہ عیسیٰ ابنِ مریمؑ ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

۱۹۴ – اختلاف کرنے والوں سے مراد عیسائی ہیں۔ ان میں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی ایک مُتَّفَق عَلَیہ قول نہیں ہے بلکہ بیسیوں اقوال ہیں، جن کی کثرت خود اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل حقیقت ان کے لیے بھی مُشتبہ ہی رہی۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیح نہ تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلّت کے ساتھ صلیب دے رہے تھے اور مسیح وہیں کسی جگہ کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیحؑ ہی کو گیا تھا مگر اُن کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی بلکہ اُتارے جانے کے بعد ان میں جان تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ انھوں نے

اِلَيۡهِ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ۝۱۵۸ وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا

اُٹھالیا،[195] اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔ اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا

صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اُٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ اپنے مختلف حواریوں سے ملے اور باتیں کیں۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیحؑ کے جسمِ انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا، مگر اُلوہیّت کی رُوح جو اس میں تھی وہ اُٹھالی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اُٹھائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

۱۹۵ – یہ اس معاملے کی اصل حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ اس میں جَزم اور صراحت کے ساتھ جو چیز بتائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کو قتل کرنے میں یہودی کامیاب نہیں ہوئے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا۔ اب رہا یہ سوال کہ اُٹھا لینے کی کیفیت کیا تھی، تو اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ اُن کو جسم و رُوح کے ساتھ کُرۂ زمین سے اُٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا، اور نہ یہی صاف کہتا ہے کہ انھوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی رُوح اٹھائی گئی۔ اس لیے قرآن کی بُنیاد پر نہ تو ان میں سے کسی ایک پہلو کی قطعی نفی کی جاسکتی ہے اور نہ اثبات۔ لیکن قرآن کے اندازِ بیان پر غور کرنے سے یہ بات بالکل نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اُٹھائے جانے کی نوعیت و کیفیت خواہ کچھ بھی ہو، بہرحال مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ نے کوئی ایسا معاملہ ضرور کیا ہے جو غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ اس غیر معمولی پن کا اظہار تین چیزوں سے ہوتا ہے:

ایک یہ کہ عیسائیوں میں مسیح علیہ السّلام کے جسم و رُوح سمیت اُٹھائے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور اُن اسباب میں سے تھا جن کی بنا پر ایک بہت بڑا گروہ اُلوہیّتِ مسیحؑ کا قائل ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کی صاف صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہٖ وہی ”رفع“ (ascension) کا لفظ استعمال کیا جو عیسائی اِس واقعے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کتابِ مبین کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کسی خیال کی تردید کرنا چاہتی ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کو مزید تقویّت پہنچانے والی ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر مسیح علیہ السلام کا اُٹھایا جانا ویسا ہی اُٹھایا جانا ہوتا جیسا کہ ہر مرنے والا دُنیا سے اُٹھایا جاتا ہے، یا اگر اس رفع سے مراد محض دَرجات و مراتب کی بلندی ہوتی جیسے حضرت ادریسؑ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وَّرَفَعۡنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا، تو اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کے لیے زیادہ مناسب الفاظ یہ ہوسکتے تھے کہ ”یقیناً انھوں نے مسیحؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو زندہ بچالیا اور پھر طبعی موت دی۔ یہودیوں نے اس کو ذلیل کرنا چاہا تھا مگر اللہ نے اس کو بلند درجہ عطا کیا۔“

تیسرے یہ کہ اگر یہ رفع ویسا ہی معمولی قسم کا رفع ہوتا جیسے ہم محاورے میں کسی مرنے والے کو کہتے ہیں کہ اُسے

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾ ۚ

جو اُس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا[۱۹۶] اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دے گا،[۱۹۷]

اللہ نے اُٹھا لیا، تو اس کا ذکر کرنے کے بعد یہ فقرہ بالکل غیر موزوں تھا کہ "اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے"۔ یہ تو صرف کسی ایسے واقعے کے بعد ہی موزوں و مناسب ہو سکتا ہے جس میں اللہ کی قوتِ قاہرہ اور اس کی حکمت کا غیر معمولی ظہور رہوا ہو۔

اس کے جواب میں قرآن سے اگر کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے مُتَوَفِّيْكَ کا لفظ استعمال کیا ہے (آیت ۵۵)۔ لیکن جیسا کہ وہاں ہم حاشیہ ۵۱ میں واضح کر چکے ہیں، یہ لفظ طبعی موت کے معنیٰ میں صریح نہیں ہے بلکہ قبضِ رُوح، اور قبضِ رُوح و جسم، دونوں پر دلالت کر سکتا ہے۔ لہٰذا یہ اُن قرائن کو ساقط کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے جو ہم نے اُوپر بیان کیے ہیں۔ بعض لوگ جن کو مسیحؑ کی طبعی موت کا حکم لگانے پر اصرار ہے، سوال کرتے ہیں کہ تَوَفِّی کا لفظ قبضِ روح و جسم پر استعمال ہونے کی کوئی اور نظیر بھی ہے؟ لیکن جب کہ قبضِ رُوح و جسم کا واقعہ تمام نوعِ انسانی کی تاریخ میں پیش ہی ایک مرتبہ آیا ہو تو اس معنیٰ پر اس لفظ کے استعمال کی نظیر پُوچھنا محض ایک بے معنیٰ بات ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا اصل لُغت میں اس استعمال کی گنجایش ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو ماننا پڑے گا کہ قرآن نے رفعِ جسمانی کے عقیدے کی صاف تردید کرنے کے بجائے یہ لفظ استعمال کر کے اُن قرائن میں ایک اور قرینے کا اضافہ کر دیا ہے جن سے اس عقیدے کو اُلٹی مدد ملتی ہے، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ موت کے صریح لفظ کو چھوڑ کر وفات کے محتمل المعنیین لفظ کو ایسے موقع پر استعمال کرتا جہاں رفعِ جسمانی کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ایک فاسد اعتقاد، یعنی اُلوہیّتِ مسیحؑ کے اعتقاد کا موجب بن رہا تھا۔ پھر رفعِ جسمانی کے اس عقیدے کو مزید تقویت اُن کثیر التعداد احادیث سے پہنچتی ہے جو قیامت سے پہلے حضرت عیسٰی ابنِ مریم علیہ السّلام کے دوبارہ دُنیا میں آنے اور دجّال سے جنگ کرنے کی تصریح کرتی ہیں (تفسیر سُورۂ اَحزاب کے ضمیمے میں ہم نے ان احادیث کو نقل کر دیا ہے)۔ اُن سے حضرت عیسٰیؑ کی آمدِ ثانی تو قطعی طور پر ثابت ہے۔ اب یہ ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ ان کا مرنے کے بعد دوبارہ اس دُنیا میں آنا زیادہ قرینِ قیاس ہے، یا زندہ کہیں خدا کی کائنات میں موجود ہونا اور پھر واپس آنا؟

۱۹۶– اِس فقرے کے دو معنیٰ بیان کیے گئے ہیں اور الفاظ میں دونوں کا یکساں احتمال ہے۔ ایک معنیٰ وہ جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ "اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیحؑ پر ایمان نہ لے آئے"۔ اہلِ کتاب سے مراد یہودی ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ عیسائی بھی ہوں۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مسیحؑ کی طبعی موت جب واقع ہوگی، اس وقت جتنے اہلِ کتاب موجود ہوں گے وہ سب ان پر (یعنی ان کی رسالت پر) ایمان لا چکے ہوں گے۔ دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ تمام اہلِ کتاب پر مرنے سے عین قبل رسالتِ مسیحؑ کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور وہ مسیحؑ پر ایمان لے آتے ہیں، مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایمان لانا مفید نہیں ہو سکتا۔ دونوں معنیٰ

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ
لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿١٦٠﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا
وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ

غرض اِن یہودی بن جانے والوں کے[198] اِسی ظالمانہ رویّے کی بنا پر، اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں[199]، اور سُود لیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا[200]، اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں، ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں[201]،

متعدّد صحابہ، تابعین اور اکابر مفسّرین سے منقول ہیں اور صحیح مراد صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔

۱۹۷ – یعنی یہودیوں اور عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کے ساتھ اور اُس پیغام کے ساتھ، جو آپ لائے تھے، جو معاملہ کیا ہے اس پر آپ خداوند تعالیٰ کی عدالت میں گواہی دیں گے۔ اس گواہی کی کچھ تفصیل آگے سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں آنے والی ہے۔

۱۹۸ – جملۂ معترضہ ختم ہونے کے بعد یہاں سے پھر وہی سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے جو اُوپر سے چلا آ رہا تھا۔

۱۹۹ – یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں، بلکہ اس قدر بے باک مجرم بن چکے ہیں کہ دُنیا میں خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو تحریک بھی اُٹھتی ہے، اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ ہی کام کرتا نظر آتا ہے، اور راہِ حق کی طرف بُلانے کے لیے جو تحریک بھی شروع ہوتی ہے، اکثر اس کے مقابلے میں یہودی ہی سب سے بڑھ کر مزاحم بنتے ہیں، در آں حالے کہ یہ کم بخت کتاب اللہ کے حامل اور انبیاءؑ کے وارث ہیں۔ ان کا تازہ ترین جرم یہ اشتراکی تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہنمائی ہی نے پروان چڑھایا ہے۔ اِن نام نہاد اہلِ کتاب کے نصیب میں یہ جرم بھی مقدر تھا کہ دُنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت خدا کے صریح انکار پر، خدا سے کھُلّم کھُلّا دشمنی پر، خدا پرستی کو مٹا دینے کے علی الاعلان عزم و ارادہ پر تعمیر کیا گیا، اس کے مُوجد و مُختَرِع اور بانی و سربراہِ کار موسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا ہوں۔ اشتراکیت کے بعد زمانۂ جدید میں گمراہی کا دوسرا بڑا ستون فرائڈ کا فلسفہ ہے، اور لُطف یہ ہے کہ وہ بھی بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد ہے۔

۲۰۰ – تورات میں بالفاظِ صریح یہ حکم موجود ہے کہ:

> ”اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو، جو تیرے پاس رہتا ہو، قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اُس سے سود لینا۔ اگر تُو کسی وقت اپنے ہمسایے کے کپڑے گرو رکھ بھی لے تو سُورج کے ڈوبنے تک اس کو واپس کر دینا، کیونکہ فقط وہی ایک اُس کا اوڑھنا ہے، اس کے جسم کا وہی لباس ہے،

وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ مِنۡهُمۡ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ وَ الۡمُقِيۡمِيۡنَ الصَّلٰوةَ وَ الۡمُؤۡتُوۡنَ

اور جولوگ اِن میں سے کافر ہیں، ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے[۲۰۲]۔ مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایمان دار ہیں وہ سب اُس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی[۲۰۳]۔ اِس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی

پھر وہ کیا اوڑھ کر سوئے گا؟ پس جب وہ فریاد کرے گا تو میں اُس کی سنوں گا، کیونکہ میں مہربان ہوں۔" (خُروج، باب ۲۲: ۲۵-۲۷)

اس کے علاوہ اور بھی کئی مقامات پر تورات میں سُود کی حُرمت وارد ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسی تورات کے ماننے والے یہودی آج دنیا کے سب سے بڑے سُود خوار ہیں اور اپنی تنگ دلی و سنگ دلی کے لیے ضربُ المَثَل بن چکے ہیں۔

۲۰۱ – غالبًا یہ اُسی مضمون کی طرف اشارہ ہے جو آگے سورۂ اَنعام آیت ۱۴۶ میں آنے والا ہے۔ یعنی یہ کہ بنی اسرائیل پر تمام وہ جانور حرام کر دیے گئے جن کے ناخن ہوتے ہیں، اور ان پر گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی گئی۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ اشارہ اُن دُوسری پابندیوں اور سختیوں کی طرف بھی ہو جو یہودی فقہ میں پائی جاتی ہیں۔ کسی گروہ کے لیے دائرۂ زندگی کو تنگ کر دیا جانا فی الواقع اس کے حق میں ایک طرح کی سزا ہی ہے۔ (مفصّل بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَنعام، حاشیہ ۱۲۲)

۲۰۲ – یعنی اس قوم کے جو لوگ ایمان و اطاعت سے منحرف اور بغاوت و انکار کی روش پر قائم ہیں، ان کے لیے خدا کی طرف سے دردناک سزا تیار ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں جو عبرت ناک سزا ان کو ملی اور مل رہی ہے وہ کبھی کسی دُوسری قوم کو نہیں ملی۔ دو ہزار برس ہو چکے ہیں کہ زمین پر کہیں ان کو عزّت کا ٹھکانا میسّر نہیں۔ دنیا میں تتّر بتّر کر دیے گئے ہیں اور ہر جگہ غریب الوطن ہیں۔ کوئی دَور ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ دنیا کے کسی نہ کسی خطّے میں ذلّت کے ساتھ پامال نہ کیے جاتے ہوں، اور اپنی دولت مندی کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ پھر غضب یہ ہے کہ قومیں پیدا ہوتی اور مٹتی ہیں، مگر اس قوم کو موت بھی نہیں آتی۔ اس کو دُنیا میں لَا یَمُوۡتُ فِیۡھَا وَلَا یَحۡیٰی کی سزا دی گئی ہے، تاکہ قیامت تک دُنیا کی قوموں کے لیے ایک زندہ نمونۂ عبرت بنی رہے اور اپنی سرگزشت سے یہ سبق دیتی رہے کہ خدا کی کتاب بغل میں رکھ کر خدا کے مقابلے میں باغیانہ جسارتیں کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے۔ رہی آخرت، تو اِن شاءاللہ وہاں کا عذاب اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگا۔ (اس موقع پر جو شبہ فلسطین کی اسرائیلی ریاست کے قیام کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اسے رفع کرنے

الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ
سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۠﴿۱۶۲﴾ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ
اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ
وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ
وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ﴿۱۶۳﴾

پابندی کرنے والے اور اللہ اور روزِ آخر پر سچّا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ ؏

اے محمدؐ! ہم نے تمھاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔[۲۰۴] ہم نے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ، عیسٰیؑ، ایّوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سُلیمانؑ کی طرف وحی بھیجی۔ ہم نے داؤدؑ کو زبور دی۔[۲۰۵]

کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۱۲)۔

۲۰۳ – یعنی ان میں سے جو لوگ کُتُبِ آسمانی کی حقیقی تعلیم سے واقف ہیں اور ہر قسم کے تعصّب، جاہلانہ ضد، آبائی تقلید اور نفس کی بندگی سے آزاد ہو کر اُس امرِ حق کو سچے دل سے مانتے ہیں جس کا ثبوت آسمانی کتابوں سے ملتا ہے، ان کی روش کافر و ظالم یہودیوں کی عام روش سے بالکل مختلف ہے۔ ان کو بیک نظر محسوس ہو جاتا ہے کہ جس دین کی تعلیم پچھلے انبیاؑ نے دی تھی، اسی کی تعلیم قرآن دے رہا ہے، اس لیے وہ بے لاگ حق پرستی کے ساتھ دونوں پر ایمان لے آتے ہیں۔

۲۰۴ – اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی چیز لے کر نہیں آئے ہیں جو پہلے نہ آئی ہو۔ ان کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ دراصل اُن کو بھی اسی ایک منبعِ علم سے ہدایت ملی ہے جس سے تمام پچھلے انبیاؑ کو ہدایت ملتی رہی ہے، اور وہ بھی اسی ایک صداقت و حقیقت کو پیش کر رہے ہیں جسے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے پیغمبر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

وحی کے معنٰی ہیں: اشارہ کرنا، دل میں کوئی بات ڈالنا، خفیہ طریقے سے کوئی بات کہنا، پیغام بھیجنا۔

۲۰۵ – موجودہ بائبل میں زَبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے، وہ ساری کی ساری زبورِ داؤدؑ نہیں ہے۔ اس میں بکثرت مزامیر دوسرے لوگوں کے بھی بھر دیے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے مصنّفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر پر

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ
نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا
مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ

ہم نے اُن رسُولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اِس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور اُن رسُولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ ہم نے موسٰیؑ سے اِس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔[۲۰۶] یہ سارے رسُول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے،[۲۰۷] تاکہ اُن کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی

تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کے ہیں، ان کے اندر فی الواقع کلامِ حق کی روشنی محسوس ہوتی ہے۔ اِسی طرح بائبل میں امثالِ سلیمانؑ کے نام سے جو کتاب موجود ہے، اس میں بھی اچھی خاصی آمیزش پائی جاتی ہے اور اس کے آخری دو باب تو صریحاً الحاقی ہیں، مگر اس کے باوجود ان امثال کا بڑا حصّہ صحیح و برحق معلوم ہوتا ہے۔ ان دو کتابوں کے ساتھ ایک اور کتاب حضرت ایوبؑ کے نام سے بھی بائبل میں درج ہے، لیکن حکمت کے بہت سے جواہر اپنے اندر رکھنے کے باوجود، اسے پڑھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا کہ واقعی حضرت ایّوبؑ کی طرف اس کتاب کی نسبت صحیح ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں اور خود اس کتاب کی ابتدا میں حضرت ایوبؑ کے جس صبرِ عظیم کی تعریف کی گئی ہے، اس کے بالکل برعکس وہ ساری کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرت ایوبؑ اپنی مصیبت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے خلاف سراپا شکایت بنے ہوئے تھے، حتّٰی کہ ان کے ہم نشین انھیں اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ خدا ظالم نہیں ہے، مگر وہ کسی طرح مان کر نہ دیتے تھے۔

ان صحیفوں کے علاوہ بائبل میں انبیائے بنی اسرائیل کے ۱۷ صحائف اور بھی درج ہیں جن کا بیشتر حصّہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ خُصوصاً یَسعیاہ، یَرمیاہ، حِزقی ایل، عاموس اور بعض دوسرے صحیفوں میں تو بکثرت مقامات ایسے آتے ہیں جنھیں پڑھ کر آدمی کی رُوح وجد کرنے لگتی ہے۔ ان میں الہامی کلام کی شان صریح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی اَخلاقی تعلیم، ان کا شرک کے خلاف جہاد، ان کا توحید کے حق میں پُرزور اِستِدلال، اور ان کی بنی اسرائیل کے اَخلاقی زوال پر سخت تنقیدیں پڑھتے وقت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اناجیل میں حضرت مسیحؑ کی تقریریں اور قرآنِ مجید اور یہ صحیفے ایک ہی سرچشمے سے نکلی ہوئی سوتیں ہیں۔

۲۰۶ – دُوسرے انبیا علیہم السلام پر تو وحی اس طرح آتی تھی کہ ایک آواز آ رہی ہے یا فرشتہ پیغام سنا رہا ہے اور وہ سُن رہے ہیں۔ لیکن موسٰی علیہ السلام کے ساتھ یہ خاص معاملہ برتا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے گفتگو کی۔ بندے اور خدا کے درمیان اس طرح باتیں ہوتی تھیں جیسے دو شخص آپس میں بات کرتے ہیں۔ مثال کے لیے اُس گفتگو کا حوالہ کافی ہے جو سورۂ طٰہٰ میں نقل کی گئی

الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ
اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى
بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ
يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ
جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

حجّت نہ رہے[۲۰۸] اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ (لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں) مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اُس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے، اور اِس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں، اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔ جو لوگ اِس کو ماننے سے خود انکار کرتے ہیں اور دُوسروں کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں، وہ یقیناً گمراہی میں حق سے بہت دُور نکل گئے ہیں۔ اِس طرح جن لوگوں نے کفر و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اُتر آئے، اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انھیں کوئی راستہ بجز جہنّم کے راستے کے نہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

ہے۔ بائبل میں بھی حضرت موسیٰؑ کی اِس خُصوصیّت کا ذکر اسی طرح کیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ”اور جیسے کوئی شخص اپنے دوست سے بات کرتا ہے، ویسے ہی خداوند رُوبرو ہو کر موسیٰؑ سے باتیں کرتا تھا۔“ (خُروج ۳۳:۱۱)

۲۰۷ – یعنی ان سب کا ایک ہی کام تھا اور وہ یہ کہ جو لوگ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیم پر ایمان لائیں اور اپنے رویّے کو اس کے مطابق دُرست کرلیں، انھیں فلاح و سعادت کی خوش خبری سُنا دیں، اور جو فکر و عمل کی غلط راہوں پر چلتے رہیں، ان کو اِس غلط روی کے بُرے انجام سے آگاہ کر دیں۔

۲۰۸ – یعنی ان تمام پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک ہی غرض تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی پر اِتمامِ حجت کرنا چاہتا تھا، تاکہ آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم اُس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا
خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ
دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى
ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ

لوگو! یہ رسول تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے حق لے کر آ گیا ہے، ایمان لے آوٴ، تمھارے ہی لیے بہتر ہے، اور اگر انکار کرتے ہو تو جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے[209] اور اللہ علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔[210]

اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو[211] اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسٰی ابنِ مریمؑ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان[212] تھا جو اللہ نے مریمؑ کی طرف بھیجا

آپ نے ہمیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اسی غرض کے لیے خدا نے دُنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر التعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے، جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانے میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ یا تو خود اس شخص پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا، یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہِ راست معلوم تھی اور انھوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا تو انھیں آگاہ نہ کیا۔

۲۰۹ – یعنی زمین و آسمان کے مالک کی نافرمانی کر کے تم اس کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے، نقصان جو کچھ ہوگا تمھارا اپنا ہوگا۔

۲۱۰ – یعنی تمھارا خدا نہ تو بے خبر ہے کہ اس کی سلطنت میں رہتے ہوئے تم شرارتیں کرو اور اسے معلوم نہ ہو، اور نہ وہ نادان ہے کہ اسے اپنے فرامین کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نمٹنے کا طریقہ نہ آتا ہو۔

۲۱۱ – یہاں اہلِ کتاب سے مراد عیسائی ہیں اور غُلُو کے معنی ہیں کسی چیز کی تائید وحمایت میں حد سے گزر جانا۔ یہودیوں کا جرم یہ تھا کہ وہ مسیحؑ کے انکار اور مخالفت میں حد سے گزر گئے، اور عیسائیوں کا جرم یہ ہے کہ وہ مسیحؑ کی عقیدت اور محبت میں

وَرُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا

اور ایک رُوح تھی اللہ کی طرف سے[213] (جس نے مریمؑ کے رِحم میں بچّے کی شکل اختیار کی) پس تم اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان[214] لاؤ اور نہ کہو کہ "تین" ہیں۔[215] باز آجاؤ،

حد سے گزر گئے۔

۲۱۲ – اصل میں لفظ "کلمہ" استعمال ہوا ہے۔ مریمؑ کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت مریم علیہا السّلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے نُطفے سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کرلے۔ عیسائیوں کو ابتداءً مسیح علیہ السلام کی پیدائشِ بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا۔ مگر انھوں نے یُونانی فلسفے سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو "کلام" یا "نُطق" (logos) کا ہم معنیٰ سمجھ لیا۔ پھر اس کلام ونُطق سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفتِ کلام مراد لے لی۔ پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السّلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیحؑ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السّلام کی اُلوہیّت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصوّر نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی اَزَلی صفات میں سے نطق وکلام کی صفت کو مسیحؑ کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

۲۱۳ – یہاں خود مسیحؑ کو رُوْحٌ مِّنْهُ (خدا کی طرف سے ایک رُوح) کہا گیا ہے، اور سُورۂ بَقَرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (ہم نے پاک روح سے مسیحؑ کی مدد کی)۔ دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ رُوح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا تھی۔ سراسر حقانیت اور راست بازی تھی، اور ازسرتاپا فضیلتِ اخلاق تھی۔ یہی تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی۔ مگر انھوں نے اس میں بھی غُلُوّ کیا، رُوْحٌ مِّنَ اللّٰهِ کو عین روح اللہ قرار دے لیا، اور روح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی رُوحِ مقدس تھی جو مسیحؑ کے اندر حلول کر گئی تھی۔ اس طرح اللہ اور مسیحؑ کے ساتھ ایک تیسرا خدا رُوح القدس کو بنا ڈالا گیا۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غُلُوّ تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ آج بھی انجیلِ مَتّی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ "فرشتے نے اسے (یعنی یوسف نجّار کو) خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف ابنِ داؤد! اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر، کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ رُوح القدس کی قدرت سے ہے۔" (باب ۱، آیت ۲۰)

۲۱۴ – یعنی اللہ کو واحد الٰہ مانو اور تمام رسولوں کی رسالت تسلیم کرو، جن میں سے ایک رسول مسیحؑ بھی ہیں۔ یہی مسیح علیہ السلام کی اصلی تعلیم تھی اور یہی امرِ حق ہے جسے ایک سچے پَیرَوِ مسیحؑ کو ماننا چاہیے۔

۲۱۵ – یعنی تین الٰہوں کے عقیدے کو چھوڑ دو، خواہ وہ کسی شکل میں تمھارے اندر پایا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ہیں، ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ ان کے لیے یہ تسلیم

وقف لازم

خَيْرًا لَّكُمْ ۗ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۗ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ
لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ ع

ع ۲۳ ۳

یہ تمھارے ہی لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔[۲۱۶] زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں اس کی مِلک ہیں،[۲۱۷] اور ان کی کفالت وخبر گیری کے لیے بس وہی کافی ہے۔[۲۱۸] ع

کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ توحید اصلِ دین ہے۔ مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتدا میں ان کو پیش آ گئی تھی کہ کلام اللہ نے مسیحؑ کی شکل میں ظُہور کیا اور رُوح اللہ نے اس میں حُلول کیا، اس کی وجہ سے انھوں نے مسیحؑ اور روح القدس کی اُلوہیّت کو بھی خداوند عالم کی اُلوہیّت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ اپنے اوپر لازم کر لیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لیے یہ مسئلہ ایک ناقابلِ حل چیستان بن گیا کہ عقیدۂ توحید کے باوجود عقیدۂ تثلیث کو، اور عقیدۂ تثلیث کے باوجود عقیدۂ توحید کو کس طرح نباہیں۔ تقریباً ۱۸ سو برس سے مسیحی علما اِسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سر کھپا رہے ہیں۔ بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں۔ اِسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے۔ اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے۔ اسی پر ان کے سارے علمِ کلام کا زورصَرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی، نہ اس کے بھیجے ہوئے مسیح نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف ان کے غُلُوّ نے پیدا کیا ہے اور اس کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ غُلُوّ سے باز آ جائیں، مسیحؑ اور روح القدس کی اُلوہیّت کا تخیّل چھوڑ دیں، صرف اللہ کو اِلٰہِ واحد تسلیم کر لیں، اور مسیحؑ کو صرف اس کا پیغمبر قرار دیں، نہ کہ کسی طور پر شریک فی الالوہیّت۔

۲۱۶ – یہ عیسائیوں کے چوتھے غُلُوّ کی تردید ہے۔ بائبل کے عہدِ جدید کی رِوایات اگر صحیح بھی ہوں تو ان سے (خصوصاً پہلی تین انجیلوں سے) زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلّق کو باپ اور اولاد کے تعلّق سے تشبیہ دی تھی اور ''باپ'' کا لفظ خدا کے لیے وہ محض مجاز اور استعارے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ تنہا مسیحؑ ہی کی کوئی خصوصیّت نہیں ہے۔ قدیم ترین زمانے سے بنی اسرائیل خدا کے لیے باپ کا لفظ بولتے چلے آ رہے تھے اور اس کی بکثرت مثالیں بائبل کے پُرانے عہدنامہ میں موجود ہیں۔ مسیحؑ نے یہ لفظ اپنی قوم کے محاورے کے مطابق ہی استعمال کیا تھا اور وہ خدا کو صرف اپنا باپ ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کا باپ کہتے تھے۔ لیکن عیسائیوں نے یہاں پھر غلو سے کام لیا اور مسیحؑ کو خدا کا اِکلوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب وغریب نظریّہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیحؑ خدا کا مظہر ہے، اور اس کے کلمے اور اس کی رُوح کا جَسَدی ظُہور ہے، اس لیے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے، اور خدا نے اپنے اِکلوتے کو زمین پر اس لیے بھیجا کہ انسانوں کے گناہ اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسان کے گناہ کا کفّارہ ادا کرے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت خود مسیح علیہ السلام کے

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ
الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ
فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ
وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا ۙ۵ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا
نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

مسیحؑ نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو، اور نہ مقرب ترین فرشتے اِس کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور تکبّر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اُس وقت وہ لوگ جنھوں نے ایمان لا کر نیک طرزِ عمل اختیار کیا ہے، اپنے اجر پُورے پُورے پائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا، اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے اُن کو اللہ دردناک سزا دے گا، اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسا رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔

لوگو! تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس دلیلِ روشن آ گئی ہے

کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیُّلات کا آفریدہ ہے اور اُس غُلُوّ کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی عظیم الشان شخصیت سے متأثّر ہو کر مبتلا ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارہ کے عقیدے کی تردید نہیں کی ہے، کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ اور اس سوال کی ایک صوفیانہ و فلسفیانہ توجیہ ہے کہ جب مسیحؑ خدا کا اکلوتا تھا تو وہ صلیب پر چڑھ کر لعنت کی موت کیوں مرا۔ لہٰذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے اگر مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے کی تردید

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ نُوۡرًا مُّبِيۡنًا ﴿١٧٤﴾ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ
وَ اعۡتَصَمُوۡا بِهٖ فَسَيُدۡخِلُهُمۡ فِىۡ رَحۡمَةٍ مِّنۡهُ وَفَضۡلٍ ۙ
وَّيَهۡدِيۡهِمۡ اِلَيۡهِ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ﴿١٧٥﴾ يَسۡتَفۡتُوۡنَكَ ؕ قُلِ
اللّٰهُ يُفۡتِيۡكُمۡ فِى الۡكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امۡرُؤٌا هَلَكَ لَيۡسَ لَهٗ وَلَدٌ
وَّلَهٗۤ اُخۡتٌ فَلَهَا نِصۡفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ

اور ہم نے تمھاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمھیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اس کی پناہ ڈھونڈیں گے، ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ ان کو دکھا دے گا۔

لوگ تم سے[219] کلالہ[220] کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمھیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن[221] ہو تو وہ اس کے ترکے میں سے نصف پائے گی، اور اگر بہن بے اولاد مرے تو

کر دی جائے اور اس غلط فہمی کو دُور کر دیا جائے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔

۲۱۷ – یعنی زمین و آسمان کی موجودات میں سے کسی کے ساتھ بھی خدا کا تعلّق باپ اور بیٹے کا نہیں ہے بلکہ محض مالک اور مملوک کا تعلّق ہے۔

۲۱۸ – یعنی خدا اپنی خدائی کا انتظام کرنے کے لیے خود کافی ہے، اس کو کسی سے مدد لینے کی حاجت نہیں کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔

۲۱۹ – یہ آیت اِس سورہ کے نُزول سے بہت بعد نازل ہوئی ہے۔ بعض رِوایات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ یہ بیان اگر صحیح نہ بھی ہو تب بھی کم از کم اتنا تو ثابت ہے کہ یہ آیت ۹ ہجری میں نازل ہوئی، اور سُورۂ نساء اس سے بہت پہلے ایک مکمل سُورہ کی حیثیت سے پڑھی جارہی تھی۔ اسی وجہ سے اس آیت کو اُن آیات کے سلسلے میں شامل نہیں کیا گیا جو احکامِ میراث کے متعلق سورہ کے آغاز میں ارشاد ہوئی ہیں، بلکہ اسے ضمیمے کے طور پر آخر میں لگا دیا گیا۔

۲۲۰ – کلالہ کے معنیٰ میں اختلاف ہے۔ بعض کی رائے میں کلالہ وہ شخص ہے جو لاولد بھی ہو اور جس کے باپ اور دادا بھی زندہ نہ ہوں۔ اور بعض کے نزدیک محض لاوَلَد مرنے والے کو کلالہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ آخر وقت تک اس معاملے میں متردّد رہے۔ لیکن عامّۂ فقہا نے حضرت ابوبکرؓ کی اس رائے کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس کا اطلاق پہلی صورت پر ہی

لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنۡ كَانَتَا اثۡنَتَيۡنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَ
اِنۡ كَانُوۡۤا اِخۡوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ ؕ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۴

بھائی اس کا وارث ہوگا۔[۲۲۲] اگر میّت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حق دار ہوں گی،[۲۲۳] اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دُہرا حصّہ ہوگا۔ اللہ تمھارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے، تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

ہوتا ہے۔ اور خود قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ یہاں کَلالہ کی بہن کو نصف ترکے کا وارث قرار دیا گیا ہے، حالانکہ اگر کَلالہ کا باپ زندہ ہو تو بہن کو سرے سے کوئی حصّہ پہنچتا ہی نہیں۔

۲۲۱ – یہاں اُن بھائی بہنوں کی میراث کا ذکر ہورہا ہے جو میّت کے ساتھ ماں اور باپ دونوں میں، یا صرف باپ میں مشترک ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک خطبے میں اس معنیٰ کی تصریح کی تھی اور صحابہؓ میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا، اس بنا پر یہ مُجمع علیہ مسئلہ ہے۔

۲۲۲ – یعنی بھائی اس کے پورے مال کا وارث ہوگا اگر کوئی اور صاحبِ فریضہ نہ ہو۔ اور اگر کوئی صاحبِ فریضہ موجود ہو، مثلاً شوہر، تو اس کا حصّہ ادا کرنے کے بعد باقی تمام ترکہ بھائی کو ملے گا۔

۲۲۳ – یہی حکم دو سے زائد بہنوں کا بھی ہے۔

تفہیم القرآن

المائدہ

(۵)

المائدہ

نام اِس سورہ کا نام پندرھویں رُکوع کی آیت هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ کے لفظ "مائدہ" سے ماخوذ ہے۔ قرآن کی بیشتر سورتوں کے ناموں کی طرح اس نام کو بھی سورت کے موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ محض دوسری سورتوں سے ممیّز کرنے کے لیے اسے علامت کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول سورت کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ صلحِ حُدَیبیہ کے بعد ٦ ہجری کے اواخر یا ٧ ہجری کے اوائل میں نازل ہوئی ہے۔ ذی القعدہ ٦ ہجری کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکّہ تشریف لے گئے۔ مگر کفارِ قریش نے عداوت کے جوش میں عرب کی قدیم ترین مذہبی رِوایات کے خلاف آپؐ کو عمرہ نہ کرنے دیا اور بڑی رَدّوکَد کے بعد یہ بات قبول کی کہ آیندہ سال آپ زیارت کے لیے آ سکتے ہیں۔ اس موقع پر ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کو ایک طرف تو زیارتِ کعبہ کے لیے سفر کے آداب بتائے جائیں، تاکہ آیندہ سال عُمرے کا سفر پوری اسلامی شان کے ساتھ ہو سکے، اور دوسری طرف انھیں تاکید کی جائے کہ دشمن کافروں نے ان کو عُمرے سے روک کر جو زیادتی کی ہے اس کے جواب میں وہ خود کوئی ناروا زیادتی نہ کریں، اس لیے کہ بہت سے کافر قبیلوں کے حج کا راستہ اسلامی مقبُوضات سے گزرتا تھا اور مسلمانوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ جس طرح انھیں زیارتِ کعبہ سے روکا گیا ہے اسی طرح وہ بھی ان کو روک دیں۔ یہی تقریب ہے اُس تمہیدی تقریر کی جس سے اس سورہ کا آغاز ہوا ہے۔ آگے چل کر تیرھویں رکوع میں پھر اسی مسئلے کو چھیڑا گیا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے رکوع سے چودھویں رُکوع تک ایک ہی سلسلۂ تقریر چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے مضامین اس سورہ میں ہم کو ملتے ہیں، وہ بھی سب کے سب اسی دَور کے معلوم ہوتے ہیں۔

بیان کے تسلسل سے غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ پوری سورت ایک ہی خطبے پر مشتمل ہے جو بیک وقت نازل ہُوا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ متفرق طور پر اس کی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے ان کو اِس سُورہ میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو، لیکن سلسلۂ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جا سکے کہ یہ سورہ دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

شانِ نزول سورۂ آلِ عمران اور سورۂ نساء کے زمانۂ نزول سے اِس سورہ کے نزول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بہت بڑا تغیّر واقع ہو چکا تھا۔ یا تو وہ وقت تھا کہ جنگِ اُحُد کے صدمے نے مسلمانوں کے لیے مدینہ کے قریبی ماحول کو بھی پُرخطر بنا دیا تھا، یا اب یہ وقت آ گیا کہ عرب میں اسلام ایک ناقابلِ شکست طاقت نظر آنے لگا اور اسلامی ریاست ایک طرف نجد تک، دوسری طرف حُدودِ شام تک، تیسری طرف ساحلِ بحرِ احمر تک، اور چوتھی طرف مکہ کے قریب تک پھیل گئی۔ اُحُد میں جو زخم مسلمانوں نے کھایا تھا وہ ان کی ہمتیں توڑنے کے بجائے ان کے عزم کے لیے ایک اور تازیانہ ثابت ہوا۔ وہ زخمی شیر کی طرح بپھر کر اُٹھے اور تین سال کی مدّت میں انھوں نے نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ ان کی مسلسل جِدّوجُہد اور سرفروشیوں کا ثمرہ یہ تھا کہ مدینہ کے چاروں طرف ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سو میل تک تمام مخالف قبائل کا زور ٹوٹ گیا۔ مدینہ پر جو یہودی خطرہ ہر وقت مُنڈلاتا رہتا تھا، اس کا ہمیشہ کے لیے اِستیصال ہو گیا اور حجاز میں دوسرے مقامات پر بھی جہاں جہاں یہودی آباد تھے، سب مدینہ کی حکومت کے باج گزار بن گئے۔ اسلام کو دبانے کے لیے قریش نے آخری کوشش غزوۂ خندق کے موقع پر کی اور اس میں وہ سخت ناکام ہوئے۔ اس کے بعد اہلِ عرب کو اس امر میں کچھ شک نہ رہا کہ اسلام کی یہ تحریک اب کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ اب اسلام محض ایک عقیدہ و مسلک ہی نہ تھا جس کی حکمرانی صرف دلوں اور دماغوں تک محدود ہو، بلکہ وہ ایک ریاست بھی تھا جس کی حکمرانی عملاً اپنے حُدُود میں رہنے والے تمام لوگوں کی زندگی پر محیط تھی۔ اب مسلمان اس طاقت کے مالک ہو چکے تھے کہ جس مسلک پر وہ ایمان لائے تھے، بے روک ٹوک اس کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اس کے سوا کسی دوسرے عقیدہ و مسلک یا قانون کو اپنے دائرۂ حیات میں دخل انداز نہ ہونے دیں۔

پھر ان چند برسوں میں اسلامی اُصُول اور نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اَخلاق، معاشرت، تمدُّن، ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلموں سے بالکل ممیّز تھے۔ تمام اسلامی مقبوضات میں مساجد اور نمازِ باجماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر بستی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانینِ دیوانی و فوج داری بڑی حد تک تفصیل کے ساتھ بن چکے تھے اور اپنی عدالتوں کے ذریعے سے نافذ کیے جا رہے تھے۔ لین دین اور خرید و فروخت کے پُرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے۔ وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا۔ نکاح اور طلاق کے قوانین، پردۂ شرعی اور استیذان کے احکام، اور زنا و قذف کی سزائیں جاری ہونے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ مسلمانوں کی نِشَست و برخاست، بول چال، کھانے پینے، وضع قطع اور رہنے سہنے کے طریقے تک اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر چکے تھے۔ اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دُنیا اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی کہ یہ لوگ، جن کا اپنا ایک الگ تمدُّن بن چکا ہے، پھر کبھی ان میں آ ملیں گے۔

صُلحِ حُدَیبیہ سے پہلے تک مسلمانوں کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ وہ کفارِ قریش کے ساتھ

ایک مسلسل کشمکش میں اُلجھے ہوئے تھے اور انھیں اپنی دعوت کا دائرہ وسیع کرنے کی مُہلت نہ ملتی تھی۔ اس رکاوٹ کو حُدَیبِیَہ کی ظاہری شکست اور حقیقی فتح نے دُور کر دیا۔ اس سے ان کو نہ صرف یہ کہ اپنی ریاست کے حُدُود میں امن میسر آ گیا، بلکہ اتنی مُہلت بھی مل گئی کہ گرد و پیش کے علاقوں میں اسلام کی دعوت کو لے کر پھیل جائیں۔ چنانچہ اس کا افتتاح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران، رُوم، مصر اور عرب کے بادشاہوں اور رئیسوں کو خطوط لکھ کر کیا اور اس کے ساتھ ہی قبیلوں اور قوموں میں مسلمانوں کے داعی خدا کے بندوں کو اس کے دین کی طرف بلانے کے لیے پھیل گئے۔

مَباحِث یہ حالات تھے جب سورۂ مائدہ نازل ہوئی۔ یہ سورہ حسبِ ذیل تین بڑے بڑے مضامین پر مشتمل ہے:

(۱) مسلمانوں کی مذہبی، تمدّنی اور سیاسی زندگی کے متعلق مزید احکام و ہدایات۔ اِس سلسلے میں سفرِ حج کے آداب مقرر کیے گئے، شعائر اللہ کے احترام اور زائرینِ کعبہ سے عَدَمِ تعرُّض کا حکم دیا گیا، کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال کے قطعی حُدُود قائم کیے گئے اور دَورِ جاہلیّت کی خود ساختہ بندشوں کو توڑ دیا گیا، اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی، وضو اور غسل اور تیمّم کے قاعدے مقرر کیے گئے، بغاوت اور فساد اور سرقہ کی سزائیں معیّن کی گئیں، شراب اور جُوئے کو قطعی حرام کر دیا گیا، قَسَم توڑنے کا کفّارہ مقرر کیا گیا، اور قانونِ شہادت میں مزید چند دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

(۲) مسلمانوں کو نصیحت۔ اب چونکہ مسلمان ایک حکمراں گروہ بن چکے تھے، ان کے ہاتھ میں طاقت تھی، جس کا نشہ قوموں کے لیے اکثر گمراہی کا سبب بنتا رہا ہے، مظلومی کا دَور خاتمے پر تھا اور اس سے زیادہ سخت آزمائش کے دَور میں وہ قدم رکھ رہے تھے، اس لیے ان کو خطاب کرتے ہوئے بار بار نصیحت کی گئی کہ عدل پر قائم رہیں، اپنے پیش رَو اہلِ کتاب کی روش سے بچیں، اللہ کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کے احکام کی پیروی کا جو عہد انھوں نے کیا ہے، اس پر ثابت قدم رہیں اور یہود و نصاریٰ کی طرح اس کو توڑ کر اُس انجام سے دوچار نہ ہوں جس سے وہ دوچار ہوئے۔ اپنے جملہ معاملات کے فیصلوں میں کتابِ الٰہی کے پابند رہیں، اور منافقت کی روش سے اجتناب کریں۔

(۳) یہودیوں اور عیسائیوں کو نصیحت۔ یہودیوں کا زور اب ٹوٹ چکا تھا اور شمالی عرب کی تقریباً تمام یہودی بستیاں مسلمانوں کے زیرِنگیں آ گئی تھیں۔ اس موقع پر ان کو ایک بار پھر ان کے غلط رویّے پر مُتنَبِّہ کیا گیا ہے اور انھیں راہِ راست پر آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ نیز چونکہ صُلحِ حُدَیبِیَہ کی وجہ سے عرب اور متصل مُمالک کی قوموں میں اسلام کی دعوت پھیلانے کا موقع نکل آیا تھا، اس لیے عیسائیوں کو بھی تفصیل کے ساتھ خطاب کر کے ان کے عقائد کی غَلَطیاں بتائی گئی ہیں اور انھیں نبیِ عربی پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ ہمسایہ مُمالک میں سے جو قومیں بُت پرست اور مجوسی تھیں، ان کو براہِ راست خطاب نہیں کیا گیا، کیونکہ اُن کی ہدایت کے لیے وہ خطبات کافی تھے جو اُن کے ہم مسلک مشرکینِ عرب کو خطاب کرتے ہوئے مکہ میں نازل ہو چکے تھے۔

آیاتھا ١٢٠ سُوۡرَةُ الۡمَآئِدَةِ مَدَنِيَّةٌ رکوعاتھا ١٦

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

المنزل ٢

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ اُحِلَّتۡ لَـكُمۡ بَهِيۡمَةُ
الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ غَيۡرَ مُحِلِّى الصَّيۡدِ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بندشوں کی پوری پابندی کرو۔[1] تمھارے لیے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کیے گئے[2] سوائے اُن کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے۔ لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لیے حلال نہ کرلو،[3]

١ – یعنی اُن حُدود اور قُیود کی پابندی کرو جو اس سُورہ میں تم پر عائد کی جارہی ہیں، اور جو بالعموم خدا کی شریعت میں تم پر عائد کی گئی ہیں۔ اس مختصر سے تمہیدی جملے کے بعد ہی اُن بندشوں کا بیان شروع ہو جاتا ہے جن کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔

٢ – ''اَنعام'' (مویشی) کا لفظ عربی زبان میں اُونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری پر بولا جاتا ہے۔ اور ''بہیمہ'' کا اِطلاق ہر چرنے والے چوپائے پر ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہوتا کہ اَنعام تمھارے لیے حلال کیے گئے، تو اس سے صرف وہی چار جانور حلال ہوتے جنھیں عَرَبی میں ''انعام'' کہتے ہیں۔ لیکن حکم اِن الفاظ میں دیا گیا ہے کہ ''مویشی کی قسم کے چرندہ چوپائے تم پر حلال کیے گئے۔'' اس سے حکم وسیع ہو جاتا ہے اور وہ سب چرندہ جانور اس کے دائرے میں آجاتے ہیں جو مویشی کی نوعیت کے ہوں۔ یعنی جو کُچلیاں نہ رکھتے ہوں، حیوانی غذا کے بجائے نباتی غذا کھاتے ہوں، اور دُوسری حیوانی خُصوصیّات میں اَنعامِ عرب سے مُماثلت رکھتے ہوں۔ نیز اس سے اشارتاً یہ بات بھی مُترشّح ہوتی ہے کہ وہ چوپائے جو مویشیوں کے برعکس کُچلیاں رکھتے ہوں اور دوسرے جانوروں کو مار کر کھاتے ہوں، حلال نہیں ہیں۔ اسی اشارے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کر کے حدیث میں صاف حکم دے دیا کہ درندے حرام ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے اُن پرندوں کو بھی حرام قرار دیا جن کے پنجے ہوتے ہیں اور جو دوسرے جانوروں کا شکار کر کے کھاتے ہیں یا مُردار خور ہوتے ہیں۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن کل ذی ناب من السباع و کل ذی مخلب من الطیر۔ دوسرے متعدّد صحابہؓ سے بھی اس کی تائید میں روایات منقول ہیں۔

٣ – ''احرام'' اُس فقیرانہ لباس کو کہتے ہیں جو زیارتِ کعبہ کے لیے پہنا جاتا ہے۔ کعبہ کے گرد کئی کئی منزل کے فاصلے پر ایک حد مقرر کر دی گئی ہے جس سے آگے بڑھنے کی کسی زائر کو اجازت نہیں، جب تک کہ وہ اپنا معمولی لباس اُتار کر احرام کا لباس نہ پہن لے۔ اس لباس میں صرف ایک تہمد ہوتا ہے اور ایک چادر جو اُوپر سے اوڑھی جاتی ہے۔ اسے احرام اس لیے کہتے ہیں کہ اسے باندھنے کے بعد آدمی پر بہت سی وہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو معمولی حالات میں حلال ہیں، مثلاً حجامت، خوشبو کا

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ

بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔[۴]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حُرمت نہ کرو[۵] ـــــ نہ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال کرلو، نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو، نہ اُن جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذرِ خداوندی کی علامت کے طور پر پٹّے پڑے ہوئے ہوں،

استعمال، ہر قسم کی زینت و آرائش اور قضائے شہوت وغیرہ۔ انھی پابندیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی جان دار کو ہلاک نہ کیا جائے، نہ شکار کیا جائے اور نہ کسی کو شکار کا پتا دیا جائے۔

۴ ـ یعنی اللہ حاکمِ مُطلَق ہے، اسے پورا اختیار ہے کہ جو چاہے حکم دے۔ بندوں کو اُس کے احکام میں چُون و چَرا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ اس کے تمام احکام حکمت و مَصلَحت پر مبنی ہیں، لیکن بندۂ مسلم اس کے حکم کی اطاعت اس حیثیت سے نہیں کرتا کہ وہ اسے مناسب پاتا ہے یا مبنی بر مَصلَحت سمجھتا ہے، بلکہ صرف اس بنا پر کرتا ہے کہ یہ مالک کا حکم ہے۔ جو چیز اس نے حرام کردی ہے وہ صرف اس لیے حرام ہے کہ اس نے حرام کی ہے، اور اِسی طرح جو اس نے حلال کردی ہے وہ بھی کسی دُوسری بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اس بنیاد پر حلال ہے کہ جو خدا ان ساری چیزوں کا مالک ہے، وہ اپنے غلاموں کو اس چیز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا قرآن پورے زور کے ساتھ یہ اُصول قائم کرتا ہے کہ اشیا کی حُرمت و حِلّت کے لیے مالک کی اجازت و عَدَمِ اجازت کے سوا کسی اور بنیاد کی قطعاً ضرورت نہیں، اور اسی طرح بندے کے لیے کسی کام کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اس کے سوا اَور کچھ نہیں کہ خدا جس کو جائز رکھے وہ جائز ہے اور جسے ناجائز قرار دے وہ ناجائز۔

۵ ـ ہر وہ چیز جو کسی مسلک، یا عقیدے، یا طرزِ فکر و عمل، یا کسی نظام کی نمایندگی کرتی ہو وہ اس کا "شِعار" کہلائے گی، کیونکہ وہ اس کے لیے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے، فوج اور پولیس وغیرہ کے یونیفارم، سِکّے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں اور وہ اپنے محکوموں سے، بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے، سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیّت کے شعائر ہیں۔ چوٹی اور زنار اور مندر برَہمَنِیّت کے شعائر ہیں۔ کیس اور کڑا اور کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں۔ ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیّت کا شعار ہے۔ سواستیکا آریانسل پرستی کا شعار ہے۔ یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروؤں سے اپنے اِن شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شِعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اُس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے، اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اسی نظام سے تعلّق رکھتا ہو تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے ارتداد اور بغاوت کا ہم معنیٰ ہے۔

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۭ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۭ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ

نہ اُن لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکانِ محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں[۶]۔ ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو[۷]۔۔۔۔۔ اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمھارے لیے مسجدِ حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمھارا غصّہ

''شعائر اللہ'' سے مراد وہ تمام علامات یا نشانیاں ہیں جو شرک وکفر اور دہریّت کے بالمقابل خالص خدا پرستی کے مسلک کی نمایندگی کرتی ہوں۔ ایسی علامات جہاں جس مسلک اور جس نظام میں بھی پائی جائیں، مسلمان ان کے احترام پر مامور ہیں، بشرطیکہ ان کا نفسیاتی پَسِ منظر خالص خدا پرستانہ ہو، کسی مشرکانہ یا کافرانہ تخیّل کی آلودگی سے انھیں ناپاک نہ کر دیا گیا ہو۔ کوئی شخص خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اگر اپنے عقیدہ وعمل میں خدائے واحد کی بندگی وعبادت کا کوئی جُز رکھتا ہے، تو اس جُز کی حد تک مسلمان اس سے مُوافَقَت کریں گے اور ان شعائر کا بھی پُورا احترام کریں گے جو اس کے مذہب میں خالص خدا پرستی کی علامت ہوں۔ اس چیز میں ہمارے اور اس کے درمیان نزاع نہیں بلکہ موافقت ہے۔ نزاع اگر ہے تو اس امر میں نہیں کہ وہ خدا کی بندگی کیوں کرتا ہے، بلکہ اس امر میں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ دُوسری بندگیوں کی آمیزش کیوں کرتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ شعائر اللہ کے احترام کا یہ حکم اُس زمانے میں دیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں اور مشرکینِ عرب کے درمیان جنگ برپا تھی، مکّے پر مشرکین قابض تھے، عرب کے ہر حصّے سے مشرک قبائل کے لوگ حج وزیارت کے لیے کعبے کی طرف جاتے تھے اور بہت سے قبیلوں کے راستے مسلمانوں کی زد میں تھے۔ اس وقت حکم دیا گیا کہ یہ لوگ مشرک ہی سہی، تمھارے اور ان کے درمیان جنگ ہی سہی، مگر جب یہ خدا کے گھر کی طرف جاتے ہیں تو انھیں نہ چھیڑو، حج کے مہینوں میں ان پر حملہ نہ کرو، خدا کے دربار میں نذر کرنے کے لیے جو جانور یہ لیے جا رہے ہوں اُن پر ہاتھ نہ ڈالو، کیونکہ ان کے بگڑے ہوئے مذہب میں خدا پرستی کا جتنا حصّہ باقی ہے، وہ بجائے خود احترام کا مستحق ہے نہ کہ بے احترامی کا۔

۶ – ''شعائر اللہ'' کے احترام کا عام حکم دینے کے بعد چند شعائر کا نام لے کر ان کے احترام کا خاص طور پر حکم دیا گیا، کیونکہ اُس وقت جنگی حالات کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جنگ کے جوش میں کہیں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی توہین نہ ہو جائے۔ ان چند شعائر کو نام بنام بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ صرف یہی احترام کے مستحق ہیں۔

۷ – احرام بھی مِن جُملہ شعائر اللہ ہے، اور اس کی پابندیوں میں سے کسی پابندی کو توڑنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے۔ اس لیے شعائر اللہ ہی کے سلسلے میں اس کا ذکر بھی کر دیا گیا کہ جب تک تم احرام بند ہو، شکار کرنا خدا پرستی کے شعائر میں سے ایک شِعار کی توہین کرنا ہے۔ البتہ جب شرعی قاعدے کے مطابق احرام کی حد ختم ہو جائے تو شکار کرنے کی اجازت ہے۔

قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡكُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا ۘ وَتَعَاوَنُوۡا
عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ۖ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲﴾ حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةُ وَالدَّمُ
وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالۡمُنۡخَنِقَةُ وَالۡمَوۡقُوۡذَةُ
وَالۡمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيۡحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيۡتُمۡ ۟

تمھیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو[8] نہیں! جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں، ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں، ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔

تم پر حرام کیا گیا مُردار[9]، خُون، سُور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو[10]، وہ جو گلا گُھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو ـــــ سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا[11] ـــــ

۸ — چونکہ کفار نے اس وقت مسلمانوں کو کعبے کی زیارت سے روک دیا تھا اور عرب کے قدیم دستور کے خلاف حج تک سے مسلمان محروم کر دیے گئے تھے، اس لیے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جن کافر قبیلوں کے راستے اسلامی مقبوضات کے قریب سے گزرتے ہیں، ان کو ہم بھی حج سے روک دیں اور زمانۂ حج میں ان کے قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر انھیں اِس ارادے سے باز رکھا۔

۹ — یعنی وہ جانور جو طبعی موت مر گیا ہو۔

۱۰ — یعنی جس کو ذبح کرتے وقت خدا کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو، یا جس کو ذبح کرنے سے پہلے یہ نیت کی گئی ہو کہ یہ فُلاں بزرگ یا فُلاں دیوی یا دیوتا کی نذر ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۷۱)

۱۱ — یعنی جو جانور مذکورۂ بالا حوادث میں سے کسی حادثے کا شکار ہو جانے کے باوجود مرا نہ ہو بلکہ کچھ آثارِ زندگی اس میں پائے جاتے ہوں، اس کو اگر ذبح کر لیا جائے تو اُسے کھایا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ حلال جانور کا گوشت صرف ذبح کرنے سے حلال ہوتا ہے، کوئی دوسرا طریقہ اس کو ہلاک کرنے کا صحیح نہیں ہے۔ یہ ''ذبح'' اور ''ذکاۃ'' اسلام کے اصطلاحی لفظ ہیں۔ ان سے مراد حلق کا اتنا حصّہ کاٹ دینا ہے جس سے جسم کا خون اچھی طرح خارج ہو جائے۔ جھٹکا کرنے یا

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ

اور وہ جو کسی آستانے[12] پر ذبح کیا گیا ہو۔[13] نیز یہ بھی تمھارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعے سے اپنی قسمت معلوم کرو۔[14]

گلا گھونٹنے یا کسی اور تدبیر سے جانور کو ہلاک کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ خُون کا بیشتر حصّہ جسم کے اندر ہی رک کر رہ جاتا ہے اور وہ جگہ جگہ جم کر گوشت کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ برعکس اِس کے ذبح کرنے کی صورت میں دماغ کے ساتھ جسم کا تعلّق دیر تک باقی رہتا ہے، جس کی وجہ سے رگ رگ کا خُون کھنچ کر باہر آ جاتا ہے اور اس طرح پورے جسم کا گوشت خون سے صاف ہو جاتا ہے۔ خُون کے متعلّق ابھی اوپر ہی یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ حرام ہے، لہٰذا گوشت کے پاک اور حلال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خون اس سے جُدا ہو جائے۔

۱۲ – اصل میں لفظ ''نُصُب'' استعمال ہُوا ہے۔ اس سے مراد وہ سب مَقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو، خواہ وہاں کوئی پتھر یا لکڑی کی مُورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا ہم معنٰی لفظ آستانہ یا اِستھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا سے، یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔

۱۳ – اِس مَقام پر یہ بات خوب سمجھ لینی چاہیے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حرام وحلال کی جو قُیود شریعت کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں، اُن کی اصل بنیاد اُن اشیا کے طبّی فوائد یا نقصانات نہیں ہوتے، بلکہ اُن کے اَخلاقی فوائد و نقصانات ہوتے ہیں۔ جہاں تک طبیعی اُمور کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو انسان کی اپنی سعی وجستجو اور کاوش و تحقیق پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ دریافت کرنا انسان کا اپنا کام ہے کہ مادّی اشیا میں سے کیا چیزیں اس کے جسم کو غذائے صالح بہم پہنچانے والی ہیں اور کیا چیزیں تغذیے کے لیے غیر مفید یا نقصان دِہ ہیں۔ شریعت اِن اُمور میں اس کی رہنمائی کی ذمّہ داری اپنے سر نہیں لیتی۔ اگر یہ کام اس نے اپنے ذمّے لیا ہوتا تو سب سے پہلے سنکھیا کو حرام کیا ہوتا۔ لیکن آپ دیکھتے ہی ہیں کہ قرآن و حدیث میں اُس کا، یا اُن دوسرے مُفرَدات و مُرکّبات کا، جو انسان کے لیے سخت مہلک ہیں، سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ شریعت غذا کے معاملے میں جس چیز پر روشنی ڈالتی ہے، وہ دراصل اُس کا یہ پہلو ہے کہ کس غذا کا انسان کے اخلاق پر کیا اثر ہوتا ہے، اور کون سی غذائیں طہارتِ نفس کے لحاظ سے کیسی ہیں، اور غذا حاصل کرنے کے طریقوں میں سے کون سے طریقے اعتقادی و نظری حیثیت سے صحیح یا غلط ہیں۔ چونکہ اس کی تحقیق کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے، اور اسے دریافت کرنے کے ذرائع انسان کو میسّر ہی نہیں ہیں، اور اسی بنا پر انسان نے اکثر اِن اُمور میں غَلَطیاں کی ہیں، اس لیے شریعت صرف اِنھی اُمور میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ جن چیزوں کو اس نے حرام کیا ہے، انھیں اس وجہ سے حرام کیا ہے کہ یا تو اخلاق پر ان کا بُرا اثر پڑتا ہے، یا وہ طہارت کے خلاف ہیں، یا ان کا تعلّق کسی فاسد عقیدے سے ہے۔ برعکس اس کے جن چیزوں کو اس نے حلال کیا ہے اُن کی حِلّت کی وجہ یہ ہے کہ وہ اِن بُرائیوں میں سے کوئی بُرائی اپنے اندر نہیں رکھتیں۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ خدا نے ہم کو ان اشیا کی حُرمت کے وجوہ کیوں نہ سمجھائے، تاکہ ہمیں بصیرت حاصل ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے وجوہ کو سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ مثلاً یہ بات کہ خُون، یا سُور کے گوشت، یا مُردار کے کھانے سے

ہماری اخلاقی صفات میں کیا خرابیاں رُونما ہوتی ہیں، کس قدر اور کس طرح ہوتی ہیں، اس کی تحقیق ہم کسی طرح نہیں کر سکتے، کیونکہ اَخلاق کو ناپنے اور تولنے کے ذرائع ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ اگر بالفرض اُن کے بُرے اثرات کو بیان کر بھی دیا جاتا تو شبہ کرنے والا التقریباً اُسی مَقام پر ہوتا جس مقام پر وہ اب ہے، کیونکہ وہ اس بیان کی صحت وعَدَمِ صحّت کو آخر کس چیز سے جانچتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حرام وحلال کے حُدُود کی پابندی کا انحصار ایمان پر رکھ دیا ہے۔ جو شخص اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ کتاب، اللہ کی کتاب ہے اور رسول، اللہ کا رسول ہے، اور اللہ علیم وحکیم ہے، وہ اس کے مقرر کیے ہوئے حُدُود کی پابندی کرے گا، خواہ ان کی مَصلحت اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اور جو شخص اس بنیادی عقیدے پر ہی مطمئن نہ ہو، اس کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جن چیزوں کی خرابیاں انسانی علم کے احاطے میں آگئی ہیں، صرف انھی سے پرہیز کرے، اور جن کی خرابیوں کا علمی احاطہ نہیں ہوسکا ہے، ان کے نقصانات کا تختۂ مشق بنتا رہے۔

۱۴ — اس آیت میں جس چیز کو حرام کیا گیا ہے، اس کی تین بڑی قِسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور آیت کا حکم ان تینوں پر حاوی ہے:

(۱) مشرکانہ فال گیری، جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے قسمت کا فیصلہ پُوچھا جاتا ہے، یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے، یا باہمی نِزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا ہے۔ مشرکینِ مکّہ نے اِس غرض کے لیے کعبہ کے اندر ہُبَل دیوتا کے بُت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے اِستھان میں سات تیر رکھے ہوئے تھے جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کَندہ تھے۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو، یا کھوئی ہوئی چیز کا پتا پُوچھنا ہو، یا خون کے مقدّمے کا فیصلہ مطلوب ہو، غرض کوئی کام بھی ہو، اس کے لیے ہُبَل کے پانسا دار (صاحب القِداح) کے پاس پہنچ جاتے، اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہُبَل سے دعا مانگتے کہ ہمارے اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔ پھر پانسادار اِن تیروں کے ذریعے سے فال نکالتا، اور جو تیر بھی فال میں نکل آتا، اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہُبَل کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔

(۲) تَوَہُّم پرستانہ فال گیری، جس میں زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل وفکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی وخیالی چیز یا کسی اتفاقی شے کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کا وسیلۂ علمِ غیب ہونا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔ رَمل، نُجوم، جَفَر، مختلف قسم کے شگون اور نچھتر، اور فال گیری کے بے شمار طریقے اس صنف میں داخل ہیں۔

(۳) جُوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیا کی تقسیم کا مدار حُقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فُلاں شخص کا نام نکل آیا ہے، لہٰذا ہزارہا آدمیوں کی جیب سے نکلا ہوا روپیا اُس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے۔ یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک مُعَمّے کے بہت سے حل صحیح ہیں، مگر انعام وہ شخص پائے گا جس کا حل کسی معقول کوشش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اُس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحبِ مُعَمّا کے صندوق میں بند ہے۔

اِن تین اقسام کو حرام کر دینے کے بعد قُرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے جس میں دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر کے حُقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے،

ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ

یہ سب افعال فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمھارے دین کی طرف سے پُوری مایوسی ہو چکی ہے، لٰہذا تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔[15] آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے (لٰہذا حرام و حلال کی جو قیُود تم پر عائد کر دی گئی ہیں اُن کی پابندی کرو)۔[16] البتہ جو شخص

اور فیصلہ کرنے والے کے لیے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے، اور خود ان دونوں میں سے بھی کوئی اپنا حق خود چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی رضامندی سے قُرعہ اندازی پر فیصلے کا مدار رکھا جا سکتا ہے۔ یا مثلاً دو کام یکساں دُرست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دونوں کے درمیان مذبذب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے۔ اس صورت میں ضرورت ہو تو قُرعہ اندازی کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعُموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے جب کہ دو برابر کے حق داروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آ جاتی تھی اور آپؐ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپؐ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہوگا۔

۱۵- ”آج“ سے مراد کوئی خاص دن اور تاریخ نہیں ہے بلکہ وہ دَور یا زمانہ مراد ہے جس میں یہ آیات نازل ہوئی تھیں۔ ہماری زبان میں بھی آج کا لفظ زمانۂ حال کے لیے عام طور پر بولا جاتا ہے۔

”کافروں کو تمھارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے“، یعنی اب تمھارا دین ایک مستقل نظام بن چکا ہے اور خود اپنی حاکمانہ طاقت کے ساتھ نافذ و قائم ہے۔ کفار جو اب تک اس کے قیام میں مانع و مزاحم رہے ہیں، اب اس طرف سے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ اِسے مٹا سکیں گے اور تمھیں پھر پچھلی جاہلیت کی طرف واپس لے جا سکیں گے۔

”لٰہذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو“، یعنی اس دین کے احکام اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے میں اب کسی کافر طاقت کے غلبہ و قہر اور دَراندازی و مزاحمت کا خطرہ تمھارے لیے باقی نہیں رہا ہے۔ انسانوں کے خوف کی اب کوئی وجہ نہیں رہی۔ اب تمھیں خدا سے ڈرنا چاہیے کہ اس کے احکام کی تعمیل میں اگر کوئی کوتاہی تم نے کی تو تمھارے پاس کوئی ایسا عذر نہ ہوگا جس کی بنا پر تمھارے ساتھ کچھ بھی نرمی کی جائے۔ اب شریعتِ الٰہی کی خلاف ورزی کے معنیٰ یہ نہیں ہوں گے کہ تم دوسروں کے اثر سے مجبور ہو، بلکہ اس کے صاف معنیٰ یہ ہوں گے کہ تم خدا کی اطاعت کرنا نہیں چاہتے۔

اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِیْمٌ ۝۳ یَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ

بُھوک سے مجبُور ہو کر اُن میں سے کوئی چیز کھا لے، بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو، تو بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[17]

لوگ پُوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے؟ کہو تمھارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔[18]

۱۶ – دین کو مکمل کر دینے سے مُراد اُس کو ایک مستقل نظامِ فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظامِ تہذیب و تمدّن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جُملہ مسائل کا جواب اُصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ نعمت تمام کرنے سے مُراد نعمتِ ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے۔ اور اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے میری اطاعت و بندگی اختیار کرنے کا جو اقرار کیا تھا، اس کو چونکہ تم اپنی سعی و عمل سے سچّا اور مخلصانہ اقرار ثابت کر چکے ہو، اس لیے میں نے اسے درجۂ قبولیت عطا فرمایا ہے اور تمھیں عملاً اس حالت کو پہنچا دیا ہے کہ اب فی الواقع میرے سوا کسی کی اطاعت و بندگی کا جُوا تمھاری گردنوں پر باقی نہیں رہا۔ اب جس طرح اعتقاد میں تم میرے مسلم ہو، اسی طرح عملی زندگی میں بھی میرے سوا کسی اور کے مسلم بن کر رہنے کے لیے کوئی مجبُوری تمھیں لاحق نہیں رہی ہے۔ ان احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ سکوت اختیار فرماتا ہے، مگر اندازِ کلام سے خود بخود یہ بات نکل آتی ہے کہ جب یہ احسانات میں نے تم پر کیے ہیں تو ان کا تقاضا یہ ہے کہ اب میرے قانون کی حُدُود پر قائم رہنے میں تمھاری طرف سے بھی کوئی کوتاہی نہ ہو۔

مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حَجَّۃُ الوداع کے موقع پر ۱۰ ہجری میں نازل ہوئی تھی۔ لیکن جس سلسلۂ کلام میں یہ واقع ہوئی ہے، وہ صُلحِ حُدَیْبِیَہ سے مُتّصل زمانہ (۶ ھ) کا ہے، اور سیاقِ عبارت میں دونوں فقرے کچھ ایسے پیوستہ نظر آتے ہیں کہ یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ ابتدا میں یہ سلسلۂ کلام اِن فقروں کے بغیر نازل ہوا تھا اور بعد میں جب یہ نازل ہوئے تو انھیں یہاں لا کر نصب کر دیا گیا۔ میرا قیاس یہ ہے، وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللہ، کہ ابتداءً یہ آیت اِسی سیاقِ کلام میں نازل ہوئی تھی، اس لیے اس کی حقیقی اہمیت لوگ نہ سمجھ سکے۔ بعد میں جب تمام عرب مسخّر ہو گیا اور اسلام کی طاقت اپنے شباب پر پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ یہ فقرے اپنے نبیؐ پر نازل فرمائے اور ان کے اعلان کا حکم دیا۔

۱۷ – مُلاحَظہ ہو: سورۂ بَقَرہ، حاشیہ ۱۷۲۔

۱۸ – اس جواب میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ مذہبی طرزِ خیال کے لوگ اکثر اس ذہنیّت کے شکار ہوتے رہے ہیں کہ دُنیا کی ہر چیز کو حرام سمجھتے ہیں، جب تک کہ صراحت کے ساتھ کسی چیز کو حلال نہ قرار دیا جائے۔ اس ذہنیت کی وجہ سے لوگوں پر وہمی پن اور قانونیت کا تسلّط ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں حلال اشیا اور جائز کاموں کی فہرست مانگتے ہیں اور

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ

اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سَدھایا ہو ـــ جن کو خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر تم شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو ـــ وہ جس جانور کو تمھارے لیے پکڑ رکھیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو[19]، البتہ اس پر اللہ کا نام

ہر کام اور ہر چیز کو اس شبہے کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں وہ ممنُوع تو نہیں۔ یہاں قرآن اسی ذہنیّت کی اصلاح کرتا ہے۔ پُوچھنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ انھیں تمام حلال چیزوں کی تفصیل بتائی جائے، تاکہ ان کے سوا ہر چیز کو وہ حرام سمجھیں۔ جواب میں قرآن نے حرام چیزوں کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد یہ عام ہدایت دے کر چھوڑ دیا کہ ساری پاک چیزیں حلال ہیں۔ اس طرح قدیم مذہبی نظریّہ بالکل اُلٹ گیا۔ قدیم نظریّہ یہ تھا کہ سب کچھ حرام ہے، بجز اس کے جسے حلال ٹھیرایا جائے۔ قرآن نے اس کے برعکس یہ اُصول مقرر کیا کہ سب کچھ حلال ہے، بجز اُس کے جس کی حُرمت کی تصریح کر دی جائے۔ یہ ایک بہت بڑی اصلاح تھی جس نے انسانی زندگی کو بندشوں سے آزاد کر کے دُنیا کی وسعتوں کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ پہلے حِلّت کے ایک چھوٹے سے دائرے کے سوا ساری دُنیا اس کے لیے حرام تھی۔ اب حُرمت کے ایک مختصر سے دائرے کو مُستثنیٰ کر کے ساری دُنیا اس کے لیے حلال ہو گئی۔

حلال کے لیے ”پاک“ کی قید اس لیے لگائی کہ ناپاک چیزوں کو اس اِباحت کی دلیل سے حلال ٹھیرانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اب رہا یہ سوال کہ اشیا کے ”پاک“ ہونے کا تعیُّن کس طرح ہو گا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں اُصولِ شرع میں سے کسی اصل کے ماتحت ناپاک قرار پائیں، یا جن چیزوں سے ذوقِ سلیم کراہت کرے، یا جنھیں مہذّب انسان نے بالعُموم اپنے فطری احساسِ نظافت کے خلاف پایا ہو، ان کے ماسوا سب کچھ پاک ہے۔

۱۹ – شکاری جانوروں سے مراد کُتّے، چیتے، باز، شِکرے اور تمام وہ درندے اور پرندے ہیں جن سے انسان شکار کی خدمت لیتا ہے۔ سَدھائے ہوئے جانور کی خُصُوصیّت یہ ہوتی ہے کہ وہ جس کا شکار کرتا ہے اُسے عام درندوں کی طرح پھاڑ نہیں کھاتا بلکہ اپنے مالک کے لیے پکڑ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے عام درندوں کا پھاڑا ہوا جانور حرام ہے اور سَدھائے ہوئے درندوں کا شکار حلال۔

اس مسئلے میں فقہا کے درمیان کچھ اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر شکاری جانور نے، خواہ وہ درندہ ہو یا پرندہ، شکار میں سے کچھ کھا لیا تو وہ حرام ہو گا کیونکہ اس کا کھا لینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اس نے شکار کو مالک کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے پکڑا۔ یہی مسلک امام شافعیؒ کا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا ہو تب بھی وہ حرام نہیں ہوتا، حتّٰی کہ اگر ایک تہائی حصّہ بھی وہ کھا لے تو بقیہ دو تہائی حلال ہے، اور اس معاملے میں درندے اور پرندے کے درمیان کچھ فرق نہیں۔

عَلَيۡهِ‌ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ‏ ﴿۴﴾ اَلۡيَوۡمَ
اُحِلَّ لَـكُمُ الطَّيِّبٰتُ‌ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حِلٌّ
لَّـكُمۡ ۖ وَطَعَامُكُمۡ حِلٌّ لَّهُمۡ‌ ۖ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ

لے لو[20] اور اللہ کا قانون توڑنے سے ڈرو، اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

آج تمھارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا اُن کے لیے[21]۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمھارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہلِ ایمان کے گروہ سے ہوں

یہ مسلک امام مالکؒ کا ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ شکاری درندے نے اگر شکار میں سے کھا لیا ہو تو وہ حرام ہوگا، لیکن اگر شکاری پرندے نے کھایا ہو تو حرام نہ ہوگا۔ کیونکہ شکاری درندے کو ایسی تعلیم دی جاسکتی ہے کہ وہ شکار کو مالک کے لیے پکڑ رکھے اور اس میں سے کچھ نہ کھائے، لیکن تجربے سے ثابت ہے کہ شکاری پرندہ ایسی تعلیم قبول نہیں کرتا۔ یہ مسلک امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے اصحاب کا ہے۔ اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شکاری پرندے کا شکار سرے سے جائز ہی نہیں ہے، کیونکہ اسے تعلیم سے یہ بات نہیں سکھائی جاسکتی کہ شکار کو خود نہ کھائے بلکہ مالک کے لیے پکڑ رکھے۔

۲۰ – یعنی شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ کہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عدیؓ بن حاتم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آیا میں کُتّے کے ذریعے سے شکار کر سکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا کہ ”اگر اس کو چھوڑتے ہوئے تم نے اللہ کا نام لیا ہو تو کھاؤ ورنہ نہیں۔ اور اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا ہو تو نہ کھاؤ، کیونکہ اس نے شکار کو دراصل اپنے لیے پکڑا۔“ پھر انھوں نے پوچھا کہ اگر میں شکار پر اپنا کُتّا چھوڑوں اور بعد میں دیکھوں کہ کوئی اور کُتّا وہاں موجود ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: ”اس شکار کو نہ کھاؤ۔ اس لیے کہ تم نے خدا کا نام اپنے کُتّے پر لیا تھا نہ کہ دوسرے کُتّے پر۔“

اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے ہوئے خدا کا نام لینا ضروری ہے۔ اس کے بعد اگر شکار زندہ ملے تو پھر خدا کا نام لے کر اسے ذبح کر لینا چاہیے اور اگر زندہ نہ ملے تو اس کے بغیر ہی وہ حلال ہوگا، کیونکہ ابتداءً شکاری جانور کو اس پر چھوڑتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا نام لیا جا چکا تھا۔ یہی حکم تیر کا بھی ہے۔

۲۱ – اہلِ کتاب کے کھانے میں اُن کا ذبیحہ بھی شامل ہے۔ ہمارے لیے اُن کا اور اُن کے لیے ہمارا کھانا حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور اُن کے درمیان کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ اور کوئی چھوت چھات نہیں ہے۔ ہم اُن کے ساتھ کھا سکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ۔ لیکن یہ عام اجازت دینے سے پہلے اس فقرے کا اعادہ فرمایا گیا ہے کہ ”تمھارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب اگر پاکی وطہارت کے اُن قوانین کی پابندی

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ؗ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۵﴾ ع

یا اُن قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی[۲۲]، بشرطیکہ تم اُن کے مَہر ادا کر کے نکاح میں اُن کے محافظ بنو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھُپے آشنائیاں کرو۔ اور جو کسی نے ایمان کی رَوِش پر چلنے سے انکار کیا تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہو گا۔[۲۳] ع

نہ کریں جو شریعت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں، یا اگر اُن کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں تو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر وہ خدا کا نام لیے بغیر کسی جانور کو ذبح کریں، یا اس پر خدا کے سوا کسی اَور کا نام لیں، تو اُسے کھانا ہمارے لیے جائز نہیں۔ اِسی طرح اگر اُن کے دسترخوان پر شراب، یا سُور، یا کوئی اور حرام چیز ہو تو ہم ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔

اہلِ کتاب کے سوا دُوسرے غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ذبیحہ اہلِ کتاب ہی کا جائز ہے، جب کہ انھوں نے خدا کا نام اس پر لیا ہو، رہے غیر اہلِ کتاب، تو ان کے ہلاک کیے ہوئے جانور کو ہم نہیں کھا سکتے۔

۲۲ – اِس سے مُراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ نکاح کی اجازت صرف انھی کی عورتوں سے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ شرط یہ لگا دی گئی ہے کہ وہ مُحصَنات (محفوظ عورتیں) ہوں۔ اس حکم کی تفصیلات میں فقہا کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ ابن عباسؓ کا خیال ہے کہ یہاں اہلِ کتاب سے مراد وہ اہلِ کتاب ہیں جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوں۔ رہے دار الحرب اور دار الکفر کے یہود و نصاریٰ، تو ان کی عورتوں سے نکاح کرنا دُرست نہیں۔ حَنَفِیَّہ اس سے تھوڑا اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بیرونی ممالک کے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا حرام تو نہیں ہے مگر مکرُوہ ضرور ہے۔ بخلاف اس کے سعید بن المُسَیَّبؒ اور حَسَن بصریؒ اس کے قائل ہیں کہ آیت اپنے حکم میں عام ہے، لہٰذا ذِمّی اور غیر ذِمّی میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر مُحصَنات کے مفہوم میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت عمرؓ کے نزدیک اس سے مراد پاک دامن، عِصمت مآب عورتیں ہیں، اور اس بنا پر وہ اہلِ کتاب کی آزاد منش عورتوں کو اس اجازت سے خارج قرار دیتے ہیں۔ یہی رائے حسنؒ، شَعْبیؒ اور ابراہیم نَخَعیؒ کی ہے اور حَنَفِیَّہ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔ بخلاف اس کے امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ لونڈیوں کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے، یعنی اس سے مراد اہلِ کتاب کی وہ عورتیں ہیں جو لونڈیاں نہ ہوں۔

۲۳ – اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دینے کے بعد یہ فقرہ اس لیے تنبیہ کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ
وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى
الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى
سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ
تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ
مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نماز کے لیے اُٹھو تو چاہیے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو، سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔[۲۴] اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔[۲۵] اگر بیمار ہو، یا سفر کی حالت میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص رفعِ حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو، اور پانی نہ ملے، تو پاک مٹی سے کام لو، بس اُس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔[۲۶] اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا، مگر وہ چاہتا ہے کہ

کہ جو شخص اِس اجازت سے فائدہ اُٹھائے، وہ اپنے ایمان و اَخلاق کی طرف سے ہوشیار رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کافر بیوی کے عشق میں مُبتلا ہو کر یا اس کے عقائد اور اعمال سے مُتاثّر ہو کر وہ اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے، یا اَخلاق و معاشرت میں ایسی روش پر چل پڑے جو ایمان کے منافی ہو۔

۲۴ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس حکم کی جو تشریح فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منہ دھونے میں کُلّی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے، بغیر اس کے منہ کے غسل کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اور کان چونکہ سر کا ایک حصّہ ہیں، اس لیے سر کے مسح میں کانوں کے اندرونی و بیرونی حصّوں کا مسح بھی شامل ہے۔ نیز وضو شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہییں، تاکہ جن ہاتھوں سے آدمی وضو کر رہا ہو، وہ خود پہلے پاک ہو جائیں۔

۲۵ – جنابت خواہ مباشرت سے لاحق ہوئی ہو یا خواب میں مادۂ منویہ خارج ہونے کی وجہ سے، دونوں صورتوں میں غُسل واجب ہے۔ اس حالت میں غُسل کے بغیر نماز پڑھنا یا قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہیں۔ (مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حواشی ۶۷، ۶۸ و ۶۹)۔

لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞ ۶ وَ
اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ
قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ۞ ۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ
بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ
اِعْدِلُوْا ۫ قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۞ ۸ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ

تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے[۲۷]، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے[۲۸] اس کا خیال رکھو اور اُس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھولو جو اُس نے تم سے لیا ہے، یعنی تمھارا یہ قول کہ "ہم نے سُنا اور اطاعت قبول کی"۔ اللہ سے ڈرو، اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔[۲۹] کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے پُوری طرح باخبر ہے۔ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں،

---

۲۶ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حاشیہ ۶۹ و ۷۰۔

۲۷ – جس طرح پاکیزگیِ نفس ایک نعمت ہے، اسی طرح پاکیزگیِ جسم بھی ایک نعمت ہے۔ انسان پر اللہ کی نعمت اسی وقت مکمّل ہو سکتی ہے جب کہ نفس و جسم دونوں کی طہارت و پاکیزگی کے لیے پُوری ہدایت اسے مل جائے۔

۲۸ – یعنی یہ نعمت کہ زندگی کی شاہراہِ مستقیم تمھارے لیے روشن کر دی اور دُنیا کی ہدایت و رہنمائی کے منصب پر تمھیں سرفراز کیا۔

۲۹ – مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حاشیہ ۱۶۴ و ۱۶۵۔

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٩﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١٠﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ
يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١١﴾ ع

اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا اور انھیں بڑا اجر ملے گا۔ رہے وہ لوگ جو کفر کریں اور اللہ کی آیات کو جھُٹلائیں، تو وہ دوزخ میں جانے والے ہیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے اُس احسان کو یاد کرو جو اُس نے (ابھی حال میں) تم پر کیا ہے، جب کہ ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا، مگر اللہ نے اُن کے ہاتھ تم پر اُٹھنے سے روک دیے[30]۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، ایمان رکھنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ ع

۳۰۔ اشارہ ہے اس واقعے کی طرف جسے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے رِوایَت کیا ہے کہ یہودیوں میں سے ایک گروہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاص خاص صحابہؓ کو کھانے کی دعوت پر بُلایا تھا اور خفیہ طور پر یہ سازش کی تھی کہ اچانک ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور اس طرح اسلام کی جان نکال دیں گے۔ لیکن عین وقت پر اللہ کے فضل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سازش کا حال معلوم ہو گیا اور آپؐ دعوت پر تشریف نہ لے گئے۔ چونکہ یہاں سے خطاب کا رُخ بنی اسرائیل کی طرف پھر رہا ہے، اس لیے تمہید کے طور پر اس واقعے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

یہاں سے جو تقریر شروع ہو رہی ہے اس کے دو مقاصد ہیں: پہلا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس روش پر چلنے سے روکا جائے جس پر ان کے پیش رَو اہلِ کتاب چل رہے تھے۔ چنانچہ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح آج تم سے عہد لیا گیا ہے اسی طرح کل یہی عہد بنی اسرائیل سے اور مسیح علیہ السلام کی اُمت سے بھی لیا جا چکا ہے۔ پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح وہ اپنے عہد کو توڑ کر گمراہیوں میں مبتلا ہوئے، اُسی طرح تم بھی اُسے توڑ دو اور گمراہ ہو جاؤ۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ یہُود اور نصاریٰ دونوں کو اُن کی غَلَطیوں پر مُتَنَبِّہ کیا جائے اور انھیں دینِ حق کی طرف دعوت دی جائے۔

وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ‌ۚ وَبَعَثۡنَا مِنۡهُمُ
اثۡنَىۡ عَشَرَ نَقِيۡبًا‌ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىۡ مَعَكُمۡ‌ؕ لَـئِنۡ اَقَمۡتُمُ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَيۡتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنۡتُمۡ بِرُسُلِىۡ وَعَزَّرۡتُمُوۡهُمۡ
وَاَقۡرَضۡتُمُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ

اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب[۳۱] مقرر کیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ ”میں تمھارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم رکھی، اور زکوٰۃ دی، اور میرے رسولوں کو مانا، اور ان کی مدد کی[۳۲]، اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے[۳۳]، تو یقین رکھو کہ میں تمھاری بُرائیاں تم سے زائل کر دُوں گا[۳۴]

۳۱- نقیب کے معنیٰ نگرانی اور تفتیش کرنے والے کے ہیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر قبیلے پر ایک ایک نقیب خود اسی قبیلے سے مقرر کرنے کا حکم دیا تھا، تاکہ وہ ان کے حالات پر نظر رکھے اور انھیں بے دینی و بد اَخلاقی سے بچانے کی کوشش کرتا رہے۔ بائبل کی کتاب گنتی میں بارہ ”سرداروں“ کا ذکر موجود ہے، مگر ان کی وہ حیثیت جو یہاں لفظ ”نقیب“ سے قرآن میں بیان کی گئی ہے، بائبل کے بیان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ بائبل انھیں صرف رئیسوں اور سرداروں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور قرآن ان کی حیثیت اخلاقی و دینی نگرانِ کار کی قرار دیتا ہے۔

۳۲- یعنی جو رسول بھی میری طرف سے آئیں، ان کی دعوت پر اگر تم لبیک کہتے اور ان کی مدد کرتے رہے۔

۳۳- یعنی خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے رہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اُس ایک ایک پائی کو، جو انسان اس کی راہ میں خرچ کرے، کئی گُنے زیادہ انعام کے ساتھ واپس کرنے کا وعدہ فرماتا ہے، اس لیے قرآن میں جگہ جگہ راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کو ”قرض“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ ”اچھا قرض“ ہو، یعنی جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت خرچ کی جائے، خدا کے قانون کے مطابق خرچ کی جائے، اور خلوص و حُسنِ نیت کے ساتھ خرچ کی جائے۔

۳۴- کسی سے اُس کی بُرائیاں زائل کر دینے کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ راہِ راست کو اختیار کرنے اور خدا کی ہدایت کے مطابق فکر و عمل کے صحیح طریقے پر چلنے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان کا نفس بہت سی بُرائیوں سے، اور اس کا طرزِ زندگی بہت سی خرابیوں سے پاک ہوتا چلا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس اصلاح کے باوجود اگر کوئی شخص بحیثیتِ مجموعی کمال کے مرتبے کو نہ پہنچ سکے اور کچھ نہ کچھ بُرائیاں اس کے اندر باقی رہ جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان پر مؤاخذہ نہ فرمائے گا اور ان کو اس کے حساب سے ساقط کر دے گا، کیونکہ جس نے اساسی ہدایت اور بنیادی اِصلاح قبول کر لی ہو، اس کی جُزوی اور ضمنی بُرائیوں کا حساب لینے میں اللہ تعالیٰ سخت گیر نہیں ہے۔

وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ
كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿١٢﴾ فَبِمَا

اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اُس نے سَواء السّبیل[۳۵] گُم کر دی۔'' پھر یہ اُن کا

۳۵- یعنی اس نے ''سَوَاءَ السَّبِیل'' کو پاکر پھر کھو دیا اور وہ تباہی کے راستوں میں بھٹک نکلا۔ ''سَوَاء السَّبِیل'' کا ترجمہ ''توسُّط و اعتدال کی شاہراہ'' کیا جا سکتا ہے، مگر اس سے پُورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں اصل لفظ ہی کو جُوں کا تُوں لے لیا ہے۔

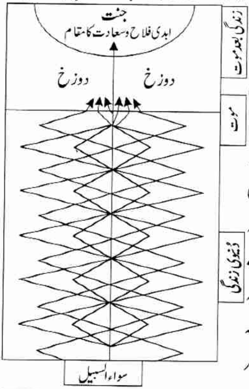
اِس لفظ کی معنویت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ انسان بجائے خود اپنی ذات میں ایک عالَمِ اصغر ہے، جس کے اندر بے شمار مختلف قوتیں اور قابلیتیں ہیں، خواہشیں ہیں، جذبات اور رُجحانات ہیں، نفس اور جسم کے مختلف مطالبے ہیں، رُوح اور طبیعت کے مختلف تقاضے ہیں۔ پھر ان افراد کے ملنے سے جو اجتماعی زندگی بنتی ہے، وہ بھی بے حد و حساب پیچیدہ تعلّقات سے مرکب ہوتی ہے اور تمدّن و تہذیب کے نَشوونُما کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ پھر دنیا میں جو سامانِ زندگی انسان کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، اس سے کام لینے اور اس کو انسانی تمدُّن میں استعمال کرنے کا سوال بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بکثرت شاخ در شاخ مسائل پیدا کرتا ہے۔

انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس پُورے عرصۂ حیات پر بیک وقت ایک متوازن نظر نہیں ڈال سکتا۔ اس بنا پر انسان اپنے لیے خود زندگی کا کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو، اس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے، اس کے سارے جذبات و رُجحانات میں توازُن قائم رہے، اس کے سب اندرونی و بیرونی تقاضے تناسُب کے ساتھ پورے ہوں، اس کی اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ملحوظ ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آئے، اور مادّی اشیا کو بھی شخصی اور تمدّنی زندگی میں عدل، انصاف اور حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہے۔ جب انسان خود اپنا رہنما اور اپنا شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو، زندگی کی ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت، حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک مسئلہ اس کے دماغ پر اس طرح مسلّط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ یا بلا ارادہ بے انصافی کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی اِس رائے کے زبردستی نافذ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازُن بگڑ جاتا ہے اور وہ بے اعتدالی کی کسی ایک انتہا کی طرف ٹیڑھی چلنے لگتی ہے۔ پھر جب یہ ٹیڑھی چال اپنے آخری حُدُود پر پہنچتے پہنچتے انسان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو وہ پہلو اور وہ ضروریات اور وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی، بغاوت شروع کر دیتے ہیں اور زور لگانا شروع کرتے ہیں کہ اُن کے ساتھ انصاف ہو۔ مگر انصاف پھر بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ پھر وہی عمل رُونما

ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک، جو سابق بے اعتدالی کی بدولت سب سے زیادہ دبایا گیا تھا، انسانی دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے مخصُوص مقتضا کے مطابق ایک خاص رُخ پر بہالے جاتا ہے، جس میں پھر دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ بے انصافی ہونے لگتی ہے۔ اِس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیشہ وہ ہچکولے ہی کھاتی رہتی ہے اور تباہی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈُھلکتی چلی جاتی ہے۔ تمام وہ راستے جو خود انسان نے اپنی زندگی کے لیے بنائے ہیں، خطِ مُنحنی کی شکل میں واقع ہیں، غلط سَمت سے چلتے ہیں اور غلط سَمت پر ختم ہو کر پھر کسی دوسری غلط سَمت کی طرف مُڑ جاتے ہیں۔

اِن بہت سے ٹیڑھے اور غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں واقع ہو، جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ، اس کے تمام جذبات ورُجحانات کے ساتھ، اس کی رُوح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ، اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پُورا پُورا انصاف کیا گیا ہو، جس کے اندر کوئی ٹیڑھ، کوئی کجی، کسی پہلو کی بے جا رعایت اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ ظلم اور بے انصافی نہ ہو، انسانی زندگی کے صحیح ارتقا اور اس کی کامیابی و بامُرادی کے لیے سخت ضروری ہے۔ انسان کی عین فطرت اس راہ کی طالب ہے، اور مختلف ٹیڑھے راستوں سے بار بار اُس کے بغاوت کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس سیدھی شاہراہ کو ڈھونڈتی ہے۔ مگر انسان خود اس شاہراہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس کی طرف صرف خدا رہنمائی کر سکتا ہے، اور خدا نے اپنے رسول اسی لیے بھیجے ہیں کہ اِس راہِ راست کی طرف انسان کی رہنمائی کریں۔

قرآن اسی راہ کو سَوَاء السبیل اور صراطِ مستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دُنیا کی اِس زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک بے شمار ٹیڑھے راستوں کے درمیان سے سیدھی گزرتی چلی جاتی ہے۔ جو اس پر چلا، وہ یہاں راست رَو اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے، اور جس نے اس راہ کو گم کر دیا، وہ یہاں غلط بیں، غلط رَو اور غلط کار ہے، اور آخرت میں لامحالہ اُسے دوزخ میں جانا ہے، کیونکہ زندگی کے تمام ٹیڑھے راستے دوزخ کی طرف جاتے ہیں۔



موجودہ زمانے کے بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی پے درپے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکّے کھاتی چلی جا رہی ہے، یہ غلط نتیجہ نکال لیا کہ ''جَدَلی عمل'' (dialectical process) انسانی زندگی کے ارتقا کا فطری طریق ہے۔ وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقا کا راستہ یہی ہے کہ پہلے ایک انتہا پسندانہ دعویٰ (thesis) اُسے ایک رُخ پر بہا لے جائے، پھر

نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوۡا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنۡهُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ

اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دُور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا اُلٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، جو تعلیم انھیں دی گئی تھی، اُس کا بڑا حصّہ بُھول چکے ہیں، اور آئے دن تمھیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتا چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ (پس جب یہ اِس حال کو پہنچ چکے ہیں تو جو شرارتیں بھی یہ کریں، وہ ان سے عین متوقع ہیں)

اِس کے جواب میں دوسرا ویسا ہی انتہا پسندانہ دعویٰ (antithesis) اُسے دُوسری انتہا کی طرف کھینچے، اور پھر دونوں کے امتزاج (synthesis) سے ارتقائے حیات کا راستہ بنے۔ حالانکہ دراصل یہ ارتقا کی راہ نہیں ہے بلکہ بدنصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقا میں بار بار مانع ہو رہے ہیں۔ ہر انتہا پسندانہ دعویٰ زندگی کو اُس کے کسی ایک پہلو کی طرف موڑتا ہے اور اسے کھینچے لیے چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ سَوَاءَ السَّبِیل سے بہت دُور جا پڑتی ہے تو خود زندگی ہی کی بعض دُوسری حقیقتیں، جن کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی، اس کے خلاف بغاوت شروع کر دیتی ہیں اور یہ بغاوت ایک جوابی دعوے کی شکل اختیار کر کے اسے مخالف سمت میں کھینچنا شروع کرتی ہے۔ جُوں جُوں سَوَاءَ السَّبِیل قریب آتی ہے، ان متصادم دعووں کے درمیان مُصَالَحت ہونے لگتی ہے اور ان کے امتزاج سے وہ چیزیں وجود میں آتی ہیں جو انسانی زندگی میں نافع ہیں۔ لیکن جب وہاں نہ سَوَاءَ السَّبِیل کے نشانات دکھانے والی روشنی موجود ہوتی ہے اور نہ اس پر ثابت قدم رکھنے والا ایمان، تو وہ جوابی دعویٰ زندگی کو اس مقام پر ٹھیرنے نہیں دیتا بلکہ اپنے زور میں اُسے دوسری جانب انتہا تک کھینچتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ پھر زندگی کی کچھ دوسری حقیقتوں کی نفی شروع ہو جاتی ہے اور نتیجے میں ایک دوسری بغاوت اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اگر اِن کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہوتی اور انھوں نے سَوَاءَ السَّبِیل کو دیکھ لیا ہوتا، تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کے لیے ارتقا کا صحیح راستہ یہی سَوَاءَ السَّبِیل ہے، نہ کہ خطِ مُنحنی پر ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتے پھرنا۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ۱۳ وَمِنَ
الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا
مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ ۱۴
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا
مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ڛ

لٰہٰذا انھیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو، اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں۔

اِسی طرح ہم نے اُن لوگوں سے بھی پُختہ عہد لیا تھا جنھوں نے کہا تھا کہ ہم "نصارٰی"[۳۶] ہیں، مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصّہ اُنھوں نے فراموش کر دیا، آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور آپس کے بُغض و عناد کا بیج بو دیا، اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انھیں بتائے گا کہ وہ دنیا میں کیا بناتے رہے ہیں۔

اے اہلِ کتاب! ہمارا رسول تمھارے پاس آگیا ہے جو کتابِ الٰہی کی بہت سی اُن باتوں کو تمھارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے، اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے۔[۳۷]

---

۳۶ - لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ "نصارٰی" کا لفظ "ناصرہ" سے ماخوذ ہے جو مسیح علیہ السّلام کا وطن تھا۔ دراصل اس کا ماخذ "نصرت" ہے، اور اس کی بِنا وہ قول ہے جو مسیح علیہ السلام کے سوال مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (خدا کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں؟) کے جواب میں حَواریوں نے کہا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (ہم اللہ کے کام میں مددگار ہیں)۔ عیسائی مصنّفین کو بالعُموم محض ظاہری مُشابہت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسیحیّت کی ابتدائی تاریخ میں ناصریہ (Nazarenes) کے نام سے جو ایک فرقہ پایا جاتا تھا، اور جنھیں حقارت کے ساتھ ناصری اور ایبونی کہا جاتا تھا، انھی کے نام کو قرآن نے تمام عیسائیوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ انھوں نے خود کہا تھا کہ ہم "نصارٰی" ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ عیسائیوں نے اپنا نام کبھی ناصری نہیں رکھا۔ (اس مسئلے کی مزید تشریح کے لیے

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ
مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٦﴾ لَقَدْ
كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ

تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو، جو اس کی رضا کے طالب ہیں، سلامتی کے طریقے بتاتا ہے[۳۸] اور اپنے اذن سے اُن کو اندھیروں سے نکال کر اُجالے کی طرف لاتا ہے اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ مسیحؑ ابنِ مریم ہی خدا ہے[۳۹]۔ اے محمدؐ! ان سے کہو کہ

صفحہ ۵۱۷ پر ضمیمے میں الگ نوٹ درج ہے)۔

۳۷ – یعنی تمھاری بعض چوریاں اور خیانتیں کھول دیتا ہے جن کا کھولنا دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے ناگزیر ہے، اور بعض سے چشم پوشی اختیار کر لیتا ہے جن کے کھولنے کی کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے۔

۳۸ – ’’سلامتی‘‘ سے مراد غلط بینی، غلط اندیشی اور غلط کاری سے بچنا اور اس کے نتائج سے محفوظ رہنا ہے۔ جو شخص اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی زندگی سے روشنی حاصل کرتا ہے، اُسے فکر و عمل کے ہر چوراہے پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح ان غلطیوں سے محفوظ رہے۔

۳۹ – عیسائیوں نے ابتداءً مسیحؑ کی شخصیت کو انسانیّت اور اُلوہیّت کا مُرکّب قرار دے کر جو غلطی کی تھی، اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے لیے مسیحؑ کی حقیقت ایک مُعمّا بن کر رہ گئی، جسے اُن کے علما نے لفّاظی اور قیاس آرائی کی مدد سے حل کرنے کی جتنی کوشش کی، اُتنے ہی زیادہ اُلجھتے چلے گئے۔ اُن میں سے جس کے ذہن پر اِس مُرکّب شخصیت کے جُزوِ انسانی نے غلبہ کیا، اس نے مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے اور تین مستقل خداؤں میں سے ایک ہونے پر زور دیا۔ اور جس کے ذہن پر جُزوِ اُلوہیّت کا اثر زیادہ غالب ہوا، اس نے مسیحؑ کو اللہ تعالیٰ کا جسمانی ظُہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے کی حیثیت ہی سے مسیحؑ کی عبادت کی۔ ان کے درمیان بیچ کی راہ جنھوں نے نکالنی چاہی، انھوں نے سارا زور ایسی لفظی تعبیریں فراہم کرنے پر صَرف کر دیا جن سے مسیحؑ کو انسان بھی کہا جاتا رہے اور اس کے ساتھ خدا بھی سمجھا جا سکے، خدا اور مسیحؑ الگ الگ بھی ہوں اور پھر ایک بھی رہیں۔ (ملاحظہ ہو: سُورۂ نساء، حاشیہ ۲۱۲، ۲۱۳ و ۲۱۵)

فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ
مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ۝ ١٧ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ
وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ
مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

اگر خدا مسیحؑ ابنِ مریم اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اُس کو اِس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور اُن سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے[۴۰] اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔

یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پُوچھو: پھر وہ تمھارے گناہوں پر تمھیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کیے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔

۴۰- اس فقرے میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ محض مسیحؑ کی اعجازی پیدایش اور ان کے اَخلاقی کمالات اور محسوس معجزات کو دیکھ کر جو لوگ اس دھوکے میں پڑ گئے کہ مسیحؑ ہی خدا ہے، وہ درحقیقت نہایت نادان ہیں۔ مسیحؑ تو اللہ کے بے شمار عجائبِ تخلیق میں سے محض ایک نمونہ ہے جسے دیکھ کر ان ضعیف البصر لوگوں کی نگاہیں چُندھیا گئیں۔ اگر اِن لوگوں کی نگاہ کچھ وسیع ہوتی تو انھیں نظر آتا کہ اللہ نے اپنی تخلیق کے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز نمونے پیش کیے ہیں اور اس کی قدرت کسی حد کے اندر محدود نہیں ہے۔ پس یہ بڑی بے دانشی ہے کہ مخلوق کے کمالات کو دیکھ کر اسی پر خالق ہونے کا گمان کر لیا جائے۔ دانشمند وہ ہیں جو مخلوق کے کمالات میں خالق کی عظیم الشان قدرت کے نشانات دیکھتے ہیں اور ان سے ایمان کا نور حاصل کرتے ہیں۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَ اِلَيْهِ
الْمَصِيْرُ ﴿١٨﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ
عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ
وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿١٩﴾ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ
يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٠﴾ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ

زمین اور آسمان اور ان کی ساری موجودات اس کی مِلک ہیں، اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔

اے اہلِ کتاب! ہمارا یہ رسول ایسے وقت تمھارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم تمھیں دے رہا ہے جب کہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدّت سے بند تھا، تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو دیکھو! اب وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آ گیا ـــــ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۴۱] ع

یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی اُس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمھیں عطا کی تھی۔ اُس نے تم میں نبی پیدا کیے، تم کو فرماں روا بنایا، اور تم کو وہ کچھ دیا جو دُنیا میں کسی کو نہ دیا تھا[۴۲]۔ اے برادرانِ قوم! اس مقدّس سرزمین میں داخل ہو جاؤ

۴۱ - اِس موقع پر یہ فقرہ نہایت بلیغ ولطیف ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جو خدا پہلے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بھیجنے پر قادر تھا، اسی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس خدمت پر مامور کیا ہے اور وہ ایسا کرنے پر قادر تھا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اس بشیر ونذیر کی بات نہ مانی تو یاد رکھو کہ اللہ قادر و توانا ہے۔ ہر سزا جو وہ تمھیں دینا چاہے بلا مُزاحمت دے سکتا ہے۔

۴۲ - یہ اشارہ ہے بنی اسرائیل کی اُس عظمتِ گزشتہ کی طرف جو حضرت موسٰی علیہ السلام سے بہت پہلے کسی

الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ وَ لَا تَرۡتَدُّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِکُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا
خٰسِرِیۡنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِنَّ فِیۡہَا قَوۡمًا جَبَّارِیۡنَ ٭ۖ وَ اِنَّا لَنۡ
نَّدۡخُلَہَا حَتّٰی یَخۡرُجُوۡا مِنۡہَا ۚ فَاِنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡہَا فَاِنَّا
دٰخِلُوۡنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمَا

جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے،[۴۳] پیچھے نہ ہٹو، ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے۔"[۴۴] انھوں نے جواب دیا: "اے موسیٰؑ! وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں، ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لیے تیار ہیں۔" اُن ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے[۴۵] جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ اُنھوں نے کہا کہ

زمانے میں اُن کو حاصل تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر اُن کی قوم میں پیدا ہوئے، اور دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں اور اُن کے بعد مصر میں اُن کو بڑا اِقتدار نصیب ہُوا۔ مدّتِ دراز تک یہی اس زمانے کی مہذّب دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے اور انھی کا سکّہ مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا۔ عُموماً لوگ بنی اسرائیل کے عُروج کی تاریخ حضرت موسیٰؑ سے شروع کرتے ہیں، لیکن قرآن اس مقام پر تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانۂ عُروج حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزر چکا تھا، جسے خود حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔

۴۳ – اِس سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا مَسکن رہ چکی تھی۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل آئے تو اسی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے نامزد فرمایا اور حکم دیا کہ جا کر اسے فتح کر لو۔

۴۴ – حضرت موسیٰؑ کی یہ تقریر اس موقع کی ہے جب کہ مصر سے نکلنے کے تقریباً دو سال بعد آپ اپنی قوم کو لیے ہوئے دشتِ فاران میں خیمہ زن تھے۔ یہ بیابان جزیرہ نمائے سینا میں عرب کی شمالی اور فلسطین کی جُنوبی سرحد سے متصل واقع ہے۔

۴۵ – قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جو لوگ جبّاروں سے ڈر رہے تھے، اُن کے درمیان سے دو شخص بول اُٹھے۔ دوسرا یہ کہ جو لوگ خدا سے ڈرنے والے تھے، ان میں سے دو شخصوں نے یہ بات کہی۔

ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَإِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَإِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى
اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى إِنَّا
لَنْ نَّدْخُلَهَآ أَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ
إِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّيْ لَآ أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِيْ
وَأَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَإِنَّهَا
مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْأَرْضِ ؕ

"اِن جبّاروں کے مقابلے میں دروازے کے اندر گُھس جاؤ، جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ پر بھروسا رکھو اگر تم مومن ہو۔" لیکن اُنھوں نے پھر یہی کہا کہ "اے موسیٰؑ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمھارا رب، دونوں جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" اس پر موسیٰؑ نے کہا: "اے میرے رب! میرے اختیار میں کوئی نہیں، مگر یا میری اپنی ذات یا میرا بھائی، پس تو ہمیں اِن نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔" اللہ نے جواب دیا: "اچھا تو وہ مُلک چالیس سال تک ان پر حرام ہے، یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے،[۴۶]

۴۶ – اِس قصّے کی تفصیلات بائبل کی کتاب گنتی، اِستثنا اور یشوع میں ملیں گی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دشتِ فاران سے بنی اسرائیل کے ۱۲ سرداروں کو فلسطین کا دَورہ کرنے کے لیے بھیجا، تاکہ وہاں کے حالات معلوم کر کے آئیں۔ یہ لوگ چالیس دن دَورہ کر کے وہاں سے واپس آئے اور انھوں نے قوم کے مجمعِ عام میں بیان کیا کہ واقعی وہاں دُودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، "لیکن جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں وہ زور آور ہیں...... ہم اس لائق نہیں ہیں کہ اُن لوگوں پر حملہ کریں...... وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب بڑے قد آور ہیں، اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبّار ہیں اور جبّاروں کی نسل سے ہیں، اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈّے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔" یہ بیان سُن کر سارا مجمع چیخ اُٹھا کہ "اے کاش ہم مصر ہی میں مر جاتے! یا کاش اِس بیابان ہی میں مرتے! خداوند! کیوں ہم کو اُس مُلک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے؟ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچّے لُوٹ کا مال ٹھیریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں۔" پھر وہ آپس میں کہنے لگے

ع
فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ ع وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ
ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وقف لازم
وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا
النصف یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۝ لَىِٕنْ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ

اِن نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ۔"[۴۷] ع

اور ذرا انھیں آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصّہ بھی بے کم و کاست سُنا دو۔ جب اُن دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دُوسرے کی نہ کی گئی۔ اُس نے کہا: "مَیں تجھے مار ڈالوں گا۔" اس نے جواب دیا: "اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔[۴۸] اگر تُو مجھے قتل کرنے کے لیے

کہ آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنالیں اور مصر کو لوٹ چلیں۔ اِس پر اُن بارہ سرداروں میں سے، جو فلسطین کے دَورے پر بھیجے گئے تھے، دو سردار، یُوشَع اور کالِب اُٹھے اور انھوں نے اِس بُزدلی پر قوم کو ملامت کی۔ کالِب نے کہا: "چلو ہم ایک دم جا کر اس ملک پر قبضہ کرلیں، کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرُّف کریں۔" پھر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا: "اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا...... فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو...... اور ہمارے ساتھ خداوند ہے، سو ان کا خوف نہ کرو۔" مگر قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ "انھیں سنگسار کردو۔" آخرکار اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے فیصلہ فرمایا کہ اچھا اب یُوشَع اور کالِب کے سوا اس قوم کے بالغ مَردوں میں سے کوئی بھی اُس سرزمین میں داخل نہ ہونے پائے گا۔ یہ قوم چالیس برس تک بے خانماں پھرتی رہے گی، یہاں تک کہ جب ان میں سے ۲۰ برس سے لے کر اُوپر کی عمر تک کے سب مرد مرجائیں گے اور نئی نسل جوان ہو کر اُٹھے گی، تب انھیں فلسطین فتح کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چنانچہ اس فیصلۂ خداوندی کے مطابق بنی اسرائیل کو دشتِ فاران سے شرقِ اُردُن تک پہنچتے پہنچتے پورے ۳۸ برس لگ گئے۔ اِس دَوران میں وہ سب لوگ مرکھپ گئے جو جوانی کی عمر میں مصر سے نکلے تھے۔ شرقِ اُردُن فتح کرنے کے بعد حضرت موسیٰؑ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت یُوشَع بن نُون کے عہدِ خلافت میں بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلسطین فتح کرسکیں۔

۴۷ — یہاں اس واقعے کا حوالہ دینے کی غرض سلسلۂ بیان پر غور کرنے سے صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ قصے کے پیرایے میں دراصل بنی اسرائیل کو یہ جتانا مقصود ہے کہ موسیٰؑ کے زمانے میں نافرمانی، انحراف اور پست ہمتی سے کام لے کر جو سزا تم نے پائی تھی، اب اس سے بہت زیادہ سخت سزا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں باغیانہ روش اختیار کرکے

لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ
رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ
مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۹﴾ فَطَوَّعَتْ
لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۳۰﴾

ہاتھ اُٹھائے گا تو مَیں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا،[۴۹] مَیں اللہ ربّ العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تُو ہی سمیٹ لے[۵۰] اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔'' آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر اُن لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

پاؤ گے۔

۴۸ – یعنی تیری قربانی اگر قبول نہیں ہوئی تو یہ میرے کسی قُصُور کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ تجھ میں تقویٰ نہیں ہے، لہٰذا میری جان لینے کے بجائے تجھ کو اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

۴۹ – اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر تُو مجھے قتل کرنے کے لیے آئے گا تو میں ہاتھ باندھ کر تیرے سامنے قتل ہونے کے لیے بیٹھ جاؤں گا اور مُدافعت نہ کروں گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تُو میرے قتل کے درپے ہوتا ہے تو ہو، میں تیرے قتل کے درپے نہ ہوں گا۔ تو میرے قتل کی تدبیر میں لگنا چاہے تو تجھے اختیار ہے، لیکن میں یہ جاننے کے بعد بھی کہ تو میرے قتل کی تیاریاں کر رہا ہے، یہ کوشش نہ کروں گا کہ پہلے مَیں ہی تجھے مار ڈالوں۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کسی شخص کا اپنے آپ کو خود قاتل کے آگے پیش کر دینا اور ظالمانہ حملے کی مُدافعت نہ کرنا کوئی نیکی نہیں ہے۔ البتہ نیکی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص میرے قتل کے درپے ہو اور میں جانتا ہوں کہ وہ میری گھات میں لگا ہُوا ہے، تب بھی میں اس کے قتل کی فکر نہ کروں اور اسی بات کو ترجیح دوں کہ ظالمانہ اقدام اُس کی طرف سے ہو، نہ کہ میری طرف سے۔ یہی مطلب تھا اس بات کا جو آدم علیہ السّلام کے اس نیک بیٹے نے کہی۔

۵۰ – یعنی بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کے قتل کی سعی میں ہم دونوں گناہ گار ہوں، میں اس کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ دونوں کا گناہ تنہا تیرے ہی حصّے میں آجائے، تیرے اپنے قاتلانہ اقدام کا گناہ بھی، اور اس نقصان کا گناہ بھی جو اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہوئے میرے ہاتھ سے تجھے پہنچ جائے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ
سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا
الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنْ معانقة ۵
اَجْلِ ذٰلِكَ ۛۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کھودنے لگا، تاکہ اُسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھُپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا: ”افسوس مجھ پر! میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھُپانے کی تدبیر نکال لیتا[51]۔“ اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا[52]۔

اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا[53] کہ ”جس نے کسی انسان کو خون کے

۵۱ – اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کے ذریعے سے آدمؑ کے اس غلط کار بیٹے کو اس کی جہالت و نادانی پر مُتنبِّہ کیا، اور جب ایک مرتبہ اس کو اپنے نفس کی طرف توجّہ کرنے کا موقع مل گیا تو اس کی ندامت صرف اسی بات تک محدود نہ رہی کہ وہ لاش چھپانے کی تدبیر نکالنے میں کوّے سے پیچھے کیوں رہ گیا، بلکہ اس کو یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر کے کتنی بڑی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ بعد کا فقرہ کہ وہ اپنے کیے پر پچھتایا، اسی مطلب پر دلالت کرتا ہے۔

۵۲ – یہاں اس واقعے کا ذکر کرنے سے مقصد یہودیوں کو ان کی اُس سازش پر لطیف طریقے سے ملامت کرنا ہے جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جلیل القدر صحابہؓ کو قتل کرنے کے لیے کی تھی (ملاحظہ ہو اِسی سورت کا حاشیہ ۳۰)۔ دونوں واقعات میں مماثلت بالکل واضح ہے۔ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے اِن اُمّیوں کو قبولیّت کا درجہ عطا فرمایا اور اُن پُرانے اہلِ کتاب کو رَد کر دیا، سراسر اِس بنیاد پر تھی کہ ایک طرف تقویٰ تھا اور دوسری طرف تقویٰ نہ تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ جنھیں رد کیا گیا تھا، اپنے مردود ہونے کی وجہ پر غور کرتے اور اُس قُصور کی تلافی کرنے پر مائل ہوتے جس کی وجہ سے وہ رَد کیے گئے تھے، ان پر ٹھیک اُسی جاہلیّت کا دَورہ پڑ گیا جس میں آدمؑ کا وہ غلط کار بیٹا مبتلا ہوا تھا، اور اُسی کی طرح وہ ان لوگوں کے قتل پر آمادہ ہو گئے جنھیں خدا نے قُبولیّت عطا فرمائی تھی۔ حالانکہ ظاہر تھا کہ ایسی جاہلانہ حرکتوں سے وہ خدا کے مقبول نہ ہو سکتے تھے، بلکہ یہ کرتوت انھیں اور زیادہ مردود بنا دینے والے تھے۔

۵۳ – یعنی چونکہ بنی اسرائیل کے اندر اُنھی صفات کے آثار پائے جاتے تھے جن کا اظہار آدمؑ کے اس ظالم بیٹے نے کیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو قتلِ نفس سے باز رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور اپنے فرمان میں یہ الفاظ لکھے

نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا
فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ؗ
ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّمَا
جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ

بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی، اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔[۵۴]" مگر اُن کا حال یہ ہے کہ ہمارے رُسول پے در پے ان کے پاس کُھلی کُھلی ہدایات لے کر آئے، پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دَو کرتے پھرتے

تھے۔ افسوس ہے کہ آج جو بائبل پائی جاتی ہے وہ فرمانِ خداوندی کے ان قیمتی الفاظ سے خالی ہے۔ البتہ تَلْمُود میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: "جس نے اسرائیل کی ایک جان کو ہلاک کیا، کتاب اللہ کی نگاہ میں اس نے گویا ساری دنیا کو ہلاک کیا، اور جس نے اسرائیل کی ایک جان کو محفوظ رکھا، کتاب اللہ کے نزدیک اس نے گویا ساری دنیا کی حفاظت کی۔" اسی طرح تَلْمُود میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ قتل کے مقدّمات میں بنی اسرائیل کے قاضی گواہوں کو خطاب کر کے کہا کرتے تھے کہ "جو شخص ایک انسان کی جان ہلاک کرتا ہے، وہ ایسی باز پُرس کا مستحق ہے کہ گویا اس نے دنیا بھر کے انسانوں کو قتل کیا ہے۔"

۵۴ – مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کی زندگی کا بقا منحصر ہے اس پر کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقا و تحفّظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے، وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیاتِ انسانی کے احترام سے اور ہمدردیِ نوع کے جذبے سے خالی ہے، لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے، کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افرادِ انسانی میں پائی جائے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے، وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے، کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقا کا انحصار ہے۔

فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ
وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ
خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ اِلَّا
الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ

ہیں کہ فساد برپا کریں[۵۵]، اُن کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سُولی پر چڑھائے جائیں، یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سَمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں[۵۶]۔ یہ ذلّت و رسوائی تو اُن کے لیے دُنیا میں ہے اور آخرت میں اُن کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ ـــــ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ

۵۵ - زمین سے مراد یہاں وہ مُلک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمّہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو۔ اور خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اُس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے مُلک میں قائم کر رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے اور اسی کے لیے اس نے اپنا رسول بھیجا تھا کہ زمین میں ایک ایسا صالح نظام قائم ہو جو انسان اور حیوان اور درخت اور ہر اُس چیز کو جو زمین پر ہے، امن بخشے، جس کے تحت انسانیت اپنی فطرت کے کمالِ مطلوب کو پہنچ سکے، جس کے تحت زمین کے وسائل اس طرح استعمال کیے جائیں کہ وہ انسان کی ترقی میں مددگار ہوں، نہ کہ اس کی تباہی و بربادی میں۔ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا، قطعِ نظر اس سے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو اُلٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کر دینے کے لیے، دراصل وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں ہر اُس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرے "بادشاہ کے خلاف لڑائی" (waging war against the king) کا مجرم قرار دیا گیا، چاہے اس کی کارروائی مُلک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ اس کی دست رس سے کتنا ہی دُور ہو۔

۵۶ - یہ مختلف سزائیں بر سبیلِ اجمال بیان کر دی گئی ہیں، تاکہ قاضی یا امامِ وقت اپنے اجتہاد سے ہر مُجرم کو اس کے جرم کی نوعیّت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو اُلٹنے کی کوشش کرنا بدترین جُرم ہے اور اسے ان انتہائی سزاؤں میں سے کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔

ع ۴

اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۴ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا
اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۵

اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[۵۷] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور اُس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو[۵۸] اور اس کی راہ میں جِدّ وجُہد کرو،[۵۹] شاید کہ تمھیں کامیابی نصیب ہو جائے۔

۵۷ – یعنی اگر وہ سعیِ فساد سے باز آگئے ہوں، اور صالح نظام کو درہم برہم کرنے یا اُلٹنے کی کوشش چھوڑ چکے ہوں، اور اُن کا بعد کا طرزِ عمل ثابت کر رہا ہو کہ وہ امن پسند، مطیع قانون، اور نیک چلن انسان بن چکے ہیں، اور اس کے بعد اُن کے سابق جرائم کا پتا چلے، تو اُن سزاؤں میں سے کوئی سزا اُن کو نہ دی جائے گی جو اُوپر بیان ہوئی ہیں۔ البتہ آدمیوں کے حُقوق پر اگر کوئی دست درازی انھوں نے کی تھی تو اس کی ذمّہ داری ان پر سے ساقط نہ ہوگی۔ مثلاً اگر کسی انسان کو انھوں نے قتل کیا تھا، یا کسی کا مال لیا تھا، یا کوئی اور جُرم انسانی جان و مال کے خلاف کیا تھا، تو اسی جرم کے بارے میں فوجداری مقدّمہ ان پر قائم کیا جائے گا، لیکن بغاوت اور غدّاری اور خدا و رسول کے خلاف مُحاربہ کا کوئی مقدّمہ نہ چلایا جائے گا۔

۵۸ – یعنی ہر اُس ذریعے کے طالب اور جویاں رہو جس سے تم اللہ کا تقرُّب حاصل کر سکو اور اس کی رضا کو پہنچ سکو۔

۵۹ – اصل میں لفظ جَاهِدُوْا استعمال فرمایا گیا ہے، جس کا مفہُوم محض ”جِدّ وجُہد“ سے پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ مجاہدہ کا لفظ مقابلے کا مُقتضی ہے اور اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو قوتیں اللہ کی راہ میں مزاحم ہیں، جو تم کو خدا کی مرضی کے مطابق چلنے سے روکتی اور اس کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں، جو تم کو پُوری طرح خدا کا بندہ بن کر نہیں رہنے دیتیں اور تمھیں اپنا یا کسی غیر اللہ کا بندہ بننے پر مجبور کرتی ہیں، ان کے خلاف اپنی تمام اِمکانی طاقتوں سے کشمکش اور جِدّ وجُہد کرو۔ اسی جدوجہد پر تمھاری فلاح و کامیابی کا اور خدا سے تمھارے تقرب کا انحصار ہے۔

اس طرح یہ آیت بندۂ مومن کو ہر محاذ پر چوطرفہ لڑائی لڑنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ایک طرف ابلیسِ لعین اور اس کا شیطانی لشکر ہے۔ دوسری طرف آدمی کا اپنا نفس اور اس کی سرکش خواہشات ہیں۔ تیسری طرف خدا سے پھرے ہوئے بہت سے انسان ہیں جن کے ساتھ آدمی ہر قسم کے معاشرتی، تمدّنی اور مَعاشی تعلّقات میں بندھا ہوا ہے۔ چوتھی طرف وہ غلط مذہبی، تمدّنی اور سیاسی نظام ہیں جو خدا سے بغاوت پر قائم ہوئے ہیں اور بندگیِ حق کے بجائے بندگیِ باطل پر انسان کو مجبُور کرتے ہیں۔ ان سب کے حربے مختلف ہیں مگر سب کی ایک ہی کوشش ہے کہ آدمی کو خدا کے بجائے اپنا مطیع بنائیں۔ بخلاف اس کے آدمی کی ترقی کا اور تقربِ خداوندی کے مقام تک اس کے عُروج کا انحصار بالکُلّیہ اس پر ہے کہ وہ سراسر خدا کا مطیع اور باطن سے لے کر ظاہر تک خالصتاً اس کا بندہ بن جائے۔ لہٰذا اپنے مقصود تک اس کا پہنچنا بغیر اِس کے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ
مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٣٦﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ
وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٣٧﴾
وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا

خُوب جان لو کہ جن لوگوں نے کفر کا رَوِیّہ اختیار کیا ہے، اگر اُن کے قبضے میں ساری زمین کی دولت ہو اور اتنی ہی اَور اس کے ساتھ، اور وہ چاہیں کہ اسے فدیے میں دے کر روزِ قیامت کے عذاب سے بچ جائیں، تب بھی وہ ان سے قبول نہ کی جائے گی اور انھیں دردناک سزا مل کر رہے گی۔ وہ چاہیں گے کہ دوزخ کی آگ سے نکل بھاگیں، مگر نہ نکل سکیں گے اور انھیں قائم رہنے والا عذاب دیا جائے گا۔

اور چور، خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو[60]، یہ اُن کی کمائی کا بدلہ ہے

ممکن نہیں ہے کہ وہ اِن تمام مانع و مزاحم قوتوں کے خلاف بیک وقت جنگ آزما ہو، ہر وقت ہر حال میں ان سے کشمکش کرتا رہے اور ان ساری رُکاوٹوں کو پامال کرتا ہُوا خدا کی راہ میں بڑھتا چلا جائے۔

۶۰ — دونوں ہاتھ نہیں بلکہ ایک ہاتھ۔ اور اُمت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ پہلی چوری پر سیدھا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ لا قطع علی خائنٍ۔ اس سے معلوم ہوا کہ سَرِقے کا اطلاق خیانت وغیرہ پر نہیں ہوتا، بلکہ صرف اِس فعل پر ہوتا ہے کہ آدمی کسی کے مال کو اس کی حفاظت سے نکال کر اپنے قبضے میں کر لے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ ایک ڈھال کی قیمت سے کم کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ ایک ڈھال کی قیمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بروایتِ عبداللہ بن عباسؓ دس درہم، بروایتِ ابنِ عمرؓ تین درہم، بروایتِ اَنسؓ بن مالک ۵ دِرہم، اور بروایتِ حضرت عائشہؓ ایک چوتھائی دینار ہوتی تھی۔ اسی اختلاف کی بنا پر فقہا کے درمیان کم سے کم نصابِ سرقہ میں اختلاف ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سرقے کا نصاب دس درہم ہے، اور امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک چوتھائی دینار۔ (اُس زمانے کے درہم میں تین ماشہ $1\frac{1}{5}$ رتی چاندی ہوتی تھی، اور ایک چوتھائی دینار ۳ دِرہم کے برابر تھا)۔

نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٨﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ کی نظرِ عنایت پھر اس پر مائل ہوجائے گی،[61] اللہ بہت درگزر کرنے والا

پھر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے گی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ لا قطع فی ثمرۃ ولا کثر (پھل اور ترکاری کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا)۔ لا قطع فی طعام (کھانے کی چوری میں قطعِ ید نہیں ہے)۔ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ لم یکن قطع السارق علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الشیء التافہ (حقیر چیزوں کی چوری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا)۔ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کا فیصلہ ہے اور صحابۂ کرامؓ میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے کہ لا قطع فی الطّیر (پرندے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے)۔ نیز سیّدنا عمرو علی رضی اللہ عنہما نے بیت المال سے چوری کرنے والے کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا اور اس معاملے میں بھی صحابۂ کرامؓ میں سے کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے۔ اِن مآخذ کی بنیاد پر مختلف ائمۂ فقہ نے مختلف چیزوں کو قطعِ ید کے حکم سے مُستثنیٰ قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ترکاریاں، پھل، گوشت، پکا ہوا کھانا، غلّہ جس کا ابھی کھلیان نہ کیا گیا ہو، کھیل اور گانے بجانے کے آلات وہ چیزیں ہیں جن کی چوری میں قطعِ ید کی سزا نہیں ہے۔ نیز جنگل میں چرتے ہوئے جانوروں کی چوری اور بیت المال کی چوری میں بھی وہ قطعِ ید کے قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی بعض چیزوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اِن چوریوں پر سرے سے کوئی سزا ہی نہ دی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ان جرائم میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

٦١ – اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کٹنے کے بعد جو شخص توبہ کر لے اور اپنے نفس کو چوری سے پاک کر کے اللہ کا صالح بندہ بن جائے، وہ اللہ کے غضب سے بچ جائے گا، اور اللہ اس کے دامن سے اس داغ کو دھو دے گا۔ لیکن اگر کسی شخص نے ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی اپنے آپ کو بدنیتی سے پاک نہ کیا اور وہی گندے جذبات اپنے اندر پرورش کیے جن کی بنا پر اس نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا، تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہاتھ تو اس کے بدن سے جدا ہوگیا مگر چوری اس کے نفس میں بدستور موجود رہی، اس وجہ سے وہ خدا کے غضب کا اسی طرح مستحق رہے گا جس طرح ہاتھ کٹنے سے پہلے تھا۔ اِسی لیے قرآنِ مجید چور کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اللہ سے معافی مانگے اور اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ کیونکہ ہاتھ کاٹنا تو انتظامِ تمدّن کے لیے ہے۔ اس سزا سے نفس پاک نہیں ہوسکتا۔ نفس کی پاکی صرف توبہ اور رُجوع اِلی اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں مذکور ہے کہ ایک چور کا ہاتھ جب آپؐ کے حکم کے مطابق کاٹا جاچکا تو آپؐ نے اُسے اپنے پاس بلایا اور اس سے فرمایا: قل استغفر اللہ

رَّحِيْمٌ ﴿٣٩﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿٤٠﴾ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ

اور رحم فرمانے والا ہے۔ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک ہے؟ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے، وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے۔

اے پیغمبرؐ! تمھارے لیے باعثِ رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں[۶۲]۔

واتوب الیہ،" کہہ، میں خدا سے معافی چاہتا ہوں اور اس سے توبہ کرتا ہوں۔" اُس نے آپؐ کی تلقین کے مطابق یہ الفاظ کہے۔ پھر آپؐ نے اس کے حق میں دعا فرمائی کہ اَللّٰھُمَّ تُبْ عَلَیْہِ۔" خدایا! اسے معاف فرما دے۔"

۶۲ – یعنی جن کی ذہانتیں اور سرگرمیاں ساری کی ساری اس کوشش میں صَرف ہو رہی ہیں کہ جاہلیّت کی جو حالت پہلے سے چلی آ رہی ہے وہی برقرار رہے اور اسلام کی یہ اصلاحی دعوت اُس بگاڑ کو دُرست کرنے میں کامیاب نہ ہونے پائے۔ یہ لوگ تمام اَخلاقی بندشوں سے آزاد ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر قسم کی رکیک سے رکیک چالیں چل رہے تھے۔ جان بُوجھ کر حق نگل رہے تھے۔ نہایت بے باکی و جسارت کے ساتھ جھوٹ، فریب، دغا اور مکر کے ہتھیاروں سے اُس پاک انسان کے کام کو شکست دینے کی کوشش کر رہے تھے جو کامل بے غَرضی کے ساتھ سراسر خیر خواہی کی بنا پر عام انسانوں کی اور خود اُن کی فلاح و بہبود کے لیے شب و روز محنت کر رہا تھا۔ اُن کی اِن حرکات کو دیکھ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دل کُڑھتا تھا، اور یہ کُڑھنا بالکل فطری امر تھا۔ جب کسی پاکیزہ انسان کو پست اخلاق لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے اور وہ محض اپنی جہالت اور خود غرضی و تنگ نظری کی بنا پر اس کی خیر خواہانہ مساعی کو روکنے کے لیے گھٹیا درجے کی چال بازیوں سے کام لیتے ہیں تو فطرتاً اُس کا دل دُکھتا ہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ نہیں ہے کہ اِن حرکات پر جو فطری رنج آپؐ کو ہوتا ہے وہ نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ منشا دراصل یہ ہے کہ اس سے آپؐ دل شکستہ نہ ہوں، ہمّت نہ ہاریں، صبر کے ساتھ بندگانِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کیے چلے جائیں۔ رہے یہ لوگ، تو جس قسم کے ذلیل اخلاق انھوں نے اپنے اندر پرورش کیے ہیں، اُن کی بنا پر یہ روش ان سے عین متوقع ہے، کوئی چیز اِن کی اِس روش میں خلافِ توقع نہیں ہے۔

مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ
الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ ۝ مع ٣ الوقف على الاول اجوز ١٢
يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ
اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ

خواہ وہ اُن میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل اُن کے ایمان نہیں لائے، یا اُن میں سے ہوں جو یہودی بن گئے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ جھُوٹ کے لیے کان لگاتے ہیں[63]، اور دُوسرے لوگوں کی خاطر، جو تمھارے پاس کبھی نہیں آئے، سُن گُن لیتے پھرتے ہیں[64]، کتاب اللہ کے الفاظ کو اُن کا صحیح محل متعیّن ہونے کے باوجود اصل معنیٰ سے پھیرتے ہیں[65]، اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمھیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو[66]۔ جسے اللہ ہی نے فتنے میں

---

٦٣ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ یہ لوگ چونکہ خواہشات کے بندے بن گئے ہیں، اس لیے سچّائی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جھُوٹ ہی انھیں پسند آتا ہے اور اسی کو یہ جی لگا کر سُنتے ہیں، کیونکہ ان کے نفس کی پیاس اُسی سے بُجھتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مجلسوں میں یہ جھُوٹ کی غرض سے آ کر بیٹھتے ہیں، تاکہ یہاں جو کچھ دیکھیں اور جو باتیں سُنیں، اُن کو اُلٹے معنیٰ پہنا کر یا ان کے ساتھ اپنی طرف سے غلط باتوں کی آمیزش کر کے آنحضرتؐ اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے لوگوں میں پھیلائیں۔

٦٤ – اس کے بھی دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ جاسوس بن کر آتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مجلسوں میں اس لیے گشت لگاتے پھرتے ہیں کہ کوئی راز کی بات کان میں پڑے تو اسے آپؐ کے دشمنوں تک پہنچائیں۔ دوسرے یہ کہ جھوٹے الزامات عائد کرنے اور افترا پردازیاں کرنے کے لیے مواد فراہم کرتے پھرتے ہیں، تاکہ اُن لوگوں میں بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پھیلائیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے براہِ راست تعلقات پیدا کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔

٦٥ – یعنی تورات کے جو احکام ان کی خواہشات کے مطابق نہیں ہیں، ان کے اندر جان بُوجھ کر ردّ و بدل کرتے ہیں اور الفاظ کے معنیٰ بدل کر من مانے احکام ان سے نکالتے ہیں۔

٦٦ – یعنی جاہل عوام سے کہتے ہیں کہ جو حکم ہم بتا رہے ہیں، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی حکم تمھیں بتائیں تو اسے قبول کرنا ورنہ رد کر دینا۔

فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ
يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚۖ وَّ لَهُمْ
فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ
لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ

ڈالنے کا ارادہ کرلیا ہو، اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کے لیے تم کچھ نہیں کر سکتے۔[۶۷] یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا،[۶۸] ان کے لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا۔

یہ جھُوٹ سُننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں،[۶۹] لہٰذا اگر یہ تمھارے پاس (اپنے مقدّمات لے کر) آئیں تو تمھیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو، ورنہ انکار کردو۔

۶۷ – اللہ کی طرف سے کسی کے فتنے میں ڈالے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے اندر اللہ تعالیٰ کسی قسم کے بُرے میلانات پرورش پاتے دیکھتا ہے، اس کے سامنے پے در پے ایسے مواقع لاتا ہے جن میں اس کی سخت آزمایش ہوتی ہے۔ اگر وہ شخص ابھی بُرائی کی طرف پوری طرح نہیں جھکا ہے تو ان آزمایشوں سے سنبھل جاتا ہے اور اس کے اندر بدی کا مقابلہ کرنے کے لیے نیکی کی جو قوتیں موجود ہوتی ہیں وہ اُبھر آتی ہیں۔ لیکن اگر وہ بُرائی کی طرف پُوری طرح جھک چکا ہوتا ہے اور اس کی نیکی اس کی بدی سے اندر ہی اندر شکست کھا چکی ہوتی ہے تو ہر ایسی آزمایش کے موقع پر وہ اور زیادہ بدی کے پھندے میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا وہ فتنہ ہے جس سے کسی بگڑتے ہوئے انسان کو بچالینا اس کے کسی خیر خواہ کے بس میں نہیں ہوتا۔ اور اس فتنے میں صرف افراد ہی نہیں ڈالے جاتے بلکہ قومیں بھی ڈالی جاتی ہیں۔

۶۸ – اس لیے کہ انھوں نے خود پاک ہونا نہ چاہا۔ جو خود پاکیزگی کا خواہش مند ہوتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے، اُسے پاکیزگی سے محروم کرنا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ اللہ پاک کرنا اُسی کو نہیں چاہتا جو خود پاک ہونا نہیں چاہتا۔

۶۹ – یہاں خاص طور پر اُن کے مفتیوں اور قاضیوں کی طرف اشارہ ہے جو جھُوٹی شہادتیں لے کر اور جھُوٹی روداد یں سُن کر اُن لوگوں کے حق میں انصاف کے خلاف فیصلے کیا کرتے تھے جن سے انھیں رشوت پہنچ جاتی تھی یا جن کے ساتھ ان کے ناجائز مفاد وابستہ ہوتے تھے۔

وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾
وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ
ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ ع

ع ۶

انکار کر دو تو یہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو، کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۷۰ ـــــ اور یہ تمھیں کیسے حَکَم بناتے ہیں جب کہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہُوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟۷۱ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے ع

۷۰ - یہودی اس وقت تک اسلامی حکومت کی باقاعدہ رعایا نہیں بنے تھے بلکہ اسلامی حکومت کے ساتھ ان کے تعلّقات مُعاہَدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رُو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی اور ان کے مقدّمات کے فیصلے انھی کے قوانین کے مطابق اُن کے اپنے جج کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یا آپؐ کے مقرر کردہ قاضیوں کے پاس اپنے مقدّمات لانے کے لیے وہ ازرُوئے قانون مجبور نہ تھے۔ لیکن یہ لوگ جن معاملات میں خود اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ کرنا نہ چاہتے تھے، اُن کا فیصلہ کرانے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس اُمید پر آ جاتے تھے کہ شاید آپؐ کی شریعت میں ان کے لیے کوئی دوسرا حکم ہو اور اس طرح وہ اپنے مذہبی قانون کی پیروی سے بچ جائیں۔

یہاں خاص طور پر جس مقدّمے کی طرف اشارہ ہے، وہ یہ تھا کہ خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلّق پایا گیا۔ تورات کی رُو سے ان کی سزا رجم تھی، یعنی یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے (اِستِثنا، باب ۲۲، آیت ۲۳-۲۴)۔ لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدّمے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پنچ بنایا جائے۔ اگر وہ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قُبول کر لیا جائے، اور رجم ہی کا حکم دیں تو نہ قبول کیا جائے۔ چنانچہ مقدّمہ آپؐ کے سامنے لایا گیا۔ آپؐ نے رجم کا حکم دیا۔ انھوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر آپؐ نے پوچھا: تمھارے مذہب میں اس کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے کہا: کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا۔ آپؐ نے ان کے علما کو قسم دے کر اُن سے پوچھا: کیا تورات میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی یہی سزا ہے؟ انھوں نے پھر وہی جھوٹا جواب دیا۔ لیکن ان میں سے ایک شخص ابنِ صوریا، جو خود یہودیوں کے بیان

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ‌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوۡا عَلَيۡهِ

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی، جو مُسلم تھے، اُسی کے مطابق اِن یہودی بن جانے والوں[۷۲] کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے، اور اِسی طرح ربّانی اور اَحبار[۷۳] بھی (اسی پر فیصلے کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انھیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمّہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر

کے مطابق اپنے وقت میں تورات کا سب سے بڑا عالم تھا، خاموش رہا۔ آپؐ نے اُس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں تجھے اُس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور طُور پر تمھیں شریعت عطا کی، کیا واقعی تورات میں زِنا کی یہی سزا لکھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ”اگر آپؐ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زِنا کی سزا تو رجم ہی ہے، مگر ہمارے ہاں جب زِنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حُکّام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو انھیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو انھیں رجم کر دیا جاتا۔ پھر جب اس سے عوام میں ناراضی پیدا ہونے لگی تو ہم نے تورات کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنالیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور انھیں منہ کالا کر کے گدھے پر اُلٹے منہ سوار کیا جائے۔“ اس کے بعد یہودیوں کے لیے کچھ بولنے کی گنجائش نہ رہی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے زانی اور زانیہ کو سنگسار کر دیا گیا۔

۷۱ – اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اِن لوگوں کی بددیانتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ ”مذہبی لوگ“ جنھوں نے تمام عرب پر اپنی دین داری اور اپنے علمِ کتاب کا سِکّہ جما رکھا تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ جس کتاب کو خود کتاب اللہ مانتے تھے اور جس پر ایمان رکھنے کے مدّعی تھے، اس کے حکم کو چھوڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدّمہ لائے تھے جن کے پیغمبر ہونے سے ان کو بشدّت انکار تھا۔ اس سے یہ راز بالکل فاش ہو گیا کہ یہ کسی چیز پر بھی صداقت کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے، دراصل ان کا ایمان اپنے نفس اور اس کی خواہشات پر ہے، جسے کتاب اللہ مانتے ہیں اس سے صرف اس لیے منہ موڑتے ہیں کہ اس کا حکم ان کے نفس کو ناگوار ہے، اور جسے معاذ اللہ! جھوٹا مدّعیِ نبوت کہتے ہیں، اس کے پاس صرف اس اُمید پر جاتے ہیں کہ شاید وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ حاصل ہو جائے جو ان کے منشا کے مطابق ہو۔

۷۲ – یہاں ضمناً اس حقیقت پر بھی مُتنبِّہ کر دیا گیا کہ انبیاؑ سب کے سب ”مسلم“ تھے، بخلاف اس کے یہ یہودی ”اِسلام“ سے ہٹ کر اور فرقہ بندی میں مبتلا ہو کر صرف ”یہودی“ بن کر رہ گئے تھے۔

۷۳ – ربّانی: عُلماء۔ اَحبار: فُقہا۔

شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا
قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾
وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ
الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ
قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ
مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ

گواہ تھے۔ پس (اے گروہِ یہود!) تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت، اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ[۷۴]۔ پھر جو قِصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفّارہ[۷۵] ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا۔ تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا، وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا۔ اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں

۷۴ – تقابل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تورات کی کتابِ خُروج، باب ۲۱، آیت ۲۳-۲۵۔

۷۵ – یعنی جو شخص صدقہ کی نیت سے قِصاص معاف کر دے اس کے حق میں یہ نیکی اس کے بہت سے گناہوں کا کَفّارہ ہو جائے گی۔ اسی معنیٰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ من جرح فی جسدہ جراحة فتصدق بھا کفر عنه ذنوبه بمثل ما تصدق بہ– یعنی جس کے جسم میں کوئی زخم لگایا گیا اور اس نے معاف کر دیا، تو جس درجے کی

هُدًى وَّنُورٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى
وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ؕ ﴿۴۶﴾ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اُس وقت موجود تھا اُس کی تصدیق کرنے والی تھی[۷۶] اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہلِ انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں[۷۷]۔

یہ معافی ہوگی اسی کے بقدر اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

۷۶ – یعنی مسیح علیہ السلام کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہی ایک دین، جو تمام پچھلے انبیاؑ کا دین تھا، مسیحؑ کا دین بھی تھا اور اسی کی طرف وہ دعوت دیتے تھے۔ تورات کی اصل تعلیمات میں سے جو کچھ ان کے زمانے میں محفوظ تھا اس کو مسیحؑ خود بھی مانتے تھے اور انجیل بھی اس کی تصدیق کرتی تھی (مُلاحظہ ہو: مَتّی، باب ۵، آیت ۱۷-۱۸)۔ قرآن اس حقیقت کا بار بار اعادہ کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے انبیاؑ دنیا کے کسی گوشے میں آئے ہیں، اُن میں سے کوئی بھی پچھلے انبیاؑ کی تردید کے لیے اور ان کے کام کو مٹا کر اپنا نیا مذہب چلانے کے لیے نہیں آیا تھا، بلکہ ہر نبی اپنے پیشرو انبیاؑ کی تصدیق کرتا تھا اور اسی کام کو فروغ دینے کے لیے آتا تھا جسے اگلوں نے ایک پاک ورثے کی حیثیت سے چھوڑا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کوئی کتاب اپنی ہی پچھلی کتابوں کی تردید کرنے کے لیے کبھی نہیں بھیجی، بلکہ اس کی ہر کتاب پہلے آئی ہوئی کتابوں کی مؤیّد اور مصدِّق تھی۔

۷۷ – یہاں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کیے ہیں: ایک یہ کہ وہ کافر ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے، وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے: اوّلاً اس کا یہ فعل حکمِ خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے، کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا، اس لیے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی و اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا، اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا

پھر اے محمدؐ! ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور "الکتاب" میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اُس کی تصدیق کرنے[٧٨] والی اور اس کی محافظ ونگہبان ہے[٧٩]۔ لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق

از حکمِ خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو، وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ البتہ جس طرح انحراف کے دَرَجات ومراتب میں فرق ہے، اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں بھی فرق ہے۔ جو شخص حکمِ الٰہی کے خلاف اس بنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے، وہ مکمل کافر اور ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو اعتقاداً حکمِ الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج از ملّت تو نہیں ہے، مگر اپنے ایمان کو کفر، ظلم اور فسق سے مخلوط کر رہا ہے۔ اِسی طرح جس نے تمام معاملات میں حکمِ الٰہی سے انحراف اختیار کر لیا ہے، وہ تمام معاملات میں کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے، اس کی زندگی میں ایمان واسلام اور کفر وظلم وفسق کی آمیزش ٹھیک ٹھیک اسی تناسُب کے ساتھ ہے جس تناسُب کے ساتھ اس نے اطاعت اور انحراف کو ملا رکھا ہے۔ بعض اہلِ تفسیر نے ان آیات کو اہلِ کتاب کے ساتھ مخصوص قرار دینے کی کوشش کی ہے، مگر کلامِ الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کے لیے کوئی گنجایش موجود نہیں۔ اس تاویل کا بہترین جواب وہ ہے جو حضرت حُذَیفہ رضی اللہ عنہ نے دیا ہے۔ ان سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔ کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ہو، وہی کافر، وہی ظالم اور وہی فاسق ہے۔ اس پر حضرت حُذَیفہؓ نے فرمایا: نعم الاخوة لکم بنو اسرائیل ان کانت لھم کل مُرّة ولکم کل حلوة کلّا واللّٰہ لتسلکن طریقھم قدر الشراك۔ "کتنے اچھے بھائی ہیں تمھارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب اُن کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمھارے لیے! ہرگز نہیں، خدا کی قسم! تم انھی کے طریقے پر قدم بقدم چلو گے۔"

٧٨ – یہاں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اگرچہ اس مضمون کو یوں بھی ادا کیا جا سکتا تھا کہ "پچھلی کتابوں" میں سے جو کچھ اپنی اصلی اور صحیح صورت پر باقی ہے، قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے "پچھلی کتابوں" کے بجائے "الکتاب" کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس سے یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ قرآن اور تمام وہ کتابیں جو مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں، سب کی سب فی الاصل ایک ہی کتاب ہیں۔

تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ

تمھارے پاس آیا ہے، اُس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ـــــ ہم[80] نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی۔ اگرچہ تمھارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک اُمّت بھی بنا سکتا تھا، لیکن اُس نے یہ اِس لیے کیا کہ جو کچھ اُس نے تم لوگوں کو دیا ہے،

ایک ہی ان کا مصنّف ہے، ایک ہی ان کا مدّعا اور مقصد ہے، ایک ہی ان کی تعلیم ہے، اور ایک ہی علم ہے جو ان کے ذریعے سے نوعِ انسانی کو عطا کیا گیا۔ فرق اگر ہے تو عبارات کا ہے، جو ایک ہی مقصد کے لیے مختلف مخاطبوں کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے اختیار کی گئیں۔ پس حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ کتابیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں، مؤیّد ہیں، تردید کرنے والی نہیں، تصدیق کرنے والی ہیں، بلکہ اصل حقیقت اس سے کچھ بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی ’’الکتاب‘‘ کے مختلف ایڈیشن ہیں۔

۷۹ — اصل میں لفظ ’’مُھَیْمِنْ‘‘ استعمال ہوا ہے۔ عربی میں ھیمن یھیمن ھیمنۃ کے معنیٰ مُحافظت، نگرانی، شہادت، امانت، تائید اور حمایت کے ہیں۔ ھیمن الرجل الشیئ، یعنی آدمی نے فلاں چیز کی حفاظت و نگہبانی کی۔ ھیمن الطائر علٰی فراخہٖ، یعنی پرندے نے اپنے چوزے کو اپنے پَروں میں لے کر محفوظ کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا: انی داعٍ فھیمنوا، یعنی میں دعا کرتا ہوں، تم تائید میں آمین کہو۔ اسی سے لفظ ھمیان ہے، جسے اُردو میں ہمیانی کہتے ہیں، یعنی وہ تھیلی جس میں آدمی اپنا مال رکھ کر محفوظ کرتا ہے۔ پس قرآن کو ’’الکتٰب‘‘ پر مھیمن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان تمام برحق تعلیمات کو جو پچھلی کُتُبِ آسمانی میں دی گئی تھیں، اپنے اندر لے کر محفوظ کر دیا ہے۔ وہ ان پر نگہبان ہے، اس معنیٰ میں کہ اب ان کی تعلیماتِ برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا۔ وہ ان کا مؤیّد ہے، اس معنیٰ میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کا کلام جس حد تک موجود ہے، قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ ان پر گواہ ہے، اس معنیٰ میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کے کلام اور لوگوں کے کلام کی جو آمیزش ہو گئی ہے، قرآن کی شہادت سے اس کو پھر چھانٹا جا سکتا ہے، جو کچھ ان میں قرآن کے مطابق ہے وہ خدا کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ لوگوں کا کلام۔

۸۰ — یہ ایک جملۂ معترضہ ہے، جس سے مقصود ایک سوال کی توضیح کرنا ہے جو اُوپر کے سلسلۂ تقریر کو سُنتے ہوئے مخاطب کے ذہن میں اُلجھن پیدا کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب تمام انبیاؑ اور تمام کتابوں کا دین ایک ہے، اور یہ سب ایک دوسرے کی تصدیق و تائید کرتے ہوئے آئے ہیں، تو شریعت کی تفصیلات میں ان کے درمیان فرق کیوں ہے؟ کیا بات ہے کہ عبادت کی صُورتوں میں، حرام اور حلال کی قیود میں اور قوانینِ تمدّن و معاشرت کے فُروع میں مختلف انبیاؑ اور

فِیۡ مَاۤ اٰتٰىكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا
فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۙ﴿۴۸﴾ وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ

اس میں تمھاری آزمایش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دُوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخرکار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو[۸۱] ___ پس[۸۲] اے محمدؐ! تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق

کُتُبِ آسمانی کی شریعتوں کے درمیان تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے؟

۸۱ – یہ مذکورۂ بالا سوال کا پُورا جواب ہے۔ اس جواب کی تفصیل یہ ہے:

(۱) محض اختلافِ شرائع کو اس بات کی دلیل قرار دینا غلط ہے کہ یہ شریعتیں مختلف مآخذ سے ماخوذ اور مختلف سرچشموں سے نکلی ہوئی ہیں۔ دراصل وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے مختلف قوموں کے لیے مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں مختلف ضابطے مقرر فرمائے۔

(۲) بلاشبہ یہ ممکن تھا کہ شروع ہی سے تمام انسانوں کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر کے سب کو ایک اُمّت بنا دیا جاتا۔ لیکن وہ فرق جو اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاؑ کی شریعتوں کے درمیان رکھا، اُس کے اندر دوسری بہت سی مصلحتوں کے ساتھ ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس طریقے سے لوگوں کی آزمائش کرنا چاہتا تھا۔ جو لوگ اصل دین اور اس کی رُوح اور حقیقت کو سمجھتے ہیں، اور دین میں اِن ضوابط کی حقیقی حیثیت کو جانتے ہیں، اور کسی تعصّب میں مبتلا نہیں ہیں، وہ حق کو، جس صُورت میں بھی وہ آئے گا، پہچان لیں گے اور قُبول کر لیں گے۔ اُن کو اللہ کے بھیجے ہوئے سابق احکام کی جگہ بعد کے احکام تسلیم کرنے میں کوئی تأمّل نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے جو لوگ رُوحِ دین سے بیگانہ ہیں اور ضوابط اور ان کی تفصیلات ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں، اور جنھوں نے خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیزوں پر خود اپنے حاشیے چڑھا کر ان پر جمود اور تعصّب اختیار کر لیا ہے، وہ ہر اُس ہدایت کو رَدّ کرتے چلے جائیں گے جو بعد میں خدا کی طرف سے آئے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کو مُمیّز کرنے کے لیے یہ آزمایش ضروری تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرائع میں اختلاف رکھا۔

(۳) تمام شرائع سے اصل مقصود نیکیوں اور بھلائیوں کو پانا ہے اور وہ اسی طرح حاصل ہو سکتی ہیں کہ جس وقت جو حکمِ خدا ہو، اُس کی پیروی کی جائے۔ لہٰذا جو لوگ اصل مقصد پر نگاہ رکھتے ہیں، ان کے لیے شرائع کے اختلافات اور مناہج کے فُروق پر جھگڑا کرنے کے بجائے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ مقصد کی طرف اُس راہ سے پیش قدمی کریں جس کو اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہو۔

(۴) جو اختلافات انسانوں نے اپنے جمود، تعصب، ہٹ دھرمی اور ذہن کی اُپج سے خود پیدا کر لیے ہیں، ان کا آخری فیصلہ نہ مجلسِ مناظرہ میں ہو سکتا ہے، نہ میدانِ جنگ میں۔ آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ خود کرے گا جب کہ حقیقت بے نقاب

بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ
يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ
وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ
يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

اِن لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنے میں ڈال کر اُس ہدایت سے ذرّہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمھاری طرف نازل کی ہے۔ پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے اِن کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کرلیا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔ (اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیّت[۸۳] کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں، ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ع

کر دی جائے گی اور لوگوں پر منکشف ہو جائے گا کہ جن جھگڑوں میں وہ عمریں کھپا کر دُنیا سے آئے ہیں اُن کی تہ میں ’’حق‘‘ کا جوہر کتنا تھا اور باطل کے حاشیے کس قدر۔

۸۲ – یہاں سے پھر وہی سلسلۂ تقریر چل پڑتا ہے جو اوپر سے چلا آ رہا تھا۔

۸۳ – جاہلیّت کا لفظ اسلام کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے، کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔ اور اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے، جاہلیّت کا طریقہ ہے۔ عرب کے زمانۂ قبلِ اسلام کو جاہلیت کا دَور اسی معنیٰ میں کہا گیا ہے کہ اس زمانے میں علم کے بغیر محض وہم، یا قیاس وگمان، یا خواہشات کی بنا پر انسانوں نے اپنے لیے زندگی کے طریقے مقرر کر لیے تھے۔ یہ طرزِ عمل جہاں جس دَور میں بھی انسان اختیار کریں، اسے بہرحال جاہلیت ہی کا طرزِ عمل کہا جائے گا۔ مدرَسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ محض ایک جُزوی علم ہے اور کسی معنیٰ میں بھی انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے۔ لہٰذا خدا کے دیے ہوئے علم سے بے نیاز ہو کر جو نظامِ زندگی اِس جُزوی علم کے ساتھ ظنون واَوہام اور قیاسات وخواہشات کی آمیزش کر کے بنا لیے گئے ہیں، وہ بھی اُسی طرح ’’جاہلیّت‘‘ کی تعریف میں آتے ہیں جس طرح قدیم زمانے کے جاہلی طریقے اِس

ف لازم يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ؘ
وقف غفران بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ
تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دُوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انھی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نِفاق کی بیماری ہے، وہ اُنھی میں دَوڑ دُھوپ کرتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں: ”ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہم کسی مصیبت کے چکّر میں نہ پھنس جائیں[۸۴]۔“ مگر بعید نہیں کہ اللہ جب تمھیں فیصلہ کُن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کوئی اور بات

تعریف میں آتے تھے۔

۸۴ – اُس وقت تک عرب میں کفر اور اسلام کی کشمکش کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اسلام اپنے پیروؤں کی سرفروشیوں کے سبب سے ایک طاقت بن چکا تھا، لیکن مقابل کی طاقتیں بھی زبردست تھیں۔ اسلام کی فتح کا جیسا امکان تھا، ویسا ہی کفر کی فتح کا بھی تھا۔ اس لیے مسلمانوں میں جو لوگ منافق تھے، وہ اسلامی جماعت میں رہتے ہوئے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی ربط ضبط رکھنا چاہتے تھے، تاکہ یہ کشمکش اگر اسلام کی شکست پر ختم ہو تو ان کے لیے کوئی نہ کوئی جائے پناہ محفوظ رہے۔ علاوہ بریں اُس وقت عرب میں عیسائیوں اور یہودیوں کی مَعاشی قوت سب سے زیادہ تھی۔ ساہوکارا بیشتر انھی کے ہاتھ میں تھا۔ عرب کے بہترین سرسبز وشاداب خِطّے ان کے قبضے میں تھے۔ ان کی سُودخواری کا جال ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ لہٰذا مَعاشی اسباب کی بنا پر بھی یہ منافق لوگ ان کے ساتھ اپنے سابق تعلّقات برقرار رکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا گمان تھا کہ اگر اسلام وکفر کی اس کشمکش میں ہمہ تن منہمک ہو کر ہم نے ان سب قوموں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے جن کے ساتھ اسلام اس وقت برسرِ پیکار ہے، تو یہ فعل سیاسی اور مَعاشی دونوں حیثیتوں سے ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔

عِنۡدِهٖ فَيُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ نٰدِمِيۡنَ ؕ ﴿۵۲﴾
وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَهٰٓؤُلَاۤءِ الَّذِيۡنَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ
اَيۡمَانِهِمۡ ۙ اِنَّهُمۡ لَمَعَكُمۡ ؕ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَاَصۡبَحُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۵۳﴾ الربع
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَسَوۡفَ يَاۡتِى
اللّٰهُ بِقَوۡمٍ يُّحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ
اَعِزَّةٍ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ يُجَاهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَ

ظاہر کرے[۸۵] گا تو یہ لوگ اپنے اِس نفاق پر، جسے یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، نادم ہوں گے۔ اور اُس وقت اہلِ ایمان کہیں گے: ''کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں؟'' ـــــــ ان کے سب اعمال ضائع ہو گئے اور آخر کار یہ ناکام و نامُراد ہو کر رہے[۸۶]۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اَور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبُوب ہوں گے اور اللہ اُن کو محبوب ہو گا، جو مومنوں پر نرم اور کفّار پر سخت ہوں[۸۷] گے، جو اللہ کی راہ میں جِدّ و جُہد کریں گے اور

---

۸۵ – یعنی فیصلہ کُن فتح سے کم تر درجے کی کوئی ایسی چیز جس سے عُموماً لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ ہار جیت کا آخری فیصلہ اسلام ہی کے حق میں ہو گا۔

۸۶ – یعنی جو کچھ انھوں نے اسلام کی پیَروی میں کیا، نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، زکوٰۃ دی، جہاد میں شریک ہوئے، قوانینِ اسلام کی اطاعت کی، یہ سب کچھ اس بنا پر ضائع ہو گیا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لیے خلوص نہ تھا اور وہ سب سے کٹ کر صرف ایک خدا کے ہو کر نہ رہ گئے تھے، بلکہ اپنی دنیا کی خاطر انھوں نے اپنے آپ کو خدا اور اس کے باغیوں کے درمیان آدھا آدھا بانٹ رکھا تھا۔

۸۷ – ''مومنوں پر نرم'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اہلِ ایمان کے مقابلے میں اپنی طاقت کبھی استعمال نہ کرے۔ اُس کی ذہانت، اس کی ہوشیاری، اُس کی قابلیّت، اُس کا رُسوخ و اثر، اُس کا مال، اُس کا جسمانی زور، کوئی چیز بھی

لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ
مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٥٤﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ
رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٥٦﴾ ع ٨/١٢

کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے[۸۸]۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

تمھارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسولؐ اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان کو اپنا رفیق بنا لے، اُسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔ ع

مسلمانوں کو دبانے اور ستانے اور نقصان پہنچانے کے لیے نہ ہو۔ مسلمان اپنے درمیان اس کو ہمیشہ ایک نرم خُو، رحم دل، ہمدرد اور حلیم انسان ہی پائیں۔

''کُفّار پر سخت'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مومن آدمی اپنے ایمان کی پُختگی، دین داری کے خُلوص، اُصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمان کی فراست کی وجہ سے مخالفینِ اسلام کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کے مانند ہو کہ کسی طرح اپنے مقام سے ہٹایا نہ جا سکے۔ وہ اسے کبھی موم کی ناک اور نرم چارا نہ پائیں۔ انھیں جب بھی اس سے سابقہ پیش آئے، ان پر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اللہ کا بندہ مر سکتا ہے مگر کسی قیمت پر بِک نہیں سکتا اور کسی دباؤ سے دب نہیں سکتا۔

۸۸ – یعنی اللہ کے دین کی پیروی کرنے میں، اُس کے احکام پر عمل درآمد کرنے میں، اور اِس دین کی رُو سے جو کچھ حق ہے اسے حق اور جو کچھ باطل ہے اُسے باطل کہنے میں انھیں کوئی باک نہ ہوگا۔ کسی کی مُخالَفت، کسی کی طعن وتشنیع، کسی کے اعتراض اور کسی کی پھبتیوں اور آوازوں کی وہ پروا نہ کریں گے۔ اگر رائے عام اسلام کی مخالف ہو اور اسلام کے طریقے پر چلنے کے معنیٰ اپنے آپ کو دنیا بھر میں نکّو بنا لینے کے ہوں، تب بھی وہ اسی راہ پر چلیں گے جسے وہ سچّے دل سے حق جانتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا
وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ
اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿٥٨﴾
قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ
اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٥٩﴾
قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے پیش رو اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنالیا ہے، انھیں اور دُوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ جب تم نماز کے لیے مُنادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اُڑاتے اور اس سے کھیلتے ہیں[89]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے[90]۔ اِن سے کہو: ”اے اہلِ کتاب! تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اُس تعلیم پر ایمان لے آئے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی، اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں؟“ پھر کہو: ”کیا میں اُن لوگوں کی نشان دہی کروں جن کا انجام خدا کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بھی بدتر ہے؟

---

٨٩ – یعنی اذان کی آواز سن کر اُس کی نقلیں اتارتے ہیں، تمسخر کے لیے اس کے الفاظ بدلتے اور مسخ کرتے ہیں اور اس پر آوازے کستے ہیں۔

٩٠ – یعنی ان کی یہ حرکتیں محض بے عقلی کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ جہالت اور نادانی میں مبتلا نہ ہوتے تو مسلمانوں سے مذہبی اختلاف رکھنے کے باوجود ایسی خفیف حرکات ان سے سرزد نہ ہوتیں۔ آخر کون معقول آدمی یہ پسند کرسکتا ہے کہ جب کوئی گروہ خدا کی عبادت کے لیے مُنادی کرے تو اس کا مذاق اُڑایا جائے۔

مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيۡهِ وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَ
الۡخَنَازِيۡرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوۡتَ ؕ اُولٰٓـئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنۡ
سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ﴿۶۰﴾ وَ اِذَا جَآءُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوۡا
بِالۡكُفۡرِ وَهُمۡ قَدۡ خَرَجُوۡا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا كَانُوۡا
يَكۡتُمُوۡنَ ﴿۶۱﴾ وَتَرٰى كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡاِثۡمِ وَ
الۡعُدۡوَانِ وَاَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۲﴾
لَوۡلَا يَنۡهٰٮهُمُ الرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِهِمُ الۡاِثۡمَ وَ

وہ جن پر خدا نے لعنت کی، جن پر اُس کا غضب ٹُوٹا، جن میں سے بندر اور سُؤر بنائے گئے، جنھوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ ان کا درجہ اَور بھی زیادہ بُرا ہے اور وہ سَوَاءُ السَّبِیل سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں[91]۔"

جب یہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالانکہ کفر لیے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لیے ہوئے واپس گئے، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھُپائے ہوئے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دَوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں۔ بہت بُری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔ کیوں اِن کے علما اور مشائخ اُنھیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام

۹۱ – لطیف اشارہ ہے خود یہودیوں کی طرف، جن کی اپنی تاریخ یہ کہہ رہی ہے کہ بار ہا وہ خدا کے غضب اور اس کی لعنت میں مُبتلا ہوئے، سبت کا قانون توڑنے پر ان کی قوم کے بہت سے لوگوں کی صورتیں مسخ ہوئیں، حتّٰی کہ وہ تنزّل کی اس انتہا کو پہنچے کہ طاغوت کی بندگی تک انھیں نصیب ہوئی۔ پس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر تمھاری بے حیائی اور مجرمانہ بے باکی کی کوئی حد بھی ہے کہ خود فسق و فجور اور انتہائی اَخلاقی تنزل میں مبتلا ہو اور اگر کوئی دوسرا گروہ خدا پر ایمان لا کر سچی دینداری کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہو۔

اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَقَالَتِ
الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ وقف لازم
بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا
مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ وَ

کھانے سے نہیں روکتے؟ یقیناً بہت ہی بُرا کارنامۂ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔

یہودی کہتے ہیں: اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں[92] ـــــ باندھے گئے ان کے ہاتھ،[93] اور لعنت پڑی اِن پر اُس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں[94] ـــــ اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں، جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے، وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی و باطل پرستی میں اُلٹے اضافے کا موجب بن گیا ہے[95]، اور (اس کی پاداش میں)

---

۹۲ – عَرَبی محاورے کے مطابق کسی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بخیل ہے، عطا اور بخشش سے اُس کا ہاتھ رُکا ہوا ہے۔ پس یہودیوں کے اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ بخیل ہے۔ چونکہ صدیوں سے یہودی قوم ذلّت و نکبت کی حالت میں مبتلا تھی اور اس کی گزشتہ عظمت محض ایک افسانۂ پارینہ بن کر رہ گئی تھی، جس کے پھر واپس آنے کا کوئی امکان انھیں نظر نہ آتا تھا، اس لیے بالعموم اپنے قومی مصائب پر ماتم کرتے ہوئے اس قوم کے نادان لوگ یہ بے ہودہ فقرہ کہا کرتے تھے کہ معاذ اللہ! خدا تو بخیل ہو گیا ہے، اس کے خزانے کا منہ بند ہے، ہمیں دینے کے لیے اب اس کے پاس آفات اور مصائب کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ یہ بات کچھ یہودیوں تک ہی محدود نہیں، دوسری قوموں کے جُہلا کا بھی یہی حال ہے کہ جب ان پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو خدا کی طرف رجوع کرنے کے بجائے وہ جل جل کر اس قسم کی گستاخانہ باتیں کیا کرتے ہیں۔

۹۳ – یعنی بخل میں یہ خود مُبتلا ہیں۔ دُنیا میں اپنے بخل اور اپنی تنگ دِلی کے لیے ضربُ المَثَل بن چکے ہیں۔

۹۴ – یعنی اس قسم کی گستاخیاں اور طعن آمیز باتیں کر کے یہ چاہیں کہ خدا ان پر مہربان ہو جائے اور عنایات کی بارش کرنے لگے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ بلکہ ان باتوں کا الٹا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کی نظرِ عنایت سے

اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ
اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي
الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ
الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ
جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ

ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے۔ جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ اُس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں، مگر اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اگر (اِس سرکشی کے بجائے) یہ اہلِ کتاب ایمان لے آتے اور خدا ترسی کی رَوِش اختیار کرتے تو ہم اِن کی بُرائیاں اِن سے دُور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنّتوں میں پہنچاتے۔ کاش انھوں نے تورات اور انجیل اور اُن دُوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو اِن کے رب کی طرف سے اِن کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو اِن کے لیے اُوپر سے رزق برستا اور نیچے سے

اور زیادہ محروم اور اس کی رحمت سے اَور زیادہ دُور ہوتے جاتے ہیں۔

۹۵ – یعنی بجائے اس کے کہ اس کلام کو سُن کر وہ کوئی مفید سبق لیتے، اپنی غلطیوں اور غلط کاریوں پر مُتنبِّہ ہو کر ان کی تلافی کرتے، اور اپنی گری ہوئی حالت کے اسباب معلوم کر کے اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے، اُن پر اس کا اُلٹا اثر یہ ہوا ہے کہ ضد میں آ کر انھوں نے حق و صداقت کی مُخالَفت شروع کر دی ہے۔ خیر و صلاح کے بُھولے ہوئے سبق کو سُن کر خود راہِ راست پر آنا تو درکنار، اُن کی اُلٹی کوشش یہ ہے کہ جو آواز اس سبق کو یاد دلا رہی ہے اسے دبا دیں، تاکہ کوئی دوسرا بھی اسے نہ سُننے پائے۔

اَرْجُلِهِمْ ۚ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ
سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝٦٦ ع يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۚ وَ اللّٰهُ
يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٦٧
قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا
التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ

اُبلتا۔[٩٦] اگرچہ اِن میں کچھ لوگ راست رَو بھی ہیں، لیکن ان کی اکثریت سخت بدعمل ہے۔ع

اے پیغمبرؐ! جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ کافروں کو (تمھارے مقابلے میں) کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔ صاف کہہ دو کہ ’’اے اہلِ کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور اُن دُوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔[٩٧]‘‘

۹۶- بائبل کی کتابِ اَحبار (باب ۲۶) اور اِستِثنا (باب ۲۸) میں حضرت موسٰی علیہ السلام کی ایک تقریر نقل کی گئی ہے جس میں انھوں نے بنی اسرائیل کو بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اگر تم احکامِ الٰہی کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرو گے تو کس کس طرح اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے جاؤ گے، اور اگر کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈال کر نافرمانیاں کرو گے تو کس طرح بلائیں اور مصیبتیں اور تباہیاں ہر طرف سے تم پر ہُجوم کریں گی۔ حضرت موسیٰؑ کی وہ تقریر قرآن کے اِس مختصر فقرے کی بہترین تفسیر ہے۔

۹۷- تورات اور انجیل کو قائم کرنے سے مراد راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کرنا اور انھیں اپنا دستورِ زندگی بنانا ہے۔ اِس موقع پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بائبل کے مجموعۂ کُتُبِ مقدسہ میں ایک قسم کی عبارات تو وہ ہیں جو یہودی اور عیسائی مصنّفین نے بطورِ خود لکھی ہیں۔ اور دوسری قسم کی عبارات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات یا حضرت موسٰی علیہ السلام، حضرت عیسٰی علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کے اقوال ہونے کی حیثیت سے منقول ہیں اور جن میں اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ نے ایسا فرمایا، یا فلاں نبی نے ایسا کہا۔ ان میں سے پہلی قسم کی عبارات کو الگ کر کے اگر کوئی شخص صرف دوسری قسم کی عبارات کا تتبّع کرے تو بآسانی یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کی

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا
وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٩﴾

ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اَور زیادہ بڑھا دے گا۔[98] مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔ (یقین جانو کہ یہاں اِجارہ کسی کا بھی نہیں ہے) مسلمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا عیسائی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، بے شک اس کے لیے نہ کسی خوف کا مَقام ہے نہ رنج کا۔[99]

تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ اگرچہ مترجموں اور ناسخوں اور شارحوں کی دَراندازی سے، اور بعض جگہ زبانی راویوں کی غلطی سے، یہ دوسری قسم کی عبارات بھی پوری طرح محفوظ نہیں رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان میں بعینہٖ اسی خالص توحید کی دعوت دی گئی ہے جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے، وہی عقائد پیش کیے گئے ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے اور اسی طریقِ زندگی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جس کی ہدایت قرآن دیتا ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی اُسی تعلیم پر قائم رہتے جو اِن کتابوں میں خدا اور پیغمبروں کی طرف سے منقول ہے، تو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعْثَت کے وقت وہ ایک حق پرست اور راست رَوگروہ پائے جاتے اور انھیں قرآن کے اندر وہی روشنی نظر آتی جو پچھلی کتابوں میں پائی جاتی تھی۔ اس صورت میں ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے میں تبدیلِ مذہب کا سرے سے کوئی سوال پیدا ہی نہ ہوتا، بلکہ وہ اُسی راستے کے تسلسل میں، جس پر وہ پہلے سے چلے آ رہے تھے، آپؐ کے متبع بن کر آگے چل سکتے تھے۔

۹۸- یعنی یہ بات سُن کر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور حقیقت کو سمجھنے کے بجائے وہ ضد میں آ کر اور زیادہ شدید مُخالفت شروع کر دیں گے۔

۹۹- دیکھو سورۂ بقرہ، آیت ۶۲ - و حاشیہ ۸۰۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْهِمْ
رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ
فَرِیْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِیْقًا یَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَ حَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ
فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ
صَمُّوْا كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ لَقَدْ
كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ؕ وَ
قَالَ الْمَسِیْحُ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ
رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ
عَلَیْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾

ہم نے بنی اسرائیل سے پُختہ عہد لیا اور اُن کی طرف بہت سے رسُول بھیجے، مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول اُن کی خواہشاتِ نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو کسی کو اُنھوں نے جھُٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا، اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رُونما نہ ہوگا، اس لیے اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے اُنھیں معاف کیا تو اُن میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے بنتے چلے گئے۔ اللہ اُن کی یہ سب حرکات دیکھتا رہا ہے۔

یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابنِ مریم ہی ہے۔ حالانکہ مسیحؑ نے کہا تھا کہ ”اے بنی اسرائیل! اللہ کی بندگی کرو، جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔“ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا اس پر اللہ نے جنّت حرام کر دی اور اُس کا ٹھکانا جہنّم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

وقف لازم

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ
اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ
لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۷۳ اَفَلَا
يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۷۴
مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ
الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ
كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۷۵

یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالاں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی اِن باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے، اُس کو دردناک سزا دی جائے گی۔ پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

مسیح ابنِ مریمؑ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسُول تھا، اُس سے پہلے اَور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے، اس کی ماں ایک راست باز عورت تھی، اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں، پھر دیکھو یہ کدھر اُلٹے پھرے جاتے ہیں۔[۱۰۰]

---

۱۰۰ – اِن چند لفظوں میں عیسائیوں کے عقیدۂ اُلوہیّتِ مسیحؑ کی ایسی صاف تردید کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ صفائی ممکن نہیں ہے۔ مسیحؑ کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ فی الحقیقت وہ کیا تھا، تو ان علامات سے بالکل غیر مُشتبہ طور پر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ محض ایک انسان تھا۔ ظاہر ہے کہ جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا، جس کا شجرۂ نسب تک موجود ہے، جو انسانی جسم رکھتا تھا، جو اُن تمام حُدود سے محدود اور ان تمام قُیُود سے مقیّد اور ان تمام صفات سے متّصف تھا جو انسان کے لیے مخصوص ہیں، جو سوتا تھا، کھاتا تھا، گرمی اور سردی محسوس کرتا تھا، حتّٰی کہ جسے شیطان کے ذریعے سے آزمائش میں بھی ڈالا گیا، اس کے متعلق کون معقول انسان یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ وہ

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا
نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا
تَغْلُوْا فِیْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ
ع ۱۰ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾ ع

اِن سے کہو: کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمھارے لیے نقصان کا اختیار رکھتا ہے نہ نفع کا؟ حالانکہ سب کی سُننے والا اور سب کچھ جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔ کہو: اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں ناحق غُلُو نہ کرو اور اُن لوگوں کے تخیُّلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور "سَوَاءُ السَّبِیل" سے بھٹک گئے[۱۰۱] ع

خود خدا ہے یا خدائی میں خدا کا شریک وسہیم ہے۔ لیکن یہ انسانی ذہن کی ضلالت پذیری کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ عیسائی خود اپنی مذہبی کتابوں میں مسیحؑ کی زندگی کو صریحاً ایک انسانی زندگی پاتے ہیں اور پھر بھی اسے خدائی سے مُتَّصِف قرار دینے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اُس تاریخی مسیحؑ کے قائل ہی نہیں ہیں جو عالَمِ واقعہ میں ظاہر ہوا تھا، بلکہ انھوں نے خود اپنے وہم وگمان سے ایک خیالی مسیح تصنیف کر کے اُسے خدا بنا لیا ہے۔

۱۰۱ – اشارہ ہے اُن گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے۔ خصوصاً فلاسفۂ یونان کی طرف، جن کے تخیُّلات سے متاثّر ہو کر عیسائی اُس صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداءً ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیحؑ کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے، وہ بڑی حد تک اُس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مُشاہَدہ انھوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی۔ مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیحؑ کی عقیدت اور تعظیم میں غُلُوّ کر کے، اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اَوہام اور فلسفوں سے متاثّر ہو کر، اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کو مسیحؑ کی اصل تعلیمات سے دُور کا واسطہ بھی نہ رہا۔ اس باب میں خود ایک مسیحی عالِمِ دینیات (ریورینڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ) کا بیان قابلِ مُلاحظہ ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں "یسُوع مسیح" (Jesus Christ) کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے:

"پہلی تین انجیلوں (متّی، مَرقُس، لُوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ

اِن انجیلوں کے لکھنے والے یسُوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی رُوح سے فیض یاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلّق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود مَتّی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو "مسیح" تسلیم کرنے کے بعد "الگ ایک طرف لے جا کر اُسے ملامت کی" (مَتّی ۱۶:۲۲)۔ لُوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعۂ صلیب کے بعد یسُوع کے دو شاگرد اِمّاؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ "وہ خدا اور ساری اُمّت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا" (لُوقا ۲۴: ۱۹)۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجّہ ہے کہ اگرچہ "مَرقُس" کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسُوع کے لیے لفظ "خداوند" (Lord) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا، لیکن نہ مَرقُس کی انجیل میں یسُوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ مَتّی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یسُوع کے ابتلا کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں، جیسا کہ اس واقعے کے شایانِ شان ہے، مگر مَرقُس کی "فِدیہ" والی عبارت (مَرقُس ۱۰: ۴۵) اور آخری فسح کے موقع پر چند الفاظ کو مُستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعے کو وہ معنیٰ نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے۔ حتّٰی کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا کہ یسُوع کی موت کا انسان کے گناہ اور اس کے کفّارے سے کوئی تعلّق تھا۔"

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے:

"یہ بات کہ یسُوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا، اناجیل کی متعدّد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ "مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے، کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو" (لُوقا ۱۳: ۳۳)۔ وہ اکثر اپنا ذکر "ابنِ آدم" کے نام سے کرتا ہے...... یسُوع کہیں اپنے آپ کو "ابن اللہ" نہیں کہتا۔ اس کے دوسرے ہم عصر جب اس کے متعلّق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالبًا ان کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو خدا کا مَمسُوح سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً "بیٹے" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے...... مزید برآں وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلّق کو بیان کرنے کے لیے بھی "باپ" کا لفظ اسی اِطلاقی شان میں استعمال کرتا ہے...... اِس تعلّق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا، بلکہ ابتدائی دَور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اِس خاص گہرے تعلّق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا۔ البتہ بعد کے تجرِبے اور انسانی طبائع کے عمیق مطالعے نے اسے یہ سمجھنے پر مجبُور کر دیا کہ اس معاملے میں وہ اکیلا ہے۔"

پھر یہی مصنّف لکھتا ہے:

''عید پنتکُست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ ''ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا'' یسُوع کو اُس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے...... انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسُوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نَشْو و نَما کے مدارج سے گزرا۔ اُس کو بھوک پیاس لگتی تھی، وہ تھکتا اور سوتا تھا، وہ حیرت میں مبتلا ہوسکتا تھا اور دریافتِ احوال کا محتاج تھا، اُس نے دُکھ اُٹھایا اور مرا۔ اُس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے...... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اُس پورے تصوُّر کے بالکل خلاف ہوگا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس دعوے کے ساتھ آزمائش کے واقعے کو اور گتسَمَنی اور کھوپڑی کے مَقام پر جو واردات گزریں، ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی۔ تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جائے، یہ ماننا پڑے گا کہ مسیحؑ جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیّت اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور اس محدودیّت میں اگر کوئی استثنا تھا تو وہ صرف اُسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہوسکتا ہے۔ پھر مسیحؑ کو قادرِ مُطلَق سمجھنے کی گنجایش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اِس قسم کے الفاظ سے کہ ''یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعے سے نہیں ٹل سکتی''، اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کے تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اُس زمانے سے پہلے مکمل نہ ہوئی تھی جب کہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو الٰہ سمجھنا شروع کر دیا تھا، پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیحؑ کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اِس امر کی موجود نہیں ہے کہ مسیحؑ اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔''

اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے:

''وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعۂ رفع کے وقت اسی فعلِ رفع کے ذریعے سے یسُوع پورے اختیارات کے ساتھ ''ابن اللہ'' کے مرتبے پر عَلانِیَہ فائز کیا گیا...... یہ ''ابن اللہ'' کا لفظ یقینی طور پر ذاتی اِبنیّت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسُوع کو ''خدا کا اپنا بیٹا'' کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اِس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال جس نے مسیحؑ کے لیے ''خداوند'' کا خطاب اصل مذہبی معنٰی میں

استعمال کیا۔ شاید یہ فعل مقدّم الذکر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنیٰ میں بولنا شروع کیا، پھر اپنے مُدعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ ''خداوند یسُوع مسیح'' کی طرف بہت سے وہ تصوّرات اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیے جو قدیم کُتُبِ مقدسہ میں خداوند یَہوَہ (اللہ تعالیٰ) کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیحؑ کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مُساوی قرار دیا اور اُسے مُطلَق معنیٰ میں خدا کا بیٹا ٹھیرایا۔ تاہم متعدِّد حیثیات اور پہلوؤں سے مسیحؑ کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود پال اُس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔''

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون ''مسیحیّت'' (Christianity) میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچا یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکّب ہے، مذہبی خیالات بائبل کے، اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صُورتوں میں۔

باپ، بیٹا اور رُوح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود یسُوع نے شاذونادر ہی کبھی استعمال کی تھی، اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا، تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیّت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدے کا مواد یہودی ہے (اگرچہ اس مرکّب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا) اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا، وہ نہ کوئی اَخلاقی سوال تھا نہ مذہبی، بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا، یعنی یہ کہ ان تینوں اَقانیم (باپ، بیٹے اور روح) کے درمیان تعلّق کی حقیقت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا، وہ اُس عقیدے میں درج ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا، اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خُصوصیّات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔''

اسی سلسلے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک اور مضمون ''تاریخ کلیسا'' (church history) کی یہ عبارت بھی قابلِ مُلاحَظہ ہے:

''تیسری صدی عیسوی کے خاتمے سے پہلے مسیحؑ کو عام طور پر ''کلام'' کا جَسَدی ظُہور تو مان لیا گیا تھا، تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیحؑ کی اُلُوہیّت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلے پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخرکار ۳۲۵ء میں نیقیا کی کونسل نے اُلُوہیّتِ مسیحؑ کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتّب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدّت تک جھگڑا چلتا رہا، لیکن آخری فتح نیقیا ہی کے

فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی اُلوہیّت کے ساتھ رُوح کی اُلوہیّت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلِمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نِیقیا میں مسیحؑ کا جو تصوّر قائم کیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جُزوِ لاینفک قرار پا گیا۔

پھر اس دعوے پر کہ ''بیٹے کی اُلوہیّت مسیحؑ کی ذات میں مجسّم ہوئی تھی'' ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا، جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدّتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیحؑ کی شخصیّت میں اُلوہیّت اور انسانیّت کے درمیان کیا تعلّق ہے؟ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیحؑ کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں، ایک الٰہی طبیعت، دوسری انسانی طبیعت، اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خُصوصیّات بلا کسی تغیُّر و تبدُّل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قُسطنطنیہ منعقد ہوئی، اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مَشِیَّتیں بھی رکھتی ہیں، یعنی مسیحؑ بیک وقت دو مختلف مَشِیَّتوں کا حامل ہے...... اِسی دَوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل کے مسئلے پر بھی خاص توجّہ کی اور یہ سوال مدّتوں زیرِ بحث رہا کہ نجات کے معاملے میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا۔ آخرِکار ۵۲۹ء میں اورنج کی دوسری کونسل میں...... یہ نظریّہ اختیار کیا گیا کہ ہُبُوطِ آدمؑ کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا جب تک وہ اُس فضلِ خداوندی سے، جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے، نئی زندگی نہ حاصل کر لے۔ اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں اِستمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے۔ اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسُّط سے حاصل رہ سکتی ہے۔''

مسیحی علما کے اِن بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداءً جس چیز نے مسیحیوں کو گمراہ کیا، وہ عقیدت اور محبّت کا غُلُوّ تھا۔ اسی غُلُوّ کی بنا پر مسیح علیہ السّلام کے لیے خداوند اور ابن اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے، خدائی صفات ان کی طرف منسوب کی گئیں، اور کفّارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا، حالانکہ حضرت مسیحؑ کی تعلیمات میں ان باتوں کے لیے قطعاً کوئی گنجایش موجود نہ تھی۔ پھر جب فلسفے کی ہَوا مسیحیوں کو لگی تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس ابتدائی گمراہی کو سمجھ کر اس سے بچنے کی سعی کرتے، انھوں نے اپنے گُزَشتہ پیشواؤں کی غَلَطیوں کو نباہنے کے لیے ان کی توجیہات شروع کر دیں اور مسیحؑ کی اصل تعلیمات کی طرف رُجوع کیے بغیر محض مَنطِق اور فلسفہ کی مدد سے عقیدے پر عقیدہ ایجاد کرتے چلے گئے۔ یہی وہ ضلالت ہے جس پر قرآن نے ان آیات میں مسیحیوں کو مُتنَبِّہ فرمایا ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى
ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾ كَانُوْا لَا
يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَرٰى
كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ
اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ فِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلَوْ
كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِیِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، اُن پر داؤدؑ اور عیسٰیؑ ابنِ مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، اُنھوں نے ایک دُوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا[۱۰۲]، بُرا طرزِ عمل تھا جو اُنھوں نے اختیار کیا۔ آج تم اُن میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہلِ ایمان کے مقابلے میں) کفّار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔ یقیناً بہت بُرا انجام ہے جس کی تیاری اُن کے نفسوں نے اُن کے لیے کی ہے، اللہ اُن پر غضب ناک ہو گیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مُبتلا ہونے والے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ اور پیغمبرؐ اور اُس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبرؐ پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہلِ ایمان کے مقابلے میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے[۱۰۳]۔

۱۰۲– ہر قوم کا بگاڑ ابتداءً چند افراد سے شروع ہوتا ہے۔ اگر قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہوتا ہے تو رائے عام اِن بگڑے ہوئے افراد کو دبائے رکھتی ہے اور قوم بحیثیتِ مجموعی بگڑنے نہیں پاتی۔ لیکن اگر قوم ان افراد کے معاملے میں تساہُل شروع کر دیتی ہے اور غلط کار لوگوں کو ملامت کرنے کے بجائے انھیں سوسائٹی میں غلط کاری کے لیے آزاد چھوڑ دیتی ہے، تو پھر رفتہ رفتہ وہی خرابی جو پہلے چند افراد تک محدود تھی، پُوری قوم میں پھیل کر رہتی ہے۔ یہی چیز تھی جو آخر کار بنی اسرائیل کے بگاڑ کی موجب ہوئی۔

حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسٰیؑ کی زبان سے جو لعنت بنی اسرائیل پر کی گئی، اس کے لیے مُلاحظہ ہو: زبور، ۱۰ و ۵۰

وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً
لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ
مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾
الجزء ۷ وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ
مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا
فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا

مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔

تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہُود اور مشرکین کو پاؤ گے، اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اِس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالِم اور تارک الدُّنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور اُن میں غُرورِ نفس نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سُنتے ہیں جو رسُول پر اُترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اُٹھتے ہیں کہ ”پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔“ اور وہ کہتے ہیں کہ ”آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اُسے کیوں نہ

اور مَتّی، ۲۳۔

۱۰۳ – مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور نبی اور کتاب کے ماننے والے ہوتے ہیں، انھیں فطرتاً مشرکین کے مقابلے میں اُن لوگوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہوتی ہے جو مذہب میں خواہ ان سے اختلاف ہی رکھتے ہوں، مگر بہرحال انھی کی طرح خدا اور سلسلۂ وحی و رسالت کو مانتے ہوں۔ لیکن یہ یہودی عجیب قسم کے اہلِ کتاب ہیں کہ توحید اور شرک کی جنگ میں کُھلّم کُھلّا مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں، اقرارِ نبوت اور انکارِ نبوت کی لڑائی میں عَلانیہ ان کی ہمدردیاں

مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾
وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾ ع
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ

مان لیں، جب کہ ہم اِس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے؟" اُن کے اِس قول کی وجہ سے اللہ نے اُن کو ایسی جنّتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے نیک رَوِیّہ اختیار کرنے والوں کے لیے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا اور انھیں جھٹلایا، وہ جہنّم کے مستحق ہیں ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو پاک چیزیں اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں انھیں حرام نہ کرلو[۱۰۴] اور

منکرینِ نبوّت کے ساتھ ہیں، اور پھر بھی وہ بلا کسی شرم و حیا کے یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم خدا اور پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے والے ہیں۔

۱۰۴ — اس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک یہ کہ خود حلال و حرام کے مختار نہ بن جاؤ۔ حلال وہی ہے جو اللہ نے حلال کیا، اور حرام وہی ہے جو اللہ نے حرام کیا۔ اپنے اختیار سے کسی حلال کو حرام کرو گے تو قانونِ الٰہی کے بجائے قانونِ نفس کے پیرو قرار پاؤ گے۔ دوسری بات یہ کہ عیسائی راہبوں، ہندو جوگیوں، بدھ مذہب کے بھکشوؤں اور اِشراقی مُتصوّفین کی طرح رَہبانیّت اور قطعِ لذّات کا طریقہ اختیار نہ کرو۔ مذہبی ذہنیت کے نیک مزاج لوگوں میں ہمیشہ سے یہ میلان پایا جاتا رہا ہے کہ نفس و جسم کے حُقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا، اپنے نفس کو دنیوی لذّتوں سے محروم کرنا، اور دنیا کے سامانِ زیست سے تعلق توڑنا، بجائے خود ایک نیکی ہے اور خدا کا تقرّب اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ صحابۂ کرامؓ میں بھی بعض لوگ ایسے تھے جن کے اندر یہ ذہنیت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بعض صحابیوں نے عہد کیا ہے کہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھیں گے، راتوں کو بستر پر نہ سوئیں گے بلکہ جاگ جاگ کر عبادت کرتے رہیں گے، گوشت اور چکنائی استعمال نہ کریں گے، عورتوں سے واسطہ نہ رکھیں گے۔ اس پر آپؐ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ "مجھے ایسی باتوں کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ تمھارے نفس کے

لَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۸۷ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ
اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸ لَا
يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ

حد سے تجاوُز نہ کرو،[۱۰۵] اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔ جو کچھ حلال وطیّب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اُسے کھاؤ پیو اور اُس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

تم لوگ جو مُہمل قسمیں کھالیتے ہو اُن پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم جان بُوجھ کر کھاتے ہو

بھی تم پر حُقوق ہیں۔ روزہ بھی رکھو اور کھاؤ پیو بھی۔ راتوں کو قیام بھی کرو اور سوؤ بھی۔ مجھے دیکھو، میں سوتا بھی ہوں اور قیام بھی کرتا ہوں۔ روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ گوشت بھی کھاتا ہوں اور گھی بھی۔ پس جو میرے طریقے کو پسند نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں ہے۔" پھر فرمایا: "یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے عورتوں کو اور اچھے کھانے کو اور خوشبو اور نیند اور دنیا کی لذّتوں کو اپنے اُوپر حرام کر لیا ہے؟ میں نے تو تمھیں یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ تم راہب اور پادری بن جاؤ۔ میرے دین میں نہ عورتوں اور گوشت سے اجتناب ہے اور نہ گوشہ گیری و عُزلت نشینی ہے۔ ضبطِ نفس کے لیے میرے ہاں روزہ ہے، رہبانیت کے سارے فائدے یہاں جہاد سے حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، حج اور عمرہ کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو۔ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے، وہ اس لیے ہلاک ہوئے کہ انھوں نے اپنے اُوپر سختی کی، اور جب انھوں نے خود اپنے اُوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ یہ انھی کے بقایا ہیں جو تم کو صومعوں اور خانقاہوں میں نظر آتے ہیں۔" اسی سلسلے میں بعض روایات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ ایک صحابی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ وہ ایک مدّت سے اپنی بیوی کے پاس نہیں گئے ہیں اور شب و روز عبادت میں مشغول رہتے ہیں، تو آپؐ نے بُلا کر اُن کو حکم دیا کہ ابھی اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ انھوں نے کہا: میں روزے سے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: روزہ توڑ دو اور جاؤ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک خاتون نے شکایت پیش کی کہ میرے شوہر دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر عبادت کرتے ہیں اور مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حضرت عمرؓ نے مشہور تابعی بزرگ، کعب بن سَور الاَزْدی کو اُن کے مقدّمے کی ساعت کے لیے مقرر کیا، اور انھوں نے فیصلہ دیا کہ اس خاتون کے شوہر کو تین راتوں کے لیے اختیار ہے کہ جتنی چاہیں عبادت کریں، مگر چوتھی رات لازماً ان کی بیوی کا حق ہے۔

۱۰۵ — "حد سے تجاوز کرنا" وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ حلال کو حرام کرنا اور خدا کی ٹھیرائی ہوئی پاک چیزوں سے اِس طرح پرہیز کرنا کہ گویا وہ ناپاک ہیں، یہ بجائے خود ایک زیادتی ہے۔ پھر پاک چیزوں کے استعمال میں اسراف اور افراط بھی زیادتی ہے۔ پھر حلال کی سرحد سے باہر قدم نکال کر حرام کے حُدود میں داخل ہونا بھی زیادتی ہے۔ اللہ کو یہ تینوں

بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ
مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ
اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ
ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

اُن پر وہ ضرور تم سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفّارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اَوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچّوں کو کھلاتے ہو، یا انھیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو، اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفّارہ ہے جب کہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔[۱۰۶] اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔[۱۰۷] اس طرح اللہ اپنے احکام تمھارے لیے واضح کرتا ہے شاید کہ تم شکر ادا کرو۔

باتیں ناپسند ہیں۔

۱۰۶– چونکہ بعض لوگوں نے حلال چیزوں کو اپنے اُوپر حرام کر لینے کی قسم کھا رکھی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلے میں قسم کا حکم بھی بیان فرما دیا کہ اگر کسی شخص کی زبان سے بلاارادہ قسم کا لفظ نکل گیا ہے تو اس کی پابندی کرنے کی ویسے ہی ضرورت نہیں، کیونکہ ایسی قسم پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، اور اگر جان بُوجھ کر کسی نے قسم کھائی ہے تو وہ اُسے توڑ دے اور کفّارہ ادا کر دے، کیونکہ جس نے کسی معصیت کی قسم کھائی ہو، اسے اپنی قسم پر قائم نہ رہنا چاہیے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۴۳ و ۲۴۴۔ نیز کفّارہ کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حاشیہ ۱۲۵)

۱۰۷– قسم کی حفاظت کے کئی مفہوم ہیں: ایک یہ کہ قسم کو صحیح مَصرَف میں استعمال کیا جائے، فضول باتوں اور معصیت کے کاموں میں استعمال نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جب کسی بات پر آدمی قسم کھائے تو اسے یاد رکھے، ایسا نہ ہو کہ اپنی غفلت کی وجہ سے وہ اُسے بھول جائے اور پھر اس کی خلاف ورزی کرے۔ تیسرے یہ کہ جب کسی صحیح معاملے میں بالارادہ قسم کھائی جائے تو اسے پورا کیا جائے، اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس کا کفّارہ ادا کیا جائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جُوا اور یہ آستانے اور پانسے[۱۰۸]، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، اُمّید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب[۱۰۹] ہوگی۔

۱۰۸ – آستانوں اور پانسوں کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ مائدہ، حاشیہ ۱۲ و ۱۴۔ اِسی سلسلے میں جُوئے کی تشریح بھی حاشیہ ۱۴ میں مل جائے گی۔ اگرچہ پانسے (اَزلام) اپنی نوعیّت کے اعتبار سے مَیْسِر (جُوئے) ہی کی ایک قسم ہیں، لیکن ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ عربی زبان میں اَزلام فال گیری اور قرعہ اندازی کی اُس صورت کو کہتے ہیں جو مشرکانہ عقائد اور وہمیّات سے آلودہ ہو۔ اور مَیْسِر کا اطلاق اُن کھیلوں اور اُن کاموں پر ہوتا ہے جن میں اتفاقی اُمور کو کمائی اور قسمت آزمائی اور تقسیمِ اموال و اشیا کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

۱۰۹ – اِس آیت میں چار چیزیں قطعی طور پر حرام کی گئی ہیں: ایک، شراب۔ دوسرے، قِمار بازی۔ تیسرے، وہ مَقامات جو خدا کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنے یا خدا کے سوا کسی اَور کے نام پر قربانی اور نذر و نیاز چڑھانے کے لیے مخصوص کیے گئے ہوں۔ چوتھے، پانسے۔ مؤخّر الذکر تین چیزوں کی ضروری تشریح پہلے کی جا چکی ہے۔ شراب کے متعلّق احکام کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

شراب کی حُرمت کے سلسلے میں اس سے پہلے دو حکم آچکے تھے، جو سورۂ بقرہ آیت ۲۱۹ اور سورۂ نساء آیت ۴۳ میں گزر چکے ہیں۔ اب اس آخری حکم کے آنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبے میں لوگوں کو مُتنبِّہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کو شراب سخت ناپسند ہے، بعید نہیں کہ اس کی قطعی حُرمت کا حکم آجائے، لہٰذا جن جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہو وہ اسے فروخت کر دیں۔ اس کے کچھ مدّت بعد یہ آیت نازل ہوئی اور آپؐ نے اعلان کرایا کہ اب جن کے پاس شراب ہے، وہ نہ اسے پی سکتے ہیں، نہ بیچ سکتے ہیں، بلکہ وہ اسے ضائع کر دیں۔ چنانچہ اسی وقت مدینے کی گلیوں میں شراب بہادی گئی۔ بعض لوگوں نے پوچھا: ہم یہودیوں کو تحفتاً کیوں نہ دے دیں؟ آپؐ نے فرمایا: ”جس نے یہ چیز حرام کی ہے اُس نے اِسے تحفتاً دینے سے بھی منع کر دیا ہے۔“ بعض لوگوں نے پوچھا: ہم شراب کو سرکے میں کیوں نہ تبدیل کر دیں؟ آپؐ نے اس سے بھی منع فرمایا اور حکم دیا کہ ”نہیں، اسے بہادو۔“ ایک صاحب نے باصرار دریافت کیا کہ دوا کے طور پر استعمال کی تو اجازت ہے؟ فرمایا: ”نہیں، وہ دوا نہیں ہے بلکہ بیماری ہے۔“ ایک اَور صاحب نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! ہم ایک ایسے علاقے کے رہنے والے ہیں جو نہایت سرد ہے، اور ہمیں محنت بھی بہت کرنی پڑتی ہے۔ ہم لوگ شراب سے تکان اور سردی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: جو چیز تم پیتے ہو وہ نشہ کرتی ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: تو اس سے پرہیز کرو۔ انھوں نے عرض کیا: مگر ہمارے علاقے کے لوگ تو نہیں

مانیں گے۔ فرمایا: ”اگر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو۔“

ابنِ عمرؓ کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لعن اللّٰہ الخمر و شاربھا وساقیھا و بائعھا ومُبتاعھا وعاصرھا ومعتصرھا وحاملھا والمحمولۃ الیہ۔ ”اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے شراب[۱] پر، اور اس کے پینے[۲] والے پر اور پلا[۳]نے والے پر، اور بیچنے[۴] والے پر، اور خرید[۵]نے والے پر، اور کشید[۶] کرنے والے پر، اور کشید[۷] کرانے والے پر، اور ڈھو[۸] کر لے جانے والے پر، اور اس شخص[۹] پر جس کے لیے وہ ڈھو کر لے جائی گئی ہو۔“

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس دسترخوان پر کھانا کھانے سے منع فرمایا جس پر شراب پی جا رہی ہو۔ ابتداءً آپؐ نے اُن برتنوں تک کے استعمال کو منع فرما دیا تھا جن میں شراب بنائی اور پی جاتی تھی۔ بعد میں جب شراب کی حُرمت کا حکم پوری طرح نافذ ہو گیا تب آپؐ نے برتنوں پر سے یہ قید اُٹھا دی۔

خَمر کا لفظ عرب میں انگوری شراب کے لیے استعمال ہوتا تھا، اور مجازاً گیہوں، جَو، کِشمش، کھجور اور شہد کی شرابوں کے لیے بھی یہ لفظ بولتے تھے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حُرمت کے اس حکم کو تمام اُن چیزوں پر عام قرار دیا جو نشہ پیدا کرنے والی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضورؐ کے یہ واضح ارشادات ہمیں ملتے ہیں کہ کل مسکر خمر و کل مسکر حرام۔ ”ہر نشہ آور چیز خَمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔“ کل شرابٍ اسکر فھو حرام۔ ”ہر وہ مشروب جو نشہ پیدا کرے، حرام ہے۔“ وانا انھی عن کل مسکرٍ۔ ”اور میں ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے خطبہ میں شراب کی یہ تعریف بیان کی تھی کہ الخمر ما خامر العقل۔ ”خمر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔“

نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اُصول بھی بیان فرمایا کہ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ ”جس چیز کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔“ اور ما اسکر الفرق منہ فملء الکف منہ حرام۔ ”جس چیز کا ایک پورا قرابہ نشہ پیدا کرتا ہو، اس کا ایک چُلّو پینا بھی حرام ہے۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شراب پینے والے کے لیے کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی۔ جو شخص اِس جُرم میں گرفتار ہو کر آتا تھا، اُسے جُوتے، لات، مُکّے، بَل دی ہوئی چادروں کے سونٹے اور کھجور کے سَنٹے مارے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ۴۰ ضربیں آپؐ کے زمانے میں اس جُرم پر لگائی گئی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ۴۰ کوڑے مارے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی ابتداءً ۴۰ کوڑوں ہی کی سزا رہی۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس جُرم سے باز نہیں آتے تو انھوں نے صحابۂ کرامؓ کے مشورے سے ۸۰ کوڑے سزا مقرر کی۔ اسی سزا کو امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ، اور ایک رِوایت کے بموجب امام شافعیؒ بھی، شراب کی حد قرار دیتے ہیں۔ مگر امام احمد ابنِ حَنبلؒ اور ایک دوسری رِوایت کے مطابق امام شافعیؒ ۴۰ کوڑوں کے قائل ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کو پسند فرمایا ہے۔

شریعت کی رُو سے یہ بات حکومتِ اسلامی کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ شراب کی بندش کے اس حکم کو بزورِ قوت نافذ کرے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بنی ثَقِیف کے ایک شخص رُوَیشِد نامی کی دکان اس بنا پر جلوا دی گئی کہ وہ

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي
الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ج
فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُونَ ﴿۹۱﴾ وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ
وَاحْذَرُوا ج فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوٓا أَنَّمَا عَلٰى رَسُولِنَا الْبَلٰغُ
الْمُبِينُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوٓا إِذَا مَا اتَّقَوا وَّاٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ
اتَّقَوا وَّاٰمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوا وَّأَحْسَنُوا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۳﴾ ع
يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ

ع ۱۲ / ۲

شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جُوئے کے ذریعے سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی بات مانو اور باز آ جاؤ، لیکن اگر تم نے حکم عُدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسولؐ پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمّہ داری تھی۔

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے، انھوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اس پر کوئی گرفت نہ ہو گی، بشرطیکہ وہ آیندہ اُن چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں، پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رُکیں اور جو فرمانِ الٰہی ہو اُسے مانیں، پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رَوِیّہ رکھیں۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ تمھیں اُس شکار کے ذریعے سے سخت آزمائش میں ڈالے گا

خفیہ طور پر شراب بیچتا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر ایک پُورا گاؤں حضرت عمرؓ کے حکم سے اِس قصور پر جلا ڈالا گیا کہ وہاں خفیہ طریقے سے شراب کی کشید اور فروخت کا کاروبار ہو رہا تھا۔

تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ
فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا
فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا
بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا
لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ

جو بالکل تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہوگا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تم میں سے کون اس سے غائبانہ ڈرتا ہے، پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا اُس کے لیے دردناک سزا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو[110]، اور اگر تم میں سے کوئی جان بُوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو، اسی کے ہم پلّہ ایک جانور اُسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا، جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے، اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا، یا نہیں تو اِس گناہ کے کفّارے میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا، یا اس کے بقدر روزے رکھنے ہوں[111] گے، تاکہ وہ اپنے کیے کا مزا چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا اُسے اللہ نے معاف کر دیا، لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا

---

۱۱۰ – شکار خواہ آدمی خود کرے، یا کسی دوسرے کو شکار میں کسی طور پر مدد دے، دونوں باتیں حالتِ احرام میں منع ہیں۔ نیز اگر مُحرِم کی خاطر شکار مارا گیا ہو تب بھی اس کا کھانا مُحرِم کے لیے جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی شخص نے اپنے لیے خود شکار کیا ہو اور پھر وہ اس میں سے مُحرِم کو بھی تُحفتاً کچھ دے دے تو اس کے کھانے میں کچھ مضایقہ نہیں۔ اس حکمِ عام سے مُوذی جانور مستثنیٰ ہیں۔ سانپ، بچھّو، باؤلا کتّا اور ایسے دوسرے جانور جو انسان کو نقصان پہنچانے والے ہیں، حالتِ احرام میں مارے جا سکتے ہیں۔

۱۱۱ – اِن اُمور کا فیصلہ بھی دو عادل آدمی ہی کریں گے کہ کس جانور کے مارنے پر آدمی کتنے مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا کتنے روزے رکھے۔

فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ اُحِلَّ لَكُمْ
صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ ۚ وَ حُرِّمَ
عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا
لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ
لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ

تو اس سے اللہ بدلہ لے گا، اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

تمھارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا[۱۱۲] گیا، جہاں تم ٹھیرو وہاں بھی اُسے کھا سکتے ہو اور قافلے کے لیے زادِ راہ بھی بنا سکتے ہو۔ البتہ خشکی کا شکار، جب تک تم اِحرام کی حالت میں ہو، تم پر حرام کیا گیا ہے۔ پس بچو اُس خدا کی نافرمانی سے جس کی پیشی میں تم سب کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا۔

اللہ نے مکانِ محترم، کعبہ کو لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہِ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اِس کام میں معاون بنا دیا[۱۱۳])، تاکہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے

۱۱۲- چونکہ سمندر کے سفر میں بسا اوقات زادِ راہ ختم ہو جاتا ہے اور غذا کی فراہمی کے لیے، بُجز اس کے کہ آبی جانوروں کا شکار کیا جائے، اور کوئی تدبیر ممکن نہیں ہوتی، اس لیے بحری شکار حلال کر دیا گیا۔

۱۱۳- عرب میں کعبے کی حیثیت محض ایک مقدّس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی، بلکہ اپنی مرکزیّت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی مَعاشی و تمدّنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عُمرے کے لیے سارا ملک اُس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہوتا، مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدُّنی روابط قائم کرتے، شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی، اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی مَعاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا پورا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا تھا۔ بس یہی زمانہ ایسا تھا جس میں ان کے قافلے ملک کے ایک سرے سے

وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۹۷﴾ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ
الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا
الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا یَسْتَوِی
الْخَبِیْثُ وَ الطَّیِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِیْثِ ۚ فَاتَّقُوا

اور اُسے ہر چیز کا علم ہے۔[114] خبردار ہو جاؤ! اللہ سزا دینے میں بھی سخت ہے اور اس کے ساتھ بہت درگزر اور رحم بھی کرنے والا ہے۔ رسُول پر تو صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمّہ داری ہے، آگے تمھارے کُھلے اور چُھپے سب حالات کا جاننے والا اللہ ہے۔ اے پیغمبرؐ! اِن سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں، خواہ ناپاک کی بہتات تمھیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو،[115] پس اے لوگو

دوسرے سرے تک بسہولت آتے جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور قلادوں کی موجودگی سے بھی اس نقل وحرکت میں بڑی مدد ملتی تھی، کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹّے پڑے ہوتے، انھیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں اور کسی غارت گر قبیلے کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جُرأت نہ ہوتی۔

۱۱۴– یعنی اگر تم اس انتظام پر غور کرو تو تمھیں خود اپنے ملک کی تمدّنی ومَعاشی زندگی ہی میں اس امر کی ایک بیّن شہادت مل جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے مصالح اور اُن کی ضروریات کا کیسا مکمّل اور گہرا علم رکھتا ہے اور اپنے ایک ایک حکم کے ذریعے سے انسانی زندگی کے کتنے کتنے شعبوں کو فائدہ پہنچا دیتا ہے۔ بدامنی کے یہ سیکڑوں برس جو محمدؐ عرَبی کے ظُہور سے پہلے گزرے ہیں، ان میں تم لوگ خود اپنے مفاد سے ناواقف تھے اور اپنے آپ کو تباہ کرنے پر تُلے ہوئے تھے، مگر اللہ تمھاری ضرورتوں کو جانتا تھا اور اُس نے صرف ایک کعبہ کی مرکزیّت قائم کر کے تمھارے لیے وہ انتظام کر دیا تھا جس کی بدولت تمھاری قومی زندگی برقرار رہ سکی۔ دوسری بے شمار باتوں کو چھوڑ کر اگر صرف اسی ایک بات پر دھیان کرو تو تمھیں یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ نے جو احکام تمھیں دیے ہیں، اُن کی پابندی میں تمھاری اپنی بھلائی ہے اور ان میں تمھارے لیے وہ مصلحتیں پوشیدہ ہیں جن کو نہ تم خود سمجھ سکتے ہو اور نہ اپنی تدبیروں سے پورا کر سکتے ہو۔

۱۱۵– یہ آیت قدر وقیمت کا ایک دوسرا ہی معیار پیش کرتی ہے، جو ظاہر میں انسان کے معیار سے بالکل مختلف ہے۔ ظاہر بیں نظر میں سو روپے بمقابلہ پانچ روپے کے لازماً زیادہ قیمتی ہیں، کیونکہ وہ سو ہیں اور یہ پانچ۔ لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ سو روپے اگر خدا کی نافرمانی کر کے حاصل کیے گئے ہوں تو وہ ناپاک ہیں، اور پانچ روپے اگر خدا کی فرماں برداری کرتے ہوئے کمائے گئے ہوں تو وہ پاک ہیں، اور ناپاک خواہ مقدار میں کتنا ہی زیادہ ہو، بہرحال وہ پاک کے برابر کسی طرح نہیں

اللّٰہَ یٰٓاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ ع یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا
تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡیَآءَ اِنۡ تُبۡدَ لَکُمۡ تَسُؤۡکُمۡ ۚ وَ اِنۡ تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡہَا حِیۡنَ
یُنَزَّلُ الۡقُرۡاٰنُ تُبۡدَ لَکُمۡ ؕ عَفَا اللّٰہُ عَنۡہَا ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۱۰۱﴾

جو عقل رکھتے ہو! اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو، اُمّید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایسی باتیں نہ پُوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں ناگوار ہوں،[۱۱۶] لیکن اگر تم انھیں ایسے وقت پُوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔ اب تک جو کچھ تم نے کیا اُسے اللہ نے معاف کر دیا، وہ درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے۔

ہو سکتا۔ غلاظت کے ایک ڈھیر سے عطر کا ایک قطرہ زیادہ قدر رکھتا ہے اور پیشاب کی ایک لبریز ناند کے مقابلے میں پاک پانی کا ایک چُلّو زیادہ وزنی ہے۔ لہٰذا ایک سچّے دانش مند انسان کو لازماً حلال ہی پر قناعت کرنی چاہیے خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی حقیر و قلیل ہو، اور حرام کی طرف کسی حال میں بھی ہاتھ نہ بڑھانا چاہیے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کثیر و شان دار ہو۔

۱۱۶ — نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگ عجیب عجیب قسم کے فضول سوالات کیا کرتے تھے، جن کی نہ دین کے کسی معاملے میں ضرورت ہوتی تھی اور نہ دُنیا ہی کے کسی معاملے میں۔ مثلاً ایک موقع پر ایک صاحب بھرے مجمع میں آپؐ سے پوچھ بیٹھے کہ ”میرا اصلی باپ کون ہے؟“ اسی طرح بعض لوگ احکامِ شرع میں غیر ضروری پُوچھ گچھ کیا کرتے تھے، اور خواہ مخواہ پُوچھ پُوچھ کر ایسی چیزوں کا تعیُّن کرانا چاہتے تھے جنھیں شارع نے مصلحتاً غیر معیّن رکھا ہے۔ مثلاً قرآن میں مُجملاً یہ حکم دیا گیا تھا کہ حج تم پر فرض کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے حکم سنتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ”کیا ہر سال فرض کیا گیا ہے؟“ آپؐ نے کچھ جواب نہ دیا۔ انھوں نے پھر پوچھا۔ آپؐ پھر خاموش ہو گئے۔ تیسری مرتبہ پوچھنے پر آپؐ نے فرمایا: ”تم پر افسوس ہے۔ اگر میری زبان سے ہاں نکل جائے تو حج ہر سال فرض قرار پا جائے۔ پھر تم ہی لوگ اس کی پیروی نہ کر سکو گے اور نافرمانی کرنے لگو گے۔“ ایسے ہی لایعنی اور غیر ضروری سوالات سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی لوگوں کو کثرتِ سوال سے اور خواہ مخواہ ہر بات کی کھوج لگانے سے منع فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ان اعظم المسلمین فی المسلمین جرما من سأل عن شئ لم یحرم علی الناس فحرم من اجل مسألتہ۔ ”مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال چھیڑا جو لوگوں پر حرام نہ کی گئی تھی اور پھر محض اس کے سوال چھیڑنے کی بدولت وہ چیز حرام ٹھیرائی گئی۔“ ایک دُوسری حدیث میں ہے: ان

قَدۡ سَاَلَهَا قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِكُمۡ ثُمَّ اَصۡبَحُوۡا بِهَا كٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ
اللّٰهُ مِنۡۢ بَحِيۡرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيۡلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ

تم سے پہلے ایک گروہ نے اِسی قسم کے سوالات کیے تھے، پھر وہ لوگ انھی باتوں کی وجہ سے کفر میں مُبتلا ہو گئے۔[۱۱۷]

اللہ نے نہ کوئی بَحِیرہ مقرر کیا ہے نہ سائِبَہ اور نہ وَصِیلہ اور نہ حام۔[۱۱۸] مگر

اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحَدّ حُدُودًا فلا تعتدُوھَا وسَکتَ عَنْ اشیَاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ ’’اللہ نے کچھ فرائض تم پر عائد کیے ہیں، انھیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے، ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حُدُود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے متعلّق خاموشی اختیار کی ہے، بغیر اس کے کہ اُسے بھول لاحق ہوئی ہو، لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ۔‘‘ ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبّہ کیا گیا ہے۔ جن امور کو شارع نے مُجملاً بیان کیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی، یا جو احکام بر سبیلِ اِجمال دیے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعیُّنات کا ذکر نہیں کیا ہے، ان میں اِجمال اور عَدَمِ تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی، تفصیلات بتانی چاہیے تھیں مگر نہ بتائیں، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان اُمور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لیے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعیُّنات اور تقیُّدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے، اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے، اِستِنباط سے کسی نہ کسی طرح مُجمَل کو مُفصَّل، مُطلَق کو مُقیَّد، غیر معیَّن کو معیّن بنا کر ہی چھوڑتا ہے، وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے۔ اس لیے کہ مابعد الطّبیعی اُمور میں جتنی تفصیلات زیادہ ہوں گی، ایمان لانے والے کے لیے اتنے ہی زیادہ اُلجھن کے مواقع بڑھیں گے، اور احکام میں جتنی قُیود زیادہ ہوں گی، پیروی کرنے والے کے لیے خلاف ورزیِ حکم کے امکانات بھی اسی قدر زیادہ ہوں گے۔

۱۱۷– یعنی پہلے انھوں نے خود ہی عقائد اور احکام میں مُوشگافیاں کیں اور ایک ایک چیز کے متعلّق سوال کر کر کے تفصیلات اور قُیود کا ایک جال اپنے لیے تیار کرایا، پھر خود ہی اُس میں اُلجھ کر اعتقادی گمراہیوں اور عملی نافرمانیوں میں مبتلا ہو گئے ــــــ اِس گروہ سے مراد یہودی ہیں جن کے نقشِ قدم پر چلنے میں، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہات کے باوجود، مسلمانوں نے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔

۱۱۸– جس طرح ہمارے مُلک میں گائے، بیل اور بکرے خدا کے نام پر یا کسی بُت یا قبر یا دیوتا یا پیر کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں، اور ان سے کوئی خدمت لینا یا انھیں ذبح کرنا یا کسی طور پر ان سے فائدہ اُٹھانا حرام سمجھا جاتا ہے،

الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ اَكْثَرُهُمْ
لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ
وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ
اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

یہ کافر اللہ پر جھُوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں (کہ ایسے وہمیّات کو مان رہے ہیں)۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبرؐ کی طرف، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے چلے جائیں گے، خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستے کی انھیں خبر ہی نہ ہو؟

اسی طرح زمانۂ جاہلیّت میں اہلِ عرب بھی مختلف طریقوں سے جانوروں کو پُن کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان طریقوں سے چھوڑے ہوئے جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔

بَحِیْرہ اُس اُونٹنی کو کہتے تھے جو پانچ دفعہ بچے جَن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نر بچّہ ہوا ہو۔ اس کا کان چیر کر اُسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا، نہ اُس کا دُودھ پیا جاتا، نہ اُسے ذبح کیا جاتا، نہ اس کا اُون اُتارا جاتا۔ اُسے حق تھا کہ جس کھیت اور جس چراگاہ میں چاہے چَرے اور جس گھاٹ سے چاہے پانی پیے۔

سائبہ اُس اُونٹ یا اُونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی مَنّت کے پورا ہونے، یا کسی بیماری سے شفا پانے، یا کسی خطرے سے بچ جانے پر بطور شکرانہ کے پُن کر دیا گیا ہو۔ نیز جس اُونٹنی نے دس مرتبہ بچّے دیے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو اسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وَصِیلہ: اگر بکری کا پہلا بچہ نر ہوتا تو وہ خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا، اور اگر وہ پہلی بار مادہ جنتی تو اسے اپنے لیے رکھ لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوتے تو نر کو ذبح کرنے کے بجائے یونہی خداؤں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس کا نام وَصِیلہ تھا۔

حام: اگر کسی اُونٹ کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا تو اس بُوڑھے اُونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نیز اگر کسی اُونٹ کے نُطفے سے دس بچّے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مِل جاتی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ‌ۚ لَا يَضُرُّكُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا
اهۡتَدَيۡتُمۡ‌ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ
تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا شَهَادَةُ بَيۡنِكُمۡ اِذَا حَضَرَ
اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ حِيۡنَ الۡوَصِيَّةِ اثۡنٰنِ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ اَوۡ اٰخَرٰنِ
مِنۡ غَيۡرِكُمۡ اِنۡ اَنۡتُمۡ ضَرَبۡتُمۡ فِى الۡاَرۡضِ فَاَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةُ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی فکر کرو، کسی دُوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔[119] اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیّت کر رہا ہو تو اس کے لیے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمھاری جماعت میں سے دو صاحبِ عدل[120] آدمی گواہ بنائے جائیں، یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیر مسلموں ہی میں سے

---

۱۱۹ – یعنی بجائے اس کے کہ آدمی ہر وقت یہ دیکھتا رہے کہ فلاں کیا کر رہا ہے اور فلاں کے عقیدے میں کیا خرابی ہے اور فلاں کے اعمال میں کیا بُرائی ہے، اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔ اسے فکر اپنے خیالات کی، اپنے اخلاق اور اعمال کی ہونی چاہیے کہ وہ کہیں خراب نہ ہوں۔ اگر آدمی خود اللہ کی اطاعت کر رہا ہے، خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کر رہا ہے، اور راست روی و راست بازی کے مُقتضیات پورے کر رہا ہے، جن میں لازماً امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی شامل ہے، تو یقیناً کسی شخص کی گمراہی و کج روی اس کے لیے نقصان دِہ نہیں ہو سکتی۔

اِس آیت کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ آدمی بس اپنی نجات کی فکر کرے، دوسروں کی اصلاح کی فکر نہ کرے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس غلط فہمی کی تردید کرتے ہوئے اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں: ”لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ بُرائی کو دیکھیں اور اسے بدلنے کی کوشش نہ کریں، ظالم کو ظلم کرتے ہوئے پائیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں، تو بعید نہیں کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ خدا کی قسم! تم کو لازم ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو، ورنہ اللہ تم پر ایسے

الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ
ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ
اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ
اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ
الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا
وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى

دو گواہ لے لیے جائیں[۱۲۱]۔ پھر اگر کوئی شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ "ہم کسی ذاتی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں، اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو (ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں)، اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں، اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔" لیکن اگر پتا چل جائے کہ ان دونوں نے اپنے آپ کو گناہ میں مُبتلا کیا ہے تو پھر ان کی جگہ دو اور شخص جو ان کی بہ نسبت شہادت دینے کے لیے اہل تر ہوں، ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کی حق تلفی ہوئی ہو، اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ "ہماری شہادت اُن کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے اپنی گواہی میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے، اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے ہوں گے۔" اس طریقے سے زیادہ توقع کی جا سکتی ہے

لوگوں کو مسلّط کر دے گا جو تم میں سب سے بدتر ہوں گے اور وہ تم کو سخت تکلیفیں پہنچائیں گے، پھر تمھارے نیک لوگ خدا سے دُعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی۔

۱۲۰ – یعنی دین دار، راست باز اور قابلِ اعتماد مسلمان۔

۱۲۱ – اِس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلم کو شاہد بنانا صرف اُس حالت میں دُرست ہے جب کہ کوئی مسلمان گواہ بننے کے لیے میسّر نہ آ سکے۔

أَن يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ عَلَىٰ وَجْهِهَا أَوْ يَخَافُوا أَن تُرَدَّ أَيْمَانٌ
بَعْدَ أَيْمَانِهِمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاسْمَعُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْفَاسِقِينَ ﴿١٠٨﴾ يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ ۖ
قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿١٠٩﴾ إِذْ قَالَ اللَّهُ
يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ
أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَ

کہ لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت دیں گے، یا کم از کم اس بات ہی کا خوف کریں گے کہ ان کی قسموں کے بعد دُوسری قسموں سے کہیں ان کی تردید نہ ہو جائے۔ اللہ سے ڈرو اور سُنو، اللہ نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔ؑ

جس روز[122] اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پُوچھے گا کہ تمھیں کیا جواب[123] دیا گیا، تو وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں،[124] آپ ہی تمام پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں۔ پھر تصوّر کرو اس موقع کا جب اللہ فرمائے[125] گا کہ ”اے مریمؑ کے بیٹے عیسٰیؑ! یاد کر میری اس نعمت کو جو مَیں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی، مَیں نے رُوحِ پاک سے تیری مدد کی، تُو گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرتا تھا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی،

۱۲۲– مراد ہے قیامت کا دن۔

۱۲۳– یعنی اسلام کی طرف جو دعوت تم نے دُنیا کو دی تھی اس کا کیا جواب دنیا نے تمھیں دیا۔

۱۲۴– یعنی ہم تو صرف اُس محدُود ظاہری جواب کو جانتے ہیں جو ہمیں اپنی زندگی میں ملتا ہُوا محسوس ہُوا۔ باقی رہا یہ کہ فی الحقیقت ہماری دعوت کا ردِّ عمل کہاں کس صُورت میں کتنا ہُوا، تو اس کا صحیح علم آپ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔

۱۲۵– ابتدائی سوال تمام رسولوں سے بحیثیتِ مجموعی ہوگا۔ پھر ایک ایک رسول سے الگ الگ شہادت لی جائے گی، جیسا کہ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بتصریح ارشاد ہوا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام سے جو سوال کیا جائے گا، وہ یہاں بطورِ خاص نقل کیا جا رہا ہے۔

اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ وَ اِذْ
تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ
طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ تُخْرِجُ
الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ
بِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ

میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی، تُو میرے حکم سے مٹی کا پُتلا پرندے کی شکل کا بناتا اور اس میں پُھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا، تُو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا، تُو مُردوں کو میرے حکم سے نکالتا تھا،[۱۲۶] پھر جب تو بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکرِ حق تھے انھوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں، تو میں نے ہی تجھے اُن سے بچایا، اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، تب اُنھوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں"[۱۲۷] ــــــ (حواریوں کے سلسلے میں)[۱۲۸] یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب

---

۱۲۶ - یعنی حالتِ موت سے نکال کر زندگی کی حالت میں لاتا تھا۔

۱۲۷ - یعنی حواریوں کا تجھ پر ایمان لانا بھی ہمارے فضل اور توفیق کا نتیجہ تھا، ورنہ تجھ میں تو اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ اُس جھٹلانے والی آبادی میں ایک ہی تصدیق کرنے والا اپنے بل بُوتے پر پیدا کر لیتا ــــــ ضمناً یہاں یہ بھی بتا دیا کہ حواریوں کا اصل دین اسلام تھا نہ کہ عیسائیت۔

۱۲۸ - چونکہ حواریوں کا ذکر آ گیا تھا اس لیے سلسلۂ کلام کو توڑ کر جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں حواریوں ہی کے متعلّق ایک اور واقعے کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا، جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ مسیحؑ سے براہِ راست جن

الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ
اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا
اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا
وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ
عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ
رَبَّنَاۤ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا
لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ

حواریوں نے کہا: اے عیسٰی ابنِ مریم! کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اُتار سکتا ہے؟ تو عیسٰیؑ نے کہا: اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ اُنھوں نے کہا: ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔ اس پر عیسٰی ابنِ مریمؑ نے دُعا کی: ”خدایا! ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر، جو ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تُو بہترین

جن شاگردوں نے تعلیم پائی تھی وہ مسیحؑ کو ایک انسان اور محض ایک بندہ سمجھتے تھے اور ان کے وہم وگمان میں بھی اپنے مرشد کے خدا یا شریکِ خدا یا فرزندِ خدا ہونے کا تصوّر نہ تھا۔ نیز یہ کہ مسیحؑ نے خود بھی اپنے آپ کو ان کے سامنے ایک بندۂ بے اختیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جو گفتگو قیامت کے روز ہونے والی ہے، اس کے اندر اس جملۂ معترضہ کا کون سا موقع ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملۂ معترضہ اُس گفتگو سے متعلق نہیں ہے جو قیامت کے روز ہوگی، بلکہ اُس کی اس پیشگی حکایت سے متعلق ہے جو اس دنیا میں کی جا رہی ہے۔ قیامت کی اس ہونے والی گفتگو کا ذکر یہاں کیا ہی اس لیے جا رہا ہے کہ موجودہ زندگی میں عیسائیوں کو اُس سے سبق ملے اور وہ راہِ راست پر آئیں۔ لہٰذا اس گفتگو کے سلسلے میں حواریوں کے اس واقعے کا ذکر بطور ایک جملۂ معترضہ کے آنا کسی طرح غیر متعلق نہیں ہے۔

الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ
مِنْكُمْ فَاِنِّىْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ ع وَ
اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَ
اُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِىْٓ اَنْ

ع ۱۵ ۵

رازق ہے۔" اللہ نے جواب دیا: "میں اُس کو تم پر نازل کرنے والا ہوں[129] مگر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا، اسے میں ایسی سزا دوں گا جو دُنیا میں کسی کو نہ دی ہوگی"، ع —— غرض جب (یہ احسانات یاددلا کر) اللہ فرمائے گا کہ "اے عیسیٰ ابن مریمؑ! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو؟[130]" تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ "سبحان اللہ! میرا یہ کام نہ تھا کہ

۱۲۹ – قرآن اس باب میں خاموش ہے کہ یہ خوان فی الواقع اُتارا گیا یا نہیں۔ دوسرے کسی معتبر ذریعے سے بھی اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ یہ نازل ہوا ہو، اور ممکن ہے کہ حواریوں نے بعد کی خوفناک دھمکی سن کر اپنی درخواست واپس لے لی ہو۔

۱۳۰ – عیسائیوں نے اللہ کے ساتھ صرف مسیحؑ اور رُوح القدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسیحؑ کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا۔ حضرت مریم علیہا السلام کی اُلوہیّت یا قُدّوسیت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائبل میں موجود نہیں ہے۔ مسیحؑ کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دنیا اس تخیّل سے بالکل ناآشنا تھی۔ تیسری صدی عیسوی کے آخری دَور میں اسکندریہ کے بعض علمائے دینیات نے پہلی مرتبہ حضرت مریمؑ کے لیے "اُمّ اللہ" یا "مادرِ خدا" کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اُلوہیّتِ مریم کا عقیدہ اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ لیکن اوّل اوّل چرچ اسے باقاعدہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ پھر جب نَسطُورِیَس کے اس عقیدے پر کہ مسیحؑ کی واحد ذات میں دو مستقل جُداگانہ شخصیتیں جمع تھیں، مسیحی دُنیا میں بحث وجدال کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تو اس کا تصفیہ کرنے کے لیے ۴۳۱ء میں شہر اِفسُوس میں ایک کونسل منعقد ہوئی، اور اس کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں حضرت مریمؑ کے لیے "مادرِ خدا" کا لقب استعمال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا، وہ اس کے بعد کلیسا کے اندر بھی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا، حتّٰی کہ نزولِ قرآن کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے حضرت مریمؑ اتنی بڑی دیوی بن گئیں کہ باپ، بیٹا اور رُوح القدس تینوں ان کے سامنے ہیچ ہوگئے۔ ان کے مجسّمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوئے تھے، ان کے آگے عبادت

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا
فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾
مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ
وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ
اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ

وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا، آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے، آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے اُن سے اُس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ میں اُسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بُلا لیا تو آپ ان پر نگراں تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگراں ہیں۔ اب اگر

کے جملہ مَراسم ادا کیے جاتے تھے، انھی سے دُعائیں مانگی جاتی تھیں، وہی فریاد رس، حاجت روا، مشکل کُشا اور بے کسوں کی پُشتیبان تھیں، اور ایک مسیحی بندے کے لیے سب سے بڑا ذریعۂ اعتماد اگر کوئی تھا تو وہ یہ تھا کہ ”مادرِ خدا“ کی حمایت و سرپرستی اسے حاصل ہو۔ قیصر جَسْٹِینِیَن اپنے ایک قانون کی تمہید میں حضرت مریمؑ کو اپنی سلطنت کا حامی و ناصر قرار دیتا ہے۔ اس کا مشہور جنرل نرسیس میدانِ جنگ میں حضرت مریمؑ سے ہدایت و رہنمائی طلب کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر قیصر ہِرَقْل نے اپنے جھنڈے پر ”مادرِ خدا“ کی تصویر بنا رکھی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس تصویر کی برکت سے یہ جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ اگرچہ بعد کی صدیوں میں تحریکِ اصلاح کے اثر سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مریم پرستی کے خلاف شدّت سے آواز اُٹھائی، لیکن رومن کیتھولک کلیسا آج تک اس مسلک پر قائم ہے۔

تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ
الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوۡمُ يَنۡفَعُ الصّٰدِقِيۡنَ صِدۡقُهُمۡ ؕ لَهُمۡ
جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِىَ اللّٰهُ
عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ
وَالۡاَرۡضِ وَمَا فِيۡهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

ع ۱۶

آپ انھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں، اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔'' تب اللہ فرمائے گا: ''یہ وہ دن ہے جس میں سچّوں کو اُن کی سچّائی نفع دیتی ہے، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔''

زمین اور آسمانوں اور تمام موجودات کی پادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ع

ضمیمہ

(نوٹ بسلسلہ حاشیہ ۳۶)

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیروؤں کا نام کبھی ''عیسائی'' یا ''مسیحی'' نہیں رکھا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے نام سے کسی نئے مذہب کی بنا ڈالنے نہیں آئے تھے۔ ان کی دعوت اُسی دین کو تازہ کرنے کی طرف تھی، جسے حضرت موسیٰؑ اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیا لے کر آئے تھے۔ اس لیے انھوں نے عام بنی اسرائیل اور پیروانِ شریعتِ موسوی سے الگ نہ کوئی جماعت بنائی اور نہ اس کا کوئی مستقل نام رکھا۔ ان کے ابتدائی پیرو خود بھی نہ اپنے آپ کو اسرائیلی ملّت سے الگ سمجھتے تھے، نہ ایک مستقل گروہ بن کر رہے، اور نہ انھوں نے اپنے لیے کوئی امتیازی نام اور نشان قرار دیا۔ وہ عام یہودیوں کے ساتھ بیت المقدس ہی کے ہیکل میں عبادت کرنے کے لیے جاتے تھے اور اپنے آپ کو موسوی شریعت ہی پر عمل کرنے کا پابند سمجھتے تھے۔ (ملاحظہ ہو: کتابِ اعمال ۱:۳-۱۰، ۱:۱۴، ۱۵:۱ و ۵، ۲۱:۲۱)

آگے چل کر جدائی کا عمل دو جانب سے شروع ہوا۔ ایک طرف حضرت عیسیٰؑ کے پیروؤں میں سے پولوس (سینٹ پال) نے شریعت کی پابندی ختم کر کے یہ اعلان کر دیا کہ بس مسیحؑ پر ایمان لے آنا نجات کے لیے کافی ہے۔ اور دوسری طرف یہودی علما نے پیروانِ مسیحؑ کو ایک گمراہ فرقہ قرار دے کر عامّۂ بنی اسرائیل سے کاٹ دیا۔ لیکن اس جدائی کے باوجود ابتداءً اس نئے فرقے کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ خود پیروانِ مسیحؑ اپنے لیے کبھی ''شاگرد'' کا لفظ استعمال کرتے تھے اور کبھی اپنے رفقا کا ذکر ''بھائیوں'' (اِخْوَان)، ''ایمان داروں'' (مُؤْمِنِیْن)، ''جو ایمان لائے'' (الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا)، اور ''مُقدّسوں'' کے الفاظ سے کرتے تھے (کتابِ اعمال ۲:۴۴، ۴:۳۲، ۹:۲۶، ۱۱:۲۹، ۱۳:۵۲، ۱۵:۱ و ۲۳۔ رومیوں ۱۵:۲۵۔ کُلُسِّیوں ۱:۲)۔ بخلاف اس کے یہودی ان لوگوں کو کبھی ''گلیلی'' کہتے تھے اور کبھی ''ناصریوں کا بدعتی فرقہ'' کہہ کر پکارتے تھے (اعمال ۲۴:۵۔ لُوقا ۱۳:۲)۔ یہ نام دھرنے کی کوشش انھوں نے ازراہِ طنز و تشنیع اس بنا پر کی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وطن ناصرہ تھا اور وہ فلسطین کے ضلع گلیل میں واقع تھا۔ لیکن یہ طنزیہ الفاظ اس حد تک رائج نہ ہو سکے کہ پیروانِ مسیحؑ کے لیے نام کی حیثیت اختیار کر جاتے۔

اس گروہ کا موجودہ نام مسیحی (Christian) پہلی مرتبہ ۴۳ء یا ۴۴ء میں انطاکیہ کے مشرک باشندوں نے رکھا تھا، جب کہ سینٹ پال اور بَرنَباس نے وہاں پہنچ کر اپنے مذہب کی تبلیغ عام شروع کی (اعمال ۱۱:۲۶)۔ یہ نام بھی دراصل طنز و تمسخر کے طور پر مخالفین کی طرف سے رکھا گیا تھا، اور پیروانِ مسیحؑ اسے خود اپنے نام کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن جب ان کے دشمنوں نے ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا تو ان کے لیڈروں نے کہا کہ اگر تمھیں مسیحؑ کی طرف نسبت دے کر ''مسیحی'' کہا جاتا ہے تو تمھیں اس پر شرمانے کی کیا ضرورت ہے (۱-پطرس ۴:۱۶)۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ لوگ خود بھی اپنے آپ کو اسی نام سے موسوم کرنے لگے جس سے ان کے دشمنوں نے طنزاً انھیں موسوم کیا تھا، یہاں تک کہ آخر کار ان کے اندر سے یہ احساس ہی ختم ہو گیا کہ یہ دراصل ایک بُرا لقب تھا جو انھیں دیا گیا تھا۔

قرآنِ مجید نے اسی لیے مسیحؑ کے ماننے والوں کو مسیحی یا عیسائی کے نام سے یاد نہیں کیا ہے، بلکہ انھیں یاد دلایا ہے کہ تم دراصل ان لوگوں کے نام لیوا ہو جنھیں عیسیٰ ابنِ مریمؑ نے پکارا تھا کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ، ''کون ہے جو اللہ کی راہ میں میری مدد کرے''، اور انھوں نے جواب دیا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ، ''ہم اللہ کی راہ میں مددگار ہیں''۔ اس لیے تم اپنی ابتدائی اور بنیادی حقیقت کے اعتبار سے نصاریٰ یا انصار ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنری اس یاد دہانی پر قرآن کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اُلٹی شکایت کر رہے ہیں کہ قرآن نے ان کو مسیحی کہنے کے بجائے نصاریٰ کے نام سے کیوں موسوم کیا!

تفہیم القرآن

الانعام

(۶)

الانعام

نام اِس سُورہ کے رکوع ۱۶ و ۱۷ میں بعض اَنعام (مویشیوں) کی حُرمت اور بعض کی حِلّت کے متعلق اہلِ عرب کے توہّمات کی تردید کی گئی ہے۔ اِسی مناسبت سے اس کا نام ''الانعام'' رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ پُوری سورہ مکّہ میں بیک وقت نازل ہوئی تھی۔ حضرت مُعاذؓ بن جَبَل کی چچا زاد بہن اَسماءؓ بنتِ یزید کہتی ہیں کہ ''جب یہ سورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہی تھی، اس وقت آپؐ اُونٹنی پر سوار تھے، میں اس کی نکیل پکڑے ہوئے تھی اور بوجھ کے مارے اُونٹنی کا یہ حال ہو رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اس کی ہڈیاں اب ٹوٹ جائیں گی۔'' روایات میں اس کی بھی تصریح ہے کہ جس رات یہ نازل ہوئی اسی رات کو آپؐ نے اسے قلم بند کرا دیا۔

اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت مکّی دَور کے آخری زمانے میں نازل ہوئی ہوگی۔ حضرت اَسماءؓ بنتِ یزید کی روایت بھی اسی کی تصدیق کرتی ہے۔ کیونکہ موصوفہ انصار میں سے تھیں اور ہجرت کے بعد ایمان لائیں۔ اگر قبولِ اسلام سے پہلے محض بربنائے عقیدت وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکہ حاضر ہوئی ہوں گی تو یقیناً یہ حاضری آپؐ کی مکی زندگی کے آخری سال ہی میں ہوئی ہوگی۔ اس سے پہلے اہلِ یَثرِب کے ساتھ آپؐ کے تعلّقات اتنے بڑھے ہی نہ تھے کہ وہاں سے کسی عورت کا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونا ممکن ہوتا۔

شانِ نزول زمانۂ نزول متعین ہو جانے کے بعد ہم بآسانی اس پَس منظر کو دیکھ سکتے ہیں جس میں یہ خطبہ ارشاد ہوا ہے۔ اس وقت اللہ کے رسول کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے بارہ سال گزر چکے تھے۔ قریش کی مزاحمت اور ستم گری و جفا کاری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسلام قبول کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ظلم وستم سے عاجز آ کر ملک چھوڑ چکی تھی اور حَبَش میں مقیم تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت کے لیے نہ ابوطالب باقی رہے تھے اور نہ حضرت خَدِیجہؓ، اس لیے ہر دنیوی سہارے سے محروم ہو کر آپؐ شدید مزاحمتوں کے مقابلے میں تبلیغِ رسالت کا فرض انجام دے رہے تھے۔ آپؐ کی تبلیغ کے اثر سے مکّہ میں اور گردونواح کے قبائل میں بھی صالح افراد پے درپے اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، لیکن قوم بحیثیت مجموعی ردّ و انکار پر تُلی ہوئی تھی۔ جہاں کوئی شخص اسلام کی طرف ادنیٰ میلان بھی ظاہر کرتا تھا، اسے طعن و ملامت، جسمانی اذیّت اور مَعاشی و معاشرتی مقاطعے کا ہدف بننا پڑتا تھا۔ اس تاریک ماحول میں صرف ایک ہلکی سی شعاع یثرب کی طرف سے نمودار ہوئی تھی جہاں سے اَوس اور خَزرَج کے بااثر لوگ آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور جہاں کسی اندرونی مزاحمت کے بغیر اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر اس حقیر سی ابتدا میں مستقبل کے جو امکانات پوشیدہ تھے، انھیں کوئی ظاہر بیں آنکھ

نہ دیکھ سکتی تھی۔ بظاہر دیکھنے والوں کو جو کچھ نظر آتا تھا، وہ بس یہ تھا کہ اسلام ایک کمزور سی تحریک ہے جس کی پُشت پر کوئی مادّی طاقت نہیں، جس کا داعی اپنے خاندان کی ضعیف سی حمایت کے سوا کوئی زور نہیں رکھتا، اور جسے قبول کرنے والے چند مُٹھی بھر بے بس اور منتشر افراد اپنی قوم کے عقیدہ و مسلک سے منحرف ہو کر اس طرح سوسائٹی سے نکال پھینکے گئے ہیں جیسے پتّے اپنے درخت سے جھڑ کر زمین پر پھیل جائیں۔

مَباحِث اِن حالات میں یہ خطبہ ارشاد ہوا ہے اور اس کے مضامین کو سات بڑے بڑے عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) شرک کا اِبطال اور عقیدۂ توحید کی طرف دعوت،

(۲) عقیدۂ آخرت کی تبلیغ اور اس غلط خیال کی تردید کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے،

(۳) جاہلیّت کے اُن توہُّمات کی تردید جن میں لوگ مبتلا تھے،

(۴) اُن بڑے بڑے اُصولِ اخلاق کی تلقین جن پر اسلام سوسائٹی کی تعمیر چاہتا تھا،

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت کے خلاف لوگوں کے اعتراضات کا جواب،

(۶) طویل جِدّوجُہد کے باوجود دعوت کے نتیجہ خیز نہ ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں کے اندر اضطراب اور دل شکستگی کی جو کیفیت پیدا ہو رہی تھی اس پر تسلّی،

(۷) منکرین اور مخالفین کو ان کی غفلت و سرشاری اور نادانستہ خودکُشی پر نصیحت، تنبیہ اور تہدید۔

لیکن خطبے کا انداز یہ نہیں ہے کہ ایک ایک عنوان پر الگ الگ یکجا گفتگو کی گئی ہو۔ بلکہ خطبہ ایک دریا کی سی روانی کے ساتھ چلتا جاتا ہے اور اس کے دوران میں یہ عنوانات مختلف طریقوں سے بار بار چھِڑتے ہیں اور ہر بار ایک نئے انداز سے ان پر گفتگو کی جاتی ہے۔

مکّی زندگی کے اَدوار یہاں چونکہ پہلی مرتبہ ناظرین کے سامنے ایک مفصّل مکّی سورہ آ رہی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مَقام پر ہم مکّی سورتوں کے تاریخی پَس منظر کی ایک جامع تشریح کر دیں، تاکہ آئندہ تمام مکی سورتوں کو، اور ان کی تفسیر کے سلسلے میں ہمارے اشارات کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

جہاں تک مَدنی سورتوں کا تعلّق ہے، ان میں سے تو قریب قریب ہر ایک کا زمانۂ نزول معلوم ہے یا تھوڑی سی کاوش سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان کی تو بکثرت آیتوں کی انفرادی شانِ نزول تک معتبر روایات میں مل جاتی ہے۔ لیکن مکی سورتوں کے متعلق ہمارے پاس اتنے مفصّل ذرائع معلومات موجود نہیں ہیں۔ بہت کم سورتیں یا آیتیں ایسی ہیں جن کے زمانۂ نُزول اور موقعِ نزول کے بارے میں کوئی صحیح و معتبر روایت ملتی ہو۔ کیونکہ اُس زمانے کی تاریخ اس قدر جُزئی تفصیلات کے ساتھ مُرتَّب نہیں ہوئی ہے جیسی کہ مدنی دَور کی تاریخ ہے۔ اس وجہ سے مکّی سورتوں کے معاملے میں ہم کو تاریخی شہادتوں کے بجائے زیادہ تر اُن اندرونی شہادتوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو مختلف سورتوں کے موضوع، مضمون اور اندازِ بیان میں، اور اپنے پَس منظر کی طرف اُن کے جلی یا خفی اشارات میں پائی جاتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اِس

نوعیّت کی شہادتوں سے مدد لے کر ایک ایک سورت اور ایک ایک آیت کے متعلق یہ تعین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ فلاں تاریخ کو، یا فلاں سنہ میں فلاں موقع پر نازل ہوئی ہے۔ زیادہ صحّت کے ساتھ جو کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ایک طرف ہم مکّی سورتوں کی اندرونی شہادتوں کو، اور دُوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کی تاریخ کو آمنے سامنے رکھیں اور پھر دونوں کا تقابُل کرتے ہوئے یہ رائے قائم کریں کہ کون سی سورت کس دَور سے تعلّق رکھتی ہے۔

اس طرزِ تحقیق کو ذہن میں رکھ کر جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ دعوتِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے ہم کو چار بڑے بڑے نمایاں ادوار پر منقسم نظر آتی ہے:

پہلا دَور، آغازِ بعثت سے لے کر اعلانِ نبوّت تک، تقریباً ۳ سال، جس میں دعوت خفیہ طریقے سے خاص خاص آدمیوں کو دی جا رہی تھی اور عام اہلِ مکہ کو اس کا علم نہ تھا۔

دوسرا دَور، اعلانِ نبوّت سے لے کر ظلم وستم اور فتنہ (persecution) کے آغاز تک، تقریباً ۲ سال، جس میں پہلے مخالفت شروع ہوئی، پھر اس نے مزاحمت کی شکل اختیار کی، پھر تضحیک، استہزاء، الزامات، سَبّ وشَتم، جھوٹے پروپیگنڈے اور مخالفانہ جتھا بندی تک نوبت پہنچی، اور بالآخر ان مسلمانوں پر زیادتیاں شروع ہوگئیں جو نسبتاً زیادہ غریب، کمزور اور بے یار و مددگار تھے۔

تیسرا دَور، آغازِ فتنہ (۵ نبویؐ) سے لے کر ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات (۱۰ نبویؐ) تک، تقریباً پانچ چھ سال۔ اس میں مخالفت انتہائی شدّت اختیار کرتی چلی گئی، بہت سے مسلمان کفارِ مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آ کر حَبَش کی طرف ہجرت کر گئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان اور باقی ماندہ مسلمانوں کا مَعاشی ومعاشرتی مقاطعہ کیا گیا اور آپؐ اپنے حامیوں اور ساتھیوں سمیت شِعْبِ ابی طالب میں محصُور کر دیے گئے۔

چوتھا دَور، ۱۰ نبویؐ سے لے کر ۱۳ نبویؐ تک، تقریباً ۳ سال۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے انتہائی سختی ومصیبت کا زمانہ تھا۔ مکہ میں آپؐ کے لیے زندگی دُوبھر کر دی گئی تھی، طائف گئے تو وہاں بھی پناہ نہ ملی، حج کے موقع پر عرب کے ایک ایک قبیلے سے آپؐ اپیل کرتے رہے کہ وہ آپؐ کی دعوت قبول کرے اور آپؐ کا ساتھ دے، مگر ہر طرف سے کورا جواب ہی ملتا رہا۔ اور ادھر اہلِ مکہ بار بار یہ مشورے کرتے رہے کہ آپؐ کو قتل کر دیں یا قید کر دیں یا اپنی بستی سے نکال دیں۔ آخرِکار اللہ کے فضل سے انصار کے دل اسلام کے لیے کُھل گئے اور ان کی دعوت پر آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

ان میں سے ہر دَور میں قرآنِ مجید کی جو سورتیں نازل ہوئی ہیں، وہ اپنے مضامین اور اندازِ بیان میں دوسرے دَور کی سورتوں سے مختلف ہیں۔ اُن میں بکثرت مقامات پر ایسے اشارات بھی پائے جاتے ہیں جن سے پَس منظر کے حالات اور واقعات پر صاف روشنی پڑتی ہے۔ ہر دَور کی خُصوصیّات کا اثر اُس دَور کے نازل شدہ کلام میں بہت بڑی حد تک نمایاں نظر آتا ہے۔ انھی علامات پر اعتماد کر کے ہم آیندہ ہر مکّی سورہ کے دیباچے میں یہ بتائیں گے کہ وہ مکہ کے کس دَور میں نازل ہوئی ہے۔

سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ مَكِّيَّةٌ

۱۶۵ آیاتہا ۲۰ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ
وَ النُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِیْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ

تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے، روشنی اور تاریکیاں پیدا کیں۔ پھر بھی وہ لوگ جنھوں نے دعوتِ حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، دُوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھیرا رہے ہیں[1]۔ وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا[2] کیا، پھر تمھارے لیے زندگی کی ایک مدّت مقرر کر دی، اور ایک دُوسری مدّت اور بھی ہے جو اس کے ہاں طے[3] شدہ ہے۔

۱ – یاد رہے کہ مُخاطَب وہ مشرکینِ عرب ہیں جو اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ ہے، وہی دن نکالتا اور رات لاتا ہے اور اسی نے آفتاب و ماہتاب کو وجود بخشا ہے۔ ان میں سے کسی کا بھی یہ عقیدہ نہ تھا کہ یہ کام لات یا ہُبَل یا عُزّیٰ یا کسی اَور دیوی یا دیوتا کے ہیں۔ اس لیے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ نادانو! جب تم خود یہ مانتے ہو کہ زمین و آسمان کا خالق اور گردشِ لیل و نہار کا فاعل اللہ ہے تو یہ دوسرے کون ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے سجدے کرتے ہو، نذریں اور نیازیں چڑھاتے ہو، دعائیں مانگتے ہو اور اپنی حاجتیں پیش کرتے ہو۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ فاتحہ حاشیہ ۲، سورۂ بقرہ حاشیہ ۱۶۳)

روشنی کے مقابلے میں تاریکیوں کو بصیغۂ جمع بیان کیا گیا، کیونکہ تاریکی نام ہے عَدَمِ نور کا، اور عَدَمِ نور کے بے شمار مدارج ہیں۔ اس لیے نور واحد ہے اور تاریکیاں بہت ہیں۔

۲ – انسانی جسم کے تمام اجزا زمین سے حاصل ہوتے ہیں، کوئی ایک ذرّہ بھی اس میں غیر ارضی نہیں ہے، اس لیے فرمایا کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔

۳ – یعنی قیامت کی گھڑی، جب کہ تمام اگلے پچھلے انسان از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے اور حساب دینے کے لیے اپنے رب کے سامنے حاضر ہوں گے۔

ثُمَّ اَنۡتُمۡ تَمۡتَرُوۡنَ ۝۲ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الۡاَرۡضِ ؕ
يَعۡلَمُ سِرَّكُمۡ وَجَهۡرَكُمۡ وَيَعۡلَمُ مَا تَكۡسِبُوۡنَ ۝۳ وَمَا تَاۡتِيۡهِمۡ
مِّنۡ اٰيَةٍ مِّنۡ اٰيٰتِ رَبِّهِمۡ اِلَّا كَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِيۡنَ ۝۴ فَقَدۡ
كَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ ؕ فَسَوۡفَ يَاۡتِيۡهِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا كَانُوۡا
بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝۵ اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ
مَّكَّنّٰهُمۡ فِي الۡاَرۡضِ مَا لَمۡ نُمَكِّنۡ لَّكُمۡ وَاَرۡسَلۡنَا السَّمَآءَ
عَلَيۡهِمۡ مِّدۡرَارًا ۖ وَّجَعَلۡنَا الۡاَنۡهٰرَ تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهِمۡ

مگر تم لوگ ہو کہ شک میں پڑے ہوئے ہو۔ وہی ایک خدا آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی، تمھارے کُھلے اور چُھپے سب حال جانتا ہے اور جو بُرائی یا بھلائی تم کماتے ہو، اس سے خوب واقف ہے۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں جو ان کے سامنے آئی ہو اور انھوں نے اس سے منہ نہ موڑ لیا ہو۔ چنانچہ اب جو حق ان کے پاس آیا تو اسے بھی انھوں نے جھٹلا دیا۔ اچھّا، جس چیز کا وہ اب تک مذاق اُڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کے متعلّق کچھ خبریں انھیں پہنچیں[۴] گی۔ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانے میں دَور دورہ رہا ہے؟ اُن کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمھیں نہیں بخشا ہے، ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں،

۴ – اشارہ ہے ہجرت اور اُن کامیابیوں کی طرف جو ہجرت کے بعد اسلام کو پے در پے حاصل ہونے والی تھیں۔ جس وقت یہ اشارہ فرمایا گیا تھا، اُس وقت نہ کفّار یہ گمان کر سکتے تھے کہ کس قسم کی خبریں انھیں پہنچنے والی ہیں، اور نہ مسلمانوں ہی کے ذہن میں اس کا کوئی تصوّر تھا۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی آیندہ کے امکانات سے بے خبر تھے۔

فَاَهۡلَكۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ وَاَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِيۡنَ ۞ ۶
وَلَوۡ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ كِتٰبًا فِىۡ قِرۡطَاسٍ فَلَمَسُوۡهُ بِاَيۡدِيۡهِمۡ لَقَالَ
الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۞ ۷ وَقَالُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ
عَلَيۡهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوۡ اَنۡزَلۡنَا مَلَـكًا لَّقُضِىَ الۡاَمۡرُ ثُمَّ لَا يُنۡظَرُوۡنَ ۞ ۸
وَلَوۡ جَعَلۡنٰهُ مَلَـكًا لَّجَعَلۡنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسۡنَا عَلَيۡهِمۡ

(مگر جب انھوں نے کفرانِ نعمت کیا تو) آخرِ کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انھیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دُوسرے دَور کی قوموں کو اُٹھایا۔

اے پیغمبرؐ! اگر ہم تمھارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چُھوکر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا؟[۵] اگر کہیں ہم نے فرشتہ اُتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، پھر انھیں کوئی مُہلت نہ دی جاتی[۶]۔ اور اگر ہم فرشتے کو اُتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اُتارتے اور اس طرح انھیں اُسی شبہے میں مبتلا کر دیتے جس میں

۵- یعنی جب یہ شخص خدا کی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے تو آسمان سے ایک فرشتہ اُترنا چاہیے تھا جو لوگوں سے کہتا کہ یہ خدا کا پیغمبرؐ ہے، اس کی بات مانو، ورنہ تمھیں سزا دی جائے گی۔ جاہل معترضین کو اس بات پر تعجب تھا کہ خالقِ ارض وسما کسی کو پیغمبرؐ مقرر کرے اور پھر اس طرح اُسے بے یار و مددگار، پتھر کھانے اور گالیاں سننے کے لیے چھوڑ دے۔ اتنے بڑے بادشاہ کا سفیر اگر کسی بڑے اسٹاف کے ساتھ نہ آیا تھا تو کم از کم ایک فرشتہ تو اس کی اَرْدَلی میں رہنا چاہیے تھا، تاکہ وہ اس کی حفاظت کرتا، اس کا رُعب بٹھاتا، اس کی ماموریّت کا یقین دلاتا اور فوق الفطری طریقے سے اس کے کام انجام دیتا۔

۶- یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لینے کے لیے جو مہلت تمھیں ملی ہوئی ہے، یہ اُسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ جہاں غیب کا پردہ چاک ہوا، پھر مُہلت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ اُس کے بعد تو صرف حساب ہی لینا باقی

مَا يَلْبِسُوْنَ ﴿۹﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ
ع بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾
قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ

اب یہ مُبتلا ہیں۔[7]

اے محمدؐ! تم سے پہلے بھی بہت سے رسُولوں کا مذاق اُڑایا جا چکا ہے، مگر ان مذاق اُڑانے والوں پر آخرِ کار وہی حقیقت مسلّط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ ع اِن سے کہو: ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہُوا ہے۔[8]

ان سے پُوچھو: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟— کہو سب کچھ اللہ ہی کا ہے،[9]

رہ جائے گا۔ اس لیے کہ دنیا کی زندگی تمھارے لیے ایک امتحان کا زمانہ ہے، اور امتحان اس امر کا ہے کہ تم حقیقت کو دیکھے بغیر عقل وفکر کے صحیح استعمال سے اس کا اِدراک کرتے ہو یا نہیں، اور اِدراک کرنے کے بعد اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو قابو میں لا کر اپنے عمل کو حقیقت کے مطابق دُرست رکھتے ہو یا نہیں۔ اس امتحان کے لیے غیب کا غیب رہنا شرطِ لازم ہے، اور تمھاری دُنیوی زندگی، جو دراصل مہلتِ امتحان ہے، اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک غیب، غیب ہے۔ جہاں غیب شہادت میں تبدیل ہوا، یہ مہلت لازماً ختم ہو جائے گی اور امتحان کے بجائے نتیجۂ امتحان نکلنے کا وقت آ پہنچے گا۔ لہٰذا تمھارے مطالبے کے جواب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تمھارے سامنے فرشتے کو اس کی اصلی صورت میں نمایاں کر دیا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ابھی تمھارے امتحان کی مدّت ختم نہیں کرنا چاہتا۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بَقَرہ حاشیہ ۲۲۸)

۷ — یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ فرشتے کے آنے کی پہلی صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنی اصلی غیبی صورت میں ظاہر ہوتا۔ لیکن اُوپر بتا دیا گیا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اب دوسری صورت یہ باقی رہ گئی کہ وہ انسانی صورت میں آئے۔ اس کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ انسانی صورت میں آئے تو اس کے مامور من اللہ ہونے میں بھی تم کو وہی اشتباہ پیش آئے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مامور من اللہ ہونے میں پیش آ رہا ہے۔

۸ — یعنی گزری ہوئی قوموں کے آثارِ قدیمہ اور ان کے تاریخی افسانے شہادت دیں گے کہ صداقت وحقیقت سے منہ موڑنے اور باطل پرستی پر اصرار کرنے کی بدولت کس طرح یہ قومیں عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئیں۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾
وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِى الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾
قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ
يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّىْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ

اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اُوپر لازم کرلیا ہے (اسی لیے وہ نافرمانیوں اور سرکشیوں پر تمھیں جلدی سے نہیں پکڑ لیتا)، قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا، یہ بالکل ایک غیر مُشتَبَہ حقیقت ہے، مگر جن لوگوں نے اپنے آپ کو خود تباہی کے خطرے میں مُبتلا کرلیا ہے وہ اسے نہیں مانتے۔

رات کے اندھیرے اور دن کے اُجالے میں جو کچھ ٹھیرا ہوا ہے سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ کہو: اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اُس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے، روزی لیتا نہیں ہے؟[۱۰] کہو: مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اُس کے آگے سرِ تسلیم خم کروں (اور تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے)

۹- یہ ایک لطیف اندازِ بیان ہے۔ پہلے حکم ہوا کہ ان سے پوچھو، زمین و آسمان کی موجودات کس کی ہیں۔ سائل نے سوال کیا اور جواب کے انتظار میں ٹھیر گیا۔ مُخاطَب اگرچہ خود قائل ہیں کہ سب کچھ اللہ کا ہے، لیکن نہ تو وہ غلط جواب دینے کی جرأت رکھتے ہیں، اور نہ صحیح جواب دینا چاہتے ہیں، کیونکہ اگر صحیح جواب دیتے ہیں تو انھیں خوف ہے کہ مخالف اس سے ان کے مشرکانہ عقیدے کے خلاف اِستِدلال کرے گا۔ اس لیے وہ کچھ جواب نہیں دیتے۔ تب حکم ہوتا ہے کہ تم خود ہی کہو کہ سب کچھ اللہ کا ہے۔

۱۰- اس میں ایک لطیف تعریض ہے۔ مشرکوں نے اللہ کے سوا جن جن کو اپنا خدا بنا رکھا ہے، وہ سب اپنے ان بندوں کو رزق دینے کے بجائے اُلٹا ان سے رزق پانے کے محتاج ہیں۔ کوئی فرعون خدائی کے ٹھاٹ نہیں جما سکتا جب تک اس کے بندے اسے ٹیکس اور نذرانے نہ دیں۔ کسی صاحبِ قبر کی شانِ معبُودیت قائم نہیں ہوسکتی جب تک

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ
رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ
رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ
فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ
الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ قف شَهِيْدٌۢ
بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۟ قف وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ

تُو بہر حال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ کہو: اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے (خوفناک) دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔ اُس دن جو سزا سے بچ گیا، اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ اگر اللہ تمھیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمھیں اس نقصان سے بچا سکے، اور اگر وہ تمھیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے۔

ان سے پُوچھو: کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ —— کہو: میرے اور تمھارے درمیان اللہ گواہ ہے[۱۱]، اور یہ قرآن میری طرف بذریعۂ وحی بھیجا گیا ہے، تاکہ تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے،

اس کے پرستار اس کا شاندار مقبرہ تعمیر نہ کریں۔ کسی دیوتا کا دربارِ خداوندی سج نہیں سکتا جب تک اس کے پُجاری اس کا مجسّمہ بنا کر کسی عالی شان مندر میں نہ رکھیں اور اس کو تزئین و آرایش کے سامانوں سے آراستہ نہ کریں۔ سارے بناوٹی خدا بیچارے خود اپنے بندوں کے محتاج ہیں۔ صرف ایک خداوندِ عالَم ہی وہ حقیقی خدا ہے جس کی خدائی آپ اپنے بَل بُوتے پر قائم ہے اور جو کسی کی مدد کا محتاج نہیں، بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں۔

۱۱ – یعنی اس بات پر گواہ ہے کہ میں اس کی طرف سے مامور ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اسی کے حکم سے کہہ رہا ہوں۔

بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ
قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِىْ بَرِىْٓءٌ مِّمَّا
تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ وقف لازم
اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ ع وَ
مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ

سب کو مُتنبّہ کردُوں۔ کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دُوسرے خدا بھی ہیں؟[۱۲] کہو: میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں[۱۳] دے سکتا۔ کہو: خدا تو وہی ایک ہے اور میں اُس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مُبتلا ہو۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس بات کو اس طرح غیر مُشتبَہ طور پر پہچانتے ہیں جیسے ان کو اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ پیش نہیں آتا۔[۱۴] مگر جنھوں نے اپنے آپ کو خود خسارے میں ڈال دیا ہے، وہ اِسے نہیں مانتے ع اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھُوٹا بہتان لگائے،[۱۵] یا اللہ کی نشانیوں کو جھُٹلائے[۱۶]؟ یقیناً

۱۲- کسی چیز کی شہادت دینے کے لیے محض قیاس یا گمان کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے علم ہونا ضروری ہے جس کی بِنا پر آدمی یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ ایسا ہے۔ پس سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تمھیں یہ علم ہے کہ اس جہانِ ہست و بُود میں خدا کے سوا اور بھی کوئی کارفرما حاکم ذی اختیار ہے جو بندگی و پرستش کا مستحق ہو؟

۱۳- یعنی اگر تم علم کے بغیر محض جھُوٹی شہادت دینا چاہتے ہو تو دو، میں تو ایسی شہادت نہیں دے سکتا۔

۱۴- یعنی کُتُبِ آسمانی کا علم رکھنے والے اس حقیقت کو غیر مُشتبَہ طور پر پہچانتے ہیں کہ خدا ایک ہی ہے اور خدائی میں کسی کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ جس طرح کسی کا بچّہ بہت سے بچّوں میں بلا جُلا کھڑا ہو تو وہ الگ پہچان لے گا کہ اس کا بچہ کون سا ہے، اسی طرح جو شخص کتابِ الٰہی کا علم رکھتا ہو، وہ اُلُوہیّت کے متعلّق لوگوں کے بے شمار مختلف عقیدوں اور نظریّوں کے درمیان بلا کسی شک و اشتباہ کے یہ پہچان لیتا ہے کہ ان میں سے امرِ حق کون سا ہے۔

۱۵- یعنی یہ دعویٰ کرے کہ خدا کے ساتھ دُوسری بہت سی ہستیاں بھی خدائی میں شریک ہیں، خدائی صفات سے متّصف ہیں، خداوندانہ اختیارات رکھتی ہیں، اور اس کی مستحق ہیں کہ انسان ان کے آگے عبدیت کا رویّہ اختیار کرے۔ نیز یہ بھی اللہ پر بہتان ہے کہ کوئی یہ کہے کہ خدا نے فلاں فلاں ہستیوں کو اپنا مُقرّبِ خاص قرار دیا ہے اور اُسی نے یہ حکم

لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَ یَوۡمَ نَحۡشُرُہُمۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ نَقُوۡلُ
لِلَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا اَیۡنَ شُرَکَآؤُکُمُ الَّذِیۡنَ کُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۲۲﴾
ثُمَّ لَمۡ تَکُنۡ فِتۡنَتُہُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا وَ اللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا
مُشۡرِکِیۡنَ ﴿۲۳﴾ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ کَذَبُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا
کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُ اِلَیۡکَ ۚ وَ جَعَلۡنَا

ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے، تو وہ اِس کے سوا کوئی فتنہ نہ اُٹھا سکیں گے کہ (یہ جھُوٹا بیان دیں کہ) اے ہمارے آقا! تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔ دیکھو، اُس وقت یہ کس طرح اپنے اُوپر آپ جھُوٹ گھڑیں گے، اور وہاں اُن کے سارے بناوٹی معبُود گم ہوجائیں گے۔

ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمھاری بات سُنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے

دیا ہے، یا کم از کم یہ کہ وہ اِس پر راضی ہے کہ ان کی طرف خدائی صفات منسوب کی جائیں اور ان سے وہ معاملہ کیا جائے جو بندے کو اپنے خدا کے ساتھ کرنا چاہیے۔

۱۶- اللہ کی نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں بھی ہیں جو انسان کے اپنے نفس اور ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں، اور وہ بھی جو پیغمبروں کی سیرت اور ان کے کارناموں میں ظاہر ہوئیں، اور وہ بھی جو کُتُبِ آسمانی میں پیش کی گئیں۔ یہ ساری نشانیاں ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں، یعنی یہ کہ موجوداتِ عالم میں خدا صرف ایک ہے، باقی سب بندے ہیں۔ اب جو شخص ان تمام نشانیوں کے مقابلے میں کسی حقیقی شہادت کے بغیر، کسی علم، کسی مُشاہدے اور کسی تجرِبے کے بغیر، مُجرّد قیاس و گمان یا تقلیدِ آبائی کی بنا پر، دوسروں کو اُلُوہیت کی صفات سے متّصف اور خداوندی حُقوق کا مستحق ٹھیراتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ حقیقت و صداقت پر ظلم کر رہا ہے، اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہے اور کائنات کی ہر اس چیز پر ظلم کر رہا ہے جس کے ساتھ وہ اس غلط نظریّے کی بنا پر کوئی معاملہ کرتا ہے۔

عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ
يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ
يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾

اُن کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے (کہ سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہیں سنتے[۱۷])۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے۔ حدیہ ہے کہ جب وہ تمھارے پاس آ کر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے وہ (ساری باتیں سُننے کے بعد) یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستانِ پارینہ کے سوا کچھ نہیں[۱۸]۔

۱۷- یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ قانونِ فطرت کے تحت جو کچھ دنیا میں واقع ہوتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب فرماتا ہے، کیونکہ دراصل اس قانون کا بنانے والا اللہ ہی ہے اور جو نتائج اس قانون کے تحت رونما ہوتے ہیں، وہ سب حقیقت میں اللہ کے اذن وارادہ کے تحت ہی رونما ہوا کرتے ہیں۔ ہٹ دھرم منکرینِ حق کا سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہ سننا اور داعیِ حق کی کسی بات کا ان کے دل میں نہ اُترنا اُن کی ہٹ دھرمی اور تعصّب اور جمود کا فطری نتیجہ ہے۔ قانونِ فطرت یہی ہے کہ جو شخص ضد پر اُتر آتا ہے اور بے تعصّبی کے ساتھ صداقت پسند انسان کا سا رَوِیّہ اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوتا، اس کے دل کے دروازے ہر اس صداقت کے لیے بند ہو جاتے ہیں جو اس کی خواہشات کے خلاف ہو۔ اس بات کو جب ہم بیان کریں گے تو یوں کہیں گے کہ فلاں شخص کے دل کے دروازے بند ہیں۔ اور اسی بات کو جب اللہ بیان فرمائے گا تو یوں فرمائے گا کہ اس کے دل کے دروازے ہم نے بند کر دیے ہیں۔ کیونکہ ہم صرف واقعہ بیان کرتے ہیں اور اللہ حقیقتِ واقعہ کا اظہار فرماتا ہے۔

۱۸- نادان لوگوں کا عُموماً یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص انھیں حق کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے نئی بات کیا کہی، یہ تو سب وہی پرانی باتیں ہیں جو ہم پہلے سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ گویا ان احمقوں کا نظریّہ یہ ہے کہ کسی بات کے حق ہونے کے لیے اس کا نیا ہونا بھی ضروری ہے اور جو بات پرانی ہے وہ حق نہیں ہے۔ حالانکہ حق ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر جو لوگ انسانوں کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے ہیں وہ سب قدیم ترین زمانے سے ایک ہی امرِ حق کو پیش کرتے آئے ہیں، اور آیندہ بھی جو اس منبعِ علم سے فائدہ اٹھا کر کچھ پیش کرے گا وہ اسی پرانی بات کو دُہرائے گا۔ البتہ نئی بات صرف وہی لوگ نکال سکتے ہیں جو خدا کی روشنی سے محروم ہو کر اَزَلی وابَدی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے اور اپنے ذہن کی اُپج سے کچھ نظریات گھڑ کر انھیں حق کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بلاشبہ ایسے نادرۂ کار ہو سکتے ہیں کہ وہ بات کہیں جو ان سے پہلے کبھی دنیا میں کسی نے نہ کہی ہو۔

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِنْ يُّهْلِكُوْنَ إِلَّآ
أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا
يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧﴾
بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۗ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا
لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَقَالُوْٓا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا
الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۗ

وہ اس امرِ حق کو قبول کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دُور بھاگتے ہیں۔ (وہ سمجھتے ہیں کہ اس حرکت سے وہ تمھارا کچھ بگاڑ رہے ہیں) حالانکہ دراصل وہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں مگر انھیں اس کا شُعور نہیں ہے۔ کاش! تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ درحقیقت یہ بات وہ محض اس وجہ سے کہیں گے کہ جس حقیقت پر انھوں نے پردہ ڈال رکھا تھا وہ اس وقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی ہوگی،[19] ورنہ اگر انھیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیجا جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں جس سے انھیں منع کیا گیا ہے، وہ تو ہیں ہی جھوٹے (اس لیے اپنی اس خواہش کے اظہار میں بھی جھوٹ ہی سے کام لیں گے)۔ آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اُٹھائے جائیں گے۔ کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔

١٩ – یعنی ان کا یہ قول درحقیقت عقل و فکر کے کسی صحیح فیصلے اور کسی حقیقی تبدیلیِ رائے کا نتیجہ نہ ہوگا بلکہ محض مشاہدۂ حق کا نتیجہ ہوگا، جس کے بعد ظاہر ہے کہ کوئی کٹّے سے کٹّا کافر بھی انکار کی جرأت نہیں کرسکتا۔

قَالَ اَلَیۡسَ ھٰذَا بِالۡحَقِّ ؕ قَالُوۡا بَلٰی وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ
بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ ﴿۳۰﴾ ع قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ اللّٰہِ ؕ حَتّٰۤی
اِذَا جَآءَتۡہُمُ السَّاعَۃُ بَغۡتَۃً قَالُوۡا یٰحَسۡرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطۡنَا فِیۡہَا ۙ
وَ ہُمۡ یَحۡمِلُوۡنَ اَوۡزَارَہُمۡ عَلٰی ظُہُوۡرِہِمۡ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوۡنَ ﴿۳۱﴾
وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ

اس وقت ان کا رب ان سے پُوچھے گا: ”کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟“ یہ کہیں گے: ”ہاں اے ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے۔“ وہ فرمائے گا: ”اچھا! تو اب اپنے انکارِ حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو۔“ ع

نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا۔ جب اچانک وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے: ”افسوس! ہم سے اس معاملے میں کیسی تقصیر ہوئی۔“ اور ان کا حال یہ ہوگا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو! کیسا بُرا بوجھ ہے جو یہ اُٹھا رہے ہیں۔ دُنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے[20]، حقیقت میں آخرت ہی کا مقام

۲۰ – اس کا یہ مطلب نہیں کہ دُنیا کی زندگی میں کوئی سنجیدگی نہیں ہے اور یہ محض کھیل اور تماشے کے طور پر بنائی گئی ہے۔ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی حقیقی اور پائدار زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی ایسی ہے جیسے کوئی شخص کچھ دیر کھیل اور تفریح میں دل بہلائے اور پھر اصل سنجیدہ کاروبار کی طرف واپس ہو جائے۔ نیز اسے کھیل اور تماشے سے تشبیہ اس لیے بھی دی گئی ہے کہ یہاں حقیقت کے مخفی ہونے کی وجہ سے بے بصیرت اور ظاہر پرست انسانوں کے لیے غلط فہمیوں میں مبتلا ہونے کے بہت سے اسباب موجود ہیں اور ان غلط فہمیوں میں پھنس کر لوگ حقیقتِ نفس الامری کے خلاف ایسے ایسے عجیب طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جن کی بدولت ان کی زندگی محض ایک کھیل اور تماشا بن کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً جو شخص یہاں بادشاہ بن کر بیٹھتا ہے، اس کی حیثیت حقیقت میں تھیٹر کے اس مصنوعی بادشاہ سے مختلف نہیں ہوتی جو تاج پہن کر جلوہ افروز ہوتا ہے اور اس طرح حکم چلاتا ہے گویا کہ وہ واقعی بادشاہ ہے۔ حالانکہ حقیقی بادشاہی کی اس کو ہوا تک نہیں لگی ہوتی۔ ڈائریکٹر کے ایک اشارے پر وہ معزول ہو جاتا ہے، قید کیا جاتا ہے اور اس کے قتل تک کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔

خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ
الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى

اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں، پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لوگے؟

اے محمدؐ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمھیں رنج ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ تمھیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں[21]۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسُول جھٹلائے جا چکے ہیں مگر اس تکذیب پر اور اُن اذیّتوں پر جو انھیں پہنچائی گئیں، انھوں نے

ایسے ہی تماشے اس دُنیا میں ہر طرف ہو رہے ہیں۔ کہیں کسی ولی یا دیوی کے دربار سے حاجت روائیاں ہو رہی ہیں، حالاں کہ وہاں حاجت روائی کی طاقت کا نام ونشان تک موجود نہیں۔ کہیں کوئی غیب دانی کے کمالات کا مظاہرہ کر رہا ہے، حالاں کہ غیب کے علم کا وہاں شائبہ تک نہیں۔ کہیں کوئی لوگوں کا رزّاق بنا ہوا ہے، حالاں کہ بیچارہ خود اپنے رزق کے لیے کسی اَور کا محتاج ہے۔ کہیں کوئی اپنے آپ کو عزّت اور ذلّت دینے والا، نفع اور نقصان پہنچانے والا سمجھے بیٹھا ہے اور یوں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجا رہا ہے گویا کہ وہی گرد وپیش کی ساری مخلوق کا خدا ہے، حالاں کہ بندگی کی ذلّت کا داغ اس کی پیشانی پر لگا ہوا ہے اور قسمت کا ایک ذرا سا جھٹکا اسے کبریائی کے مَقام سے گرا کر انھی لوگوں کے قدموں میں پامال کرا سکتا ہے جن پر وہ کل تک خدائی کر رہا تھا۔ یہ سب کھیل جو دنیا کی چند روزہ زندگی میں کھیلے جا رہے ہیں، موت کی ساعت آتے ہی یکلخت ختم ہو جائیں گے اور اس سرحد سے پار ہوتے ہی انسان اُس عالَم میں پہنچ جائے گا جہاں سب کچھ عین مطابقِ حقیقت ہوگا اور جہاں دنیوی زندگی کی ساری غلط فہمیوں کے چھلکے اتار کر ہر انسان کو دکھا دیا جائے گا کہ وہ صداقت کا کتنا جوہر اپنے ساتھ لایا ہے جو میزانِ حق میں کسی وزن اور کسی قدر و قیمت کا حامل ہو سکتا ہو۔

۲۱ — واقعہ یہ ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی آیات سنانی شروع نہ کی تھیں، آپؐ کی قوم کے سب لوگ آپؐ کو امین اور صادق سمجھتے تھے اور آپؐ کی راست بازی پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ انھوں نے آپؐ کو جھٹلایا اُس وقت جب کہ آپؐ نے اللہ کی طرف سے پیغام پہنچانا شروع کیا۔ اور اس دُوسرے دَور میں بھی ان کے اندر کوئی شخص ایسا نہ تھا جو شخصی حیثیت سے آپؐ کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت کر سکتا ہو۔ آپؐ کے کسی سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی آپؐ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپؐ دنیا کے کسی معاملے میں کبھی جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انھوں نے جتنی آپؐ کی تکذیب کی، وہ محض نبی ہونے کی حیثیت سے کی۔ آپؐ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل تھا، اور حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ اس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم

مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ
وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۴﴾ وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكَ
اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی
السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى

صبر کیا، یہاں تک کہ انھیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں[۲۲] ہے، اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں۔ تاہم اگر ان لوگوں کی بے رُخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سُرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔[۲۳] اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا،

سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: انا لا نکذبك ولکن نکذب ما جئت به۔ ''ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے، مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں، اُسے جھوٹ قرار دیتے ہیں۔'' جنگِ بدر کے موقع پر اخنس بن شَرِیق نے تخلیے میں ابوجہل سے پوچھا کہ یہاں میرے اور تمھارے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں ہے، سچ بتاؤ کہ محمدؐ کو تم سچّا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟ اس نے جواب دیا کہ ''خدا کی قسم محمدؐ ایک سچّا آدمی ہے، عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، مگر جب لِوا اور سقایت اور حجابت اور نبوّت سب کچھ بنی قُصَیّ ہی کے حصّے میں آ جائے تو بتاؤ، باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا؟'' اسی بنا پر یہاں اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو تسلّی دے رہا ہے کہ تکذیب دراصل تمھاری نہیں بلکہ ہماری کی جا رہی ہے، اور جب ہم تحمّل و بُردباری کے ساتھ اسے برداشت کیے جا رہے ہیں اور ڈھیل پر ڈھیل دیے جاتے ہیں تو تم کیوں مضطرب ہوتے ہو۔

۲۲ – یعنی اللہ نے حق اور باطل کی کش مکش کے لیے جو قانون بنا دیا ہے، اسے تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ حق پرستوں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ایک طویل مدت تک آزمایشوں کی بھٹّی میں تپائے جائیں۔ اپنے صبر کا، اپنی راست بازی کا، اپنے ایثار اور اپنی فداکاری کا، اپنے ایمان کی پختگی اور اپنے توکّل علی اللہ کا امتحان دیں۔ مصائب اور مشکلات کے دَور سے گزر کر اپنے اندر وہ صفات پرورش کریں جو صرف اِسی دشوار گزار گھاٹی میں پرورش پا سکتی ہیں۔ اور ابتداءً خالص اخلاقِ فاضلہ و سیرتِ صالحہ کے ہتھیاروں سے جاہلیت پر فتح حاصل کر کے دکھائیں۔ اس طرح جب وہ اپنا اصلح ہونا ثابت کر دیں گے تب اللہ کی نُصرت ٹھیک اپنے وقت پر ان کی دستگیری کے لیے آ پہنچے گی۔ وقت سے پہلے وہ کسی کے لائے نہیں آ سکتی۔

۲۳ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے تھے کہ اس قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدّتیں گزر گئی ہیں اور کسی طرح یہ راستی پر

النصف وقف غفران

فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ

لہٰذا نادان مت[۲۴] بنو۔ دعوتِ حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سُننے والے ہیں،

نہیں آتی تو بسا اوقات آپؐ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش! کوئی نشانی خدا کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جس سے اِن لوگوں کا کفر ٹُوٹے اور یہ میری صداقت تسلیم کر لیں۔ آپؐ کی اِسی خواہش کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے صبری سے کام نہ لو۔ جس ڈھنگ اور جس ترتیب و تدریج سے ہم اس کام کو چلوا رہے ہیں، اسی پر صبر کے ساتھ چلے جاؤ۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو کیا ہم خود نہ لے سکتے تھے؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ جس فکری و اخلاقی انقلاب اور جس مدنیّتِ صالحہ کی تعمیر کے کام پر تم مامور کیے گئے ہو، اُسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے۔ تاہم اگر لوگوں کے موجودہ جُمُود اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا، اور تمھیں گمان ہے کہ اس جُمُود کو توڑنے کے لیے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرانا ہی ضروری ہے، تو خود زور لگاؤ اور تمھارا کچھ بس چلتا ہو تو زمین میں گھس کر یا آسمان پر چڑھ کر کوئی ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو جسے تم سمجھو کہ یہ بے یقینی کو یقین میں تبدیل کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔ مگر ہم سے اُمید نہ رکھو کہ ہم تمھاری یہ خواہش پوری کریں گے، کیونکہ ہماری اسکیم میں اس تدبیر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

۲۴ – یعنی اگر صرف یہی بات مطلوب ہوتی کہ تمام انسان کسی نہ کسی طور پر راست رَو بن جائیں تو نبی بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے اور مومنوں سے کفار کے مقابلے میں جِدّ وجُہد کرانے اور دعوتِ حق کو تدریجی تحریک کی منزلوں سے گزروانے کی حاجت ہی کیا تھی۔ یہ کام تو اللہ کے ایک ہی تخلیقی اشارے سے انجام پا سکتا تھا۔ لیکن اللہ اس کام کو اس طریقے پر کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا منشا تو یہ ہے کہ حق کو دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ فکرِ صحیح سے کام لے کر حق کو پہچان لیں، وہ اپنے آزادانہ اختیار سے اُس پر ایمان لائیں۔ اپنی سیرتوں کو اس کے سانچے میں ڈھال کر باطل پرستوں کے مقابلے میں اپنا اخلاقی تفوّق ثابت کریں۔ انسانوں کے مجموعے میں سے صالح عناصر کو اپنے طاقتور استدلال، اپنے بلند نصب العین، اپنے بہتر اُصُولِ زندگی اور اپنی پاکیزہ سیرت کی کشش سے اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں۔ اور باطل کے خلاف پیہم جِدّ وجُہد کر کے فطری ارتقا کی راہ سے اقامتِ دینِ حق کی منزل تک پہنچیں۔ اللہ اس کام میں ان کی رہنمائی کرے گا اور جس مرحلے پر جیسی مدد اللہ سے پانے کا وہ اپنے آپ کو مستحق بنائیں گے، وہ مدد بھی انھیں دیتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اس فطری راستے کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ محض اپنی قدرتِ قاہرہ کے زور سے افکارِ فاسدہ کو مٹا کر لوگوں میں فکرِ صالح پھیلا دے اور تمدُّنِ فاسد کو نیست و نابود کر کے مدنیّتِ صالحہ تعمیر کر دے، تو ایسا ہرگز نہ ہوگا، کیونکہ یہ اللہ کی اُس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اس نے انسان کو دنیا میں ایک ذمّہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے، اسے تصرُّف کے اختیارات دیے ہیں، طاعت وعصیان کی آزادی بخشی ہے، امتحان کی مُہلت عطا کی ہے، اور اس کی سعی کے مطابق جزا اور سزا دینے کے لیے فیصلے کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔

وقف منزل

وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ
عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ
لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا
طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى
الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ

رہے مُردے[25]، تو انھیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اُٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے) واپس لائے جائیں گے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس نبیؐ پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اُتری؟ کہو: اللہ نشانی اتارنے کی پُوری قدرت رکھتا ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مُبتلا ہیں[26]۔ زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہَوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمھاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوِشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں، وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں[27]۔ اللہ جسے چاہتا ہے

---

۲۵ – سُننے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ضمیر زندہ ہیں، جنھوں نے اپنی عقل و فکر کو معطّل نہیں کر دیا ہے، اور جنھوں نے اپنے دل کے دروازوں پر تعصب اور جُمود کے قفل نہیں چڑھا دیے ہیں۔ ان کے مقابلے میں مُردہ وہ لوگ ہیں جو لکیر کے فقیر بنے اندھوں کی طرح چلے جا رہے ہیں اور اس لکیر سے ہٹ کر کوئی بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، خواہ وہ صریح حق ہی کیوں نہ ہو۔

۲۶ – نشانی سے مراد محسوس معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ معجزہ نہ دکھائے جانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اس کو دکھانے سے عاجز ہیں، بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے، جسے یہ لوگ محض اپنی نادانی سے

يُضۡلِلۡهُ ۖ وَمَنۡ يَّشَاۡ يَجۡعَلۡهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝٣٩ قُلۡ

بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے[28]۔ ان سے کہو:

نہیں سمجھتے۔

۲۷– مطلب یہ ہے کہ اگر تمھیں محض تماش بینی کا شوق نہیں ہے بلکہ فی الواقع یہ معلوم کرنے کے لیے نشانی دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ نبیؐ جس چیز کی طرف بُلا رہا ہے وہ امرِحق ہے یا نہیں، تو آنکھیں کھول کر دیکھو، تمھارے گرد و پیش ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ زمین کے جانوروں اور ہَوا کے پرندوں کی کسی ایک نوع کو لے کر اس کی زندگی پر غور کرو۔ کس طرح اس کی ساخت ٹھیک ٹھیک اس کے مناسبِ حال بنائی گئی ہے۔ کس طرح اس کی جِبلّت میں اس کی فطری ضرورتوں کے عین مطابق قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ کس طرح اس کی رزق رسانی کا انتظام ہو رہا ہے۔ کس طرح اس کی ایک تقدیر مقرر ہے جس کے حُدود سے وہ نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ کس طرح ان میں سے ایک ایک جانور اور ایک ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کی، اُسی مقام پر جہاں وہ ہے، خبرگیری، نگرانی، حفاظت اور رہنمائی کی جارہی ہے۔ کس طرح اس سے ایک مقرر اسکیم کے مطابق کام لیا جارہا ہے۔ کس طرح اسے ایک ضابطے کا پابند بنا کر رکھا گیا ہے اور کس طرح اس کی پیدایش، تناسُل اور موت کا سلسلہ پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اگر خدا کی بے شمار نشانیوں میں سے صرف اِسی ایک نشانی پر غور کرو تو تمھیں معلوم ہو جائے کہ خدا کی توحید اور اس کی صفات کا جو تصور یہ پیغمبر تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے اور اس تصور کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس رَوِیّے کی طرف تمھیں دعوت دے رہا ہے وہ عین حق ہے۔ لیکن تم لوگ نہ خود اپنی آنکھیں کھول کر دیکھتے ہو نہ کسی سمجھانے والے کی بات سُنتے ہو۔ جہالت کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہو اور چاہتے ہو کہ عجائبِ قدرت کے کرشمے دکھا کر تمھارا دل بہلایا جائے۔

۲۸– خدا کا بھٹکانا یہ ہے کہ ایک جہالت پسند انسان کو آیاتِ الٰہی کے مطالعے کی توفیق نہ بخشی جائے، اور ایک متعصب غیر حقیقت پسند طالبِ علم اگر آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرے بھی تو حقیقت رسی کے نشانات اس کی آنکھ سے اوجھل رہیں اور غلط فہمیوں میں اُلجھانے والی چیزیں اسے حق سے دُور اور دُور تر کھینچتی چلی جائیں۔ بخلاف اس کے اللہ کی ہدایت یہ ہے کہ ایک طالبِ حق کو علم کے ذرائع سے فائدہ اُٹھانے کی توفیق بخشی جائے اور اللہ کی آیات میں اسے حقیقت تک پہنچنے کے نشانات ملتے چلے جائیں۔ ان تینوں کیفیتوں کی بکثرت مثالیں آئے دن ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ بکثرت انسان ایسے ہیں جن کے سامنے آفاق اور اَنفُس میں اللہ کی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ جانوروں کی طرح انھیں دیکھتے ہیں اور کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ اور بہت سے انسان ہیں جو حیوانیات (Zoology)، نباتات (Botany)، حیاتیات (Biology)، ارضیات (Geology)، فلکیات (Astronomy)، عضویات (Physiology)، علم التشریح (Anatomy) اور سائنس کی دوسری شاخوں کا مطالعہ کرتے ہیں، تاریخ، آثارِ قدیمہ اور عُلومِ اجتماع (Social Sciences) کی تحقیق کرتے ہیں اور

أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ
اللّٰهِ تَدْعُونَ ۚ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ﴿۴۰﴾ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ
فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ ﴿۴۱﴾ ع

ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آ جاتی ہے یا آخری گھڑی آ پہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اَور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچّے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔[۲۹] ع

ایسی ایسی نشانیاں ان کے مشاہدے میں آتی ہیں جو قلب کو ایمان سے لبریز کر دیں۔ مگر چونکہ وہ مطالعے کا آغاز ہی تعصّب کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے پیشِ نظر دُنیا اور اس کے فوائد و منافع کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس لیے اس مشاہدے کے دَوران میں ان کو صداقت تک پہنچانے والی کوئی نشانی نہیں ملتی، بلکہ جو نشانی بھی سامنے آتی ہے وہ انھیں اُلٹی دہریت، الحاد، مادّہ پرستی اور نیچریّت ہی کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ ان کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ناپید نہیں ہیں جو آنکھیں کھول کر اس کارگاہِ عالم کو دیکھتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ:

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

۲۹ – گزشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ تم ایک نشانی کا مطالبہ کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تمھارے گردوپیش ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے مثال کے طور پر حیوانات کی زندگی کے مشاہدے کی طرف توجّہ دلائی گئی۔ اس کے بعد اب ایک دوسری نشانی کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے جو خود منکرینِ حق کے اپنے نفس میں موجود ہے۔ جب انسان پر کوئی بڑی آفت آ جاتی ہے، یا موت اپنی بھیانک صُورت کے ساتھ سامنے آکھڑی ہوتی ہے، اُس وقت ایک خدا کے دامن کے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ اُسے نظر نہیں آتی۔ بڑے بڑے مشرک ایسے موقع پر اپنے معبُودوں کو بھول کر خدائے واحد کو پکارنے لگتے ہیں۔ کٹے سے کٹّا دہریہ تک خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ اسی نشانی کو یہاں حق نمائی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے، کیونکہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ خدا پرستی اور توحید کی شہادت ہر انسان کے نفس میں موجود ہے، جس پر غفلت و جہالت کے خواہ کتنے ہی پردے ڈال دیے گئے ہوں، مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی وہ اُبھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ ابوجہل کے بیٹے عِکرِمہ کو اِسی نشانی کے مشاہدے سے ایمان کی توفیق نصیب ہوئی۔ جب مکّۂ معظمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر فتح

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا
تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ
اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ
بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ

تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسُول بھیجے اور اُن قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا، تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جُھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انھوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔ پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو، جو انھیں کی گئی تھی، بُھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوش حالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ اُن بخششوں میں، جو انھیں عطا کی گئی تھیں، خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انھیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنھوں نے

ہو گیا تو عِکْرِمہ جِدّہ کی طرف بھاگے اور ایک کشتی پر سوار ہو کر حَبَش کی راہ لی۔ راستے میں سخت طوفان آیا اور کشتی خطرے میں پڑ گئی۔ اوّل اوّل تو دیویوں اور دیوتاؤں کو پکارا جاتا رہا، مگر جب طوفان کی شدّت بڑھی اور مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی تو سب کہنے لگے کہ یہ وقت اللہ کے سوا کسی کو پکارنے کا نہیں ہے، وہی چاہے تو ہم بچ سکتے ہیں۔ اُس وقت عِکْرِمہ کی آنکھیں کُھلیں اور ان کے دل نے آواز دی کہ اگر یہاں اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں تو کہیں اور کیوں ہو۔ یہی تو وہ بات ہے جو اللہ کا وہ نیک بندہ ہمیں بیس برس سے سمجھا رہا ہے اور ہم خواہ مخواہ اس سے لڑ رہے ہیں۔ یہ عِکْرِمہ کی زندگی میں فیصلہ کُن لمحہ تھا۔ انھوں نے اُسی وقت خدا سے عہد کیا کہ اگر میں اس طوفان سے بچ گیا تو سیدھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا اور بعد میں آ کر نہ صرف

ظَلَمُوۡا ؕ وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۵﴾ قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ
اَخَذَ اللّٰهُ سَمۡعَكُمۡ وَ اَبۡصَارَكُمۡ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ مَّنۡ اِلٰهٌ
غَيۡرُ اللّٰهِ يَاۡتِيۡكُمۡ بِهٖ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ ثُمَّ هُمۡ
يَصۡدِفُوۡنَ ﴿۴۶﴾ قُلۡ اَرَءَيۡتَكُمۡ اِنۡ اَتٰٮكُمۡ عَذَابُ اللّٰهِ بَغۡتَةً
اَوۡ جَهۡرَةً هَلۡ يُهۡلَكُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرۡسِلُ
الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ‌ ۚ فَمَنۡ اٰمَنَ وَاَصۡلَحَ
فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَالَّذِيۡنَ
كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الۡعَذَابُ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۴۹﴾

ظلم کیا تھا، اور تعریف ہے اللہ ربّ العالمین کے لیے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)۔

اے محمدؐ! ان سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ تمھاری بینائی اور سماعت تم سے چھین لے اور تمھارے دلوں پر مُہر کر دے[۳۰] تو اللہ کے سوا اور کون سا خدا ہے جو یہ قوتیں تمھیں واپس دلا سکتا ہو؟ دیکھو، کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چُرا جاتے ہیں۔ کہو: کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ کی طرف سے اچانک یا عَلانیہ تم پر عذاب آ جائے تو کیا ظالم لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہو گا؟ ہم جو رسُول بھیجتے ہیں اسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ وہ نیک کردار لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والے اور بدکرداروں کے لیے ڈرانے والے ہوں۔ پھر جو لوگ ان کی بات مان لیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں، وہ اپنی نافرمانیوں کی پاداش میں سزا بھگت کر رہیں گے۔

مسلمان ہوئے بلکہ اپنی بقیہ عمر اسلام کے لیے جہاد کرتے گزار دی۔

۳۰- یہاں دلوں پر مُہر کرنے سے مراد سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں سلب کر لینا ہے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ
وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّىْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ ۗ
قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۗ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع ۵

اے محمدؐ! ان سے کہو: ”میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے[۳۱]۔“ پھر ان سے پوچھو: ”کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں[۳۲]؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟“ ع

۳۱ – نادان لوگوں کے ذہن میں ہمیشہ سے یہ احمقانہ تصوّر رہا ہے کہ جو شخص خدا رسیدہ ہو اسے انسانیت سے ماورا ہونا چاہیے، اُس سے عجائب و غرائب صادر ہونے چاہییں، وہ ایک اشارہ کرے اور پہاڑ سونے کا بن جائے، وہ حکم دے اور زمین سے خزانے اُبلنے لگیں، اس پر لوگوں کے اگلے پچھلے سب حالات روشن ہوں، وہ بتا دے کہ گم شدہ چیز کہاں رکھی ہے، مریض بچ جائے گا یا مر جائے گا، حاملہ کے پیٹ میں نر ہے یا مادہ۔ پھر اس کو انسانی کمزوریوں اور محدودیتوں سے بھی بالاتر ہونا چاہیے۔ بھلا وہ بھی کوئی خدا رسیدہ ہوا جسے بُھوک اور پیاس لگے، جس کو نیند آئے، جو بیوی بچے رکھتا ہو، جو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے خرید و فروخت کرتا پھرے، جسے کبھی قرض لینے کی ضرورت پیش آئے اور کبھی وہ مفلسی و تنگ دستی میں مبتلا ہو کر پریشان حال رہے۔ اسی قسم کے تصوّرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین کی ذہنیّت پر مسلّط تھے۔ وہ جب آپؐ سے پیغمبری کا دعویٰ سُنتے تھے تو آپؐ کی صداقت جانچنے کے لیے آپؐ سے غیب کی خبریں پوچھتے تھے، خوارقِ عادت کا مطالبہ کرتے تھے، اور آپؐ کو بالکل عام انسانوں جیسا ایک انسان دیکھ کر اعتراض کرتے تھے کہ یہ اچھا پیغمبر ہے جو کھاتا پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ انھی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

۳۲ – مطلب یہ ہے کہ میں جن حقیقتوں کو تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں ان کا میں نے مشاہدہ کیا ہے، وہ براہِ راست میرے تجربے میں آئی ہیں، مجھے وحی کے ذریعے سے ان کا ٹھیک ٹھیک علم دیا گیا ہے، ان کے بارے میں میری شہادت آنکھوں دیکھی شہادت ہے۔ بخلاف اس کے تم ان حقیقتوں کی طرف سے اندھے ہو، تم ان کے بارے میں جو خیالات رکھتے ہو، وہ یا تو قیاس و گمان پر مبنی ہیں یا محض اندھی تقلید پر۔ لہٰذا میرے اور تمھارے درمیان بینا اور نابینا کا سا فرق ہے اور اسی اعتبار سے مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے، نہ اس اعتبار سے کہ میرے پاس خدائی کے خزانے ہیں، یا میں عالم الغیب ہوں، یا انسانی کمزوریوں سے مُبرّا ہوں۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ
مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ
یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَیْكَ
مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ

اور اے محمدؐ! تم اس (علمِ وحی) کے ذریعے سے اُن لوگوں کو نصیحت کرو جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اُس کے سوا وہاں کوئی (ایسا ذی اقتدار) نہ ہوگا جو ان کا حامی و مددگار ہو، یا ان کی سفارش کرے، شاید کہ (اس نصیحت سے متنبّہ ہو کر) وہ خدا ترسی کی روش اختیار کرلیں[۳۳]۔ اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پُکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں، انھیں اپنے سے دُور نہ پھینکو[۳۴]۔ اُن کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمھارے حساب میں سے کسی چیز کا بار اُن پر نہیں۔

۳۳- مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی میں ایسے مدہوش ہیں کہ انھیں نہ موت کی فکر ہے نہ یہ خیال ہے کہ کبھی ہمیں اپنے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے، ان پر تو یہ نصیحت ہرگز کارگر نہ ہوگی۔ اور اسی طرح ان لوگوں پر بھی اس کا کچھ اثر نہ ہوگا جو اس بے بنیاد بھروسے پر جی رہے ہیں کہ دنیا میں ہم جو چاہیں کرگزریں، آخرت میں ہمارا بال تک بیکا نہ ہوگا، کیونکہ ہم فلاں کے دامن گرفتہ ہیں، یا فلاں ہماری سفارش کر دے گا، یا فلاں ہمارے لیے کفّارہ بن چکا ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو چھوڑ کر تم اپنا رُوئے سُخن ان لوگوں کی طرف رکھو جو خدا کے سامنے حاضری کا بھی اندیشہ رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ جھوٹے بھروسوں پر پُھولے ہوئے بھی نہ ہوں۔ اس نصیحت کا اثر صرف ایسے ہی لوگوں پر ہوسکتا ہے اور انھی کے دُرست ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

۳۴- قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مِنجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپؐ کے گرد و پیش ہماری قوم کے غلام، مَوالی اور ادنیٰ طبقے کے لوگ جمع ہوگئے ہیں۔ وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ اس شخص کو ساتھی بھی کیسے کیسے معزّز لوگ ملے ہیں، بِلال، عمّار، صُہَیب اور خبّاب۔ بس یہی لوگ اللہ کو ہمارے درمیان ایسے ملے جن کو برگزیدہ کیا جاسکتا تھا! پھر وہ ان ایمان لانے والوں کی خستہ حالی کا مذاق اُڑانے پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے، بلکہ ان میں سے جس جس سے کبھی پہلے کوئی اخلاقی کمزوری ظاہر ہوئی تھی اس پر بھی حرف گیریاں کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ

فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ
بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ
سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

اس پر بھی اگر تم انھیں دُور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔[35] دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے،[36] تاکہ وہ اِنھیں دیکھ کر کہیں: ”کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟“ ——ہاں! کیا خدا اپنے شکر گزار بندوں کو اِن سے زیادہ نہیں جانتا ہے؟ جب تمھارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو: ”تم پر سلامتی ہے۔ تمھارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی بُرائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ اُسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔[37]“

فلاں جو کل تک یہ تھا اور فلاں جس نے یہ کیا تھا، آج وہ بھی اس ”برگزیدہ گروہ“ میں شامل ہے۔ انھی باتوں کا جواب یہاں دیا جا رہا ہے۔

۳۵– یعنی ہر شخص اپنے عیب و صواب کا ذمہ دار آپ ہی ہے۔ ان مسلمان ہونے والوں میں سے کسی شخص کی جواب دِہی کے لیے تم کھڑے نہ ہو گے اور نہ تمھاری جواب دِہی کے لیے ان میں سے کوئی کھڑا ہو گا۔ تمھارے حصّے کی کوئی نیکی یہ تم سے چھین نہیں سکتے اور اپنے حصّے کی کوئی بدی تم پر ڈال نہیں سکتے۔ پھر جب یہ محض طالبِ حق بن کر تمھارے پاس آتے ہیں تو آخر تم کیوں انھیں اپنے سے دُور پھینکو۔

۳۶– یعنی غریبوں اور مفلسوں اور ایسے لوگوں کو جو سوسائٹی میں ادنیٰ حیثیت رکھتے ہیں، سب سے پہلے ایمان کی توفیق دے کر ہم نے دولت اور عزّت کا گھمنڈ رکھنے والے لوگوں کو آزمائش میں ڈال دیا ہے۔

۳۷– جو لوگ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، ان میں بکثرت لوگ ایسے بھی تھے جن سے

ع ۶/۶ ۱۲

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ع ۵۵ قُلْ
اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّآ
اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۵۶
قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ۭ مَا عِنْدِيْ مَا
تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ

اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے۔[۳۸] ع

اے محمدؐ! اِن سے کہو کہ تم لوگ اللہ کے سوا جن دُوسروں کو پکارتے ہو، اُن کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔ کہو: میں تمھاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا، اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہوگیا، راہِ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔ کہو: میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیلِ روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو۔[۳۹] فیصلے کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امرِ حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین

زمانۂ جاہلیت میں بڑے بڑے گناہ ہو چکے تھے۔ اب اسلام قبول کرنے کے بعد اگرچہ ان کی زندگیاں بالکل بدل گئی تھیں، لیکن مخالفینِ اسلام اُن کو سابق زندگی کے عُیُوب اور افعال کے طعنے دیتے تھے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ اہلِ ایمان کو تسلّی دو۔ انھیں بتاؤ کہ جو شخص توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیتا ہے، اس کے پچھلے قصوروں پر گرفت کرنے کا طریقہ اللہ کے ہاں نہیں ہے۔

۳۸- ''اس طرح'' کا اشارہ اُس پورے سلسلۂ تقریر کی طرف ہے جو چوتھے رُکوع کی اِس آیت سے شروع ہوا تھا: ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں اُتری۔'' مطلب یہ ہے کہ ایسی صاف اور صریح دلیلوں اور نشانیوں کے بعد بھی جو لوگ اپنے کفر و انکار پر اصرار ہی کیے چلے جائیں، ان کا مجرم ہونا بالکل غیر مُشتبہ طور پر ثابت ہوا جاتا ہے، اور یہ حقیقت بالکل آئینے کی طرح نمایاں ہوئی جاتی ہے کہ دراصل یہ لوگ ضلالت پسندی کی بنا پر یہ راہ چل رہے ہیں، نہ اس بنا پر کہ راہِ حق کے دلائل واضح نہیں ہیں، یا یہ کہ کچھ دلیلیں ان کی اس گمراہی کے حق میں بھی موجود ہیں۔

۳۹- اشارہ ہے عذابِ الٰہی کی طرف۔ مخالفین کہتے تھے کہ اگر تم خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے نبی ہو اور ہم

الْفٰصِلِيْنَ ﴿٥٧﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ
بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٨﴾ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ
الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ
مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ
لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٩﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ
وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ
مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٠﴾ ع

ع ۷ ۱۴

فیصلہ کرنے والا ہے۔کہو: اگر کہیں وہ چیز میرے اختیار میں ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمھارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا مگر اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہیے۔اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔درخت سے گرنے والا کوئی پتّا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔خشک و تر سب کچھ ایک کُھلی کتاب میں لکھا ہُوا ہے۔وہی ہے جو رات کو تمھاری رُوحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے، پھر دُوسرے روز وہ تمھیں اِسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے، تاکہ زندگی کی مقرر مدّت پوری ہو۔آخر کار اسی کی طرف تمھاری واپسی ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ع

کُھلّم کُھلّا تم کو جھٹلا رہے ہیں تو کیوں نہیں خدا کا عذاب ہم پر ٹوٹ پڑتا؟ تمھارے مامون مِن اللہ ہونے کا تقاضا تو یہ تھا کہ اِدھر کوئی تمھاری تکذیب یا توہین کرتا اور اُدھر فوراً زمین دھنستی اور وہ اس میں سما جاتا، یا بجلی گرتی اور وہ بھسم ہو جاتا۔یہ کیا ہے کہ خدا کا فرستادہ اور اس پر ایمان لانے والے تو مصیبتوں پر مصیبتیں اور ذلتوں پر ذلتیں سہ رہے ہیں اور ان کو گالیاں دینے اور پتھر مارنے والے چین کیے جاتے ہیں؟

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى
اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۟ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾
قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ
خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ
يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

اپنے بندوں پر وہ پُوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے،[۴۰] یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے، پھر سب کے سب اللہ، اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس لائے جاتے ہیں۔ خبردار ہو جاؤ! فیصلے کے سارے اختیارات اسی کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔

اے محمدؐ! ان سے پوچھو: صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمھیں خطرات سے بچاتا ہے؟ کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر اور چُپکے چُپکے دُعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے تُو نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار ہوں گے؟ —— کہو: اللہ تمھیں اُس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے، پھر تم دُوسروں کو اُس کا شریک ٹھیراتے ہو۔[۴۱]

---

۴۰ – یعنی ایسے فرشتے جو تمھاری ایک ایک جنبش اور ایک ایک بات پر نگاہ رکھتے ہیں اور تمھاری ہر ہر حرکت کا ریکارڈ محفوظ کرتے رہتے ہیں۔

۴۱ – یعنی یہ حقیقت کہ تنہا اللہ ہی قادرِ مُطلق ہے، اور وہی تمام اختیارات کا مالک اور تمھاری بھلائی اور بُرائی کا مختارِ کُل ہے، اور اسی کے ہاتھ میں تمھاری قسمتوں کی باگ ڈور ہے، اِس کی شہادت تو تمھارے اپنے نفس میں موجود ہے۔ جب کوئی سخت وقت آتا ہے اور اسباب کے سر رشتے ٹوٹتے نظر آتے ہیں تو اس وقت تم بے اختیار اُسی کی طرف

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ
تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ
بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۞٦٥ وَكَذَّبَ
بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۞٦٦ لِكُلِّ نَبَاٍ

کہو: وہ اِس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اُوپر سے نازل کر دے، یا تمھارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے، یا تمھیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دُوسرے گروہ کی طاقت کا مزا چکھوا دے۔ دیکھو، ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں، شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں[۴۲]۔ تمھاری قوم اُس کا انکار کر رہی ہے حالانکہ وہ حقیقت ہے۔ اِن سے کہہ دو کہ میں تم پر حوالہ دار نہیں بنایا گیا ہوں[۴۳]، ہر خبر کے

رُجوع کرتے ہو۔ لیکن اس کُھلی علامت کے ہوتے ہوئے بھی تم نے خدائی میں بلا دلیل و حجت اور بلا ثبوت دوسروں کو اس کا شریک بنا رکھا ہے۔ پلتے ہو اس کے رزق پر اور اَن داتا بناتے ہو دوسروں کو۔ مدد پاتے ہو اس کے فضل و کرم سے اور حامی و ناصر ٹھیراتے ہو دوسروں کو۔ غلام ہو اس کے اور بندگی بجا لاتے ہو دوسروں کی۔ مشکل کشائی کرتا ہے وہ، بُرے وقت پر گڑگڑاتے ہو اس کے سامنے، اور جب وہ وقت گزر جاتا ہے تو تمھارے مشکل کُشا بن جاتے ہیں دوسرے اور نذریں اور نیازیں چڑھنے لگتی ہیں دوسروں کے نام کی۔

۴۲۔ جو لوگ عذابِ الٰہی کو اپنے سے دُور پا کر حق دشمنی میں جرأت پر جرأت دکھا رہے تھے، انھیں متنبّہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے عذاب کو آتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ہوا کا ایک طوفان تمھیں اچانک برباد کر سکتا ہے۔ زلزلے کا ایک جھٹکا تمھاری بستیوں کو پیوندِ خاک کر دینے کے لیے کافی ہے۔ قبیلوں اور قوموں اور ملکوں کی عداوتوں کے میگزین میں ایک چنگاری وہ تباہی پھیلا سکتی ہے کہ سال ہا سال تک خوں ریزی و بدامنی سے نجات نہ ملے۔ پس اگر عذاب نہیں آ رہا ہے تو یہ تمھارے لیے غفلت و مدہوشی کی پِینک نہ بن جائے کہ مطمئن ہو کر صحیح و غلط کا امتیاز کیے بغیر اندھوں کی طرح زندگی کے راستے پر چلتے رہو۔ غنیمت سمجھو کہ اللہ تمھیں مہلت دے رہا ہے اور وہ نشانیاں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے جن سے تم حق کو پہچان کر صحیح راستہ اختیار کر سکو۔

۴۳۔ یعنی میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو کچھ تم نہیں دیکھ رہے ہو وہ زبردستی تمھیں دکھاؤں اور جو کچھ تم نہیں سمجھ رہے ہو

مُّسْتَقَرٌّ ۫ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ
اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا
یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۶۸﴾
وَ مَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰی
لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَ ذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا

ظُہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے، عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا۔

اور اے محمدؐ! جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دُوسری باتوں میں لگ جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تمھیں بُھلاوے میں ڈال دے[۴۴] تو جس وقت تمھیں اس غلطی کا احساس ہو جائے، اس کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔ اُن کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمّہ داری پرہیزگار لوگوں پر نہیں ہے، البتہ نصیحت کرنا اُن کا فرض ہے، شاید کہ وہ غلط روی سے بچ جائیں۔[۴۵] چھوڑو اُن لوگوں کو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے

وہ بزور تمھاری سمجھ میں اُتار دوں۔ اور میرا یہ کام بھی نہیں ہے کہ اگر تم نہ دیکھو اور نہ سمجھو تو تم پر عذاب نازل کر دوں۔ میرا کام صرف حق اور باطل کو ممیّز کر کے تمھارے سامنے پیش کر دینا ہے۔ اب اگر تم نہیں مانتے تو جس بُرے انجام سے میں تمھیں ڈراتا ہوں، وہ اپنے وقت پر خود تمھارے سامنے آجائے گا۔

۴۴ – یعنی اگر کسی وقت ہماری یہ ہدایت تمھیں یاد نہ رہے اور تم بُھولے سے ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھے رہ جاؤ۔

۴۵ – مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی نافرمانی سے خود بچ کر کام کرتے ہیں، ان پر نافرمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری نہیں ہے، پھر وہ کیوں خواہ مخواہ اس بات کو اپنے اوپر فرض کر لیں کہ ان نافرمانوں سے بحث و مناظرہ کر کے ضرور انھیں قائل کر کے ہی چھوڑیں گے، اور ان کے ہر لغو و مُہمل اعتراض کا جواب ضرور ہی دیں گے، اور اگر وہ نہ مانتے ہوں تو کسی نہ کسی طرح منوا کر ہی رہیں گے۔ ان کا فرض بس اتنا ہے کہ جنھیں گمراہی میں بھٹکتے دیکھ رہے ہیں انھیں نصیحت کریں اور حق بات ان کے سامنے

وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا
كَسَبَتْ ۖۤ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ
كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ
لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۧ ﴿۷۰﴾ قُلْ ع ۸ ۱۴
اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى
اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى
الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ

اور جنھیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ ہاں، مگر یہ قرآن سُنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے کرتُوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے، اور گرفتار بھی اِس حال میں ہو کہ اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و مددگار اور کوئی سفارشی اس کے لیے نہ ہو، اور اگر وہ ہر ممکن چیز فدیے میں دے کر چھُوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے، کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے، ان کو تو اپنے انکارِ حق کے معاوضے میں کھولتا ہُوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب بھگتنے کو ملے گا۔ؑ

اے محمدؐ! ان سے پُوچھو: کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پُکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان؟ اور جب کہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم اُلٹے پاؤں پھر جائیں؟ کیا ہم اپنا حال اُس شخص کا سا کر لیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگردان پھر رہا ہو، درآں حالے کہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ اِدھر آ، یہ سیدھی راہ موجود ہے؟

پیش کر دیں۔ پھر اگر وہ نہ مانیں اور جھگڑے اور بحث اور حجت بازیوں پر اُتر آئیں تو اہلِ حق کا یہ کام نہیں ہے کہ ان کے ساتھ دماغی کُشتیاں لڑنے میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کرتے پھریں۔ ضلالت پسند لوگوں کے بجائے انھیں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کو

قُلۡ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰىؕ وَاُمِرۡنَا لِنُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَۙ ﴿۷۱﴾
وَاَنۡ اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوۡهُؕ وَهُوَ الَّذِىۡۤ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَ
هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَـقِّؕ وَيَوۡمَ يَقُوۡلُ

کہو: حقیقت میں صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالکِ کائنات کے آگے سرِ اطاعت خم کر دو، نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو، اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے[۴۶]۔ اور جس دن وہ کہے گا کہ

اُن لوگوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و تلقین پر صَرف کرنا چاہیے جو خود طالبِ حق ہوں۔

۴۶ — قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے یا حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ ارشاد بہت وسیع معانی پر مشتمل ہے۔

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تخلیق محض کھیل کے طور پر نہیں ہوئی ہے۔ یہ ایشور جی کی لیلا نہیں ہے۔ یہ کسی بچے کا کھلونا نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے وہ اس سے کھیلتا رہے اور پھر یونہی اُسے توڑ پھوڑ کر پھینک دے۔ دراصل یہ ایک نہایت سنجیدہ کام ہے جو حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے، ایک مقصدِ عظیم اس کے اندر کارفرما ہے، اور اس کا ایک دَور گزر جانے کے بعد ناگزیر ہے کہ خالق اُس پُورے کام کا حساب لے جو اُس دَور میں انجام پایا ہو، اور اسی دَور کے نتائج پر دوسرے دَور کی بنیاد رکھے۔ یہی بات ہے جو دوسرے مقامات پر یوں بیان کی گئی ہے: رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ "اے ہمارے رب! تُو نے یہ سب کچھ فضول پیدا نہیں کیا ہے۔" اور وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا لٰعِبِيۡنَ۔ "ہم نے آسمان و زمین اور ان چیزوں کو جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔" اور اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ۔ "تو کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں یونہی فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے؟"

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے یہ سارا نظامِ کائنات حق کی ٹھوس بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ عدل اور حکمت اور راستی کے قوانین پر اس کی ہر چیز مبنی ہے۔ باطل کے لیے فی الحقیقت اس نظام میں جڑ پکڑنے اور بار آور ہونے کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے۔ یہ اَور بات ہے کہ اللہ باطل پرستوں کو موقع دے دے کہ وہ اگر اپنے جھوٹ اور ظلم اور ناراستی کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو اپنی کوشش کر دیکھیں۔ لیکن آخر کار زمین باطل کے ہر بیج کو اُگل کر پھینک دے گی اور آخری فردِ حساب میں ہر باطل پرست دیکھ لے گا کہ جو کوششیں اس نے اس شجرِ خبیث کی کاشت اور آبیاری میں صَرف کیں وہ سب ضائع ہو گئیں۔

کُنۡ فَیَکُوۡنُ ؕ قَوۡلُہُ الۡحَقُّ ؕ وَ لَہُ الۡمُلۡکُ یَوۡمَ یُنۡفَخُ فِی
الصُّوۡرِ ؕ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ ؕ وَ ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۷۳﴾
وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہِیۡمُ لِاَبِیۡہِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصۡنَامًا اٰلِہَۃً ۚ اِنِّیۡۤ

حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا۔ اس کا ارشاد عین حق ہے۔ اور جس روز صُور پھونکا[۴۷] جائے گا، اس روز پادشاہی اُسی کی ہوگی[۴۸]، وہ غیب اور شہادت[۴۹] ہر چیز کا عالم ہے اور دانا اور باخبر ہے۔

ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو جب کہ اُس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا: "کیا تُو بتوں کو خدا بناتا ہے؟[۵۰] میں تو

تیسرا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اس ساری کائنات کو بر بنائے حق پیدا کیا ہے اور اپنے ذاتی حق کی بنا پر ہی وہ اس پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ اس کا حکم یہاں اس لیے چلتا ہے کہ وہی اپنی پیدا کی ہوئی کائنات میں حکمرانی کا حق رکھتا ہے۔ دوسروں کا حکم اگر بظاہر چلتا نظر بھی آتا ہو تو اس سے دھوکا نہ کھاؤ، فی الحقیقت نہ ان کا حکم چلتا ہے، نہ چل سکتا ہے، کیونکہ کائنات کی کسی چیز پر بھی ان کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اس پر اپنا حکم چلائیں۔

۴۷ – صُور پھونکنے کی صحیح کیفیت کیا ہوگی، اس کی تفصیل ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ قرآن سے جو کچھ ہمیں معلوم ہُوا ہے، وہ صرف اتنا ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے حکم سے ایک مرتبہ صُور پھونکا جائے گا اور سب ہلاک ہو جائیں گے۔ پھر نہ معلوم کتنی مدّت بعد، جسے اللہ ہی جانتا ہے، دوسرا صُور پھونکا جائے گا اور تمام اوّلین و آخرین از سرِ نو زندہ ہو کر اپنے آپ کو میدانِ حشر میں پائیں گے۔ پہلے صُور پر سارا نظامِ کائنات دَرہم بَرہم ہوگا اور دوسرے صُور پر ایک دوسرا نظام نئی صورت اور نئے قوانین کے ساتھ قائم ہو جائے گا۔

۴۸ – یہ مطلب نہیں ہے کہ آج پادشاہی اس کی نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُس روز جب پردہ اُٹھایا جائے گا اور حقیقت بالکل سامنے آجائے گی تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سب جو با اختیار نظر آتے تھے، یا سمجھے جاتے تھے، بالکل بے اختیار ہیں اور پادشاہی کے سارے اختیارات اسی ایک خدا کے لیے ہیں جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔

۴۹ – غیب: وہ سب کچھ جو مخلوقات سے پوشیدہ ہے۔

شہادت: وہ سب کچھ جو مخلوقات کے لیے ظاہر و معلوم ہے۔

۵۰ – یہاں حضرت ابراہیمؑ کے واقعے کا ذکر اس امر کی تائید اور شہادت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ جس طرح اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت سے آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کے ساتھیوں نے شرک کا انکار کیا ہے اور سب مصنوعی خداؤں سے منہ موڑ کر صرف ایک مالکِ کائنات کے آگے سرِ اطاعت خم کر دیا ہے، اسی طرح کل یہی کچھ ابراہیم علیہ السلام بھی کر چکے ہیں۔

اٰرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ
مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾

تجھے اور تیری قوم کو کُھلی گمراہی میں پاتا ہوں۔" ابراہیمؑ کو ہم اِسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظامِ سلطنت دکھاتے[51] تھے اور اس لیے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو[52] جائے۔

اور جس طرح آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والوں سے ان کی جاہل قوم جھگڑ رہی ہے، اسی طرح کل حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے بھی ان کی قوم یہی جھگڑا کر چکی ہے۔ اور کل جو جواب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو دیا تھا، آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیروؤں کی طرف سے ان کی قوم کو بھی وہی جواب ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس راستے پر ہیں جو نوحؑ اور ابراہیمؑ اور نسلِ ابراہیمی کے تمام انبیاؑ کا راستہ رہا ہے۔ اب جو لوگ ان کی پیروی سے انکار کر رہے ہیں، انھیں معلوم ہو جانا چاہیے کہ وہ انبیاؑ کے طریقے سے ہٹ کر ضلالت کی راہ پر جا رہے ہیں۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ عرب کے لوگ بالعموم حضرت ابراہیمؑ کو اپنا پیشوا اور مقتدا مانتے تھے۔ خُصوصاً قریش کے تو فخر و ناز کی ساری بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ان کے تعمیر کردہ خانۂ خدا کے خادم ہیں۔ اس لیے ان کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کے عقیدۂ توحید کا اور شرک سے اُن کے انکار اور مشرک قوم سے اُن کی نزاع کا ذکر کرنے کے معنٰی یہ تھے کہ قریش کا سارا سرمایۂ فخر و ناز اور کفارِ عرب کا اپنے مشرکانہ دین پر سارا اطمینان ان سے چھین لیا جائے، اور اُن پر ثابت کر دیا جائے کہ آج مسلمان اُس مقام پر ہیں جس پر حضرت ابراہیمؑ تھے، اور تمھاری حیثیت وہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے لڑنے والی جاہل قوم کی تھی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے معتقدوں اور قادری النسب پیرزادوں کے سامنے حضرتِ شیخؒ کی اصل تعلیمات اور ان کی زندگی کے واقعات پیش کر کے یہ ثابت کر دے کہ جن بزرگ کے تم نام لیوا ہو، تمھارا اپنا طریقہ ان کے بالکل خلاف ہے اور تم نے آج انھی گمراہ لوگوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے جن کے خلاف تمھارے مُقتدا تمام عمر جہاد کرتے رہے۔

۵۱ – یعنی جس طرح تم لوگوں کے سامنے آثارِ کائنات نمایاں ہیں اور اللہ کی نشانیاں تمھیں دکھائی جا رہی ہیں، اُسی طرح ابراہیمؑ کے سامنے بھی یہی آثار تھے اور یہی نشانیاں تھیں۔ مگر تم لوگ انھیں دیکھنے پر بھی اندھوں کی طرح کچھ نہیں دیکھتے اور ابراہیمؑ نے انھیں آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہی سورج اور چاند اور تارے جو تمھارے سامنے طُلوع و غروب ہوتے ہیں اور روزانہ تم کو جیسا گمراہ طلوع ہوتے وقت پاتے ہیں ویسا ہی غروب ہوتے وقت چھوڑ جاتے ہیں، انھی کو اُس آنکھوں والے انسان نے بھی دیکھا تھا اور انھی نشانات سے وہ حقیقت تک پہنچ گیا۔

۵۲ – اس مقام کو اور قرآن کے اُن دوسرے مقامات کو جہاں حضرت ابراہیمؑ سے اُن کی قوم کی نزاع کا ذکر آیا

ہے، اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے مذہبی و تمدّنی حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔
جدید اثری تحقیقات کے سلسلے میں نہ صرف وہ شہر دریافت ہو گیا ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے، بلکہ دَورِ ابراہیمی میں اُس علاقے کے لوگوں کی جو حالت تھی اس پر بھی بہت کچھ روشنی پڑی ہے۔ سر لیونارڈ وولی (Sir Leonard Woolley) نے اپنی کتاب ("Abraham", London, 1935) میں اس تحقیقات کے جو نتائج شائع کیے ہیں، ان کا خلاصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ۲۱۰۰ قبلِ مسیح کے لگ بھگ زمانے میں، جسے اب عام طور پر محققین حضرت ابراہیمؑ کے ظُہور کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں، شہر اُر کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی، اور بعید نہیں کہ پانچ لاکھ ہو۔ بڑا صنعتی و تجارتی مرکز تھا۔ ایک طرف پامیر اور نیلگری تک سے وہاں مال آتا تھا اور دوسری طرف اناطولیہ تک سے اس کے تجارتی تعلّقات تھے۔ جس ریاست کا یہ صدر مقام تھا اس کے حُدود موجودہ حکومتِ عراق سے شمال میں کچھ کم اور مغرب میں کچھ زیادہ تھے۔ ملک کی آبادی بیشتر صنعت و تجارت پیشہ تھی۔ اس عہد کی جو تحریرات آثارِ قدیمہ کے کھنڈروں میں دستیاب ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطۂ نظر خالص مادّہ پرستانہ تھا۔ دولت کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصدِ حیات تھا۔ سُود خواری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی۔ سخت کاروباری قسم کے لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور آپس میں بہت مقدّمہ بازیاں ہوتی تھیں۔ اپنے خداؤں سے ان کی دُعائیں زیادہ تر درازیِ عمر، خوش حالی اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہُوا کرتی تھیں۔ آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی:

(۱) عَمیلو: یہ اُونچے طبقے کے لوگ تھے جن میں پُجاری، حکومت کے عہدہ دار اور فوجی افسر وغیرہ شامل تھے۔

(۲) مِشکینو: یہ تُجّار، اہلِ صنعت اور زراعت پیشہ لوگ تھے۔

(۳) اَردو: یعنی غلام۔

ان میں سے پہلے طبقہ، یعنی عَمیلو کو خاص امتیازات حاصل تھے۔ ان کے فوجداری اور دیوانی حقوق دوسروں سے مختلف تھے، اور ان کی جان و مال کی قیمت دوسروں سے بڑھ کر تھی۔

یہ شہر اور یہ معاشرہ تھا جس میں حضرت ابراہیمؑ نے آنکھیں کھولیں۔ ان کا اور ان کے خاندان کا جو حال ہمیں تلمُود میں ملتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عَمیلو طبقے کے ایک فرد تھے اور ان کا باپ ریاست کا سب سے بڑا عہدے دار تھا۔ (دیکھو سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۹۰)

اُر کے کُتبات میں تقریباً ۵ ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ خدا تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ خدا ہوتا تھا جو ربُّ البَلَد، مہا دیو یا رئیس الآلہہ سمجھا جاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبُودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ اُر کا ربّ البَلَد ''نَنّار'' (چاند دیوتا) تھا، اور اسی مناسبت سے بعد کے لوگوں نے اس شہر کا نام ''قمرینہ'' بھی لکھا ہے۔ دوسرا بڑا شہر لَرسہ تھا جو بعد میں اُر کے بجائے مرکزِ سلطنت ہوا۔ اُس کا ربّ البَلَد ''شماش'' (سورج دیوتا) تھا۔ ان بڑے خداؤں کے ماتحت بہت سے چھوٹے خدا بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیّاروں میں سے اور کم تر زمین سے منتخب کیے گئے تھے،

اور لوگ اپنی مختلف فُرُوعی ضروریات ان سے متعلق سمجھتے تھے۔ ان آسمانی اور زمینی دیوتاؤں اور دیویوں کی شبیہیں بُتوں کی شکل میں بنالی گئی تھیں اور تمام مراسمِ عبادت انھی کے آگے بجالائے جاتے تھے۔

نَنّار کا بُت اُر میں سب سے اُونچی پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ اسی کے قریب ’’نَنّار‘‘ کی بیوی ’’نن گل‘‘ کا مَعبَد تھا۔ نَنّار کے مَعبَد کی شان ایک شاہی محل سرا کی سی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں روزانہ رات کو ایک پُجارن جا کر اس کی دُلھن بنتی تھی۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر وقف تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں (religious prostitutes) کی سی تھی۔ وہ عورت بڑی معزز خیال کی جاتی تھی جو ’’خدا‘‘ کے نام پر اپنی بکارت قربان کر دے۔ کم از کم ایک مرتبہ اپنے آپ کو ’’راہِ خدا‘‘ میں کسی اجنبی کے حوالے کرنا عورت کے لیے ذریعۂ نجات خیال کیا جاتا تھا۔ اب یہ بیان کرنا کچھ ضروری نہیں کہ اس مذہبی قحبہ گری سے مستفید ہونے والے زیادہ تر پُجاری حضرات ہی ہوتے تھے۔

نَنّار محض دیوتا ہی نہ تھا بلکہ مُلک کا سب سے بڑا زمیندار، سب سے بڑا تاجر، سب سے بڑا کارخانہ دار اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم بھی تھا۔ بکثرت باغ، مکانات اور زمینیں اس مندر کے لیے وقف تھیں۔ اس جائداد کی آمدنی کے علاوہ کسان، زمیندار، تُجّار سب ہر قسم کے غلّے، دودھ، سونا، کپڑا اور دوسری چیزیں لا کر مندر میں نذر بھی کرتے تھے، جنھیں وصول کرنے کے لیے مندر میں ایک بہت بڑا اسٹاف موجود تھا۔ بہت سے کارخانے مندر کے ماتحت قائم تھے۔ تجارتی کاروبار بھی بہت بڑے پیمانے پر مندر کی طرف سے ہوتا تھا۔ یہ سب کام دیوتا کی نیابت میں پُجاری ہی انجام دیتے تھے۔ پھر مُلک کی سب سے بڑی عدالت مندر ہی میں تھی۔ پُجاری اس کے جج تھے اور ان کے فیصلے ’’خدا‘‘ کے فیصلے سمجھے جاتے تھے۔ خود شاہی خاندان کی حاکمیّت بھی نَنّار ہی سے ماخوذ تھی۔ اصل بادشاہ نَنّار تھا اور فرماں روائے ملک اس کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ اس تعلق سے بادشاہ خود بھی معبُودوں میں شامل ہو جاتا تھا اور خداؤں کے مانند اس کی پرستش کی جاتی تھی۔

اُر کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں حکمران تھا، اس کے بانیِ اوّل کا نام اُرَنَمُّو تھا، جس نے ۲۳۰۰ برس قبلِ مسیح میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ اس کے حُدُودِ مملکت مشرق میں سوسہ سے لے کر مغرب میں لُبنان تک پھیلے ہوئے تھے۔ اُسی سے اس خاندان کو ’’نَمُّو‘‘ کا نام ملا جو عربی میں جا کر نمرود ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد اس خاندان اور اس قوم پر مسلسل تباہی نازل ہونی شروع ہوئی۔ پہلے عیلامیوں نے اُر کو تباہ کیا اور نمرود کو نَنّار کے بُت سمیت پکڑ لے گئے۔ پھر لَرسہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت اُر کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخرِ کار ایک عربی النسل خاندان کے ماتحت بابل نے زور پکڑا اور لَرسہ اور اُر دونوں اس کے زیرِ حکم ہو گئے۔ ان تباہیوں نے نَنّار کے ساتھ اُر کے لوگوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا، کیونکہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکا۔

تعیُّن کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد کے اَدوار میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کا اثر اس ملک کے لوگوں نے کہاں تک قبول کیا۔ لیکن ۱۹۱۰ قبلِ مسیح میں بابل کے بادشاہ حَمورابی (بائبل کے اَمرافیل) نے جو قوانین مرتب کیے تھے، وہ شہادت دیتے ہیں کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کی تدوین میں مشکوٰۃِ نبوّت سے حاصل کی ہوئی روشنی کسی حد تک ضرور کارفرما تھی۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ
لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷٦﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ
اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ
الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ
فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ

چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اُس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا: یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا: ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا: یہ ہے میرا رب۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا: اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا: یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اُٹھا: "اے برادرانِ قوم! میں اُن سب سے بیزار ہوں جنھیں تم خدا کا شریک ٹھیراتے ہو۔[۵۳] میں نے تو

ان قوانین کا مُفَصّل کتبہ ۱۹۰۲ بعدِ مسیح میں ایک فرانسیسی مفتش آثارِ قدیمہ کو ملا اور اس کا انگریزی ترجمہ C.H.W. John نے ۱۹۰۳ بعدِ مسیح میں (The Oldest Code of Law) کے نام سے شائع کیا۔ اس ضابطۂ قوانین کے بہت سے اُصول اور فُروع موسوی شریعت سے مشابہت رکھتے ہیں۔

یہ اب تک کی اثری تحقیقات کے نتائج اگر صحیح ہیں تو ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم میں شرک محض ایک مذہبی عقیدہ اور بُت پرستانہ عبادات کا مجموعہ ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس قوم کی پوری مَعاشی، تمدّنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام اسی عقیدے پر مبنی تھا۔ اس کے مقابلے میں حضرت ابراہیمؑ توحید کی جو دعوت لے کر اُٹھے تھے، اس کا اثر صرف بُتوں کی پرستش ہی پر نہ پڑتا تھا بلکہ شاہی خاندان کی معبودیت اور حاکمیّت، پُجاریوں اور اُونچے طبقوں کی معاشرتی، مَعاشی اور سیاسی حیثیت، اور پورے ملک کی اجتماعی زندگی اُس کی زد میں آئی جاتی تھی۔ اُن کی دعوت کو قبول کرنے کے معنٰی یہ تھے کہ نیچے سے اُوپر تک ساری سوسائٹی کی عمارت ادھیڑ ڈالی جائے اور اسے ازسرِنَو توحیدِ الٰہ کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے۔ اِسی لیے ابراہیم علیہ السّلام کی آواز بلند ہوتے ہی عوام اور خواص، پُجاری اور نمرود سب کے سب بیک وقت اس کو دبانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

۵۳ – یہاں حضرت ابراہیمؑ کے اُس ابتدائی تفکّر کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے سے

پہلے اُن کے لیے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک صحیح الدماغ اور سلیم النظر انسان، جس نے سراسر شرک کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، اور جسے توحید کی تعلیم کہیں سے حاصل نہ ہو سکتی تھی، کس طرح آثارِ کائنات کا مشاہدہ کر کے اور ان پر غور و فکر اور ان سے صحیح اِستدلال کر کے امرِ حق معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُوپر قومِ ابراہیمؑ کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب ہوش سنبھالا تھا تو ان کے گرد و پیش ہر طرف چاند، سورج اور تاروں کی خدائی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کی جستجوئے حقیقت کا آغاز اسی سوال سے ہونا چاہیے تھا کہ کیا فی الواقع ان میں سے کوئی رب ہو سکتا ہے؟ اسی مرکزی سوال پر انھوں نے غور و فکر کیا اور آخرکار اپنی قوم کے سارے خداؤں کو ایک اٹل قانون کے تحت غلاموں کی طرح گردش کرتے دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ جن جن کے رب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان میں سے کسی کے اندر بھی رُبُوبیّت کا شائبہ تک نہیں ہے، رب صرف وہی ایک ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا اور بندگی پر مجبور کیا ہے۔

اس قصّے کے الفاظ سے عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ جب رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا، پھر چاند دیکھا اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا، پھر سورج دیکھا اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو یہ کہا، اس پر ایک عام ناظر کے ذہن میں فوراً یہ سوال کھٹکتا ہے کہ کیا بچپن سے آنکھ کھولتے ہی روزانہ حضرت ابراہیمؑ پر رات طاری نہ ہوتی رہی تھی اور کیا وہ ہر روز چاند، تاروں اور سورج کو طلوع و غروب ہوتے نہ دیکھتے تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ غور و فکر تو انھوں نے سِنِّ رُشد کو پہنچنے کے بعد ہی کیا ہوگا۔ پھر یہ قصّہ اس طرح کیوں بیان کیا گیا ہے کہ جب رات ہوئی تو یہ دیکھا اور دن نکلا تو یہ دیکھا؟ گویا اس خاص واقعے سے پہلے انھیں یہ چیزیں دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، حالانکہ ایسا ہونا صریحاً مُستبعَد ہے۔ یہ شبہ بعض لوگوں کے لیے اس قدر ناقابلِ حل بن گیا کہ اسے دفع کرنے کی کوئی صورت انھیں اس کے سوا نظر نہ آئی کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش اور پرورش کے متعلق ایک غیر معمولی قصّہ تصنیف کریں۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش اور پرورش ایک غار میں ہوئی تھی جہاں سِنِّ رُشد کو پہنچنے تک وہ چاند، تاروں اور سورج کے مُشاہَدے سے محروم رکھے گئے تھے۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے اس نوعیت کی کسی داستان کی ضرورت نہیں ہے۔ نیوٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے باغ میں ایک سیب کو درخت سے گرتے دیکھا اور اس سے اس کا ذہن اچانک اس سوال کی طرف متوجہ ہو گیا کہ اشیا آخر زمین پر ہی کیوں گرا کرتی ہیں، یہاں تک کہ غور کرتے کرتے وہ قانونِ جذب و کشش کے اِستنباط تک پہنچ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعے سے پہلے نیوٹن نے کبھی کوئی چیز زمین پر گرتے نہیں دیکھی تھی؟ ظاہر ہے کہ ضرور دیکھی ہوگی اور بارہا دیکھی ہوگی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُسی خاص تاریخ کو سیب گرنے کے مُشاہَدے سے نیوٹن کے ذہن میں وہ حرکت پیدا ہوئی جو اس سے پہلے روز مرہ کے ایسے سیکڑوں مشاہدات سے نہ ہوئی تھی؟ اس کا جواب اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی کہ غور و فکر کرنے والا ذہن ہمیشہ ایک طرح کے مشاہدات سے ایک ہی طرح متاثر نہیں ہوا کرتا۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی، مگر ایک وقت اُسی چیز کو دیکھ کر یکایک ذہن میں ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے، جس سے فکر کی قوتیں ایک خاص مضمون کی

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٧٩﴾ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَ
قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ
شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٨٠﴾ وَكَيْفَ

یکسُو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا: "کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہِ راست دکھا دی ہے۔ اور میں تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا، ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہُوا ہے، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟[۵۴] اور آخر میں تمھارے

طرف کام کرنے لگتی ہیں۔ یا پہلے سے کسی سوال کی تحقیق میں ذہن اُلجھ رہا ہوتا ہے اور یکایک روزمرہ ہی کے مُشاہَدات میں سے کسی ایک چیز پر نظر پڑتے ہی گُتھّی کا وہ سِرا ہاتھ لگ جاتا ہے جس سے ساری اُلجھنیں سُلجھتی چلی جاتی ہیں۔ ایسا ہی معاملہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ راتیں روز آتی تھیں اور گزر جاتی تھیں۔ سورج اور چاند اور تارے سب ہی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے اور اُبھرتے رہتے تھے۔ لیکن وہ ایک خاص دن تھا جب ایک تارے کے مشاہدے نے ان کے ذہن کو اُس راہ پر ڈال دیا جس سے بالآخر وہ توحیدِ الٰہ کی مرکزی حقیقت تک پہنچ کر رہے۔ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا ذہن پہلے سے اس سوال پر غور کر رہا ہو کہ جن عقائد پر ساری قوم کا نظامِ زندگی چل رہا ہے ان میں کس حد تک صداقت ہے، اور پھر ایک تارا یکایک سامنے آکر کشودِ کار کے لیے کلید بن گیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تارے کے مشاہدے ہی سے ذہنی حرکت کی ابتدا ہوئی ہو۔

اس سلسلے میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے تارے کو دیکھ کر کہا یہ میرا رب ہے، اور جب چاند اور سورج کو دیکھ کر انھیں اپنا رب کہا، تو کیا اُس وقت عارضی طور پر ہی سہی، وہ شرک میں مبتلا نہ ہو گئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طالبِ حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھیرتا ہے، اصل اعتبار اُن منزلوں کا نہیں ہوتا، بلکہ اصل اعتبار اُس سَمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے اور اُس آخری مقام کا ہوتا ہے جہاں پہنچ کر وہ قیام کرتا ہے۔ بیچ کی منزلیں ہر جویائے حق کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان پر ٹھیرنا بسلسلۂ طلب و جستجو

اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا
لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ
بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا وقف لازم
اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۹

ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ، اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ حقیقت میں تو امن انھی کے لیے ہے اور راہِ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔[۵۵]'' ع

ہوتا ہے نہ کہ بصورتِ فیصلہ۔ اصلاً یہ ٹھیراؤ سوالی و استفہامی ہُوا کرتا ہے نہ کہ حُکمی۔ طالب جب اِن میں سے کسی منزل پر رُک کر کہتا ہے کہ ''ایسا ہے'' تو دراصل یہ اس کی آخری رائے نہیں ہوتی بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''ایسا ہے؟'' اور تحقیق سے اس کا جواب نفی میں پا کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ میں جہاں جہاں وہ ٹھیرتا رہا، وہاں وہ عارضی طور پر کفر یا شرک میں مبتلا رہا۔

۵۴ – اصل میں لفظ تَذَکُّر استعمال ہوا ہے، جس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص جو غفلت اور بُھلاوے میں پڑا ہُوا ہو، وہ چونک کر اُس چیز کو یاد کر لے جس سے وہ غافل تھا۔ اسی لیے ہم نے اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ کا یہ ترجمہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، تمھارا اصلی و حقیقی رب اس سے بے خبر نہیں ہے، اس کا علم ساری چیزوں پر وسیع ہے، پھر کیا اس حقیقت سے واقف ہو کر بھی تمھیں ہوش نہ آئے گا؟

۵۵ – یہ پوری تقریر اس بات پر شاہد ہے کہ وہ قوم اللہ فاطر السماوات والارض کی ہستی کی منکر نہ تھی بلکہ اس کا اصلی جُرم اللہ کے ساتھ دوسروں کو خدائی صفات اور خداوندانہ حُقوق میں شریک قرار دینا تھا۔ اوّل تو حضرت ابراہیمؑ خود ہی فرما رہے ہیں کہ تم اللہ کے ساتھ دوسری چیزوں کو شریک کرتے ہو۔ دوسرے جس طرح آپ ان لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے اللہ کا ذکر فرماتے ہیں، یہ اندازِ بیان صرف اُنھی لوگوں کے مقابلے میں اختیار کیا جا سکتا ہے جو اللہ کے نفسِ وجود سے منکر نہ ہوں۔ لہٰذا اُن مفسّرین کی رائے درست نہیں ہے جنھوں نے اس مقام پر اور حضرت ابراہیمؑ کے سلسلے میں دوسرے مقامات پر قرآن کے

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ
نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ
يَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ
دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ

یہ تھی ہماری وہ حجّت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلے میں عطا کی۔ ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تمھارا رب نہایت دانا اور علیم ہے۔

پھر ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو راہِ راست دکھائی۔ (وہی راہِ راست جو) اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی۔ اور اُسی کی نسل سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت بخشی)۔ اس طرح ہم نیکو کاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ (اُسی کی اولاد سے) زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو (راہ یاب کیا)۔

بیانات کی تفسیر اس مفروضہ پر کی ہے کہ قومِ ابراہیمؑ اللہ کی منکر یا اس سے ناواقف تھی اور صرف اپنے معبودوں ہی کو خدائی کا بالکُلّیہ مالک سمجھتی تھی۔

آخری آیت میں یہ جو فقرہ ہے کہ ”جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا“، اس میں لفظ ظلم سے بعض صحابہؓ کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ شاید اس سے مراد معصیت ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصریح فرما دی کہ دراصل یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ لہٰذا اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اللہ کو مانیں اور اپنے اس ماننے کو کسی مشرکانہ عقیدہ و عمل سے آلودہ نہ کریں، امن صرف اُنھی کے لیے ہے اور وہی راہِ راست پر ہیں۔

اس موقع پر یہ جان لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ واقعہ جو حضرت ابراہیمؑ کی عظیم الشان پیغمبرانہ زندگی کا نقطۂ آغاز ہے، بائبل میں کوئی جگہ نہیں پا سکا ہے۔ البتہ تَلْمُود میں اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن اس میں دو باتیں قرآن سے مختلف ہیں۔ ایک یہ کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی جستجوئے حقیقت کو سورج سے شروع کر کے تاروں تک اور پھر خدا تک لے جاتی ہے۔ دوسرے اس کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب سورج کو ھٰذَا رَبِّیْ کہا تو ساتھ ہی اس کی پرستش بھی کر ڈالی، اور اسی طرح

كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝٨٥ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ
وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝٨٦ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ
وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٨٧
ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ
اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝٨٨ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ

ہر ایک ان میں سے صالح تھا۔ (اسی کے خاندان سے) اسماعیلؑ، الیسعؑ، اور یونسؑ اور لُوطؑ کو (راستہ دکھایا)۔ اِن میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دُنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ نیز ان کے آبا واجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا، انھیں اپنی خدمت کے لیے چُن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا۔ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پروا نہیں) ہم نے

چاند کو بھی انھوں نے ھٰذَا رَبِّیْ کہہ کر اس کی پرستش کی۔

۵۶ – یعنی جس شرک میں تم لوگ مُبتلا ہو، اگر کہیں وہ بھی اسی میں مُبتلا ہوئے ہوتے تو یہ مرتبے ہرگز نہ پا سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ کوئی شخص کامیاب ڈاکا زنی کر کے فاتح کی حیثیت سے دُنیا میں شہرت پا لیتا، یا زر پرستی میں کمال پیدا کر کے قارون کا سا نام پیدا کر لیتا، یا کسی اور صورت سے دُنیا کے بدکاروں میں نامُور بدکار بن جاتا۔ لیکن یہ امام ہدایت اور امام المتقین ہونے کا شَرَف اور یہ دُنیا بھر کے لیے خیر و صلاح کا سرچشمہ ہونے کا مَقام تو کوئی بھی نہ پا سکتا اگر شرک سے مجتنب اور خالص خدا پرستی کی راہ پر ثابت قدم نہ ہوتا۔

۵۷ – یہاں انبیا علیہم السلام کو تین چیزیں عطا کیے جانے کا ذکر کیا گیا ہے: ایک کتاب، یعنی اللہ کا ہدایت نامہ۔ دوسرے حُکم، یعنی اس ہدایت نامہ کا صحیح فہم، اور اس کے اُصولوں کو معاملاتِ زندگی پر منطبق کرنے کی صلاحیت، اور مسائلِ حیات

وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ
اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٠﴾ ع وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ
حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ
قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى

ع ١٠ ٨

کچھ اَور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں[58]۔ اے محمدؐ! وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، انھی کے راستے پر تم چلو، اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ وہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دُنیا والوں کے لیے۔ ع

ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے[59]۔ ان سے پوچھو: پھر وہ کتاب جسے موسیٰؑ لایا تھا، جو تمام انسانوں کے لیے روشنی اور

میں فیصلہ کُن رائے قائم کرنے کی خداداد قابلیت۔ تیسرے نبوت، یعنی یہ منصب کہ وہ اس ہدایت نامہ کے مطابق خلق اللہ کی رہنمائی کریں۔

۵۸ – مطلب یہ ہے کہ اگر یہ کافر ومشرک لوگ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تو کر دیں، ہم نے اہلِ ایمان کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا ہے جو اس نعمت کی قدر کرنے والا ہے۔

۵۹ – پچھلے سلسلۂ بیان اور بعد کی جوابی تقریر سے صاف مُترشّح ہوتا ہے کہ یہ قول یہودیوں کا تھا۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ تھا کہ میں نبی ہوں اور مجھ پر کتاب نازل ہوئی ہے، اس لیے قدرتی طور پر کفّارِ قریش اور دوسرے مشرکینِ عرب اس دعوے کی تحقیق کے لیے یہود ونصاریٰ کی طرف رُجوع کرتے تھے اور ان سے پُوچھتے تھے کہ تم بھی اہلِ کتاب ہو، پیغمبروں کو مانتے ہو، بتاؤ کیا واقعی اس شخص پر اللہ کا کلام نازل ہوا ہے؟ پھر جو کچھ جواب وہ دیتے، اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سرگرم مخالفین جگہ جگہ بیان کر کے لوگوں کو برگشتہ کرتے پھرتے تھے۔ اسی لیے یہاں یہودیوں کے اس قول کو، جسے مخالفینِ اسلام نے حجّت بنا رکھا تھا، نقل کر کے اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔
شبہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک یہودی جو خود تورات کو خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب مانتا ہے، یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر بسا اوقات آدمی کسی دوسرے کی سچّی باتوں کو ردّ کرنے کے لیے ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جن سے خود اس کی اپنی مسلّمہ صداقتوں پر بھی زد پڑ جاتی ہے۔ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کو ردّ کرنے پر تُلے ہوئے تھے اور اپنی مخالفت کے جوش میں اس قدر اندھے ہو جاتے

لِلنَّاسِ تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا ۚ
وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرۡهُمۡ
فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ
الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَلِتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰى وَمَنۡ حَوۡلَهَا ؕ

ہدایت تھی، جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو، کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو، اور جس کے ذریعے سے تم کو وہ علم دیا گیا جو نہ تمھیں حاصل تھا اور نہ تمھارے باپ دادا کو، آخر اُس کا نازل کرنے والا کون تھا؟[۶۰] ــــ بس اتنا کہہ دو کہ اللہ، پھر اُنھیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لیے چھوڑ دو۔ (اُسی کتاب کی طرح) یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ بڑی خیر و برکت والی ہے۔ اُس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی۔ اور اس لیے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے تم بستیوں کے اِس مرکز (یعنی مکّہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبّہ کرو۔

تھے کہ حضوؐر کی رسالت کی تردید کرتے کرتے خود رسالت ہی کی تردید کر گزرتے تھے۔

اور یہ جو فرمایا کہ لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب یہ کہا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی حکمت اور اس کی قدرت کا اندازہ کرنے میں غلطی کی ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر علمِ حق اور ہدایت نامۂ زندگی نازل نہیں کیا ہے، وہ یا تو بشر پر نزولِ وحی کو ناممکن سمجھتا ہے اور یہ خدا کی قدرت کا غلط اندازہ ہے، یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے انسان کو ذہانت کے ہتھیار اور تصرّف کے اختیارات تو دے دیے مگر اس کی صحیح رہنمائی کا کوئی انتظام نہ کیا، بلکہ اسے دنیا میں اندھا دُھند کام کرنے کے لیے یونہی چھوڑ دیا، اور یہ خدا کی حکمت کا غلط اندازہ ہے۔

۶۰ ــ یہ جواب چونکہ یہودیوں کو دیا جا رہا ہے اس لیے موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے نزول کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، کیوں کہ وہ خود اس کے قائل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ تسلیم کرنا کہ حضرت موسیٰؑ پر تورات نازل ہوئی تھی، ان کے اس قول کی آپ سے آپ تردید کر دیتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ نیز اس سے کم از کم اتنی بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ بشر پر خدا کا کلام نازل ہو سکتا ہے اور ہو چکا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ
يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ
اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ

جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں، وہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں[61]۔ اور اُس شخص سے بڑا ظالم اَور کون ہوگا جو اللہ پر جھُوٹا بہتان گھڑے، یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے، درآں حالے کہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو، یا جو اللہ کی نازل کردہ چیز کے مقابلے میں کہے کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر کے دکھا دوں گا؟ کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جب کہ وہ سکراتِ موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے

---

۶۱ – پہلی دلیل اس بات کے ثبوت میں تھی کہ بشر پر خدا کا کلام نازل ہو سکتا ہے اور عملاً ہُوا بھی ہے۔ اب یہ دوسری دلیل اس بات کے ثبوت میں ہے کہ یہ کلام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے، یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے چار باتیں شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں:

ایک یہ کہ یہ کتاب بڑی خیر و برکت والی ہے، یعنی اس میں انسان کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین اُصول پیش کیے گئے ہیں۔ عقائدِ صحیحہ کی تعلیم ہے، بھلائیوں کی ترغیب ہے، اخلاقِ فاضلہ کی تلقین ہے، پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہے، اور پھر یہ جہالت، خودغرضی، تنگ نظری، ظلم، فُحش اور دوسری اُن بُرائیوں سے، جن کا انبار تم لوگوں نے کُتُبِ مُقدّسہ کے مجموعے میں بھر رکھا ہے، بالکل پاک ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سے پہلے خدا کی طرف سے جو ہدایت نامے آئے تھے، یہ کتاب اُن سے الگ ہٹ کر کوئی مختلف ہدایت پیش نہیں کرتی بلکہ اُسی چیز کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو اُن میں پیش کی گئی تھی۔

تیسرے یہ کہ یہ کتاب اُسی مقصد کے لیے نازل ہوئی ہے جو ہر زمانے میں اللہ کی طرف سے کتابوں کے نُزول کا مقصد رہا ہے، یعنی غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانا اور کج روی کے انجامِ بد سے خبردار کرنا۔

چوتھے یہ کہ اس کتاب کی دعوت نے انسانوں کے گروہ میں سے ان لوگوں کو نہیں سمیٹا جو دنیا پرست اور خواہشِ نفس کے بندے ہیں، بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا ہے جن کی نظر حیاتِ دنیا کی تنگ سرحدوں سے آگے تک جاتی ہے، اور پھر اس کتاب سے متاثر ہو کر جو انقلاب ان کی زندگی میں رُونما ہوا ہے، اس کی سب سے زیادہ نمایاں علامت یہ ہے کہ وہ

بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ
الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ
اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٩٣﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ
اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى
مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ
تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٩٤﴾ ع اِنَّ اللّٰهَ
فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ

ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ”لاؤ، نکالو اپنی جان، آج تمھیں اُن باتوں کی پاداش میں ذِلّت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اُس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے۔“ (اور اللہ فرمائے گا:) ”لو اب تم ویسے ہی تنِ تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمھیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا، جو کچھ ہم نے تمھیں دُنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو، اور اب ہم تمھارے ساتھ تمھارے اُن سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلّق تم سمجھتے تھے کہ تمھارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصّہ ہے، تمھارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زَعْم رکھتے تھے۔“ ع

دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے[٦٢]۔ وہی زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور وہی مُردہ کو

انسانوں کے درمیان اپنی خدا پرستی کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ کیا یہ خُصوصیات اور یہ نتائج کسی ایسی کتاب کے ہو سکتے ہیں جسے کسی جھُوٹے انسان نے گھڑ لیا ہو، جو اپنی تصنیف کو خدا کی طرف منسوب کر دینے کی انتہائی مجرمانہ جسارت تک کر گزرے؟

٦٢ – یعنی زمین کی تہوں میں بیج کو پھاڑ کر اس سے درخت کی کونپل نکالنے والا۔

الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿٩٥﴾ فَالِقُ
الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ
ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ
لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٩٧﴾ وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ
فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿٩٨﴾

زندہ سے خارج کرتا ہے۔[٦٣] یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے، پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟ پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے۔ اُسی نے رات کو سُکون کا وقت بنایا ہے۔ اُسی نے چاند اور سُورج کے طُلوع و غروب کا حساب مقرّر کیا ہے۔ یہ سب اُسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں[٦٤]۔ اور وہی ہے جس نے ایک مُتنفّس سے تم کو پیدا کیا،[٦٥] پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سمجھ بُوجھ رکھتے ہیں[٦٦]۔

٦٣ – زندہ کو مُردہ سے نکالنے کا مطلب بے جان مادّے سے زندہ مخلوقات کو پیدا کرنا ہے، اور مُردہ کو زندہ سے خارج کرنے کا مطلب جان دار اجسام میں سے بے جان مادّوں کو خارج کرنا ہے۔

٦٤ – یعنی اِس حقیقت کی نشانیاں کہ خدا صرف ایک ہے، کوئی دوسرا نہ خدائی کی صفات رکھتا ہے، نہ خدائی کے اختیارات میں حصّہ دار ہے، اور نہ خدائی کے حقوق میں سے کسی حق کا مستحق ہے۔ مگر ان نشانیوں اور علامتوں سے حقیقت تک پہنچنا جاہلوں کے بس کی بات نہیں، اس دولت سے بہرہ ور صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو علمی طریق پر آثارِ کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ
كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا
مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ
مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ
مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اُگائی، پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیے، پھر ان سے تہ بر تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جُھکے پڑتے ہیں، اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے، جن کے پھل ایک دُوسرے سے ملتے جُلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خُصوصیات جُدا جُدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر اُن کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو، اِن چیزوں میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ اِس پر بھی لوگوں نے جِنّوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا دیا،[٦٧]

٦۵ – یعنی نسلِ انسانی کی ابتدا ایک متنفّس سے کی۔

٦٦ – یعنی نوعِ انسانی کی تخلیق، اور اس کے اندر مرد و زن کی تفریق، اور تناسُل کے ذریعے سے اس کی افزایش، اور رحمِ مادر میں انسانی بچّے کا نُطفہ قرار پا جانے کے بعد سے زمین میں اس کے سونپے جانے تک اس کی زندگی کے مختلف اطوار پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں بے شمار کُھلی کُھلی نشانیاں آدمی کے سامنے آئیں گی جن سے وہ اُس حقیقت کو پہچان سکتا ہے جو اُوپر بیان ہوئی ہے۔ مگر ان نشانیوں سے یہ معرفت حاصل کرنا انھی لوگوں کا کام ہے جو سمجھ بُوجھ سے کام لیں۔ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے والے، جو صرف اپنی خواہشات سے اور انھیں پُورا کرنے کی تدبیروں ہی سے غرض رکھتے ہیں، اِن نشانیوں میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔

٦۷ – یعنی اپنے وہم وگمان سے یہ ٹھیرا لیا کہ کائنات کے انتظام میں اور انسان کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں اللہ کے ساتھ دُوسری پوشیدہ ہستیاں بھی شریک ہیں، کوئی بارش کا دیوتا ہے تو کوئی روئیدگی کا، کوئی دولت کی دیوی

ع ۱۲ ۱۸

وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى
عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۱۰۰ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ
وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ۝۱۰۱ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ
فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۱۰۲ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ
وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝۱۰۳ قَدْ جَاۗءَكُمْ
بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ وَ

حالانکہ وہ اُن کا خالق ہے، اور بے جانے بُوجھے اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں[68]، حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں ع وہ تو آسمانوں اور زمین کا مُوجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ کوئی اس کی شریکِ زندگی ہی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمھارا رب، کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔ نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے، وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے۔

دیکھو، تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں، اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اُٹھائے گا، مَیں

ہے تو کوئی بیماری کی، وغیر ذالکَ مِن الخرافات۔ اِس قسم کے لغو اعتقادات دُنیا کی تمام مشرک قوموں میں ارواح اور شیاطین اور راکشسوں اور دیوتاؤں اور دیویوں کے متعلق پائے جاتے رہے ہیں۔

۶۸ ـ جُہلائے عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اسی طرح دُنیا کی دُوسری مشرک قوموں نے بھی خدا سے سلسلۂ نسب چلایا ہے اور پھر دیوتاؤں اور دیویوں کی ایک پُوری نسل اپنے وہم سے پیدا کر دی ہے۔

مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿١٠٤﴾ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ
وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿١٠٥﴾ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ

تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں[٦٩]۔

اِس طرح ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں، تم کسی سے پڑھ آئے ہو، اور جو لوگ علم رکھتے ہیں ان پر ہم حقیقت کو روشن کر دیں[٧٠]۔ اَے محمدؐ! اُس وحی کی پیروی کیے جاؤ جو تم پر تمھارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے،

٦٩ ـــ یہ فقرہ اگرچہ اللہ ہی کا کلام ہے مگر نبیؐ کی طرف سے ادا ہو رہا ہے۔ قرآنِ مجید میں جس طرح مُخاطَب بار بار بدلتے ہیں کہ کبھی نبیؐ سے خطاب ہوتا ہے، کبھی اہلِ ایمان سے، کبھی اہلِ کتاب سے، کبھی کُفّار و مُشرکین سے، کبھی قریش کے لوگوں سے، کبھی اہلِ عرب سے اور کبھی عام انسانوں سے، حالانکہ اصل غرض پوری نوعِ انسانی کی ہدایت ہے، اسی طرح مُتکلّم بھی بار بار بدلتے ہیں کہ کہیں متکلّم خدا ہوتا ہے، کہیں وحی لانے والا فرشتہ، کہیں فرشتوں کا گروہ، کہیں نبیؐ، اور کہیں اہلِ ایمان، حالانکہ ان سب صُورتوں میں کلام وہی ایک خدا کا کلام ہوتا ہے۔

”مَیں تم پر پاسباں نہیں ہوں“ یعنی میرا کام بس اتنا ہی ہے کہ اس روشنی کو تمھارے سامنے پیش کر دوں۔ اس کے بعد آنکھیں کھول کر دیکھنا یا نہ دیکھنا تمھارا اپنا کام ہے۔ میرے سُپرد یہ خدمت نہیں کی گئی ہے کہ جنھوں نے خود آنکھیں بند کر رکھی ہیں ان کی آنکھیں زبردستی کھولوں اور جو کچھ وہ نہیں دیکھتے وہ انھیں دکھا کر ہی چھوڑوں۔

٧٠ ـــ یہ وہی بات ہے جو سُورۂ بَقَرہ رُکوع ۳ میں فرمائی گئی ہے کہ مچھر اور مکڑی وغیرہ چیزوں کی تمثیلیں سُن کر حق کے طالب تو اس صداقت کو پالیتے ہیں جو ان تمثیلوں کے پیرایے میں بیان ہوئی ہے، مگر جن پر انکار کا تعصب مسلّط ہے، وہ طنز سے کہتے ہیں کہ بھلا اللہ کے کلام میں ان حقیر چیزوں کے ذکر کا کیا کام ہوسکتا ہے۔ اُسی مضمون کو یہاں ایک دُوسرے پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ کہنے کا مدّعا یہ ہے کہ یہ کلام لوگوں کے لیے آزمایش بن گیا ہے، جس سے کھوٹے اور کھرے انسان ممیّز ہوجاتے ہیں۔ ایک طرح کے انسان وہ ہیں جو اس کلام کو سُن کر یا پڑھ کر اس کے مقصد و مدّعا پر غور کرتے ہیں اور جو حکمت و نصیحت کی باتیں اس میں فرمائی گئی ہیں ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ بخلاف اس کے ایک دوسری طرح کے انسانوں کا حال یہ ہے کہ اسے سُننے اور پڑھنے کے بعد ان کا ذہن مغزِ کلام کی طرف متوجّہ ہونے کے بجائے اس ٹٹول میں لگ جاتا ہے کہ آخر یہ اُمّی انسان یہ مضامین لایا کہاں سے ہے، اور چونکہ مخالفانہ تعصب پہلے سے ان کے دل پر قبضہ کیے ہوئے ہوتا ہے اس لیے ایک خدا کی طرف سے نازل شدہ ہونے کے امکان کو چھوڑ کر باقی تمام ممکن التصور صُورتیں وہ اپنے ذہن سے تجویز کرتے ہیں اور انھیں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا انھوں نے اس کتاب کے ماخذ کی تحقیق کر لی ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ
عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ

کیونکہ اُس ایک رب کے سوا کوئی اَور خدا نہیں ہے۔ اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو۔ اگر اللہ کی مشیّت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کرسکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو[۷۱]۔ اور (اے ایمان لانے والو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پُکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں[۷۲]۔ ہم نے تو اسی طرح ہر گروہ کے لیے اس کے عمل کو خوش نما

---

۷۱ – مطلب یہ ہے کہ تمھیں داعی اور مبلّغ بنایا گیا ہے، کوتوال نہیں بنایا گیا۔ تمھارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اِس روشنی کو پیش کرو اور اظہارِ حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اُٹھا نہ رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم کو نہ اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو، اور نہ تمھاری ذمّہ داری وجواب دِہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمھارے حلقۂ نبوّت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انھیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لیے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اُس کی آزمایش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمھارے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمھیں دکھا دی گئی ہے اُس کے اُجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو اور دُوسروں کو اُس کی دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کرلیں انھیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو، خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں۔ اور جو اسے قبول نہ کریں ان کے پیچھے نہ پڑو۔ جس انجامِ بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مُصِر ہیں، اس کی طرف جانے کے لیے انھیں چھوڑ دو۔

عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ
لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا
جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ

بنا دیا ہے[۷۳]، پھر انھیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے، اُس وقت وہ اُنھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی[۷۴] ہمارے سامنے آ جائے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اے محمدؐ! ان سے کہو کہ ”نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں[۷۵]۔“ اور تمھیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں[۷۶]۔ ہم اُسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ

---

۷۲ – یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو کی گئی ہے کہ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ بھی اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و تکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبُودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ جائے، کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دُور پھینک دے گی۔

۷۳ – یہاں پھر اُس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیے جس کی طرف اس سے پہلے بھی ہم اپنے حواشی میں اشارہ کر چکے ہیں کہ جو اُمُور قوانینِ فطرت کے تحت رُونما ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں اپنا فعل قرار دیتا ہے، کیونکہ وہی ان قوانین کا مقرر کرنے والا ہے اور جو کچھ ان قوانین کے تحت رُونما ہوتا ہے وہ اسی کے امر سے رُونما ہوتا ہے۔ جس بات کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے کہ ہم نے ایسا کیا ہے، اسی کو اگر ہم انسان بیان کریں تو اس طرح کہیں گے کہ فطرتاً ایسا ہی ہُوا کرتا ہے۔

۷۴ – نشانی سے مراد کوئی ایسا صریح محسوس معجزہ ہے جسے دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپؐ کے مامور مِنَ اللہ ہونے کو مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

۷۵ – یعنی نشانیوں کے پیش کرنے اور بنا لانے کی قدرت مجھے حاصل نہیں ہے، ان کا اختیار تو اللہ کو ہے، چاہے دکھائے اور نہ چاہے نہ دکھائے۔

۷۶ – یہ خطاب مسلمانوں سے ہے جو بے تاب ہو ہو کر تمنّا کرتے تھے اور کبھی کبھی زبان سے بھی اس خواہش کا

يُؤْمِنُوا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١١٠﴾ ع

الجزء ٨

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا
عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿١١١﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا
شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ

پہلی مرتبہ اس پر ایمان نہیں لائے تھے[۷۷]۔ ہم انھیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑے دیتے ہیں ع اگر ہم فرشتے بھی ان پر نازل کر دیتے اور مُردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے، اِلّا یہ کہ مشیّتِ الٰہی یہی ہو کہ وہ ایمان لائیں[۷۸]، مگر اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔ اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنّوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے، جو ایک دُوسرے پر خوش آیند

اظہار کر دیتے تھے کہ کوئی ایسی نشانی ظاہر ہو جائے جس سے اُن کے گمراہ بھائی راہِ راست پر آ جائیں۔ ان کی اسی تمنا اور خواہش کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ آخر تمھیں کس طرح سمجھایا جائے کہ ان لوگوں کا ایمان لانا کسی نشانی کے ظہور پر موقوف نہیں ہے۔

۷۷ – یعنی ان کے اندر وہی ذہنیّت کام کیے جا رہی ہے جس کی وجہ سے انھوں نے پہلی مرتبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سُن کر اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے نقطۂ نظر میں ابھی تک کوئی تغیّر واقع نہیں ہوا ہے۔ وہی عقل کا پھیر اور نظر کا بھینگا پن جو انھیں اُس وقت صحیح سمجھنے اور صحیح دیکھنے سے روک رہا تھا، آج بھی ان پر اسی طرح مُسلّط ہے۔

۷۸ – یعنی یہ لوگ اپنے اختیار و انتخاب سے تو حق کو باطل کے مقابلے میں ترجیح دے کر قبول کرنے والے ہیں نہیں۔ اب اِن کے حق پرست بننے کی صرف ایک ہی صورت باقی ہے اور وہ یہ کہ عملِ تخلیق و تکوین سے جس طرح تمام بے اختیار مخلوقات کو حق پرست پیدا کیا گیا ہے اسی طرح انھیں بھی بے اختیار کر کے جبلّی و پیدائشی حق پرست بنا ڈالا جائے۔ مگر یہ اُس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا تمھارا یہ توقع کرنا فضول ہے کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست اپنی تکوینی مداخلت سے ان کو مومن بنائے گا۔

زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ؕ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوۡهُ فَذَرۡهُمۡ
وَمَا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصۡغٰۤى اِلَيۡهِ اَفۡـِٕدَةُ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ

باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر اِلقا کرتے رہتے ہیں۔[۷۹] اگر تمھارے رب کی مشیّت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔[۸۰] پس تم انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیاں کرتے رہیں۔ (یہ سب کچھ ہم انھیں اسی لیے کرنے دے رہے ہیں کہ) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے

۷۹ – یعنی آج اگر شیاطینِ جنّ و اِنس متفق ہو کر تمھارے مقابلے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو تمھارے ہی ساتھ پیش آ رہی ہو۔ ہر زمانے میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی پیغمبر دُنیا کو راہِ راست دکھانے کے لیے اُٹھا تو تمام شیطانی قوتیں اس کے مشن کو ناکام کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئیں۔

''خوش آیند باتوں'' سے مراد وہ تمام چالیں اور تدبیریں اور شکوک و شبہات و اعتراضات ہیں جن سے یہ لوگ عوام کو داعیِ حق اور اس کی دعوت کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کا کام لیتے ہیں۔ پھر ان سب باتوں کو بحیثیتِ مجموعی دھوکے اور فریب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ حق سے لڑنے کے لیے جو ہتھیار بھی مخالفینِ حق استعمال کرتے ہیں، وہ نہ صرف دُوسروں کے لیے بلکہ خود ان کے لیے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکا ہوتے ہیں، اگرچہ بظاہر وہ ان کو نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں۔

۸۰ – یہاں ہماری سابق تشریحات کے علاوہ یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہیے کہ قرآن کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی مَشِیّت اور اس کی رضا میں بہت بڑا فرق ہے، جس کو نظر انداز کر دینے سے بالعموم شدید غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں۔ کسی چیز کا اللہ کی مشیّت اور اس کے اذن کے تحت رُونما ہونا لازمی طور پر یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔ دُنیا میں کوئی واقعہ کبھی صُدُور میں نہیں آتا جب تک اللہ اس کے صُدُور کا اذن نہ دے اور اپنی عظیم الشان اسکیم میں اس کے صُدُور کی گنجایش نہ نکالے اور اسباب کو اس حد تک مساعد نہ کر دے کہ وہ واقعہ صادر ہو سکے۔ کسی چور کی چوری، کسی قاتل کا قتل، کسی ظالم و مفسد کا ظلم و فساد اور کسی کافر و مشرک کا کفر و شرک اللہ کی مشیت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اسی طرح کسی مومن اور کسی متّقی انسان کا ایمان و تقویٰ بھی مشیتِ الٰہی کے بغیر محال ہے۔ دونوں قسم کے واقعات یکساں طور پر مشیّت کے تحت رُونما ہوتے ہیں۔ مگر پہلی قسم کے واقعات سے اللہ راضی نہیں ہے اور اس کے برعکس دُوسری قسم کے واقعات کو اُس کی رضا اور اس کی پسندیدگی و محبوبیت کی سند حاصل ہے۔ اگرچہ آخرِ کار کسی خیرِ عظیم ہی کے لیے فرمانروائے کائنات کی مشیّت کام کر رہی ہے، لیکن اُس خیرِ عظیم کے ظُہور کا راستہ نُور و ظلمت، خیر و شر اور صلاح و فساد کی مختلف قوتوں کے ایک دُوسرے کے مقابلے میں نبرد آزما ہونے ہی سے صاف ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی بزرگ تر مَصلَحتوں کی بنا پر وہ طاعت

بِالۡاٰخِرَةِ وَلِيَرۡضَوۡهُ وَلِيَقۡتَرِفُوۡا مَا هُمۡ مُّقۡتَرِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾
اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡتَغِىۡ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ اِلَيۡكُمُ الۡكِتٰبَ

اُن کے دل اِس (خوشنما دھوکے) کی طرف مائل ہوں اور وہ اس سے راضی ہو جائیں اور اُن بُرائیوں کا اِکتساب کریں جن کا اِکتساب وہ کرنا چاہتے ہیں ـــــ پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، حالانکہ اس نے پُوری تفصیل کے ساتھ تمھاری طرف

اور معصیت، ابراہیمیّت اور نمرُودیت، مُوسویت اور فرعونیّت، آدمیّت اور شیطنت، دونوں کو اپنا اپنا کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اس نے اپنی ذی اختیار مخلوق (جن اور انسان) کو خیر اور شر میں سے کسی ایک کے انتخاب کر لینے کی آزادی عطا کر دی ہے۔ جو چاہے اس کارگاہِ عالَم میں اپنے لیے خیر کا کام پسند کر لے اور جو چاہے شر کا کام۔ دونوں قسم کے کارکنوں کو، جس حد تک خدائی مَصلحتیں اجازت دیتی ہیں، اسباب کی تائید نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کی رضا اور اس کی پسندیدگی صرف خیر ہی کے لیے کام کرنے والوں کو حاصل ہے اور اللہ کو محبوب یہی بات ہے کہ اس کے بندے اپنی آزادیِ انتخاب سے فائدہ اُٹھا کر خیر کو اختیار کریں نہ کہ شر کو۔

اس کے ساتھ یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ دُشمنانِ حق کی مخالفانہ کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مشیّت کا بار بار حوالہ دیتا ہے، اس سے مقصود دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور آپؐ کے ذریعے سے اہلِ ایمان کو، یہ سمجھانا ہے کہ تمھارے کام کی نوعیّت فرشتوں کے کام کی سی نہیں ہے جو کسی مزاحمت کے بغیر احکامِ الٰہی کی تعمیل کر رہے ہیں۔ بلکہ تمھارا اصل کام شریروں اور باغیوں کے مقابلے میں اللہ کے پسند کردہ طریقے کو غالب کرنے کے لیے جِدّ وجُہد کرنا ہے۔ اللہ اپنی مشیّت کے تحت اُن لوگوں کو بھی کام کرنے کا موقع دے رہا ہے جنھوں نے اپنی سعی و جُہد کے لیے خود اللہ سے بغاوت کے راستے کو اختیار کیا ہے، اور اسی طرح وہ تم کو بھی، جنھوں نے طاعت و بندگی کے راستے کو اختیار کیا ہے، کام کرنے کا پورا موقع دیتا ہے۔ اگرچہ اس کی رضا اور ہدایت و رہنمائی اور تائید و نصرت تمھارے ہی ساتھ ہے، کیونکہ تم اُس پہلو میں کام کر رہے ہو جسے وہ پسند کرتا ہے، لیکن تمھیں یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی فوق الفطری مداخلت سے اُن لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دے گا جو ایمان نہیں لانا چاہتے، یا ان شیاطینِ جنّ و اِنس کو زبردستی تمھارے راستے سے ہٹا دے گا جنھوں نے اپنے دل و دماغ کو اور دست و پا کی قوتوں کو اور اپنے وسائل و ذرائع کو حق کی راہ روکنے کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نہیں، اگر تم نے واقعی حق اور نیکی اور صداقت کے لیے کام کرنے کا عزم کیا ہے تو تمھیں باطل پرستوں کے مقابلے میں سخت کش مکش اور جِدّ وجُہد کر کے اپنی حق پرستی کا ثبوت دینا ہوگا۔ ورنہ معجزوں کے زور سے باطل کو مٹانا اور حق کو غالب کرنا ہوتا تو تمھاری ضرورت ہی کیا تھی، اللہ خود ایسا انتظام کر سکتا تھا کہ دنیا میں کوئی شیطان نہ ہوتا اور کسی شرک و کفر کے ظُہور کا امکان نہ ہوتا۔

مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ
رَّبِّكَ بِالۡحَـقِّ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ
رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ
الۡعَلِيۡمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ
سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾

کتاب نازل کر دی ہے؟[۸۱] اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمھارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔[۸۲] تمھارے رب کی بات سچّائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے، کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔

اور اے محمدؐ! اگر تم اُن لوگوں کی اکثریّت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔[۸۳]

۸۱ – اس فقرے میں متکلّم نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور خطاب مسلمانوں سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ نے اپنی کتاب میں صاف صاف یہ تمام حقیقتیں بیان کر دی ہیں اور یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ فوق الفطری مداخلت کے بغیر حق پرستوں کو فطری طریقوں ہی سے غلبۂ حق کی جِدّوجُہد کرنی ہوگی، تو کیا اب میں اللہ کے سوا کوئی اور ایسا صاحبِ امر تلاش کروں جو اللہ کے اس فیصلے پر نظرِ ثانی کرے اور ایسا کوئی معجزہ بھیجے جس سے یہ لوگ ایمان لانے پر مجبُور ہو جائیں؟

۸۲ – یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو واقعات کی توجیہ میں آج گھڑی گئی ہو۔ تمام وہ لوگ جو کُتُبِ آسمانی کا علم رکھتے ہیں اور جنھیں انبیا علیہم السلام کے مِشن سے واقفیت حاصل ہے، اس بات کی شہادت دیں گے کہ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے ٹھیک ٹھیک امرِ حق ہے اور وہ اَزَلی و اَبَدی حقیقت ہے جس میں کبھی فرق نہیں آیا ہے۔

۸۳ – یعنی بیشتر لوگ جو دنیا میں بستے ہیں، علم کے بجائے قیاس و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور ان کے عقائد، تخیُّلات، فلسفے، اُصُولِ زندگی اور قوانینِ عمل سب کے سب قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ بخلاف اس کے اللہ کا راستہ، یعنی دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ جو اللہ کی رضا کے مطابق ہے، لازماً صرف وہی ایک ہے جس کا علم اللہ نے خود دیا ہے، نہ کہ وہ جس کو

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ
بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ
مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ
فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ

درحقیقت تمھارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اُس کے راستے سے ہٹا ہُوا ہے اور کون سیدھی راہ پر ہے۔

پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اُس کا گوشت کھاؤ۔[۸۴] آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالتِ اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے، اُن کی تفصیل وہ تمھیں بتا چکا ہے۔[۸۵]

لوگوں نے بطورِ خود اپنے قیاسات سے تجویز کر لیا ہے۔ لہٰذا کسی طالبِ حق کو یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ دُنیا کے بیشتر انسان کس راستے پر جا رہے ہیں، بلکہ اسے پُوری ثابت قدمی کے ساتھ اُس راہ پر چلنا چاہیے جو اللہ نے بتائی ہے، چاہے اس راستے پر چلنے کے لیے وہ دُنیا میں اکیلا ہی رہ جائے۔

۸۴ – مِن جملہ ان غلط طریقوں کے جو اکثر اہلِ زمین نے بطورِ خود قیاس و گمان سے تجویز کر لیے اور جنھیں مذہبی حُدُود و قیُود کی حیثیّت حاصل ہوگئی، ایک وہ پابندیاں بھی ہیں جو کھانے پینے کی چیزوں میں مختلف قوموں کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ بعض چیزوں کو لوگوں نے آپ ہی آپ حلال قرار دے لیا ہے، حالانکہ اللہ کی نظر میں وہ حرام ہیں۔ اور بعض چیزوں کو انھوں نے خود حرام ٹھیرا لیا ہے، حالانکہ اللہ نے انھیں حلال کیا ہے۔ خُصُوصیّت کے ساتھ سب سے زیادہ جاہلانہ بات جس پر پہلے بھی بعض گروہ مُصِرّ تھے اور آج بھی دُنیا کے بعض گروہ مُصِرّ ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ کا نام لے کر جو جانور ذبح کیا جائے وہ تو ان کے نزدیک ناجائز ہے اور اللہ کے نام کے بغیر جسے ذبح کیا جائے وہ بالکل جائز ہے۔ اسی کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یہاں مسلمانوں سے فرما رہا ہے کہ اگر تم حقیقت میں اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کے احکام کو مانتے ہو تو اُن تمام اَوہام اور تعصبات کو چھوڑ دو جو کفّار و مشرکین میں پائے جاتے ہیں، اُن سب پابندیوں کو توڑ دو جو خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر لوگوں نے خود عائد کر رکھی ہیں، حرام صرف اسی چیز کو سمجھو جسے خدا نے حرام کیا ہے اور حلال اسی کو ٹھیراؤ جس کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔

۸۵ – مُلاحَظہ ہو سورۂ نحل، آیت ۱۱۵۔ اس اشارے سے ضمناً یہ بھی متحقق ہُوا کہ سورۂ نحل اس سُورہ سے پہلے نازل

وَ اِنَّ كَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآىِٕهِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍؕ اِنَّ رَبَّكَ
هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗؕ
اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا
یَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ
وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌؕ وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓـٕهِمْ
لِیُجَادِلُوْكُمْۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ۠ ﴿۱۲۱﴾ ع ۱۴

بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کُن باتیں کرتے ہیں، ان حد سے گزرنے والوں کو تمھارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی، جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔ اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو، اس کا گوشت نہ کھاؤ، ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات اِلقا کرتے ہیں تا کہ وہ تم سے جھگڑا کریں[۸۶]۔ لیکن اگر تم نے اُن کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو[۸۷]۔ ع

ہو چکی تھی۔

۸۶ – حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ علمائے یہود جُہلائے عرب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے کے لیے جو سوالات سکھایا کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ”آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ جسے خدا مارے وہ تو حرام ہو اور جسے ہم ماریں وہ حلال ہو جائے“۔ یہ ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے اس ٹیڑھی ذہنیت کا جو ان نام نہاد اہلِ کتاب میں پائی جاتی تھی۔ وہ اس قسم کے سوالات گھڑ گھڑ کر پیش کرتے تھے تا کہ عوام کے دلوں میں شُبہات ڈالیں اور انھیں حق سے لڑنے کے لیے ہتھیار فراہم کر کے دیں۔

۸۷ – یعنی ایک طرف اللہ کی خداوندی کا اقرار کرنا اور دوسری طرف اللہ سے پھرے ہوئے لوگوں کے احکام پر چلنا اور ان کے مقرر کیے ہوئے طریقوں کی پابندی کرنا، شرک ہے۔ توحید یہ ہے کہ زندگی سراسر اللہ کی اطاعت میں بسر ہو۔ اللہ کے ساتھ اگر دُوسروں کو اعتقاداً مستقل بالذّات مُطاع مان لیا جائے تو یہ اعتقادی شرک ہے، اور اگر عملاً ایسے

اَوَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى
النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا ؕ
كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا

کیا وہ شخص جو پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی[۸۸] اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اُجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے، اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہُوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو؟[۸۹] کافروں کے لیے تو اسی طرح ان کے اعمال خوش نُما بنا دیے گئے ہیں[۹۰]، اور اسی طرح ہم نے

لوگوں کی اطاعت کی جائے جو اللہ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود امر و نہی کے مختار بن گئے ہوں تو یہ عملی شرک ہے۔

۸۸ – یہاں موت سے مُراد جہالت و بے شُعوری کی حالت ہے، اور زندگی سے مُراد علم و اِدراک اور حقیقت شناسی کی حالت۔ جس شخص کو صحیح اور غلط کی تمیز نہیں اور جسے معلوم نہیں کہ راہِ راست کیا ہے، وہ طبیعیات کے نقطۂ نظر سے چاہے ذی حیات ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو انسانیت کی زندگی میسّر نہیں ہے۔ وہ زندہ حیوان تو ضرور ہے مگر زندہ انسان نہیں۔ زندہ انسان درحقیقت صرف وہ شخص ہے جسے حق اور باطل، نیکی اور بدی، راستی اور ناراستی کا شُعور حاصل ہے۔

۸۹ – یعنی تم کس طرح یہ توقع کر سکتے ہو کہ جس انسان کو انسانیت کا شُعور نصیب ہو چکا ہے اور جو علم کی روشنی میں ٹیڑھے راستوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ کو صاف دیکھ رہا ہے، وہ اُن بے شُعور لوگوں کی طرح دنیا میں زندگی بسر کرے گا جو نادانی و جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

۹۰ – یعنی جن لوگوں کے سامنے روشنی پیش کی جائے اور وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیں، جنھیں راہِ راست کی طرف دعوت دی جائے اور وہ اپنے ٹیڑھے راستوں ہی پر چلتے رہنے کو ترجیح دیں، ان کے لیے اللہ کا قانون یہی ہے کہ پھر انھیں تاریکی ہی اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چلنا اور ٹھوکریں کھا کھا کر گرنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ان کو جھاڑیاں ہی باغ اور کانٹے ہی پھُول نظر آتے ہیں۔ انھیں ہر بدکاری میں مزا آتا ہے، ہر حماقت کو وہ تحقیق سمجھتے ہیں، اور ہر فساد انگیز تجربے کے بعد اُس سے بڑھ کر دُوسرے فساد انگیز تجربے کے لیے وہ اِس اُمید پر تیار ہو جاتے ہیں کہ پہلے اتفاق سے دہکتے ہوئے انگارے پر ہاتھ پڑ گیا تھا تو اب کے لعل بدخشاں ہاتھ آ جائے گا۔

فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا لِیَمْكُرُوْا فِیْهَا ؕ وَ مَا
یَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ
اٰیَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔۘ
اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ
اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا كَانُوْا
یَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ
لِلْاِسْلَامِ ۚ وَ مَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّهٗ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا
حَرَجًا كَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ یَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ

وقف منزل
وقف لازم

ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں، مگر انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔

جب ان کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں: "ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسُولوں کو دی گئی ہے۔"[91] اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ قریب ہے وہ وقت جب یہ مجرم اپنی مکّاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلّت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔

پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے[92]، اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اُس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصوّر کرتے ہی) اُسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی رُوح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اِس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی اُن

۹۱ – یعنی ہم رسُولوں کے اِس بیان پر ایمان نہیں لائیں گے کہ ان کے پاس فرشتہ آیا اور خدا کا پیغام لایا، بلکہ ہم صرف اسی وقت ایمان لا سکتے ہیں جب کہ فرشتہ خود ہمارے پاس آئے اور براہِ راست ہم سے کہے

عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ
قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ
جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ
اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ
اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا

لوگوں پر مسلّط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے، حالانکہ یہ راستہ تمھارے رب کا سیدھا راستہ ہے اور اس کے نشانات اُن لوگوں کے لیے واضح کر دیے گئے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس سلامتی کا گھر[۹۳] ہے اور وہ ان کا سر پرست ہے، اُس صحیح طرزِ عمل کی وجہ سے جو انھوں نے اختیار کیا۔

جس روز اللہ ان سب لوگوں کو گھیر کر جمع کرے گا، اس روز وہ جِنّوں[۹۴] سے خطاب کر کے فرمائے گا کہ "اے گروہِ جن! تم نے تو نوعِ انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا"۔ انسانوں میں سے جو اُن کے رفیق تھے وہ عرض کریں گے: "پروردگار! ہم میں سے ہر ایک نے دُوسرے کو خوب استعمال کیا ہے[۹۵]، اور اب ہم اُس وقت پر آ پہنچے ہیں جو تُو نے ہمارے لیے مقرر کر دیا تھا"۔ اللہ فرمائے گا: "اچھا اب آگ تمھارا ٹھکانا ہے، اس میں تم ہمیشہ رہو گے"۔ اُس سے بچیں گے صرف وہی

کہ یہ اللہ کا پیغام ہے۔

۹۲ — سینہ کھول دینے سے مراد اسلام کی صداقت پر پُوری طرح مطمئن کر دینا اور شکوک و شبہات اور تذبذب و تردُّد کو دُور کر دینا ہے۔

۹۳ — "سلامتی کا گھر" یعنی جنّت جہاں انسان ہر آفت سے محفوظ اور ہر خرابی سے مامون ہو گا۔

۹۴ — یہاں جنّوں سے مُراد شیاطینِ جن ہیں۔

مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿١٢٨﴾ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ
بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٢٩﴾ ع يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ ع ۱۵ ۸
وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ
وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا
وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ

جنھیں اللہ بچانا چاہے گا، بے شک تمھارا رب دانا اور علیم [96] ہے۔ دیکھو، اس طرح ہم (آخرت میں) ظالموں کو ایک دُوسرے کا ساتھی بنائیں گے اُس کمائی کی وجہ سے جو وہ (دُنیا میں ایک دُوسرے کے ساتھ مل کر) کرتے تھے [97] ع (اس موقع پر اللہ ان سے یہ بھی پوچھے گا کہ) "اے گروہِ جن و اِنس! کیا تمھارے پاس خود تم ہی میں سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے اور اِس دن کے انجام سے ڈراتے تھے؟" وہ کہیں گے: "ہاں، ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں [98]۔" آج دُنیا کی زندگی نے اِن لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے، مگر اُس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ

۹۵- یعنی ہم میں سے ہر ایک نے دُوسرے سے ناجائز فائدے اُٹھائے ہیں، ہر ایک دُوسرے کو فریب میں مبتلا کر کے اپنی خواہشات پوری کرتا رہا ہے۔

۹۶- یعنی اگرچہ اللہ کو اختیار ہے کہ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے، مگر یہ سزا اور معافی بلاوجہِ معقول، مجرّد خواہش کی بنا پر نہیں ہوگی بلکہ علم اور حکمت پر مبنی ہوگی۔ خدا معاف اسی مجرم کو کرے گا جس کے متعلّق وہ جانتا ہے کہ وہ خود اپنے جُرم کا ذمّہ دار نہیں ہے اور جس کے متعلّق اس کی حکمت یہ فیصلہ کرے گی کہ اسے سزا نہ دی جانی چاہیے۔

۹۷- یعنی جس طرح وہ دنیا میں گناہ سمیٹنے اور بُرائیوں کا اکتساب کرنے میں ایک دُوسرے کے شریک تھے، اسی طرح آخرت کی سزا پانے میں بھی وہ ایک دوسرے کے شریکِ حال ہوں گے۔

۹۸- یعنی ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ کی طرف سے رسُول پر رسُول آتے اور ہمیں حقیقت سے خبردار کرتے رہے، مگر یہ ہمارا اپنا قصور تھا کہ ہم نے ان کی بات نہ مانی۔

كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿١٣٠﴾ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ
وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿١٣١﴾ وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَ مَا رَبُّكَ
بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٢﴾ وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ

کافر تھے[99]۔ (یہ شہادت اُن سے اس لیے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ) تمھارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جب کہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں[100]۔

ہر شخص کا درجہ اُس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمھارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ تمھارا رب بے نیاز ہے اور مہربانی اس کا شیوہ ہے[101]۔ اگر وہ چاہے تو

۹۹ – یعنی بے خبر اور ناواقف نہ تھے بلکہ کافر تھے۔ وہ خود تسلیم کریں گے کہ حق ہم تک پہنچا تھا مگر ہم نے خود اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

۱۰۰ – یعنی اللہ اپنے بندوں کو یہ موقع نہیں دینا چاہتا کہ وہ اس کے مقابلے میں یہ احتجاج کر سکیں کہ آپ نے ہمیں حقیقت سے تو آگاہ کیا نہیں، اور نہ ہم کو صحیح راستہ بتانے کا کوئی انتظام فرمایا، مگر جب ناواقفیت کی بنا پر ہم غلط راہ پر چل پڑے تو اب آپ ہمیں پکڑتے ہیں۔ اِسی حجّت کو قطع کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں، تاکہ جنّ وانس کو صاف صاف خبردار کر دیا جائے۔ اب اگر لوگ غلط راستوں پر چلتے ہیں اور اللہ ان کو سزا دیتا ہے تو اس کا الزام خود ان پر ہے نہ کہ اللہ پر۔

۱۰۱ – ”تمھارا رب بے نیاز ہے“، یعنی اس کی کوئی غرض تم سے اٹکی ہوئی نہیں ہے، اس کا کوئی مفاد تم سے وابستہ نہیں ہے کہ تمھاری نافرمانی سے اس کا کچھ بگڑ جاتا ہو، یا تمھاری فرماں برداری سے اس کو کوئی فائدہ پہنچ جاتا ہو۔ تم سب مل کر سخت نافرمان بن جاؤ تو اس کی بادشاہی میں ذرہ برابر کمی نہیں کر سکتے، اور سب کے سب مل کر اس کے مطیع فرمان اور عبادت گزار بن جاؤ تو اس کے ملک میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ وہ نہ تمھاری سلامیوں کا محتاج ہے اور نہ تمھاری نذر و نیاز کا۔ اپنے بے شمار خزانے تم پر لُٹا رہا ہے بغیر اس کے کہ ان کے بدلے میں اپنے لیے تم سے کچھ چاہے۔

”مہربانی اس کا شیوہ ہے۔“ یہاں موقع ومحل کے لحاظ سے اس فقرے کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ تمھارا رب تم کو راہِ راست پر چلنے کی جو تلقین کرتا ہے اور حقیقتِ نفس الامری کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے سے جو منع کرتا ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمھاری راست روی سے اس کا کوئی فائدہ اور غلط روی سے اس کا کوئی نقصان ہوتا ہے، بلکہ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ راست روی میں تمھارا اپنا فائدہ اور غلط روی میں تمھارا اپنا نقصان ہے۔ لہٰذا یہ سراسر

يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ
ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿١٣٣﴾ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ
بِمُعْجِزِيْنَ ﴿١٣٤﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ
تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿١٣٥﴾

تم لوگوں کو لے جائے اور تمھاری جگہ دوسرے جن لوگوں کو چاہے لے آئے، جس طرح اُس نے تمھیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اُٹھایا ہے۔ تم سے جس چیز کا وعدہ کیا جا رہا ہے، وہ یقیناً آنے والی ہے[۱۰۲] اور تم خدا کو عاجز کر دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اے محمدؐ! کہہ دو کہ لوگو! تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو اور مَیں بھی اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں[۱۰۳]، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ انجامِ کار کس کے حق میں بہتر ہوتا ہے، بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

اس کی مہربانی ہے کہ وہ تمھیں اُس صحیح طرزِ عمل کی تعلیم دیتا ہے جس سے تم بلند مدارج تک ترقی کرنے کے قابل بن سکتے ہو، اور اس غلط طرزِ عمل سے روکتا ہے جس کی بدولت تم پست مراتب کی طرف تنزُّل کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تمھارا رب سخت گیر نہیں ہے، تم کو سزا دینے میں اُسے کوئی لُطف نہیں آتا ہے، وہ تمھیں پکڑنے اور مارنے پر تُلا ہُوا نہیں ہے کہ ذرا تم سے قصور سرزد ہو اور وہ تمھاری خبر لے ڈالے۔ درحقیقت وہ اپنی تمام مخلوقات پر نہایت مہربان ہے، غایت درجے کے رحم و کرم کے ساتھ خدائی کر رہا ہے، اور یہی اس کا معاملہ انسانوں کے ساتھ بھی ہے۔ اسی لیے وہ تمھارے قُصُور پر قُصُور معاف کرتا چلا جاتا ہے۔ تم نافرمانیاں کرتے ہو، گناہ کرتے ہو، جرائم کا ارتکاب کرتے ہو، اس کے رزق سے پَل کر بھی اس کے احکام سے منہ موڑتے ہو، مگر وہ حلم اور عفو ہی سے کام لیے جاتا ہے اور تمھیں سنبھلنے اور سمجھنے اور اپنی اصلاح کر لینے کے لیے مُہلت پر مُہلت دیے جاتا ہے۔ ورنہ اگر وہ سخت گیر ہوتا تو اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ تمھیں دنیا سے رخصت کر دیتا اور تمھاری جگہ کسی دُوسری قوم کو اُٹھا کھڑا کرتا، یا سارے انسانوں کو ختم کر کے کوئی اور مخلوق پیدا کر دیتا۔

۱۰۲– یعنی قیامت، جس کے بعد تمام اگلے پچھلے انسان از سرِ نَو زندہ کیے جائیں گے اور اپنے رب کے سامنے آخری فیصلے کے لیے پیش ہوں گے۔

۱۰۳– یعنی اگر میرے سمجھانے سے تم نہیں سمجھتے اور اپنی غلط روی سے باز نہیں آتے تو جس راہ پر تم چل رہے ہو چلے جاؤ، اور مجھے اپنی راہ چلنے کے لیے چھوڑ دو، انجامِ کار جو کچھ ہو گا وہ تمھارے سامنے بھی آ جائے گا اور میرے سامنے بھی۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا

اِن لوگوں[۱۰۴] نے اللہ کے لیے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصّہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں: یہ اللہ کے لیے ہے، بزَعمِ خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے۔[۱۰۵] پھر جو حصّہ ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو

۱۰۴ – اُوپر کا سلسلۂ تقریر اس بات پر تمام ہُوا تھا کہ اگر یہ لوگ نصیحت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اپنی جاہلیّت پر اصرار ہی کیے جاتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ اچھا، تم اپنے طریقے پر عمل کرتے رہو اور مَیں اپنے طریقے پر عمل کروں گا، قیامت ایک دن ضرور آنی ہے، اس وقت تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس روش کا کیا انجام ہوتا ہے، بہرحال یہ خوب سمجھ لو کہ وہاں ظالموں کو فلاح نصیب نہ ہوگی۔ اس کے بعد اب اُس جاہلیّت کی کچھ تشریح کی جاتی ہے جس پر وہ لوگ اصرار کر رہے تھے اور جسے چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے۔ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ تمھارا وہ "ظلم" کیا ہے جس پر قائم رہتے ہوئے تم کسی فلاح کی اُمّید نہیں کر سکتے۔

۱۰۵ – اِس بات کے وہ خود قائل تھے کہ زمین اللہ کی ہے اور کھیتیاں وہی اگاتا ہے۔ نیز اُن جانوروں کا خالق بھی اللہ ہی ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں خدمت لیتے ہیں۔ لیکن ان کا تصور یہ تھا کہ ان پر اللہ کا یہ فضل اُن دیویوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں اور جنّات، اور آسمانی ستاروں اور بزرگانِ سَلَف کی ارواح کے طفیل و برکت سے ہے جو ان پر نظرِ کرم رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار اور اپنے جانوروں میں سے دو حصّے نکالتے تھے۔ ایک حصّہ اللہ کے نام کا، اس شکریے میں کہ اس نے یہ کھیت اور یہ جانور انھیں بخشے۔ اور دُوسرا حصّہ اپنے قبیلہ یا خاندان کے سرپرست معبُودوں کی نذر و نیاز کا، تا کہ اُن کی مہربانیاں ان کے شاملِ حال رہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے ان کے اسی ظلم پر گرفت فرماتا ہے کہ یہ سب مویشی ہمارے پیدا کیے ہوئے اور ہمارے عطا کردہ ہیں، ان میں یہ دُوسروں کی نذر و نیاز کیسی؟ یہ نمک حرامی نہیں تو کیا ہے کہ تم اپنے محسن کے احسان کو، جو اس نے سراسر خود اپنے فضل و کرم سے تم پر کیا ہے، دُوسروں کی مداخلت اور ان کے توسُّط کا نتیجہ قرار دیتے ہو اور شکریے کے استحقاق میں انھیں اُس کے ساتھ شریک کرتے ہو۔ پھر اشارتاً دُوسری گرفت اس بات پر بھی فرمائی ہے کہ یہ اللہ کا حصّہ جو انھوں نے مقرر کیا ہے، یہ بھی بزَعمِ خود کر لیا ہے، اپنے شارع خود بن بیٹھے ہیں، آپ ہی جو حصّہ چاہتے ہیں اللہ کے لیے مقرر کر لیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں دُوسروں کے لیے طے کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اپنی بخشش کا اصل مالک و مختار خود اللہ ہے اور یہ بات اسی کی شریعت کے مطابق طے ہونی چاہیے کہ اس بخشش میں سے کتنا حصّہ اس کے شکریے کے لیے نکالا جائے اور باقی میں کون کون حق دار ہیں۔ پس درحقیقت اس خود مختارانہ طریقے سے جو حصّہ یہ لوگ اپنے زَعمِ باطل میں خدا

يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿١٣٦﴾ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ

نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے[۱۰۶]۔ کیسے بُرے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ!

اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو

کے لیے نکالتے ہیں اور فقراو مساکین وغیرہ پر خیرات کرتے ہیں وہ بھی کوئی نیکی نہیں ہے۔ خدا کے ہاں اس کے مقبول ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔

۱۰۶ – یہ لطیف طنز ہے اُن کی اس حرکت پر کہ وہ خدا کے نام سے جو حصّہ نکالتے تھے اس میں بھی طرح طرح کی چالبازیاں کر کے کمی کرتے رہتے تھے اور ہر صُورت سے اپنے خود ساختہ شریکوں کا حصّہ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جو دلچسپی انھیں اپنے ان شریکوں سے ہے وہ خدا سے نہیں ہے۔ مثلاً جو غلّے یا پھل وغیرہ خدا کے نام پر نکالے جاتے، ان میں سے اگر کچھ گر جاتا تو وہ شریکوں کے حصّے میں شامل کر دیا جاتا تھا، اور اگر شریکوں کے حصّے میں سے گِرتا، یا خدا کے حصّے میں مل جاتا تو اُسے انھی کے حصّے میں واپس کیا جاتا۔ کھیت کا جو حصّہ شریکوں کی نذر کے لیے مخصوص کیا جاتا تھا، اگر اس میں سے پانی اُس حصّے کی طرف پھُوٹ بہتا جو خدا کی نذر کے لیے مختص ہوتا تھا تو اس کی ساری پیداوار شریکوں کے حصّے میں داخل کر دی جاتی تھی، لیکن اگر اس کے برعکس صُورت پیش آتی تو خدا کے حصّے میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا غلّہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو خدا کا حصّہ کھا لیتے تھے مگر شریکوں کے حصّے کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصے میں کچھ کمی آجاتی تو وہ خدا کے حصّے سے پُوری کی جاتی تھی، لیکن خدا کے حصے میں کمی ہوتی تو شریکوں کے حصے میں سے ایک حبّہ بھی اس میں نہ ڈالا جاتا۔ اس طرزِ عمل پر کوئی نکتہ چینی کرتا تو جواب میں طرح طرح کی دل فریب توجیہیں کی جاتی تھیں۔ مثلاً کہتے تھے کہ خدا تو غنی ہے، اس کے حصے میں سے کچھ کم بھی ہو جائے تو اُسے کیا پروا ہو سکتی ہے۔ رہے یہ شریک، تو یہ بندے ہیں، خدا کی طرح غنی نہیں ہیں، اس لیے ذرا سی کمی بیشی پر بھی ان کے ہاں گرفت ہو جاتی ہے۔

اِن توہُمّات کی اصل جڑ کیا تھی، اس کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ جُہلائے عرب اپنے مال میں سے جو حصہ خدا کے لیے نکالتے تھے، وہ فقیروں، مسکینوں، مسافروں اور یتیموں وغیرہ کی مدد میں صَرف کیا جاتا تھا، اور جو حصّہ شریکوں کی نذر و نیاز کے لیے نکالتے تھے، وہ یا تو براہِ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا آستانوں پر چڑھاوے کی صُورت میں پیش کیا جاتا اور اس طرح بالواسطہ مجاوروں اور پُجاریوں تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی لیے ان خود غرض مذہبی

قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ

خوشنما بنا دیا ہے[107] تاکہ ان کو ہلاکت میں مُبتلا کریں[108] اور ان پر ان کے دین کو مُشتبَہ بنا دیں۔[109]

پیشواؤں نے صدیوں کی مسلسل تلقین سے ان جاہلوں کے دل میں یہ بات بٹھائی تھی کہ خدا کے حصّے میں کمی ہو جائے تو کچھ مضایقہ نہیں، مگر ’’خدا کے پیاروں‘‘ کے حصّے میں کمی نہ ہونی چاہیے، بلکہ حتّی الامکان کچھ بیشی ہی ہوتی رہے تو بہتر ہے۔

۱۰۷ – یہاں ’’شریکوں‘‘ کا لفظ ایک دُوسرے معنیٰ میں استعمال ہُوا ہے جو اُوپر کے معنیٰ سے مختلف ہے۔ اوپر کی آیت میں جنھیں ’’شریک‘‘ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا، وہ ان کے معبود تھے جن کی برکت یا سفارش یا توسُّط کو یہ لوگ نعمت کے حُصُول میں مددگار سمجھتے تھے اور شکرِ نعمت کے استحقاق میں انھیں خدا کے ساتھ حصّہ دار بناتے تھے۔ بخلاف اس کے، اس آیت میں ’’شریک‘‘ سے مُراد وہ انسان اور شیطان ہیں جنھوں نے قتلِ اولاد کو ان لوگوں کی نگاہ میں ایک جائز اور پسندیدہ فعل بنا دیا تھا۔ انھیں شریک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے جس طرح پرستش کا مستحق تنہا اللہ تعالیٰ ہے، اسی طرح بندوں کے لیے قانون بنانے اور جائز و ناجائز کی حدیں مقرر کرنے کا حق دار بھی صرف اللہ ہے۔ لہٰذا جس طرح کسی دُوسرے کے آگے پرستش کے افعال میں سے کوئی فعل کرنا اسے خدا کا شریک بنانے کا ہم معنیٰ ہے، اسی طرح کسی کے خود ساختہ قانون کو برحق سمجھتے ہوئے اس کی پابندی کرنا اور اس کے مقرر کیے ہوئے حُدُود کو واجب الاطاعت ماننا بھی اسے خدائی میں اللہ کا شریک قرار دینے کا ہم معنیٰ ہے۔ یہ دونوں افعال بہرحال شرک ہیں، خواہ اُن کا مرتکب ان ہستیوں کو زبان سے الٰہ اور رب کہے یا نہ کہے جن کے آگے وہ نذر و نیاز پیش کرتا ہے یا جن کے مقرر کیے ہوئے قانون کو واجب الاطاعت مانتا ہے۔

قتلِ اولاد کی تین صُورتیں اہلِ عرب میں رائج تھیں اور قرآن میں تینوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

(۱) لڑکیوں کا قتل، اس خیال سے کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے، یا قبائلی لڑائیوں میں وہ دشمن کے ہاتھ نہ پڑیں، یا کسی دُوسرے سبب سے وہ ان کے لیے سببِ عار نہ بنیں۔

(۲) بچّوں کا قتل، اس خیال سے کہ ان کی پرورش کا بار نہ اُٹھایا جا سکے گا اور ذرائعِ مَعاش کی کمی کے سبب سے وہ ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائیں گے۔

(۳) بچّوں کو اپنے معبُودوں کی خوشنودی کے لیے بھینٹ چڑھانا۔

۱۰۸ – یہ ہلاکت کا لفظ نہایت معنیٰ خیز ہے۔ اِس سے مراد اخلاقی ہلاکت بھی ہے کہ جو انسان سنگ دلی اور شقاوت کی اس حد کو پہنچ جائے کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے لگے اس میں جوہرِ انسانیت تو درکنار، جوہرِ حیوانیت تک باقی نہیں رہتا۔ اور نوعی و قومی ہلاکت بھی، کہ قتلِ اولاد کا لازمی نتیجہ نسلوں کا گھٹنا اور آبادی کا کم ہونا ہے، جس سے نوعِ انسانی کو بھی نقصان پہنچتا ہے، اور وہ قوم بھی تباہی کے گڑھے میں گرتی ہے جو اپنے حامیوں اور اپنے تمدّن

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَقَالُوْا هٰذِهٖ
اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ
وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ
عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے، لہٰذا انھیں چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیوں میں لگے رہیں۔[110]

کہتے ہیں: یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں، انھیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنھیں ہم کھلانا چاہیں، حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔[111] پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے،[112] اور یہ سب کچھ انھوں نے اللہ پر افترا کیا ہے،[113] عنقریب اللہ انھیں ان افترا پردازیوں کا بدلہ دے گا۔

کے کارکنوں اور اپنی میراث کے وارثوں کو پیدا نہیں ہونے دیتی، یا پیدا ہوتے ہی خود اپنے ہاتھوں انھیں ختم کر ڈالتی ہے۔ اور اس سے مراد انجامی ہلاکت بھی ہے کہ جو شخص معصوم بچّوں پر یہ ظلم کرتا ہے، اور جو اپنی انسانیت کو بلکہ اپنی حیوانی فطرت تک کو یُوں اُلٹی چھُری سے ذبح کرتا ہے، اور جو نوعِ انسانی کے ساتھ اور خود اپنی قوم کے ساتھ یہ دشمنی کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو خدا کے شدید عذاب کا مستحق بناتا ہے۔

۱۰۹ — زمانۂ جاہلیّت کے عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا پیرو کہتے اور سمجھتے تھے، اور اس بنا پر ان کا خیال یہ تھا کہ جس مذہب کا وہ اتباع کر رہے ہیں، وہ خدا کا پسندیدہ مذہب ہی ہے۔ لیکن جو دین ان لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے سیکھا تھا، اس کے اندر بعد کی صدیوں میں مذہبی پیشوا، قبائل کے سردار، خاندانوں کے بڑے بوڑھے اور مختلف لوگ طرح طرح کے عقائد اور اعمال اور رُسوم کا اضافہ کرتے چلے گئے، جنھیں آنے والی نسلوں نے اصل مذہب کا جُز سمجھا اور عقیدت مندی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ چونکہ روایات میں، یا تاریخ میں، یا کسی کتاب میں ایسا کوئی ریکارڈ محفوظ نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ اصل مذہب کیا تھا اور بعد میں کیا چیزیں کس زمانے میں کس نے کس طرح اضافہ کیں، اس وجہ سے اہلِ عرب کے لیے ان کا پُورا دین مُشتَبَہ ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ کسی چیز کے متعلق یقین کے ساتھ یہی کہہ سکتے تھے کہ یہ اس اصل دین کا جز ہے جو خدا کی طرف سے آیا تھا، اور نہ یہی جانتے تھے کہ یہ بدعات اور غلط رُسُوم ہیں جو بعد میں لوگوں نے بڑھا دیں۔ اِسی صُورتِ حال کی ترجمانی اس فقرے میں کی گئی ہے۔

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى
اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۭ
اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ
عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا

اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے، یہ ہمارے مَردوں کے لیے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام، لیکن اگر وہ مُردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں[۱۱۴]۔ یہ باتیں جو انھوں نے گھڑ لی ہیں، ان کا بدلہ اللہ انھیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔

یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دیے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھیرا لیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے

۱۱۰ — یعنی اگر اللہ چاہتا کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کر سکتے تھے، لیکن چونکہ اللہ کی مشیّت یہی تھی کہ جو شخص جس راہ پر جانا چاہتا ہے اسے جانے کا موقع دیا جائے، اسی لیے یہ سب کچھ ہُوا۔ پس اگر یہ لوگ تمھارے سمجھانے سے نہیں مانتے اور ان افترا پردازیوں ہی پر انھیں اصرار ہے، تو جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں کرنے دو، ان کے پیچھے پڑنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

۱۱۱ — اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ بعض جانوروں کے متعلّق یا بعض کھیتیوں کی پیداوار کے متعلّق منت مان لیتے تھے کہ یہ فُلاں آستانے یا فُلاں حضرت کی نیاز کے لیے مخصُوص ہیں۔ اُس نیاز کو ہر ایک نہ کھا سکتا تھا، بلکہ اس کے لیے ان کے ہاں ایک مفصّل ضابطہ تھا، جس کی رُو سے مختلف نیازوں کو مختلف قسم کے مخصُوص لوگ ہی کھا سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس فعل کو نہ صرف مشرکانہ افعال میں شمار کرتا ہے، بلکہ اس پہلو پر بھی تنبیہ فرماتا ہے کہ یہ ضابطہ ان کا خود ساختہ ہے۔ یعنی جس خدا کے رزق میں سے وہ یہ منّتیں مانتے اور نیازیں کرتے ہیں، اس نے نہ ان منّتوں اور نیازوں کا حکم دیا ہے اور نہ ان کے کھانے کے متعلّق یہ پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ سب کچھ ان خودسر اور باغی بندوں نے اپنے اختیار سے خود ہی تصنیف کر لیا ہے۔

۱۱۲ — روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے ہاں بعض مخصوص منّتوں اور نذروں کے جانور ایسے ہوتے تھے جن پر خدا کا نام لینا جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا ممنوع تھا، کیونکہ حج کے لیے لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کہنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا دودھ دوہتے وقت، یا ان پر سوار ہونے کی حالت میں، یا ان کو ذبح کرتے ہوئے، یا ان کو کھانے کے وقت

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِيْنَ ﴿١٤٠﴾ ع وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ
غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ
وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ

ع ۱۶ / ۱۱ / ۳

اور ہرگز وہ راہِ راست پانے والوں میں سے نہ تھے۔[115] ع

وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان[116] اور نخلستان پیدا کیے، کھیتیاں اُگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں، زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صُورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ

اہتمام کیا جاتا تھا کہ خدا کا نام زبان پر نہ آئے۔

۱۱۳ – یعنی یہ قاعدے خدا کے مقرر کیے ہوئے نہیں ہیں، مگر وہ ان کی پابندی یہی سمجھتے ہوئے کر رہے ہیں کہ انھیں خدا نے مقرر کیا ہے، اور ایسا سمجھنے کے لیے ان کے پاس خدا کے کسی حکم کی سند نہیں ہے بلکہ صرف یہ سند ہے کہ باپ دادا سے یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔

۱۱۴ – اہلِ عرب کے ہاں نذروں اور منّتوں کے جانوروں کے متعلّق جو خود ساختہ شریعت بنی ہوئی تھی، اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان جانوروں کے پیٹ سے جو بچّہ پیدا ہو، اس کا گوشت صرف مرد کھا سکتے ہیں، عورتوں کے لیے ان کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن اگر وہ بچہ مُردہ ہو یا مرجائے تو اس کا گوشت کھانے میں مرد و عورت سب شریک ہو سکتے ہیں۔

۱۱۵ – یعنی اگرچہ وہ لوگ جنھوں نے یہ رسم و رواج گھڑے تھے تمھارے باپ دادا تھے، تمھارے مذہبی بزرگ تھے، تمھارے پیشوا اور سردار تھے، لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہے، ان کے ایجاد کیے ہوئے غلط طریقے صرف اس لیے صحیح اور مقدس نہیں ہو سکتے کہ وہ تمھارے اسلاف اور بزرگ تھے۔ جن ظالموں نے قتلِ اولاد جیسے وحشیانہ فعل کو رسم بنایا ہو، جنھوں نے خدا کے دیے ہوئے رزق کو خواہ مخواہ خدا کے بندوں پر حرام کیا ہو، جنھوں نے دین میں اپنی طرف سے نئی نئی باتیں شامل کر کے خدا کی طرف منسوب کی ہوں، وہ آخر فلاح یاب اور راست رَو کیسے ہو سکتے ہیں۔ چاہے وہ تمھارے اسلاف اور بزرگ ہی کیوں نہ ہوں، بہرحال تھے وہ گمراہ، اور اپنی اس گمراہی کا بُرا انجام بھی وہ دیکھ کر رہیں گے۔

۱۱۶ – اصل میں جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن سے مراد دو طرح کے باغ ہیں: ایک وہ جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں۔ دُوسرے وہ جن کے درخت خود اپنے تنوں پر کھڑے رہتے ہیں۔ ہماری زبان میں باغ کا لفظ صرف دوسری قسم کے باغوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے ہم نے جَنّٰتٍ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ کا ترجمہ

اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ
الْمُسْرِفِيْنَ ۙ ﴿۱۴۱﴾ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا
رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ
مُّبِيْنٌ ۙ ﴿۱۴۲﴾ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ
قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ

یہ پھلیں، اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو، اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کیے جن سے سواری و بار برداری کا کام لیا جاتا ہے اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔[۱۱۷] کھاؤ اُن چیزوں میں سے جو اللہ نے تمھیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔[۱۱۸] یہ آٹھ نر و مادہ ہیں، دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے۔ اے محمدؐ! ان سے پُوچھو کہ اللہ نے اُن کے نر حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچّے جو بھیڑوں

''باغ'' کیا ہے اور جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ کے لیے ''تاکستان'' (یعنی انگوری باغ) کا لفظ اختیار کیا ہے۔

۱۱۷ – اصل میں لفظ فَرْش استعمال ہوا ہے۔ جانوروں کو فَرش کہنا یا تو اس رعایت سے ہے کہ وہ چھوٹے قد کے ہیں اور زمین سے لگے ہوئے چلتے ہیں، یا اس رعایت سے کہ وہ ذبح کے لیے زمین پر لٹائے جاتے ہیں، یا اس رعایت سے کہ ان کی کھالوں اور ان کے بالوں سے فرش بنائے جاتے ہیں۔

۱۱۸ – سلسلۂ کلام پر نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ تین باتیں ذہن نشین کرانا چاہتا ہے: ایک یہ کہ یہ باغ اور کھیت اور یہ جانور جو تم کو حاصل ہیں، یہ سب اللہ کے بخشے ہوئے ہیں، کسی دُوسرے کا اس بخشش میں کوئی حصّہ نہیں ہے، اس لیے بخشش کے شکریے میں بھی کسی کا کوئی حصّہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے یہ کہ جب یہ چیزیں اللہ کی بخشش ہیں تو ان کے استعمال میں اللہ ہی کے قانون کی پیروی ہونی چاہیے۔ کسی دُوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ ان کے استعمال پر اپنی طرف سے حُدود مقرر کر دے۔ اللہ کے سوا کسی اَور کی مقرر کردہ رسموں کی پابندی کرنا اور اللہ کے سوا کسی اَور کے آگے شُکرِ نعمت کی نذر پیش کرنا ہی حد سے گزرنا ہے اور یہی شیطان کی پیروی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ سب چیزیں اللہ نے انسان کے کھانے پینے اور استعمال کرنے ہی کے لیے پیدا کی ہیں، اس لیے پیدا نہیں کیں کہ انھیں خواہ مخواہ حرام کر لیا جائے۔ اپنے اوہام اور قیاسات کی بنا پر جو پابندیاں لوگوں نے خدا کے رزق اور اس کی بخشی ہوئی چیزوں کے استعمال پر عائد کر لی ہیں، وہ

اَمْ حَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَ
مِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَیْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ
حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ
اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا
یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۴﴾ ع قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ ع

اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچّے ہو[119]۔ اور اِسی طرح دو اُونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ پُوچھو: اِن کے نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچّے جو اُونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں[120]؟ کیا تم اُس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا حکم تمھیں دیا تھا؟ پھر اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اَور کون ہوگا جو اللہ کی طرف منسُوب کر کے جھوٹی بات کہے، تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہ نمائی کرے۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھاتا۔ ع

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے، اس میں تو مَیں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو

سب منشائے الٰہی کے خلاف ہیں۔

۱۱۹ – یعنی گمان و وہم یا آبائی روایات نہ پیش کرو بلکہ علم پیش کرو اگر وہ تمھارے پاس ہو۔

۱۲۰ – یہ سوال اس تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ اُن پر خود اپنے ان توہّمات کی غیر معقولیت واضح ہو جائے۔ یہ بات کہ ایک ہی جانور کا نر حلال ہو اور مادہ حرام، یا مادہ حلال ہو اور نر حرام، یا جانور خود حلال ہو مگر اس کا بچّہ حرام، یہ صریحاً ایسی نامعقول بات ہے کہ عقلِ سلیم اسے ماننے سے انکار کرتی ہے اور کوئی ذی عقل انسان یہ تصوّر نہیں کر سکتا کہ خدا نے ایسی لغویّات کا حکم دیا ہوگا۔ پھر جس طریقے سے قرآن نے اہلِ عرب کو اُن کے اِن توہّمات کی غیر معقولیّت سمجھانے کی کوشش کی ہے، بعینہٖ اسی طریقے پر دُنیا کی اُن دُوسری قوموں کو بھی اُن کے توہّمات کی لغویّات پر متنبّہ کیا جا سکتا ہے جن کے اندر کھانے پینے کی چیزوں میں حُرمت وحِلّت کی غیر معقول پابندیاں اور چُھوت چھات

مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا
مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ
بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

کسی کھانے والے پر حرام ہو، الا یہ کہ وہ مُردار ہو، یا بہایا ہُوا خون ہو، یا سُور کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے، یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اَور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔[۱۲۱] پھر جو شخص مجبُوری کی حالت میں (کوئی چیز اِن میں سے کھالے) بغیر اس کے کہ وہ نافرمانی کا ارادہ رکھتا ہو اور بغیر اس کے کہ وہ حدِ ضرورت سے تجاوُز کرے، تو یقیناً تمھارا رب درگزر سے کام لینے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

کی قُیود پائی جاتی ہیں۔

۱۲۱ – یہ مضمون سُورۂ بقرہ آیت ۱۷۳ اور سورۂ مائدہ آیت ۳ میں گزر چکا ہے، اور آگے سُورۂ نحل آیت ۱۱۵ میں آنے والا ہے۔

سُورۂ بَقرہ کی آیت اور اس آیت میں بظاہر اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہاں محض ''خون'' کہا گیا ہے اور یہاں خون کے ساتھ مَسْفُوْح کی قید لگائی گئی ہے، یعنی ایسا خون جو کسی جانور کو زخمی کر کے یا ذبح کر کے نکالا گیا ہو۔ مگر دراصل یہ اختلاف نہیں بلکہ اُس حکم کی تشریح ہے۔ اِسی طرح سُورۂ مائدہ کی آیت میں ان چار چیزوں کے علاوہ چند اور چیزوں کی حُرمت کا بھی ذکر ملتا ہے، یعنی وہ جانور جو گلا گُھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گِر کر، یا ٹکّر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ لیکن فی الحقیقت یہ بھی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک تشریح ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو جانور اس طور پر ہلاک ہوئے ہوں، وہ بھی مُردار کی تعریف میں آتے ہیں۔

فقہائے اسلام میں سے ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حیوانی غذاؤں میں سے یہی چار چیزیں حرام ہیں اور ان کے سوا ہر چیز کا کھانا جائز ہے۔ یہی مسلک حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کا تھا۔ لیکن متعدّد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض چیزوں کے کھانے سے یا تو منع فرمایا ہے یا ان پر کراہت کا اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً پالتو گدھے، کُچلیوں والے درندے اور پنجوں والے پرندے۔ اس وجہ سے اکثر فقہا تحریم کو ان چار چیزوں تک محدُود نہیں مانتے بلکہ دُوسری چیزوں تک اسے وسیع قرار دیتے ہیں۔ مگر اس کے بعد پھر مختلف چیزوں کی حِلّت وحُرمت میں فقہا کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ مثلاً پالتو گدھے کو امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ حرام قرار دیتے ہیں، لیکن بعض دُوسرے فقہا کہتے ہیں کہ وہ حرام نہیں ہے بلکہ کسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اس کی ممانعت فرما دی تھی۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ
حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ
مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۡ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

اور جن لوگوں نے یہودیّت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے، اور گائے اور بکری کی چربی بھی، بجز اُس کے جو اُن کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا انھیں دی تھی[۱۲۲]، اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔

درندہ جانوروں اور شکاری پرندوں اور مُردار خور حیوانات کو حَنَفِیّہ مُطلقاً حرام قرار دیتے ہیں، مگر امام مالکؒ اور اَوزاعیؒ کے نزدیک شکاری پرندے حلال ہیں۔ لَیثؒ کے نزدیک بلّی حلال ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک صرف وہ درندے حرام ہیں جو انسان پر حملہ کرتے ہیں، جیسے شیر، بھیڑیا، چیتا وغیرہ۔ عِکرِمہ کے نزدیک کوّا اور بجو دونوں حلال ہیں۔ اسی طرح حَنَفِیّہ تمام حشرات الارض کو حرام قرار دیتے ہیں، مگر ابنِ ابی لیلیٰ، امام مالکؒ اور اوزاعیؒ کے نزدیک سانپ حلال ہے۔

ان تمام مختلف اقوال اور ان کے دلائل پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ دراصل شریعتِ الٰہی میں قطعی حُرمت اُن چار ہی چیزوں کی ہے جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ ان کے سوا دُوسری حیوانی غذاؤں میں مختلف درجوں کی کراہت ہے۔ جن چیزوں کی کراہت صحیح روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ حُرمت کے درجے سے قریب تر ہیں، اور جن چیزوں میں فقہا کے درمیان اختلاف ہُوا ہے ان کی کراہت مشکوک ہے۔ رہی طبعی کراہت جس کی بنا پر بعض اشخاص بعض چیزوں کو کھانا پسند نہیں کرتے، یا طبقاتی کراہت جس کی بنا پر انسانوں کے بعض طبقے بعض چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں، یا قومی کراہت جس کی بنا پر بعض قومیں بعض چیزوں سے نفرت کرتی ہیں، تو شریعتِ الٰہی کسی کو مجبور نہیں کرتی کہ وہ خواہ مخواہ ہر اس چیز کو ضرور ہی کھا جائے جو حرام نہیں کی گئی ہے۔ اور اسی طرح شریعت کسی کو یہ حق بھی نہیں دیتی کہ وہ اپنی کراہت کو قانون قرار دے اور ان لوگوں پر الزام عائد کرے جو ایسی غذائیں استعمال کرتے ہیں جنھیں وہ ناپسند کرتا ہے۔

۱۲۲ – یہ مضمون قرآنِ مجید میں تین مقامات پر بیان ہوا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: "کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعتِ محمدی میں حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں، البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنھیں تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے اُوپر حرام کر لیا تھا۔ ان سے کہو کہ لاؤ تورات اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچے ہو۔" (آیت ۹۳) پھر سُورۂ نساء میں فرمایا کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی بنا پر" ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں۔" (آیت ۱۶۰) اور یہاں ارشاد ہُوا ہے کہ ان کی سرکشیوں کی

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ
عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٤٧﴾ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ

اب اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو ان سے کہہ دو کہ تمھارے رب کا دامنِ رحمت وسیع ہے اور مجرموں سے اس کے عذاب کو پھیرا نہیں جا سکتا۔[۱۲۳]

یہ مشرک لوگ (تمھاری ان باتوں کے جواب میں) ضرور کہیں گے کہ ”اگر اللہ چاہتا

پاداش میں ہم نے ان پر تمام ناخن والے جانور حرام کیے اور بکری اور گائے کی چربی بھی ان کے لیے حرام ٹھیرا دی۔ اِن تینوں آیتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ محمّدی اور یہودی فقہ کے درمیان حیوانی غذاؤں کی حِلّت و حُرمت کے معاملے میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ دو وجوہ پر مبنی ہے:

ایک یہ کہ نُزولِ تورات سے صدیوں پہلے حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السّلام نے بعض چیزوں کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور ان کے بعد ان کی اولاد بھی ان چیزوں کی تارک رہی، حتّٰی کہ یہودی فقہا نے ان کو باقاعدہ حرام سمجھ لیا اور ان کی حُرمت تورات میں لکھ لی۔ اِن اشیا میں اُونٹ اور خرگوش اور سافان شامل ہیں۔ آج بائبل میں تورات کے جو اجزا ہم کو ملتے ہیں، اُن میں ان تینوں چیزوں کی حُرمت کا ذکر ہے۔ (اَحبار ۱۱: ۴-۶۔ اِستِثنا ۱۴: ۷) لیکن قرآنِ مجید میں یہودیوں کو جو چیلنج دیا گیا تھا کہ لاؤ تورات اور دکھاؤ یہ چیزیں کہاں حرام لکھی ہیں، اس سے معلوم ہُوا کہ تورات میں ان احکام کا اضافہ اس کے بعد کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر اس وقت تورات میں یہ احکام موجود ہوتے تو بنی اسرائیل فوراً لا کر پیش کر دیتے۔

دُوسرا فرق اس وجہ پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت سے جب یہودیوں نے بغاوت کی اور آپ اپنے شارع بن بیٹھے تو انھوں نے بہت سی پاک چیزوں کو اپنی مُوشگافیوں سے خود حرام کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر انھیں اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیا۔ ان اشیا میں ایک تو ناخن والے جانور شامل ہیں، یعنی شُتر مُرغ، قاز، بط وغیرہ۔ دُوسرے گائے اور بکری کی چربی۔ بائبل میں ان دونوں قسم کی حرمتوں کو احکامِ تورات میں داخل کر دیا گیا ہے۔ (اَحبار ۱۱: ۱۶-۱۸۔ اِستِثنا ۱۴: ۱۴-۱۵-۱۶۔ اَحبار ۳: ۱۷ و ۷: ۲۲-۲۳) لیکن سُورۂ نساء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں تورات میں حرام نہ تھیں بلکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد حرام ہوئی ہیں، اور تاریخ بھی شہادت دیتی ہے کہ موجودہ یہودی شریعت کی تدوین دُوسری صدی عیسوی کے آخر میں رَبّی یہوداہ کے ہاتھوں مکمل ہوئی ہے۔

رہا یہ سوال کہ پھر ان چیزوں کے متعلق یہاں اور سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے حَرَّمْنَا (ہم نے حرام کیا) کا لفظ کیوں استعمال کیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدائی تحریم کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ وہ کسی پیغمبر اور کتاب کے ذریعے سے کسی چیز کو حرام کرے۔ بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے باغی بندوں پر بناوٹی شارعوں اور جعلی قانون سازوں

مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ
الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ
عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا
تَخْرُصُوْنَ ۝۱۴۸ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ

تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔"[۱۲۴] ایسی ہی باتیں بنا بنا کر اِن سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا، یہاں تک کہ آخرِ کار ہمارے عذاب کا مزا انھوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو: "کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" پھر کہو: (تمھاری اس حجّت کے مقابلے میں) "حقیقت رس حُجّت تو اللہ کے پاس ہے، بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت

کو مسلّط کر دے اور وہ ان پر طیّبات کو حرام کر دیں۔ پہلی قسم کی تحریم خدا کی طرف سے رحمت کے طور پر ہوتی ہے اور یہ دُوسری قسم کی تحریم اس کی پھٹکار اور سزا کی حیثیت سے ہُوا کرتی ہے۔

۱۲۳ – یعنی اگر تم اب بھی اپنی نافرمانی کی روش سے باز آ جاؤ اور بندگی کے صحیح رَوِیّے کی طرف پلٹ آؤ تو اپنے رب کے دامنِ رحمت کو اپنے لیے کشادہ پاؤ گے۔ لیکن اگر اپنی اِسی مجرمانہ و باغیانہ روش پر اَڑے رہو گے تو خوب جان لو کہ اس کے غضب سے بھی پھر کوئی بچانے والا نہیں ہے۔

۱۲۴ – یعنی وہ اپنے جرم اور اپنی غلط کاری کے لیے وہی پُرانا عذر پیش کریں گے جو ہمیشہ سے مجرم اور غلط کار لوگ پیش کرتے رہے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے حق میں اللہ کی مشیّت یہی ہے کہ ہم شرک کریں اور جن چیزوں کو ہم نے حرام ٹھیرا رکھا ہے انھیں حرام ٹھیرائیں۔ ورنہ اگر خدا نہ چاہتا کہ ہم ایسا کریں تو کیوں کر ممکن تھا کہ یہ افعال ہم سے صادر ہوتے۔ پس چونکہ ہم اللہ کی مشیّت کے مطابق یہ سب کچھ کر رہے ہیں اس لیے دُرست کر رہے ہیں، اس کا الزام اگر ہے تو ہم پر نہیں، اللہ پر ہے۔ اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں ایسا ہی کرنے پر مجبُور ہیں، کہ اس کے سوا کچھ اور کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔

اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۴۹﴾ قُلۡ ہَلُمَّ شُہَدَآءَكُمُ الَّذِیۡنَ یَشۡہَدُوۡنَ اَنَّ
اللّٰہَ حَرَّمَ ہٰذَا ۚ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَلَا تَشۡہَدۡ مَعَہُمۡ ۚ وَ لَا

دے دیتا۔[۱۲۵]

ان سے کہو کہ ”لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے اِن چیزوں کو حرام کیا ہے“۔ پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا،[۱۲۶] اور ہرگز اُن لوگوں

۱۲۵ – یہ ان کے عذر کا مکمل جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے اس کا تجزیہ کر کے دیکھنا چاہیے:

پہلی بات یہ فرمائی کہ اپنی غلط کاری و گمراہی کے لیے مشیّتِ الٰہی کو معذرت کے طور پر پیش کرنا اور اسے بہانہ بنا کر صحیح رہنمائی کو قبول کرنے سے انکار کرنا مجرموں کا قدیم شیوہ رہا ہے، اور اس کا انجام یہ ہُوا ہے کہ آخر کار وہ تباہ ہوئے اور حق کے خلاف چلنے کا بُرا نتیجہ انھوں نے دیکھ لیا۔

پھر فرمایا کہ یہ عذر جو تم پیش کر رہے ہو، یہ دراصل علمِ حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض گمان اور تخمینہ ہے۔ تم نے محض مَشِیَّت کا لفظ کہیں سے سن لیا اور اس پر قیاسات کی ایک عمارت کھڑی کر لی۔ تم نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ انسان کے حق میں فی الواقع اللہ کی مَشِیّت کیا ہے۔ تم مشیت کے معنٰی یہ سمجھ رہے ہو کہ چور اگر مشیّتِ الٰہی کے تحت چوری کر رہا ہے تو وہ مجرم نہیں ہے، کیونکہ اس نے یہ فعل خدا کی مشیت کے تحت کیا ہے۔ حالانکہ دراصل انسان کے حق میں خدا کی مشیّت یہ ہے کہ وہ شُکر اور کفر، ہدایت اور ضلالت، طاعت اور معصیت میں سے جو راہ بھی اپنے لیے منتخب کرے گا، خدا وہی راہ اس کے لیے کھول دے گا، اور پھر غلط یا صحیح، جو کام بھی انسان کرنا چاہے گا، خدا اپنی عالمگیر مَصلَحتوں کا لحاظ کرتے ہوئے جس حد تک مناسب سمجھے گا اسے اس کام کا اذن اور اس کی توفیق بخش دے گا۔ لہٰذا اگر تم نے اور تمھارے باپ دادا نے مشیّتِ الٰہی کے تحت شرک اور تحریم طیّبات کی توفیق پائی تو اس کے یہ معنٰی ہرگز نہیں ہیں کہ تم لوگ اپنے اِن اعمال کے ذمّہ دار اور جواب دہ نہیں ہو۔ اپنے غلط انتخابِ راہ اور اپنے غلط ارادے اور سعی کے ذمہ دار تو تم خود ہی ہو۔

آخر میں ایک ہی فقرے کے اندر کانٹے کی بات بھی فرما دی کہ قُلْ فَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَہَدٰىكُمْ اَجْمَعِیْنَ – یعنی تم اپنی معذرت میں یہ حُجّت پیش کرتے ہو کہ ”اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے“، اس سے پُوری بات ادا نہیں ہوتی۔ پوری بات کہنا چاہتے ہو تو یوں کہو کہ ”اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا“۔ بالفاظِ دیگر، تم خود اپنے انتخاب سے راہِ راست اختیار کرنے پر تیار نہیں ہو، بلکہ یہ چاہتے ہو کہ خدا نے جس طرح فرشتوں کو پیدایشی راست رَو بنایا ہے اس طرح تمھیں بھی بنا دے۔ تو بے شک اگر اللہ کی مشیّت انسان کے حق میں یہ ہوتی تو وہ ضرور ایسا کر سکتا تھا، لیکن یہ اس کی مشیّت

تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَ الَّذِيۡنَ لَا
يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ وَهُمۡ بِرَبِّهِمۡ يَعۡدِلُوۡنَ ۝١٥٠ ع قُلۡ تَعَالَوۡا
اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔـا

کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے، اور جو آخرت کے منکر ہیں، اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔ ع

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں سُناؤں تمھارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں:[۱۲۷]

(۱) یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو،[۱۲۸]

نہیں ہے، لہٰذا جس گمراہی کو تم نے اپنے لیے خود پسند کیا ہے اللہ بھی تمھیں اسی میں پڑا رہنے دے گا۔

۱۲۶ – یعنی اگر وہ شہادت کی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ شہادت اُسی بات کی دینی چاہیے جس کا آدمی کو علم ہو، تو وہ کبھی یہ شہادت دینے کی جُرأت نہ کریں گے کہ کھانے پینے پر یہ قیود، جو ان کے ہاں رسم کے طور پر رائج ہیں، اور یہ پابندیاں کہ فلاں چیز کو فلاں نہ کھائے اور فلاں چیز کو فلاں کا ہاتھ نہ لگے، یہ سب خدا کی مقرر کردہ ہیں۔ لیکن اگر یہ لوگ شہادت کی ذمہ داری کو محسُوس کیے بغیر اتنی ڈھٹائی پر اُتر آئیں کہ خدا کا نام لے کر جھوٹی شہادت دینے میں بھی تأمّل نہ کریں، تو ان کے اس جھُوٹ میں تم ان کے ساتھی نہ بنو۔ کیونکہ اُن سے یہ شہادت اس لیے طلب نہیں کی جا رہی ہے کہ اگر یہ شہادت دے دیں تو تم ان کی بات مان لوگے، بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ ان میں سے جن لوگوں کے اندر کچھ بھی راست بازی موجود ہے، ان سے جب کہا جائے گا کہ کیا واقعی تم سچّائی کے ساتھ اس بات کی شہادت دے سکتے ہو کہ یہ ضوابط خدا ہی کے مقرر کیے ہوئے ہیں تو وہ اپنی رسموں کی حقیقت پر غور کریں گے، اور جب ان کے مِن جانبِ اللہ ہونے کا کوئی ثبوت نہ پائیں گے تو ان فضول رسموں کی پابندی سے باز آ جائیں گے۔

۱۲۷ – یعنی تمھارے رب کی عائد کی ہوئی پابندیاں وہ نہیں ہیں جن میں تم گرفتار ہو، بلکہ اصل پابندیاں یہ ہیں جو اللہ نے انسانی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے عائد کی ہیں اور جو ہمیشہ سے شرائعِ الٰہیہ کی اصل الاُصُول رہی ہیں۔ (تقابُل کے لیے مُلاحَظہ ہو: بائبل کی کتابِ خُروج، باب ۲۰)

۱۲۸ – یعنی نہ خدا کی ذات میں کسی کو اس کا شریک ٹھیراؤ، نہ اس کی صفات میں، نہ اس کے اختیارات میں، اور نہ اس کے حُقوق میں۔

وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ۚ وَ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَ اِیَّاہُمۡ ۚ وَ لَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَہَرَ مِنۡہَا وَ مَا بَطَنَ ۚ

(۲) اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو،[۱۲۹]

(۳) اور اپنی اولاد کو مُفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔

(۴) اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ[۱۳۰]، خواہ وہ کُھلی ہوں یا چُھپی۔

ذات میں شرک یہ ہے کہ جَوہرِ اُلُوہیّت میں کسی کو حصّہ دار قرار دیا جائے۔ مثلاً نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث، مشرکینِ عرب کا فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا، اور دوسرے مشرکین کا اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اور اپنے شاہی خاندانوں کو جنسِ آلہہ کے افراد قرار دینا۔ یہ سب شرک فی الذّات ہیں۔

صفات میں شرک یہ ہے کہ خدائی صفات، جیسی کہ وہ خدا کے لیے ہیں، ویسا ہی اُن کو یا اُن میں سے کسی صفت کو کسی دُوسرے کے لیے قرار دینا۔ مثلاً کسی کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس پر غیب کی ساری حقیقتیں روشن ہیں، یا وہ سب کچھ سُنتا اور دیکھتا ہے، یا وہ تمام نقائص اور تمام کمزوریوں سے مُنزّہ اور بالکل بے خطا ہے۔

اختیارات میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے جو اختیارات صرف اللہ کے لیے خاص ہیں، اُن کو یا ان میں سے کسی کو اللہ کے سوا کسی اور کے لیے تسلیم کیا جائے۔ مثلاً فوق الفطری طریقے سے نفع وضرر پہنچانا، حاجت روائی و دستگیری کرنا، محافظت و نگہبانی کرنا، دُعائیں سننا اور قسمتوں کو بنانا اور بگاڑنا۔ نیز حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حُدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لیے قانون و شرع تجویز کرنا۔ یہ سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لیے تسلیم کرنا شرک ہے۔

حقوق میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر خدا کے جو مخصوص حقوق ہیں، وہ یا ان میں سے کوئی حق خدا کے سوا کسی اور کے لیے مانا جائے۔ مثلاً رُکوع و سُجود، دست بستہ قیام، سلامی و آستانہ بوسی، شُکرِ نعمت یا اعترافِ برتری کے لیے نذر و نیاز اور قربانی، قضائے حاجات اور رفعِ مشکلات کے لیے منّت، مصائب و مشکلات میں مدد کے لیے پکارا جانا، اور ایسی ہی پرستش و تعظیم و تمجید کی دُوسری تمام صُورتیں اللہ کے مخصُوص حقوق میں سے ہیں۔ اسی طرح ایسا محبُوب ہونا کہ اس کی محبّت پر دوسری سب محبّتیں قربان کی جائیں، اور ایسا مستحقِ تقویٰ وخشیّت ہونا کہ غیب وشہادت میں اس کی ناراضی اور اس کے حکم کی خلاف ورزی سے ڈرا جائے، یہ بھی صرف اللہ کا حق ہے۔ اور یہ بھی اللہ ہی کا حق ہے کہ اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے، اور اس کی ہدایت کو صحیح و غلط کا معیار مانا جائے، اور کسی ایسی اطاعت کا حلقہ

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ
وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ
الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ

(۵) اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ[۱۳۱]۔
یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بُوجھ سے کام لو۔
(۶) اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو،[۱۳۲]
یہاں تک کہ وہ اپنے سنِّ رُشد کو پہنچ جائے،

اپنی گردن میں نہ ڈالا جائے جو اللہ کی اطاعت سے آزاد ایک مستقل اطاعت ہو اور جس کے حکم کے لیے اللہ کے حکم کی سند نہ ہو۔ اِن حُقوق میں سے جو حق بھی دُوسرے کو دیا جائے گا، وہ اللہ کا شریک ٹھیرے گا، خواہ اس کو خدائی ناموں میں سے کوئی نام دیا جائے یا نہ دیا جائے۔

۱۲۹ – نیک سلوک میں ادب، تعظیم، اطاعت، رضاجوئی، خدمت، سب داخل ہیں۔ والدین کے اِس حق کو قرآن میں ہر جگہ توحید کے حکم کے بعد بیان فرمایا گیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کے بعد بندوں کے حقوق میں سب سے مقدّم حق انسان پر اس کے والدین کا ہے۔

۱۳۰ – اصل میں لفظ ’’فَوَاحِشَ‘‘ استعمال ہُوا ہے، جس کا اطلاق اُن تمام افعال پر ہوتا ہے جن کی بُرائی بالکل واضح ہے۔ قرآن میں زنا، عملِ قومِ لوط، برہنگی، جھوٹی تہمت، اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنے کو فُحش افعال میں شمار کیا گیا ہے۔ حدیث میں چوری اور شراب نوشی اور بھیک مانگنے کو مِن جملۂ فواحش کہا گیا ہے۔ اِسی طرح دُوسرے تمام شرمناک افعال بھی فواحش میں داخل ہیں اور ارشادِ الٰہی یہ ہے کہ اس قسم کے افعال نہ عَلانِیَہ کیے جائیں نہ چُھپ کر۔

۱۳۱ – یعنی انسانی جان، جو فی الاصل خدا کی طرف سے حرام ٹھیرائی گئی ہے، ہلاک نہ کی جائے مگر حق کے ساتھ۔ اب رہا یہ سوال کہ ’’حق کے ساتھ‘‘ کا کیا مفہُوم ہے، تو اس کی تین صُورتیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں، اور دو صُورتیں اس پر زائد، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔ قرآن کی بیان کردہ صُورتیں یہ ہیں:

(۱) انسان کسی دُوسرے انسان کے قتلِ عمد کا مجرم ہو اور اس پر قِصاص کا حق قائم ہو گیا ہو۔

(۲) دینِ حق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو اور اس سے جنگ کیے بغیر چارہ نہ رہا ہو۔

(۳) دار الاسلام کے حُدود میں بدامنی پھیلائے یا اسلامی نظامِ حکومت کو اُلٹنے کی سعی کرے۔

وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ
وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ

---

(۷) اور ناپ تول میں پُورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمّہ داری کا اُتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے،[۱۳۳]

(۸) اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو،

(۹) اور اللہ کے عہد کو پُورا کرو۔[۱۳۴]

باقی دوصورتیں جو حدیث میں ارشاد ہوئی ہیں، یہ ہیں:

(۴) شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے۔

(۵) ارتداد اور خُروج از جماعت کا مرتکب ہو۔

اِن پانچ صُورتوں کے سوا کسی صُورت میں انسان کا قتل انسان کے لیے حلال نہیں ہے، خواہ وہ مومن ہو یا ذمّی یا عام کافر۔

۱۳۲ – یعنی ایسا طریقہ جو زیادہ سے زیادہ بے غرضی، نیک نیتی اور یتیم کی خیر خواہی پر مبنی ہو، اور جس پر خدا اور خلق کسی کی طرف سے بھی تم اعتراض کے مستحق نہ ہو۔

۱۳۳ – یہ اگرچہ شریعتِ الٰہی کا ایک مستقل اُصُول ہے، لیکن یہاں اس کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اپنی حد تک ناپ تول اور لین دین کے معاملات میں راستی و انصاف سے کام لینے کی کوشش کرے، وہ اپنی ذمّہ داری سے سبکدوش ہو جائے گا۔ بھُول چُوک یا نادانستہ کمی وبیشی ہو جانے پر اس سے باز پُرس نہ ہو گی۔

۱۳۴ – ”اللہ کے عہد“ سے مراد وہ عہد بھی ہے جو انسان اپنے خدا سے کرے، اور وہ بھی جو خدا کا نام لے کر بندوں سے کرے، اور وہ بھی جو انسان اور خدا، اور انسان اور انسان کے درمیان اُسی وقت آپ سے آپ بندھ جاتا ہے جس وقت ایک شخص خدا کی زمین میں ایک انسانی سوسائٹی کے اندر پیدا ہوتا ہے۔

پہلے دونوں عہد شُعوری و ارادی ہیں، اور یہ تیسرا عہد ایک فطری عہد (natural contract) ہے، جس کے باندھنے میں اگرچہ انسان کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے، لیکن واجب الاحترام ہونے میں یہ پہلے دونوں عہدوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ کسی شخص کا خدا کے بخشے ہوئے وجود سے، اس کی عطا کی ہوئی جسمانی ونفسانی قوتوں سے، اس کے دیے ہوئے جسمانی آلات سے، اور اس کی پیدا کی ہوئی زمین اور رزق اور ذرائع سے فائدہ اُٹھانا، اور اُن مواقعِ زندگی سے مُتمتّع ہونا جو قوانینِ قدرت کی بدولت فراہم ہوتے ہیں، خود بخود فطرتاً خدا کے کچھ حقوق اس پر عائد کر دیتا ہے۔ اور

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ
مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ
عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔

(۱۰) نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اِسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اُس کے راستے سے ہٹا کر تمھیں پراگندہ کر دیں[۱۳۵] گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمھارے رب نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔

اِسی طرح آدمی کا ایک ماں کے پیٹ میں اس کے خون سے پرورش پانا، ایک باپ کی محنتوں سے بسے ہوئے گھر میں پیدا ہونا، اور ایک اجتماعی زندگی کے بے شمار مختلف اداروں سے مختلف صُورتوں میں متمتع ہونا، علیٰ قدرِ مراتب اس کے ذمّے بہت سے افراد اور اجتماعی اداروں کے حقوق بھی عائد کر دیتا ہے۔ انسان کا خدا سے اور انسان کا سوسائٹی سے یہ عہد کسی کاغذ پر نہیں لکھا گیا، مگر اس کے رونگٹے رونگٹے پر ثبت ہے۔ انسان نے اسے شُعُور و ارادہ کے ساتھ نہیں باندھا، مگر اس کا پورا وجود اسی عہد کا رہینِ مِنّت ہے۔ اسی عہد کی طرف سُورۂ بَقَرہ آیت ۲۷ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فاسق وہ ہیں جو ”اللہ کے عہد کو اس کی اُستواری کے بعد توڑتے ہیں، اور جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔“ اور اسی کا ذکر آگے چل کر سُورۂ اعراف آیت ۱۷۲ میں آتا ہے کہ اللہ نے اَزَل میں آدمؑ کی پیٹھوں سے ان کی ذرّیّت کو نکال کر ان سے شہادت طلب کی تھی کہ کیا مَیں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اور انھوں نے اقرار کیا تھا کہ ہاں، ہم گواہ ہیں۔

۱۳۵ – اُوپر جس فطری عہد کا ذکر ہُوا، یہ اس عہد کا لازمی اقتضا ہے کہ انسان اپنے رب کے بتائے ہوئے راستے پر چلے، کیونکہ اس کے امر کی پیروی سے منہ موڑنا اور خودسری و خودمختاری یا بندگیِ غیر کی جانب قدم بڑھانا انسان کی طرف سے اُس عہد کی اوّلین خلاف ورزی ہے جس کے بعد ہر قدم پر اس کی دفعات ٹوٹتی چلی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اس نہایت نازک، نہایت وسیع اور نہایت پیچیدہ عہد کی ذمّہ داریوں سے انسان ہرگز عہدہ برآ نہیں ہوسکتا جب تک وہ خدا کی رہنمائی کو قبول کر کے اس کے بتائے ہوئے راستے پر زندگی بسر نہ کرے۔ اس کو قبول نہ کرنے کے دو زبردست نقصان ہیں: ایک یہ کہ ہر دُوسرے راستے کی پیروی لازماً انسان کو اس راہ سے ہٹا دیتی ہے جو خدا کے قُرب اور اس کی رضا تک پہنچنے کی ایک ہی راہ ہے۔ دُوسرے یہ کہ اس راہ سے ہٹتے ہی بے شمار پگڈنڈیاں سامنے آجاتی ہیں

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَ
تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ
يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٥٤﴾ ع وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ ع ۱۹
اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٥٥﴾ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ
الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ
لَغٰفِلِيْنَ ﴿١٥٦﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ

پھر ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی تھی جو بھلائی کی روش اختیار کرنے والے انسان پر نعمت کی تکمیل اور ہر ضروری چیز کی تفصیل اور سراسر ہدایت و رحمت تھی (اور اس لیے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی کہ) شاید لوگ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں[۱۳۶]ع اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے، ایک برکت والی کتاب۔ پس تم اِس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو، بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی[۱۳۷]، اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اور اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم

جن میں بھٹک کر پُوری نوعِ انسانی پراگندہ ہو جاتی ہے، اور اس پراگندگی کے ساتھ ہی اس کے بُلوغ و ارتقا کا خواب بھی پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔ انھی دونوں نقصانات کو اس فقرے میں بیان کیا گیا ہے کہ ’’دُوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے ہٹا کر پراگندہ کر دیں گے۔‘‘ (مُلاحظہ ہو: سُورۂ مائدہ، حاشیہ ۳۵)

۱۳۶ – رب کی ملاقات پر ایمان لانے سے مراد اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دِہ سمجھنا اور ذمّہ دارانہ زندگی بسر کرنا ہے۔ یہاں اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خود بنی اسرائیل میں اس کتاب کی حکیمانہ تعلیمات سے ذمّہ داری کا احساس بیدار ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ عام لوگ اس اعلیٰ درجے کے نظامِ زندگی کا مطالعہ کر کے اور نیکوکار انسانوں میں اس نعمتِ ہدایت اور اس رحمت کے اثرات دیکھ کر یہ محسُوس کر لیں کہ انکارِ آخرت کی غیر ذمّہ دارانہ زندگی کے مقابلے میں وہ زندگی ہر اعتبار سے بہتر ہے جو اقرارِ آخرت کی بنیاد پر ذمّہ دارانہ طریقے سے بسر کی جاتی ہے، اور اس طرح یہ مُشاہدہ و مُطالعہ انھیں انکار سے ایمان کی طرف کھینچ لائے۔

اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ
رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ
سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا
كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ
اَوْ يَاْتِىَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِىَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِىْ بَعْضُ
اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ
اَوْ كَسَبَتْ فِىْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

ان سے زیادہ راست رَو ثابت ہوتے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک دلیلِ روشن اور ہدایت اور رحمت آگئی ہے، اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔[۱۳۸] جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انھیں اس رُوگردانی کی پاداش میں ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔ کیا اب لوگ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے سامنے فرشتے آ کھڑے ہوں، یا تمھارا رب خود آ جائے، یا تمھارے رب کی بعض صریح نشانیاں[۱۳۹] نمودار ہو جائیں؟ جس روز تمھارے رب کی بعض مخصوص نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو، یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔[۱۴۰] اے محمدؐ! ان سے کہہ دو کہ اچھا، تم انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔

---

۱۳۷ – یعنی یہود و نصاریٰ کو۔

۱۳۸ – اللہ کی آیات سے مراد اس کے وہ ارشادات بھی ہیں جو قرآن کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے، اور وہ نشانیاں بھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگی میں نمایاں نظر آ رہی تھیں، اور وہ آثارِ کائنات بھی جنھیں قرآن اپنی دعوت کی تائید میں شہادت کے طور پر پیش کر رہا تھا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ
شَيْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾
مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے، یقیناً ان سے تمھارا کچھ واسطہ نہیں[۱۴۱]، ان کا معاملہ تو اللہ کے سُپرد ہے، وہی ان کو بتائے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے دس۱ گنا اجر ہے، اور جو بدی لے کر آئے گا

۱۳۹ – یعنی آثارِ قیامت، یا عذاب، یا کوئی اور ایسی نشانی جو حقیقت کی بالکل پردہ کُشائی کر دینے والی ہو اور جس کے ظاہر ہو جانے کے بعد امتحان و آزمایش کا کوئی سوال باقی نہ رہے۔

۱۴۰ – یعنی ایسی نشانیوں کو دیکھ لینے کے بعد اگر کوئی کافر اپنے کفر سے توبہ کر کے ایمان لے آئے تو اس کا ایمان لانا بے معنیٰ ہے، اور اگر کوئی نافرمان مومن اپنی نافرمانی کی رَوِش چھوڑ کر اطاعت کیش بن جائے تو اس کی اطاعت بھی بے معنیٰ، اس لیے کہ ایمان اور اطاعت کی قدر تو اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردے میں ہے، مُہلت کی رسّی دراز نظر آ رہی ہے، اور دنیا اپنی ساری متاعِ غرور کے ساتھ یہ دھوکا دینے کے لیے موجود ہے کہ کیسا خدا اور کہاں کی آخرت، بس کھاؤ پیو اور مزے کرو۔

۱۴۱ – خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اور آپؐ کے واسطے سے دینِ حق کے تمام پیرو اس کے مُخاطَب ہیں۔ ارشاد کا مدّعا یہ ہے کہ اصل دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ ایک خدا کو الٰہ اور رب مانا جائے۔ اللہ کی ذات، صفات، اختیارات اور حُقوق میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اللہ کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتے ہوئے آخرت پر ایمان لایا جائے، اور ان وسیع اُصول و کُلّیات کے مطابق زندگی بسر کی جائے جن کی تعلیم اللہ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعے سے دی ہے۔ یہی دین تمام انسانوں کو اوّل یومِ پیدایش سے دیا گیا تھا۔ بعد میں جتنے مختلف مذاہب بنے، وہ سب کے سب اس طرح بنے کہ مختلف زمانوں کے لوگوں نے اپنے ذہن کی غلط اُپج سے، یا خواہشاتِ نفس کے غلبے سے، یا عقیدت کے غُلُو سے اس دین کو بدلا اور اس میں نئی نئی باتیں ملائیں۔ اس کے عقائد میں اپنے اَوہام و قیاسات اور فلسفوں سے کمی وبیشی اور ترمیم و تحریف کی۔ اس کے احکام میں بدعات کے اضافے کیے۔ خودساختہ قوانین بنائے۔ جُزئیات میں مُوشگافیاں کیں۔ فُروعی اختلافات میں مبالغہ کیا۔ اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنایا۔ اس کے لانے والے انبیا اور اس کے عَلَم بردار بزرگوں میں سے کسی کی عقیدت میں غُلُو کیا اور کسی کو بُغض و مخالفت کا نشانہ بنایا۔ اس طرح بے شمار مذاہب اور فرقے بنتے چلے گئے اور ہر مذہب و فرقہ کی پیدایش نوعِ انسانی کو مُتخاصم گروہوں میں تقسیم کرتی

فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ قُلْ اِنَّنِيْ
هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ
حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ
نُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ
لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ

اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قُصور کیا ہے، اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

اے محمدؐ! کہو: میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، ابراہیمؑ کا طریقہ[۱۴۲] جسے یکسُو ہو کر اُس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو: میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیّت[۱۴۳]، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو: کیا میں اللہ کے سوا

چلی گئی۔ اب جو شخص بھی اصل دینِ حق کا پَیرو ہو، اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ان ساری گروہ بندیوں سے الگ ہو جائے اور ان سب سے اپنا راستہ جدا کر لے۔

۱۴۲ – ”ابراہیمؑ کا طریقہ“، یہ اس راستے کی نشان دہی کے لیے مزید ایک تعریف ہے۔ اگرچہ اس کو موسیٰؑ کا طریقہ یا عیسیٰؑ کا طریقہ بھی کہا جا سکتا تھا، مگر حضرت موسیٰؑ کی طرف دنیا نے یہودیت کو اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف مسیحیّت کو منسُوب کر رکھا ہے، اس لیے ”ابراہیمؑ کا طریقہ“ فرمایا۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہُودی اور عیسائی، دونوں گروہ برحق تسلیم کرتے ہیں، اور دونوں یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ یہُودیت اور عیسائیّت کی پیدائش سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔ نیز مشرکینِ عرب بھی ان کو راست رَو مانتے تھے اور اپنی جہالت کے باوجود کم از کم اتنی بات انھیں بھی تسلیم تھی کہ کعبہ کی بنا رکھنے والا پاکیزہ انسان خالص خدا پرست تھا نہ کہ بُت پرست۔

۱۴۳ – اصل میں لفظ ”نُسُکْ“ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی قربانی کے بھی ہیں اور اس کا اطلاق عُمومیّت کے ساتھ بندگی و پرستش کی دُوسری تمام صُورتوں پر بھی ہوتا ہے۔

اَبۡغِیۡ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیۡءٍ ؕ وَلَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا
عَلَيۡهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ
مَّرۡجِعُكُمۡ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾ وَهُوَ الَّذِىۡ
جَعَلَكُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ وَرَفَعَ بَعۡضَكُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ
دَرَجٰتٍ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِىۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيۡعُ الۡعِقَابِ ۖ

کوئی اور رب تلاش کروں حالاں کہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟[144] ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمّہ دار وہ خود ہے، کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھاتا،[145] پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، اُس وقت وہ تمھارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے، تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے۔[146] بے شک تمھارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے

۱۴۴ – یعنی کائنات کی ساری چیزوں کا رب تو اللہ ہے، میرا رب کوئی اور کیسے ہوسکتا ہے؟ کس طرح یہ بات معقول ہوسکتی ہے کہ ساری کائنات تو اللہ کی اطاعت کے نظام پر چل رہی ہو، اور کائنات کا ایک جُز ہونے کی حیثیت سے میرا اپنا وجود بھی اُسی نظام پر عامل ہو، مگر مَیں اپنی شُعوری و اختیاری زندگی کے لیے کوئی اور رب تلاش کروں؟ کیا پُوری کائنات کے خلاف مَیں اکیلا ایک دُوسرے رُخ پر چل پڑوں؟

۱۴۵ – یعنی ہر شخص خود ہی اپنے عمل کا ذمّہ دار ہے، ایک کے عمل کی ذمّہ داری دوسرے پر نہیں ہے۔

۱۴۶ – اس فقرے میں تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں:

ایک یہ کہ تمام انسان زمین میں خدا کے خلیفہ ہیں، اس معنٰی میں کہ خدا نے اپنی مملوکات میں سے بہت سی چیزیں ان کی امانت میں دی ہیں اور ان پر تصرُّف کے اختیارات بخشے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان خلیفوں میں مراتب کا فرق بھی خدا ہی نے رکھا ہے، کسی کی امانت کا دائرہ وسیع ہے اور کسی کا محدُود، کسی کو زیادہ چیزوں پر تصرُّف کے اختیارات دیے ہیں اور کسی کو کم چیزوں پر، کسی کو زیادہ قوتِ کارکردگی دی ہے اور کسی کو کم، اور بعض انسان بھی بعض انسانوں کی امانت میں ہیں۔

تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ دراصل امتحان کا سامان ہے، پوری زندگی ایک امتحان گاہ ہے، اور جس کو جو کچھ بھی

وَ إِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۶۵﴾ ع

اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔ ع

خدا نے دیا ہے، اسی میں اس کا امتحان ہے کہ اس نے کس طرح خدا کی امانت میں تصرُّف کیا، کہاں تک امانت کی ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا، اور کس حد تک اپنی قابلیّت یا نا قابلیّت کا ثبوت دیا۔ اسی امتحان کے نتیجے پر زندگی کے دُوسرے مرحلے میں انسان کے درجے کا تعیُّن منحصر ہے۔

فہرست موضوعات

(۱۰) آخرت

(۱۱) اخلاق، اخلاقی تعلیمات

(۱۲) آدم علیہ السلام

(۱۳) اذان

(۱۴) اُر

(۱۵) ارتداد

(۱۶) ازدواجی زندگی

(۱۷) ازلام (جوا)

— دیکھو ''جوا''

(۱۸) آزمائش

(۱۹) اسبابِ ضلالت

(۲۰) اسحاق علیہ السلام

(۲۱) اسلام

(٢٢) اسلام کی سیاسی تعلیمات

(۲۳) اسلام کی معاشرتی تعلیمات

(۲۴) اسلام کی معاشی تعلیمات

(۲۵) اسلامی ریاست

(۳۶) اضطرار

(۳۷) اعتکاف

(۳۸) اقامت دین

(۵۰) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

(۵۱) انبیائے کرام

(۵۲) انجیل

(۵۴) انسان

(۵۴) انصاف

(۵۵) انعام الٰہی

(۵۶) انفاق فی سبیل اللہ

(۵۷) اولی الامر

(۵۸) اوہام جاہلیت

(۵۹) اہل کتاب

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''عیسائی'' اور ''یہودی'')

(۶۰) ایام تشریق (حج)

(۶۱) آیت

ب

(۶۵) باطل

(۶۶) بخل

(۶۷) بائبل

(۶۸) بدر غزوہ (جنگ)

(۶۹) برکت

(۷۰) بسم اللہ

(۷۱) بنی اسرائیل

(۷۲) بین الاقوامی قانون

پ

(۷۳) پرہیزگار

(۷۴) پاک

(۷۵) تحریک اسلامی

ت

(۷۶) تابوت سکینہ

(۷۷) تاریخ

(۷۸) تحویل قبلہ

(۷۹) تزکیہ

(۹۸) جبت

(۹۹) حضرت جبریل علیہ السلام

(۱۰۰) جزا و سزا

(۱۰۱) جلاوطنی

(۱۰۲) جن

(۱۰۳) جنت

(۱۰۶) جہنم

چ

(۱۰۷) چاند

(۱۲۱) حلال وحرام

(۱۴۰) دنیا

(۱۴۱) دوزخ

ش

(۱۷۶) شراب

(۱۷۷) شرک

ص

(۱۸۶) صالحین

(۱۸۷) صبر

(۱۸۸) صِبْغَةَ اللّٰهِ

(۱۸۹) صحابہ کرامؓ

(۱۹۰) صدقہ

(دیکھو ''انفاق فی سبیل اللہ'')

(۱۹۱) صراطِ مستقیم

(۱۹۵) ضلالت

(۲۰۵) عدت

(۲۰۳) عدالت

(۲۰۴) عدل

(۲۰۵) عذابِ الٰہی

(۲۰۹) عکرمہ (بن ابی جہل)

(۲۱۰) عقل وفکر اور علم

(۲۱۱) علمائے کرام

(۲۱۸) عیسائی

(۲۱۹) عیسائیت

غ

(۲۲۱) غرور

(۲۲۲) غلامی

(۲۲۳) غیب

ف

(۲۲۴) فاتحہ

(۲۲۵) فاسق

(۲۲۶) فتنہ

(۲۲۷) فرشتے

قانون شہادت

عدالت و قضا

قتل انسان اور قتل اولاد

قرض و رہن

وراثت

وصیت

(۲۳۷) قانونِ مکافاتِ عمل

(۲۳۸) قبلہ

(۲۳۹) قتل، قتل اولاد، قتل انسانی

(۲۴۰) قتال فی سبیل اللہ

(۲۴۷) قرآنی قصے

(۲۴۸) قربانی

(۲۴۹) قرض

(۲۵۹) کفر، کافر

(۲۶۰) کائنات

(۲۶۱) کبائر

(۲۶۲) کتاب، کتب آسمانی

(۲۸۰) مدینہ منورہ

(۲۸۱) مذاہب

(۲۹۲) مشیت الٰہی

(۲۹۳) مصیبت

(۲۹۴) معاشی قانون و تعلیمات

(۳۰۱) منکر

(۳۰۲) منکرین حدیث

(۳۰۳) من وسلویٰ

(۳۰۴) موت

(۳۰۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام

(۳۰۶) مہر

(۳۰۷) میثاق

(مکمل تفصیل کے لیے دیکھو ’عہد‘)

(۳۰۸) میدان حشر

ن

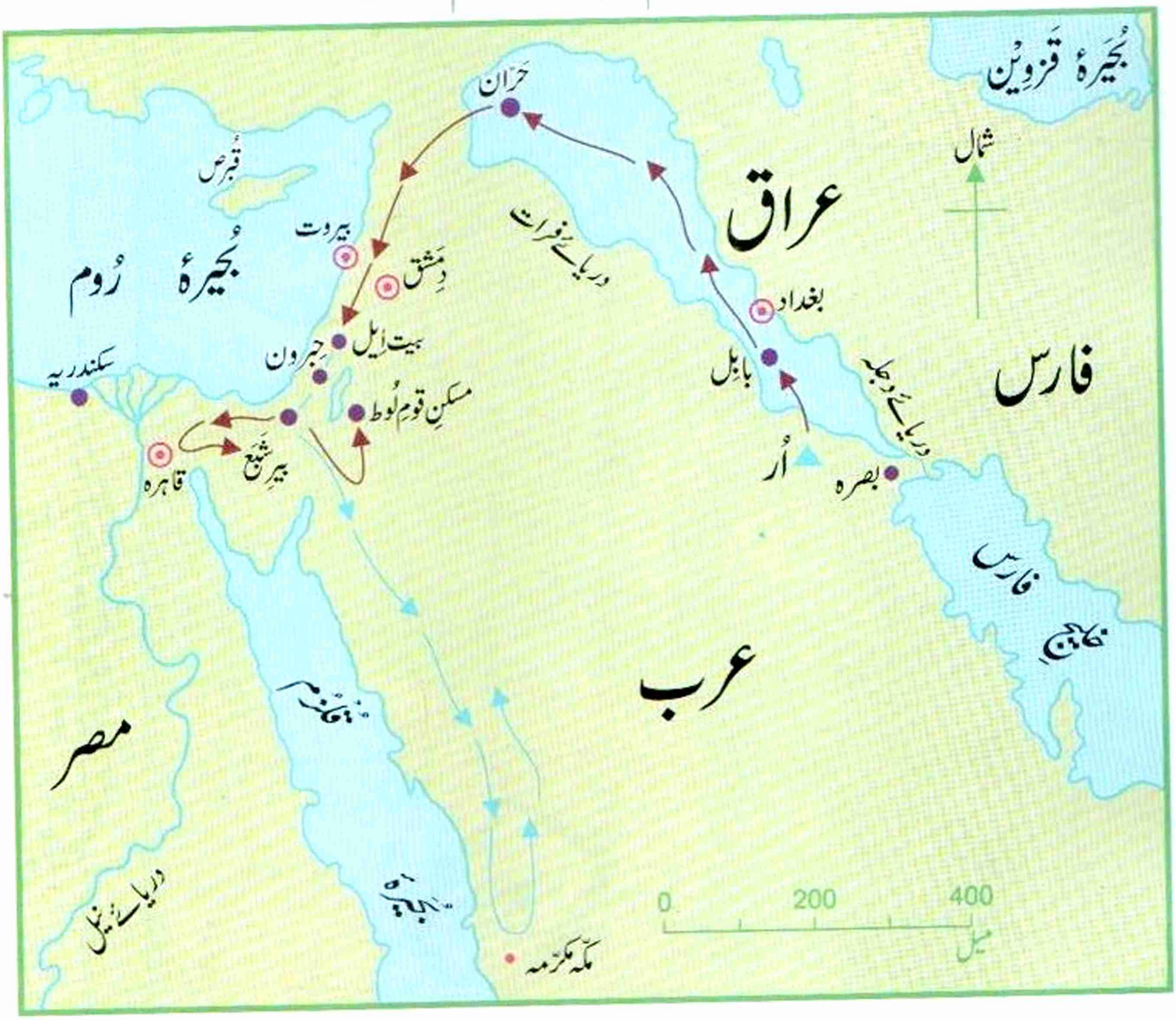
(۳۰۹) ناپ تول

(۳۱۰) نامۂ اعمال

(۳۱۱) نبوت

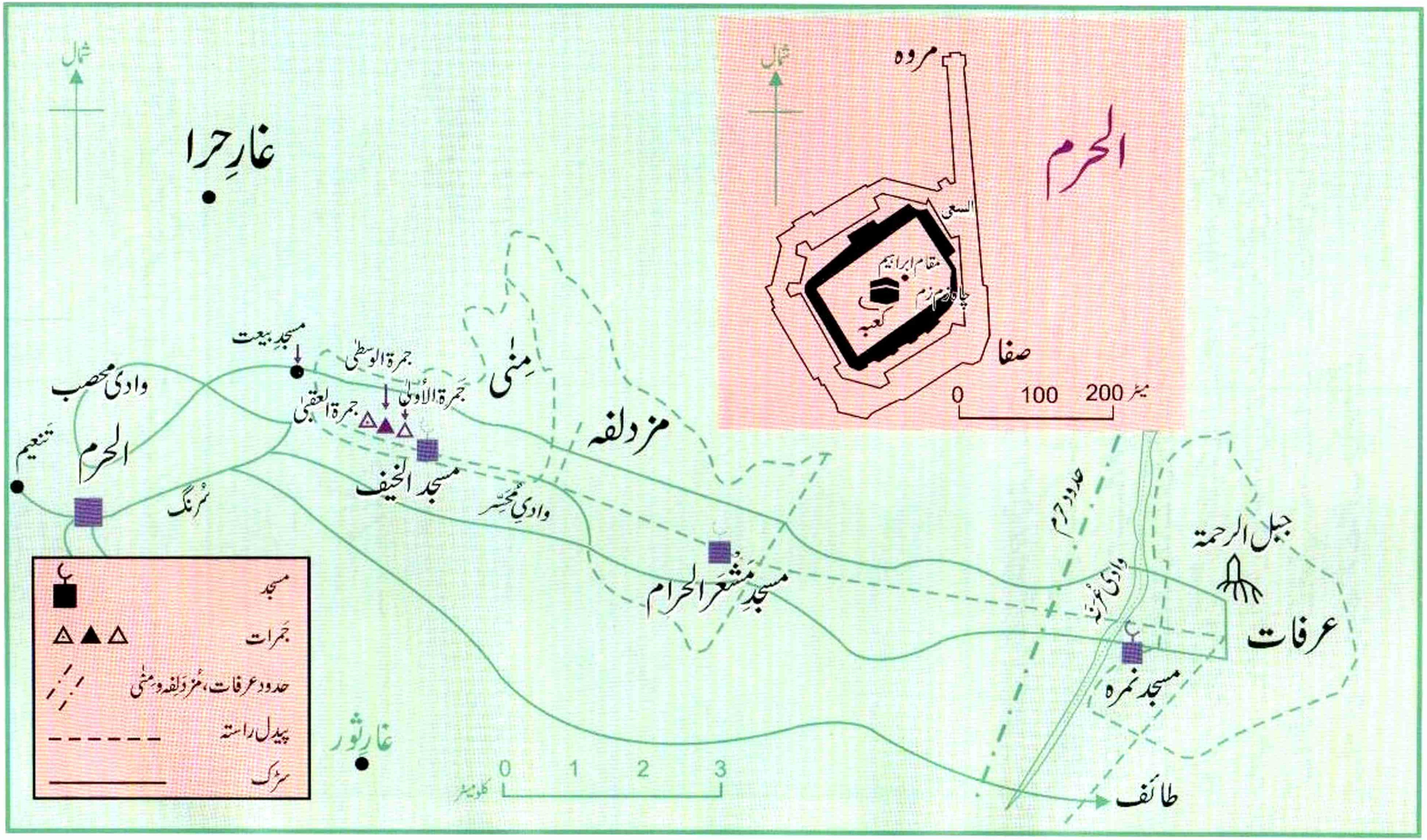
(۳۲۱) نماز

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہاجرت



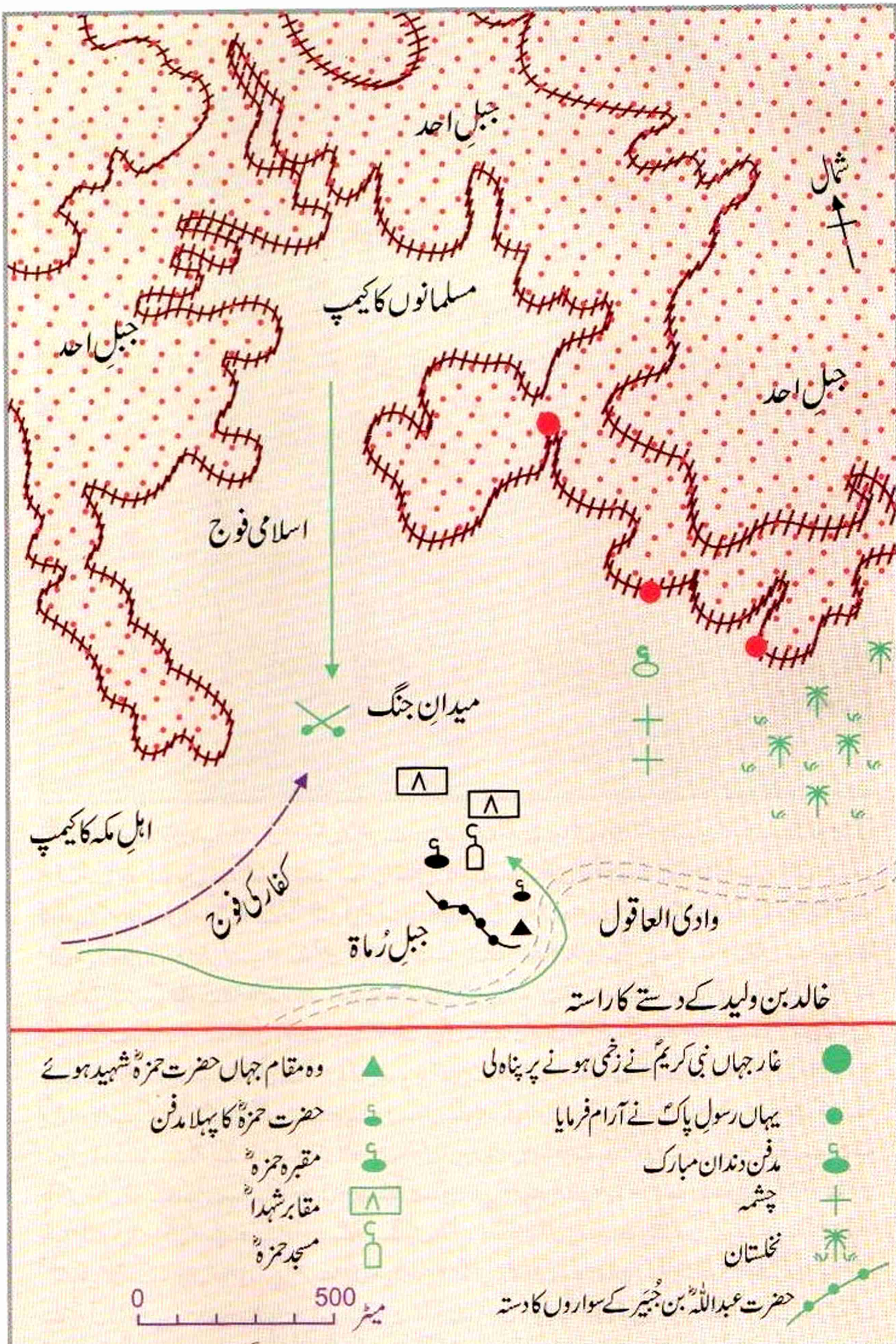
تشریح: حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق میں اُر کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آگ کے الاؤ سے بچ نکلنے کے بعد آپ وطن چھوڑ کر پہلے حرّان (یا حاران) تشریف لے گئے۔ پھر وہاں سے فلسطین کی طرف منتقل ہوئے اور بیت اِیل، بیت حبرون اور بیرِ شَبَع میں اپنی دعوت کے مراکز قائم کیے۔ پھر بحرِ لوط کے مشرق میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو مامور کیا۔ وہاں سے آپ مصر تشریف لے گئے جو اُس زمانے میں عراق کے بعد تہذیب وتمدن کا دوسرا عظیم الشان گہوارہ تھا۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مصر میں بھی آپ کا تبلیغی مشن قائم ہوا یا نہیں۔ اس کے بعد آپ نے حجاز کا رخ کیا اور مکہ میں بیت اللہ تعمیر کر کے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس کی خدمت سپرد کی۔ پھر فلسطین میں حبرون کو اپنا مستقل مرکز بنایا اور یہیں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے بعد آپ کے دوسرے صاحب زادے حضرت اسحاق علیہ السلام اس مرکز میں آپ کے جانشین ہوئے اور ان سے یہ میراث حضرت یعقوب علیہ السلام کو پہنچی۔

نقشہ مقاماتِ حج



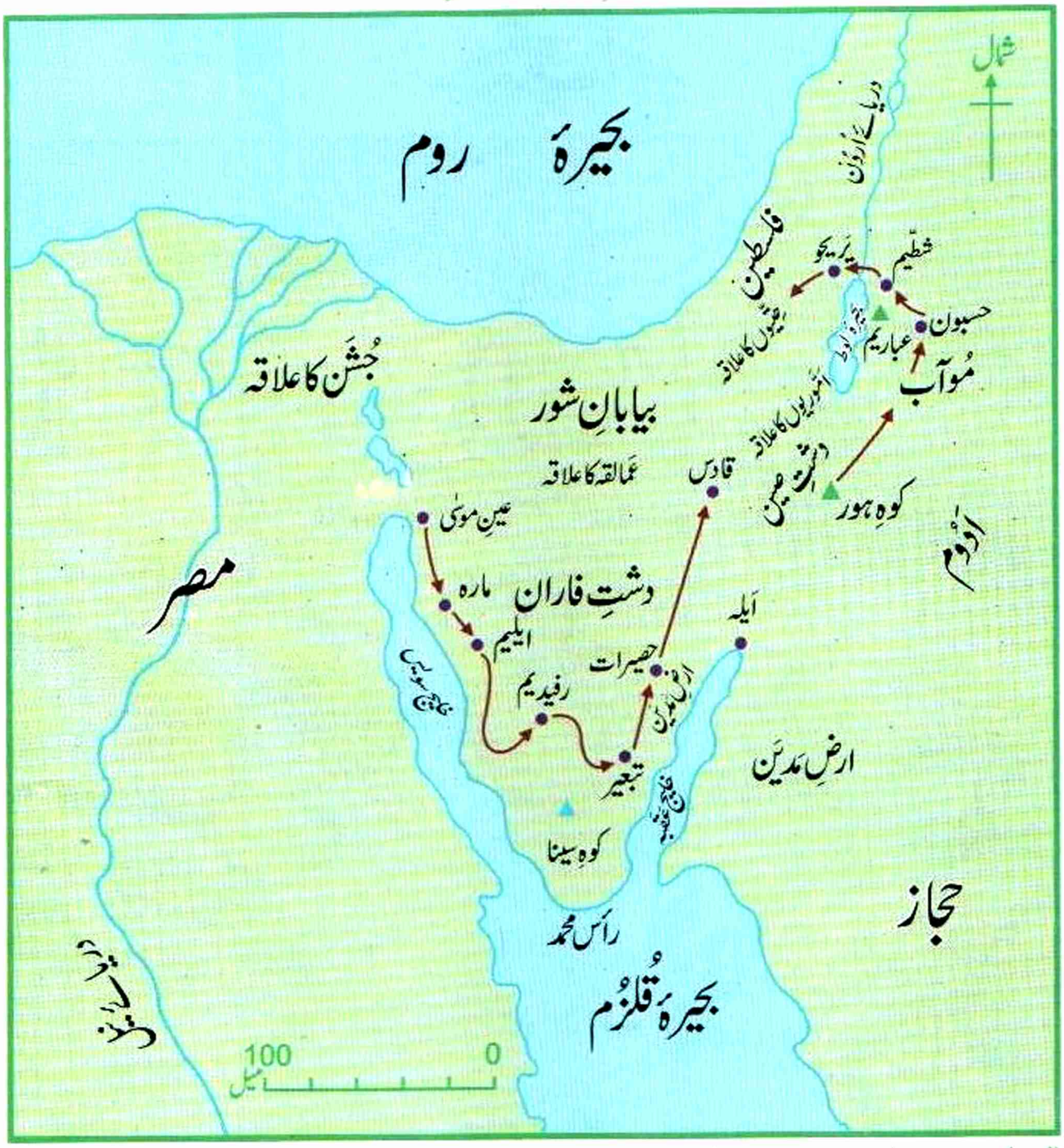
نقشہ متعلقہ صفحہ ۱۵۶ (جلداول)

نقشہ جنگِ اُحُد



جبلِ احد
شمال
جبلِ احد
مسلمانوں کا کیمپ
جبلِ احد
اسلامی فوج
جبلِ احد
میدانِ جنگ
اہلِ مکہ کا کیمپ
کفار کی فوج
جبلِ رُماۃ
وادی العاقول
خالد بن ولید کے دستے کا راستہ
غار جہاں نبی کریمؐ نے زخمی ہونے پر پناہ لی
یہاں رسولِ پاکؐ نے آرام فرمایا
مدفن دندان مبارک
چشمہ
نخلستان
حضرت عبداللہؓ بن جُبیر کے سواروں کا دستہ
وہ مقام جہاں حضرت حمزہؓ شہید ہوئے
حضرت حمزہؓ کا پہلا مدفن
مقبرہ حمزہؓ
مقابر شہداؓ
مسجد حمزہؓ
0
500
میٹر

بنی اسرائیل کی صحرا نوردی



تشریح: حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر جزیرہ نمائے سینا میں مارہ، ایلیم اور رفیدیم کے راستے کوہِ سینا کی طرف آئے اور ایک سال سے کچھ زائد مدت تک اس مقام پر ٹھیرے رہے۔ یہیں تورات کے بیشتر احکام آپ پر نازل ہوئے۔ پھر آپ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین کی طرف جاؤ اور اسے فتح کر لو کہ وہ تمھاری میراث میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیے ہوئے تبعیر اور حصیرات کے راستے دشتِ فاران میں تشریف لائے اور یہاں سے آپ نے ایک وفد فلسطین کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ قادس کے مقام پر اس وفد نے آکر اپنی رپورٹ پیش کی۔ حضرت یوشع اور کالب کے سوا پورے وفد کی رپورٹ نہایت حوصلہ شکن تھی۔ جسے سن کر بنی اسرائیل چیخ اٹھے اور انھوں نے فلسطین کی مہم پر جانے سے انکار کر دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب یہ چالیس برس تک اس علاقے میں بھٹکتے رہیں گے اور ان کی موجودہ نسل، یوشع اور کالب کے سوا فلسطین کی شکل نہ دیکھنے پائے گی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل دشتِ فاران، بیابانِ شور اور دشتِ صین کے درمیان مارے مارے پھرتے رہے اور عمالقہ، اَموریوں، اَدومیوں، مدیانیوں اور مُوآب کے لوگوں سے لڑتے بھڑتے رہے۔ جب چالیس سال گزرنے کے قریب آئے تو اَدوم کی سرحد کے قریب کوہِ ہور پر حضرت ہارون علیہ السلام نے وفات پائی۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیے ہوئے موآب کے علاقے میں داخل ہوئے اور اس پورے علاقے کو فتح کرتے ہوئے حسبون اور شطیم تک پہنچ گئے۔ یہاں کوہِ عباریم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہوا اور ان کے بعد ان کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشع علیہ السلام نے مشرق کی جانب سے دریائے اردن کو پار کر کے شہر یریحو (اریحا) کو فتح کیا۔ یہ فلسطین کا پہلا شہر تھا جو بنی اسرائیل کے قبضے میں آیا۔ پھر ایک قلیل مدت ہی میں پورا فلسطین فتح ہو گیا۔ اس نقشے میں اَیلہ (قدیم نام اَیلات اور موجودہ نام عَقَبہ) وہ مقام ہے جہاں غالباً اصحاب السبت کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر سورۂ بقرہ رکوع ۸، اور سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں آیا ہے۔